

گھر کے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
فروری 2014
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
عنیزہ سید اور رفعت سراج کے دل پذیر ناول
ماہِ ربیع الاوّل کی مناسبت سے پُرکیف مضمون
مکمل ناول ناولٹ
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات



ماڈل: فرینہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 41 • شمارہ 11 • فروری 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

یہ حقیقت ہے کہ ایک خوش باش انسان وہ ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے، سب سے محبت کرتا ہے، ہر ایک کی عزت کرتا ہے، اس کی دلچسپیاں وسیع ہوتی ہیں اور اس کے ذریعے وہ اپنی خوشیاں حاصل کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر دوسرے لوگ اس میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسے اپنی محبتیں عطا کرتے ہیں۔

آج ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور اس کی عزت کی جائے لیکن کبھی ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس حق کے ساتھ ہمارا کوئی فرض بھی ہے......؟ ہم بھی اپنے عزیز و اقارب سے محبت کریں، اپنے دوستوں کی عزت کریں۔

وہ لوگ جو بے لوث محبت کرتے ہیں...... محبتیں بانٹتے ہیں...... وہ کبھی کسی معاملے میں خسارہ نہیں اٹھاتے...... محبتیں بانٹنے والوں کو جواب میں محبتیں لازمی ملا کرتی ہیں۔

پاکستان میں جوائنٹ فیملی سسٹم کے بتدریج ختم ہونے کی ایک اہم وجہ محبت کی کمی بھی ہے...... کہ اب ہم یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے پاس رہیں...... بے شمار دادا، دادی اور نانا، نانی...... اپنے گھر میں علیحدہ رہ کر زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں بلکہ زیادہ پرسکون رہتے ہیں۔ آج کل ذمے داریوں کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے اور اسے اٹھانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ اب اگر ہم آپ سے یہ کہیں آج کل ہم بہت سارے مسائل میں اس وجہ سے بھی گرفتار ہیں کہ ہم انہیں محبت سے حل نہیں کرنا چاہتے تو یہ بات غلط نہیں ہے۔ آیئے...... ہم اپنے گھر اور اپنے آس پاس کے لوگوں سے محبت سے ملیں کہ محبت کی کمیابی نے ہمارے لہجوں میں کڑواہٹ بھر دی ہے۔ جس کی خلاصی تو ہونی ہی چاہیے۔

مدیرہ
انجم انصار

کیا یہ لوگ (زمانہ) جاہلیت کا (سا) حکم (تم سے بھی) چاہتے ہیں حالانکہ ایمان دار لوگوں کے لیے بہ اعتبار حکم کے اللہ سے اچھا کون ہے (۵۰) اے ایمان والو یہود اور نصاریٰ کو (اپنا) دوست نہ بناؤ وہ (باہم) ایک دوسرے کے دوست (رہے) ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا تو بے شک وہ ان ہی میں سے ہو جائے گا (اور) بے شک (وہ ظالم ہے اور) اللہ ظالم لوگوں کو راہ راست پر نہیں لاتا (۵۱) پس جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے ان ہی کو تم دیکھو گے کہ ان (کی محبت کرنے) میں جلدی کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) کہ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کوئی مصیبت ہمیں (نہ) پہنچ جائے پس عنقریب اللہ فتح (ظہور میں) لائے گا (اور) کوئی بات ظاہر فرمائے گا پس یہ لوگ اس پر جس کو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھا ہے پشیمان ہوں گے (۵۲) اور مسلمان کہیں گے کہ کیا یہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی سخت (سخت) قسمیں کھائیں تھیں کہ بے شک وہ تمہارے ساتھ ہیں (قیامت میں) ان کے (تمام نیک) کام ضائع ہو جائیں گے اور یہ (سخت) نقصان اٹھائیں گے (۵۳) اے ایمان والو (کافروں کی صحبت سے مرتد ہو جانے کا اندیشہ ہے اور) جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے اور وہ اسے دوست رکھتے ہیں مسلمانوں سے تواضع کرنے والے اور کافروں پر سختی کرنے والے ہوں گے اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اس جہاد پر) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے (ان لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہوگا مگر) یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ (بڑا) وسعت والا (اور) دانا ہے (۵۴)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۵۰ تا ۵۴)



سیدنا حامد ﷺ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ...(۲۰) مزمل

ترجمہ: بے شک آپ ﷺ کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ آپ ﷺ رات کو کھڑے رہتے ہیں، قریب دو تہائی یا آدھی رات یا تہائی رات اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی۔

3۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ رات کو کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہو جاتے پھر سو جاتے پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے۔ غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔

4۔ ربیعہ کعب اسلمی رات کو آپ ﷺ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے، سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی۔ (مسند احمد بن حنبل)

5۔ جب سورۂ نصر نازل ہوئی جس میں تسبیح و تحمید کا بیان ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی۔ (ابن سعد)

6۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی پوری رات آنحضور ﷺ کھڑے رہتے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نسآ (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے۔ جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی۔ خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے۔ کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے۔ (بخاری)

(قیصرہ حیات کی کتاب 'انوار اسما النبی ﷺ)

امانت

رفعت سراج

قسط 14

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے. موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے. ایسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہارسو اجالا کردیتی ہیں.

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو ناقابل قبول ہوتا ہے۔ فائزہ، احمر کے ساتھ شبینہ سے ملنے آتی ہے تو اس کے جانے سے پہلے ہی جابر علی آجاتا ہے اور وہ اس کے آنے پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ شبینہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ ستارہ کو بتادے کہ شادی اس کی نہیں بلکہ ستارہ کی ہو رہی ہے۔ گل جان نے روما کو بتایا کہ رابی کی شادی ہو رہی ہے تو روما بھی پریشان ہوگئی۔ کائناز بخار کی شدت سے نڈھال تھی وہ دل بہلانے کے لیے روما کو فون کرتی ہے تو کوئی فون ریسیو نہیں کرتا۔ گل جان، رابی کو مہر جان کی دی ہوئی ساڑی دیتی ہے کہ وہ تیار ہو جائے۔ رابی نے ساڑی پہن کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور پھر بے ترتیبی سے اپنے بال کاٹ لیے اس کے بعد اس نے تیزاب میں روئی بھگو کر اس سے اپنے چہرے پر لائنیں کھینچنا شروع کر دیں۔ اندر کی جلن نے ہر تکلیف کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ کائناز کہتی ہے تو شاہ عالم اسے روما کے گھر لے جاتے ہیں۔ صابرہ کی برہان سے بات ہوتی ہے تو وہ کائناز کے بارے میں پوچھتی ہے۔ سہراب خان، رابی کی شکل دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان ایک بار پھر آئی سی یو میں داخل ہوگئی تھیں۔ صابرہ بالآخر ستارہ کو بتاتی ہے کہ شادی اس کی ہو رہی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا کہ ان کا ذہن ماضی کی باتیں یاد کر رہا ہے اور وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ روما، رابی اور کائناز کو گل جان کے بارے میں بتاتی ہے۔ ستارہ کا وارث علی سے نکاح ہو جاتا ہے۔ گل جان، شاہ عالم کو بتاتی ہے کہ وہ مہر جان کا علاج نہیں کرائے گی اور وہ روما کو بھی کچھ دن کے لیے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں جس پر شاہ عالم کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ صابرہ، ستارہ کی رخصتی کے بعد بہت روتی ہے کہ ستارہ یہ کہہ کر گئی ہے کہ وہ اب کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔ روما فکر مند ہوتی ہے کہ وہ کب تک مہر جان کے سامنے نہیں جائے گی۔ وارث علی اپنی بیوی ستارہ کے انداز دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے وہ بغیر کسی جھجک یا گھبراہٹ کے وارث علی سے بات چیت کر رہی تھی۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شبینہ کی جگہ اس کی شادی ہوگئی ہے اور وہ اس سے ملنے اس کے گھر آسکتا ہے۔ گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے جب وہ مہر جان سے کہتی ہے کہ انہیں لگتا ہے کہ وہ اصیل خان سے محبت نہیں کرتی۔ مہر جان اس بات کی نفی کرتی ہے۔ برہان، ستارہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے تو فون کر کے وارث علی سے ایڈریس سمجھتا ہے وارث علی، برہان کی آمد سے تھوڑا پریشان ہو جاتا ہے۔ ستارہ، برہان کو بتاتی ہے کہ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں جائے گی۔ برہان اسے سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مشکل میں وہ اس کے ساتھ ہے۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس پی سے ولیمے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ روما شاہ عالم کے گھر آجاتی ہے۔ کائناز اسے پڑھنے کے لیے بلاتی ہے تو وہ اگلے دن سے پڑھنے کا کہتی ہے۔ جابر علی، ستارہ کے گھر آتا ہے تو وہ اسے ملے بغیر نوکر سے ایک پرچہ بھجوا دیتی ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ وہ سمجھ لے کہ ستارہ مر چکی ہے۔ اب وہ کبھی اس سے نہیں ملے گی۔ جابر علی سے اپنی یہ بے عزتی ہضم نہیں ہوتی اسے چپ لگ جاتی ہے۔ شاہ عالم، اصیل خان سے رابی اور روما کے والد کے بارے میں دریافت کرتے ہیں لیکن اصیل خان کو مشکل میں دیکھ کر بتانے پر اصرار نہیں کیا۔ ستارہ، وارث علی سے کہتی ہے کہ اگر ڈرائیور اپنی بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے آئے تو اسے آسانی ہو جائے گی۔ جابر علی کی خاموشی صابرہ کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ کانسٹیبل جابر علی کو ریڈ کرنے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ علاقہ وارث علی کا ہے۔ ایس پی، جابر علی کو منع کرتا ہے لیکن جابر علی کہتا ہے کہ جو آرڈر اسے ملا ہے وہ اس پر عمل ضرور کرے گا۔ ایس پی شاہ زمان، وارث علی کو جابر علی کے ارادوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ مہر جان سرونٹ کوارٹر میں جاتی ہے اور اصیل خان کو دیکھ کر اس سے پوچھتی ہیں کہ وہ کون ہے۔ اصیل خان، مہر جان کو جواب دینے کے بجائے نماز کی نیت باندھ لیتا ہے۔ جابر علی صبح صبح وارث علی کے گھر آتا ہے تو وارث علی، ستارہ سے کہتا ہے کہ وہ اپنے باپ سے مل لے اور اسے کہہ دے کہ کسی کے گھر آنے کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ ستارہ، وارث علی کی بات پر حیران رہ جاتی ہے۔

اپاکی ....

ستارہ نہایت ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔ اس نے باپ کو ایک خط کے ذریعے اپنی دلی کیفیت اور حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا...... پھر وہ دوبارہ کیوں آئے اگر ردِ عمل ظاہر کرنا ہی تھا تو اسی وقت ظاہر کر دیتے جب اس نے انہیں خط لکھا تھا جبکہ وہ جانتے ہوں گے کہ وہ موجود ہے مگر سامنے نہیں آرہی۔

اس نے خراٹے بھرتے وارث علی کی طرف دیکھا۔ وارث علی نے اس کے باپ یعنی اپنے سسر کی اتنی بے عزتی کی تھی کہ جو اس نے نہیں کی تھی...... آخر کو وہ بیٹی تھی اسے زندگی کے کسی موڑ پر رعایت مل سکتی تھی مگر سسر، داماد کے رشتے میں اتنی رعایت نہیں مل سکتی تھی۔ ہمیشہ کی دشمنی کے لیے تمام دروازے کھل سکتے تھے۔

اس روز وارث علی گھر پر نہیں تھا۔ اس نے جو دل چاہا کیا مگر اس وقت وارث علی موجود ہے خواہ سو رہا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہونے لگا مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اسی وقت دروازے پر بہت ہلکی سی دستک ہوئی۔

''کہیں ابا جان انتظار سے اکتا کر اوپر تو نہیں چلے آئے۔'' وہ بری طرح چونک گئی۔ وارث علی نے بے مروتی سے جو الفاظ کہے تھے وہ ملازم کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ من وعن پہنچا دیتا۔

''کون ہے......؟'' اس نے ڈرتے، ڈرتے سوئے ہوئے وارث علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ہوں بیگم صاحبہ...... نعیم۔''

''ایک منٹ......'' ستارہ نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر محتاط انداز میں دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے؟''

''وہ...... انسپکٹر جابر علی آپ کو بلا رہے ہیں......'' اس نے مؤدبانہ کہا۔

''مجھے......؟'' ستارہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

''جی...... وہ کہتے ہیں اپنی بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔'' نعیم نے سابقہ انداز میں کہا۔

''اچھا تم چلو...... میں آرہی ہوں۔'' ستارہ نے سوچتے ہوئے نعیم کو تو ٹہلایا۔ نعیم کے جانے کے بعد اس نے چند لمحے سوچا پھر آگے بڑھ کر اپنا دوپٹا اٹھایا، ایک نظر سوئے ہوئے وارث علی پر ڈالی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر چلی آئی۔ کمرے سے باہر آکر بھی وہ بری طرح الجھنے لگی۔ جابر علی کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کو مختلف قسم کے اندیشے ستا رہے تھے اگر جابر علی نے اپنی عادت کے مطابق بلند آواز سے بولنا شروع کر دیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ وارث علی کے انداز و اطوار سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ بدلحاظی کی انتہا تک جا سکتا ہے اور ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر وارث علی نے مشتعل ہو کر اسے باپ کے ساتھ گھر سے نکال دیا؟ تو جابر علی نے اس کے ساتھ پھر وہ کرنا تھا کہ اس گھر میں ایک دن گزارنا بھی ایسا ہی تھا جیسے ایک صدی گزارنا...... اس خیال نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی بلکہ اس پر ایک طرح کی گھبراہٹ طاری ہوگئی اور وہ منجمد دماغ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں یوں چلی آئی جیسے کوئی اسے دھکیلتا ہوا وہاں تک لایا ہو۔

جابر علی بڑی بے قراری سے ٹہل رہا تھا جیسے ایک، ایک لمحہ بھاری ہو۔ ستارہ نے اندر قدم رکھا اور دل پر پتھر رکھ کر سلام کیا۔

''السلام علیکم......'' جیسے کسی روبوٹ کے منہ سے سلام نکلا تھا۔ جابر علی نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ بڑے کڑے تیور کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''چلو میرے ساتھ......'' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ حکم صادر کر دیا۔

''کہاں......؟'' ستارہ نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا جیسے چھت اس کے سر پر آ رہی ہو۔

''گھر......'' جابر علی نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن گھر تو میرا یہ ہے جو آپ نے مجھے بڑی خوشی سے تحفے میں دیا ہے، اب آپ کے گھر سے میرا کیا واسطہ......؟'' وہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔

''زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں...... میں کہہ رہا ہوں فوراً چلو۔ یہاں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں۔'' جابر علی نے عجلت کے انداز میں کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس گھر کو آپ میری قبر سمجھیں اور مردہ کبھی قبر چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتا۔''

''بکواس بند کرو...... وارث علی نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ ڈپارٹمنٹ کے کچھ لوگوں نے مجھ سے انتقام لیا ہے، دشمنیاں بھگتائی ہیں۔'' جابر علی کو اپنے مزاج کے برخلاف وضاحت کرنا پڑی۔ اس لیے کہ وہ ستارہ کو وہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتا تھا۔

''تو یہ آپ کا مسئلہ ہے، میرا اس سے بھلا کیا تعلق ہے؟'' ستارہ نے جابر علی سے وارثت میں ملنے والی بے مروتی کا شاندار مظاہرہ کیا۔

''وارث علی وہائٹ کالر جرائم میں ملوث تو ہے ہی مگر اب ڈنکے کی چوٹ پر جرائم کرنا چاہتا ہے۔ لینڈ مافیا کا بہت بااثر بندہ ہے۔ میں نہیں چاہتا میری اولاد حرام کا مال کھائے، نکلو یہاں سے۔'' جابر علی نے اپنے حساب سے بہت اختصار کے ساتھ اسے ساتھ لے جانے کی وجہ بیان کی۔ جو ستارہ نے بہت توجہ سے سنی پھر بڑے تمسخرانہ... انداز میں مسکرائی۔

''یہ چھان بین تو پہلے کرنی چاہیے تھی اب تو آپ کی پسند سے یہ شادی ہو چکی...... اور وہائٹ، بلیک، بلو، ریڈ جو بھی کالر ہے میری قسمت ہے۔''

''میری اولاد حرام کا مال کھائے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' جابر علی کے انداز میں قطعیت تھی۔

''اب میرا حرام حلال آپ کا مسئلہ نہیں ہے، آپ اسے میری قسمت سمجھیں......'' ستارہ نے بھی باپ کی ٹون میں ہی جواب دیا۔

''کہہ رہا ہوں ناں میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اگر میری وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو تمہیں گھر سے نکالنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ اس لیے تمہیں اس سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں تمہیں اس بدکردار شخص سے خلع دلوائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا...... فوراً نکلو یہاں سے۔'' اس نے مخصوص انداز میں انگلی اٹھا کر جلدی چلنے کا اشارہ کیا مگر ستارہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بالکل بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''کیا کہہ رہا ہوں میں؟'' جابر علی نے اس کی بے خوفی اور ڈھٹائی کو غضب ناک نظروں سے گھورا۔

''آپ نے جو کہا...... میں نے سن لیا...... اب آپ بس اتنا سمجھ لیں کہ حرام کا مال کھانا میری قسمت میں لکھا ہے۔'' ستارہ نے بڑی قطعیت سے کہا۔

''غفلت میں کچھ ہو جائے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ جان بوجھ کر اللہ کی بنائی ہوئی حدود توڑنے والا مردود ہے، اس کی کبھی بخشش نہیں ہو گی۔ جلدی کرو......'' جابر علی نے اپنی فطرت کے مطابق عجلت کے انداز میں کہا...... اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا گویا سر پر کفن باندھ کر جہاد کو جا رہا ہو۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... اب حرام کھانا ہی میری قسمت ہے اور ابا جان یہ آپ کا فیصلہ تھا......'' ستارہ نے بے خوفی سے جواب دیا۔

''یہ سب کچھ تمہاری ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھا...... جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' جابر علی بڑی مشکل سے اپنا غیظ وغضب کنٹرول کر رہا تھا۔ وارث علی منظر سے غائب تھا...... جابر علی کے لیے یہ بھی غنیمت تھا اس کی آمد اس قصے کو مزید طول دے سکتی تھی اور وہ فضول بحث میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ستارہ نے ایک نظر جابر علی پر ڈالی اور ڈرائنگ روم سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ گویا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''تم ایک مجرم کو باپ پر ترجیح دے رہی ہو؟'' اسے باہر کی طرف جاتے دیکھ کر جابر علی کے تن بدن میں گویا آگ بھڑک اٹھی۔

''میں اس گھر سے کبھی نہیں جاؤں گی۔ کچھ بھی ہو جائے...... اس گھر سے اب میرا جنازہ ہی جائے گا......'' ستارہ نے ہٹ دھرم لہجے میں کہا۔

''تو پھر تمہارا جنازہ ہی جائے گا...... رزقِ حرام کھانے سے بہتر ہے کہ بندہ مر جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑی پُھرتی سے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالا...... ستارہ نے جابر علی کی بات سن کر غیر ارادی طور پر یونہی پلٹ کر دیکھا تھا۔ مگر باپ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر حیرت وخوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس سے پیشتر وہ کچھ منہ سے نکالتی جابر علی کے ریوالور سے چار پانچ شعلے نکلے اور ستارہ کے سینے اور پیٹ میں یوں جذب ہو گئے جیسے خشک مٹی پر گرنے والے پانی کے قطرے...... اس کے منہ سے کوئی چیخ بھی نہ نکل سکی اور وہ کارپٹ پر یوں گر گئی جیسے کوئی بوسیدہ خستہ دیوار...... فائر کی آواز سن کر اندر سے دو نوکر بھاگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے اور وہاں جو منظر تھا اسے دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہو گئے۔ نعیم کیونکہ خاصا کم عمر تھا اب تک ستارہ کی زیادہ بات چیت بھی اسی سے ہوئی تھی۔ وہ فوراً چیختا، شور مچاتا وارث علی کو خبر دینے ...... بھاگا تھا جو ساؤنڈ پروف ٹھنڈے بیڈروم میں بدمست نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ستارہ خون میں لت پت جابر علی کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ جابر علی کی آنکھوں میں ہنوز خون اترا ہوا تھا۔

''یہ آپ نے کیا کیا...... اپنی بیٹی کا خون کر دیا؟'' عمر رسیدہ ملازم بڑی مشکل سے گھگھیاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''دفعان ہو جاؤ یہاں سے...... اللہ اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے والی اولاد اسی طرح جہنم رسید ہوتی ہے۔'' ملازم خوف کی کیفیت میں ستارہ کی طرف دیکھ رہا تھا...... پہلی مرتبہ کسی انسان کا خون ہوتے دیکھا تھا، اس کی ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں وہ کسی سنگِ میل کی طرح اپنی جگہ گڑ کر رہ گیا تھا۔

''صاحب دروازہ کھولیں۔ جلدی باہر آئیں۔ مہمان نے گولی ماردی...... صاحب...... جلدی سے دروازہ کھولیں۔'' نعیم کے دروازہ پیٹنے اور چلّانے کی آوازیں ڈرائنگ روم تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

''دن چڑھ گیا...... تمہارے ابا جان ابھی تک ناشتا کرنے نہیں آئے کہہ کر گئے تھے کہ تھوڑی دیر میں آتا ہوں، صبح صبح کہاں چلے گئے۔'' صابرہ بہت پریشانی کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔

''شاید ابا جان کو دیر ہو رہی ہو گی...... باہر سے باہر ہی آفس چلے گئے ہوں گے۔''

''مجھے تو فکر سی ہو رہی ہے۔ وہ تو پہلے ہی بہت چپ، چپ تھے...... لگتا ہے کوئی بڑی پریشانی ہے۔'' صابرہ فکرمندی سے گویا ہوئی۔

''امی کیا، کیا جائے آپ کو تو پریشان ہونے کی عادت ہوگئی ہے۔ ابا جان یونیفارم میں گئے تھے۔ وہ آفس چلے گئے ہوں گے۔''

''ناشتے کے بغیر تو وہ گھر سے نکلتے ہی نہیں۔'' صابرہ بڑبڑائی۔

☆☆☆

جابر علی، ستارہ کے مُردہ وجود کو گھور رہا تھا جبکہ وارث علی سکتے کی کیفیت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کبھی جابر علی کو اور کبھی خون میں نہائی ہوئی ستارہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس منظر نے تو جیسے اس کے ہوش اڑا دیے تھے، قوتِ گویائی چھین لی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے بات شروع کرے اور جابر علی سے پوچھے کہ اس نے خونِ ناحق میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے...... دو، تین، نوکر بھی آ کر وارث علی کے پیچھے کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ وارث علی کو ایسے دیکھ رہے تھے گویا وہ ان کا نجات دہندہ ہو۔ ان کی گھبراہٹ اپنی جگہ بجا تھی وہ اس خوف میں مبتلا ہو چکے تھے کہ گھر میں ہونے والی اس واردات کو کہیں ان کے سر پر نہ تھوپ دیا جائے۔ یہ وہ نوکر تھے جو وارث علی کو بہت نیک، باکردار اور محنتی انسان سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کا صاحب دن رات محنت کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے یہ سب ٹھاٹ باٹ اور اعلیٰ معیارِ زندگی حاصل تھا۔ وہ تینوں معصوم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس واردات کا شاخسانہ ان کا اپنا ہی صاحب ہے۔

''یہ خون...... یہ خون...... !انسپکٹر جابر علی! تم نے اپنی بیٹی کا...... خون...... کر دیا...... کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟'' وارث علی کافی دیر گومگو کیفیت میں رہنے کے بعد جیسے پھٹ پڑا۔

جابر علی نے اپنی بے رحم اور بے مروت نظروں کا رخ وارث علی کی طرف موڑا اُس سے پہلے وہ اپنے جوتوں پر نظریں جمائے گہری سوچ میں کھڑا تھا۔

''زمین پر خون بہنے کی وجہ ہمیشہ بے ایمانی، دھوکا دہی اور ناانصافی ہوتی ہے۔ وارث علی اس خون کے ذمّے دار تم ہو۔'' جابر علی اتنی بھیانک واردات سے گزرنے کے بعد بھی اپنے مخصوص پُراعتماد انداز میں گویا ہوا۔

''مجھ پر الزام لگا کر تم بچ نہیں سکتے۔ تم نے اپنی یونیفارم کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور مجھے پھنسانے کی سازش کی ہے، یہ تو سوچ لیتے کہ یہ تمہاری اپنی بیٹی ہے۔'' وارث علی نے...... اب گولیوں کا شکار ہوئی ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے شدید حیرت اور صدمے کی کیفیت میں کہا تھا۔

''میرے گھر میں تھی تو میری بیٹی تھی یہاں آ کر یہ تمہاری بیوی بن کر مجھ سے بات کر رہی تھی۔ بددیانتی، بے ایمانی اور کرپشن کے ہاتھ مضبوط کر رہی تھی۔'' جابر علی نے یوں جواب دیا...... کہ اسے اپنے فعل پر ذرّہ برابر بھی ندامت نہیں ہو۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی احساسِ جرم میں مبتلا نہیں ہے...... بلکہ جیسے اس نے کوئی بہت بڑی نیکی کی ہو۔

''ایک بے گناہ...... اور وہ بھی تم نے اپنی اولاد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں...... تمہاری اولاد اس وقت خون میں لت پت تمہارے سامنے پڑی ہے...... تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا...... ارے...... تم انسان ہو

یا......'' وارث علی اتنا ہی بولا تھا کہ جابر علی زور سے دہاڑا۔

''بکواس بند کرو...... !تم اس ملک کا ناسور ہو...... پتا نہیں کتنے گھر اجاڑو گے...... اس سرزمین پر پیدا ہونے والی کتنی بیٹیاں تمہاری وجہ سے خودکشی کریں گی...... منہ چھپائیں گی...... یا قبر کا پردہ کریں گی، شرم کرو...... میں نے تو بڑھتے ہوئے گناہ کو مٹایا ہے، ایک ایسا گناہ جو پھلنے پھولنے جا رہا تھا۔ میری یہ بیٹی ایک مجرم کے ہاتھ مضبوط کرنے کی خبریں سنا رہی تھی مجھے اور یہ میرا فرض تھا...... کہ میں ایسا کروں۔''

''واہ...... سبحان اللہ...... جابر علی...... !تم نے اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے......'' جابر علی نے وارث علی کی بات کاٹتے ہوئے خون آشام نظروں سے گھورا۔

''اگر تیرے اندر انسانیت ہوتی خبیث انسان تو، تُو میرے گھر میں شب خون مارنے نہ آتا۔ مجھ جیسے ایماندار آدمی کو بے وقوف نہ بناتا...... لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں...... جو دنیا کی خاطر مصلحت سے کام لیتے ہیں اور آخرت کو بھلا دیتے ہیں...... اپنی موت کو بھلا دیتے ہیں۔''

''جابر علی تم جو مذہب کی آڑ لے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہو، کیا سمجھتے ہو آسمان سے فرشتے تمہارے لیے...... ایوارڈ لے کر اترنے والے ہیں...... اب تمہیں ساری زندگی جیل کی ہوا کھانا ہوگی بلکہ پھانسی کا پھندا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' وارث علی نے ایک نظر...... بے روح ستارہ کے وجود کی طرف دیکھا اور شدید دکھ اور صدمے کی کیفیت میں گویا ہوا۔

''تو میں کب بھاگ رہا ہوں۔ میں حق کی خاطر پھانسی چڑھنے کے لیے بھی تیار ہوں اگر مجھے بھاگنا ہوتا...... تو گولی مار کر بھاگ چکا ہوتا۔''

''اُف میرے خدایا!'' وارث علی نے عجیب نظروں سے جابر علی کی طرف دیکھا اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اپنا منہ بند رکھ منافق یہاں سے وہاں تک جو تباہی نظر آ رہی ہے اس کا ذمّے دار تُو ہے۔'' جابر علی اب ہذیانی انداز میں چلّایا تھا۔

''تم یہاں سے ایک انچ قدم آگے نہیں بڑھاؤ گے...... تمہاری گرفتاری اسی جگہ سے ہوگی۔''

''میں گرفتاری کا انتظار کر رہا ہوں، ارے لوگ حق کی خاطر سولی چڑھتے رہے ہیں، میں بھی تیار ہوں۔'' وارث علی نے جابر علی کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے اسے پورا یقین ہو کہ اس شخص کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔

☆☆☆

آناً فاناً جنگل کی آگ کی طرح یہ ہولناک خبر چاروں طرف پھیل چکی تھی...... صابرہ تو سنتے ہی تیورا کر گری تو اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ شبینہ اپنی جگہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ صدمے اور حیرت کی اس انتہا پر تھی جب آنسو کہیں گہری کھائیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور آنکھیں صحرا کی طرح پیاسی دکھائی دیتی ہیں، وہ رونا چاہتی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے آنسو کہاں گم ہوگئے ہیں...... ذہن ایک نکتے پر ہی جما ہوا تھا۔ وہ دریائے حیرت میں غوطہ زن تھی...... اسے آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھر میں انسانوں کا ایک ہجوم امڈ آیا تھا۔ اندر ہی نہیں گھر سے باہر بھی یوں مجمع لگا تھا جیسے کوئی جلسہ ہونے جا رہا ہو۔

برہان کو بھی آخرکار اطلاع مل ہی گئی تھی، وہ تو یونیورسٹی جا رہا تھا...... راستے میں تھا کہ ایک فون کال

آئی...... اور صرف اسے اطلاع دی گئی...... برہان نے خود کو سنبھالتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش بھی کی تھی کہ اسے یہ اطلاع دینے والا مہربان کون ہے مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا...... وہ پوائنٹ بس میں سفر کر رہا تھا جو فراٹے بھرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ اس کی اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کھڑا ہو کر ڈرائیور کو بس روکنے کے لیے کہہ سکتا اور نیچے اتر جاتا...... کھچا کھچ بھرے پوائنٹ میں ملی جلی آوازوں کا شور تھا ایک اسٹاپ پر بس کچھ اسٹوڈنٹس کو پک کرنے کے لیے رکی تو وہ نیچے اترنے کے لیے بے چین ہوا۔ اور ایک روبوٹ کی کیفیت میں اسٹوڈنٹس سے ٹکراتا، دھکیلتا آگے بڑھا اور بڑی عجلت میں پوائنٹ سے اتر گیا۔ پوائنٹ کے پیچھے آنے والے رکشا کو اس نے ہاتھ دے کر روکا اور جھٹ سے بیٹھ گیا اور پھر اپنے گھر کا پتا بتایا۔ اس کے بعد جیسے ماؤف ذہن کے ساتھ بس نادیدہ آنکھ سے اپنے لٹتے ہوئے گھر میں جھانکنے لگا جہاں اس کی ماں بال کھولے بین کر رہی تھی اور بہن رو رو کے نڈھال تھی۔

لیکن وہ جب گھر میں داخل ہوا تو منظر بالکل الٹ تھا۔ اس کی ماں بے ہوش تھی، محلے کی عورتیں اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہی تھیں جبکہ شبینہ سکتے کی کیفیت میں پتھر کا بت بنی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں یوں دروازے پر جمی تھیں جیسے وہ کسی اچھی امید سے دیکھ رہی ہو...... شاید...... اس راہ سے کوئی اچھی خبر آ جائے کوئی ایسی خبر جس میں اندھیرے نہ ہوں اجالے ہوں...... شاید کوئی کہے کہ...... ستارہ کے قتل کی خبر جھوٹ تھی وہ تو زندہ ہے...... کسی نے بڑا بھیانک مذاق کیا تھا۔

برہان نے بہت ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی بے ہوش ماں کی طرف دیکھا اور پھر بہن کی طرف...... اور پھر...... ایک رشتے دار عورت سے مخاطب ہوا جو اسے گلے لگا کر رونا چاہتی تھی...... وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''پلیز آپ لوگ روئیں نہیں، اس وقت امی کی فکر کریں۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں، امی کو اسپتال لے جانا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ بھرے مجمع پر نظر ڈالتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا جیسے ہی گھر سے باہر نکلا محلے کے مردوں نے اسے گھیر لیا۔

''ارے بیٹا......! کہاں جا رہے ہو، ہماری بات ہوئی ہے اسپتال میں ہے۔''

''وہ میں...... ٹیکسی لینے جا رہا ہوں، امی بے ہوش ہو گئی ہیں، خدانخواستہ انہیں کچھ نہ ہو جائے......''

''بیٹا! ہم کس لیے ہیں، محلے والے کس دن کام آئیں گے، چلو تم اماں کے پاس بیٹھو ہم ٹیکسی لے کر آتے ہیں۔ ایک صاحب نے ہمدردی اور اپنائیت سے کہا۔'' اِدھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔ ''ہاں، ہاں بیٹا ٹیکسی تو کوئی بھی لے آئے گا جاؤ تم اندر اپنی ماں اور بہن کو سنبھالو۔''

برہان نے چند لمحے اس مجمع کی طرف دیکھا جس میں کچھ لوگ اس کی جان پہچان کے تھے اور کچھ انجان بھی تھے۔ پھر وہ سر جھکا کر اندر چلا گیا اس کے تعاقب میں کئی آوازیں تھیں۔ ''ارے بھئی وہ کہہ رہا ہے کہ اس کی ماں بے ہوش ہے۔ جلدی سے ٹیکسی لاؤ اگر ایمبولینس پہلے آ سکتی ہے تو اسے فون کر دو۔''

برہان اندر داخل ہو گیا۔ عورتوں نے اسے دوبارہ اندر آتے دیکھا تو اِدھر اُدھر ہو کر ماں تک پہنچنے کا راستہ دینے لگیں۔

برہان بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی ماں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی بھیانک خواب ہے یا کوئی ظالم حقیقت......

☆☆☆

جابر علی کی گرفتاری کے فوراً بعد سب سے پہلے اس سے ایس پی نے ملاقات کی تھی۔

ایس پی شاہ زمان خان جو وارث علی کا ہم پیالہ، ہم نوالہ تھا جس نے وارث علی کو ایک انتہائی نیک اور پرہیز گار انسان کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ جابر علی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ ابھی تک یونیفارم میں تھا ایس پی بغل میں چھڑی دبائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اُسے بھی بہت شاک پہنچا تھا اس نے جابر علی سے کوئی طنزیہ بات نہیں کی کیونکہ وہ تو اس خبر کے آنے کے بعد سے اب تک دم بخود تھا اسے تو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آناً فاناً یہ ہو کیا گیا تھا۔

جابر علی نے ایس پی کی طرف دیکھ کر بڑی نفرت سے چہرہ موڑ لیا تھا۔

”تم نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا جابر علی......“ وہ بدقت تمام گویا ہوا تھا۔

”شاہ زمان خان اپنے کام سے کام رکھو...... اب نہ تم میرے افسر ہو اور نہ میں تمہارا ماتحت...... میں تم کے بجائے تُو سے بھی بات کر سکتا ہوں کیونکہ میں تو اپنے انجام تک آ گیا۔ اپنی خیر مناؤ...... اپنی عزت سنبھالو۔“ جابر علی کے ایک، ایک لفظ میں نفرت کے شعلوں کی آنچ تھی۔

”جابر علی! اس وقت تم مجھے ننگی گالیاں بھی دو گے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا...... میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آخر تم ہو کیا؟ اپنی اولاد کو تم نے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا؟ وہ بھی بے گناہ، بے قصور، معصوم لڑکی کو...... تمہارے چہرے پر ندامت کا، پچھتاوے کا کوئی تاثر بھی نہیں ہے۔“ ایس پی بہر حال انسان تھا اتنے بڑے سانحے پر وہ طنز اور تلخی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ حادثے کی گرد ابھی بیٹھی نہیں تھی بلکہ ابھی تو بگولے اٹھ رہے تھے اور اس گرد کو بیٹھنے میں تو شاید بہت طویل عرصہ درکار ہو گا...... جتنا بڑا طوفان ہوتا ہے اتنی دیر میں سنبھالا ملتا ہے۔

”میری روح شعلوں میں جھلس رہی ہے...... شاہ زمان خان چلے جاؤ یہاں سے اور اب کبھی میرے سامنے مت آنا۔“ جابر علی نے غراتے ہوئے کہا تھا۔

”آگ بجھ گئی......؟“ ایس پی نے گم صم کیفیت میں سوال کیا۔

”بجھ گئی ہے...... بہت سکون ہے، میرے گھر میں اگر اندھیرے نے جنم لیا تھا تو میں نے اس تاریکی سے جان چُھڑا لی۔“ جابر علی اسی طرح بڑے پُراعتماد اور سفاک لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”ابھی اس لیے سکون ہے کہ کال کوٹھڑی کا منہ نہیں دیکھا جابر علی، تمہیں پھانسی سے پہلے اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے۔“ ایس پی شاہ زمان خان نے اسی طرح گم صم کھوئی، کھوئی کیفیت میں اس سے کلام کیا تھا۔

جابر علی نے چہرہ موڑ کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس وقت اس کے بس میں ہو تو وہ ایس پی کے سینے میں بھی چار پانچ گولیاں اتار دے۔

”سچائی، ایمانداری کے لیے جان دے دوں گا اور مجھے ہمیشہ کے لیے سکون مل جائے گا۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ، میں تم جیسے دوغلے، منافق، بددیانت انسان کی شکل دیکھنا تو دور کی بات آواز بھی سننا نہیں چاہتا۔ شیطان کے ساتھ سمجھوتا نہیں کروں گا......“ یہ کہہ کر اس نے شاہ زمان کی طرف پشت کر لی تھی۔

”شیطان کو تم نے اس وقت عظیم کامیابی سے ہمکنار کیا ہے بے وقوف انسان، اس وقت شیطان کی دنیا میں تو جشن برپا ہو گا۔“ شاہ زمان خان نے بڑی سنجیدگی اور خفگی کے تاثر کے ساتھ بات کی۔

”جاؤ شیطان کے جشن میں شرکت کرو کیونکہ تم بھی تو اس کے بڑے حواری ہو، مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی کہ تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو...... بات کیوں کر رہے ہو...... لعنت بھیجتا ہوں میں تم پر اور ایسے افسروں پر جنہوں

نے اس ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے دفعان ہو جاؤ یہاں سے......“ ایک جونیئر اپنے سینئر کو جی بھر کر ذلیل کر رہا تھا مگر...... ایس پی شاہ زمان خان اس وقت حیرت اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وقتی طور پر سارے احساسات منجمد ہو جاتے ہیں اور انسان کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انسان نہ ہو وحشی جانور ہو...... جذبات اور احساسات سے عاری......

☆☆☆

صابرہ اسپتال کے ایک کمرے میں بے ہوش پڑی تھی۔ برہان کاریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ محلے کی چند عورتیں اور مرد اُن کے ساتھ آئے تھے۔ محلے کے ایک بزرگ اس کے پاس کھڑے تھے اور بہت دل سوزی سے کہہ رہے تھے۔

”بیٹے......! ہم نے تمہارے باپ کو کبھی کوئی غلط کام کرتے نہیں دیکھا۔ ہمارا اور ان کا ایک دو دن کا نہیں بیس برس کا ساتھ ہے پنج وقتہ نمازی، پرہیز گار...... رشوت اور سفارش کو تو وہ مانتا ہی نہیں تھا۔“

برہان نے خالی خالی نظروں سے ان بزرگ کی طرف دیکھا جو اس کے باپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

اسی وقت ایک دوسرا آدمی جس کو برہان گلی میں کبھی کبھی دیکھتا تھا تو سلام کر لیا کرتا تھا۔ جس کا نام بھی اس کی یادداشت میں نہیں تھا۔ برہان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہمدردی اور افسردگی سے بولا۔

”بیٹا...... بہت سے لوگ اپنا کام نکلوانے تمہارے گھر جاتے تھے مگر تمہارے باپ نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی، اس نے کبھی رشوت نہیں لی۔ پتا نہیں اس بے چارے کے ساتھ کیا ہوا لگتا ہے کہ اسے کسی سازش کے تحت پھنسایا گیا ہے...... ورنہ آج کل کے اس پُرآشوب زمانے میں ایسے ایماندار افسر تو بہت کم ہوتے ہیں ورنہ بیشتر تو رشوت اور سفارش کو اپنا جائز حق سمجھنے لگے ہیں۔“

”بیٹا! تمہاری بہن کا مرڈر تو اس کے شوہر کے گھر میں ہوا ہے ناں...... لگتا ہے کہ تمہارے بہنوئی نے کوئی چال چلی ہے۔ چار دن تو ہوئے تھے اس کی شادی کو...... سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک دم سے یہ کیا ہو گیا۔“

ایک تیسرا آدمی گویا ہوا برہان اسی طرح خالی خالی نظروں سے اپنے محلے داروں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ تو نہیں آ رہی تھی بس یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ لوگ جمع ہو کر شور مچا رہے ہیں۔

”سسٹر میری امی کو ہوش آیا؟“ صابرہ کے کمرے سے نرس باہر آئی تو برہان نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔ نرس نے برہان کی طرف دیکھ کر انکار میں سر ہلایا اور سر جھکا کر آگے بڑھ گئی۔

”بیٹا......! تم پر بہت بھاری ذمے داری آ گئی ہے مگر دیکھو حق کے لیے لڑنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ تمہیں اپنے بے گناہ باپ کی جان بچانے کے لیے جو کچھ کرنا پڑے اس میں ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔“ انہی بزرگ نے آگے بڑھ کر برہان کو سینے سے لگا لیا۔

”بے گناہ باپ......؟“ برہان کے کانوں میں ایک بازگشت سی گونجنے لگی۔ ”بے گناہ! کیا واقعی اس کا باپ بے گناہ ہے، نہیں، نہیں، ان کے ذمے ایک نہیں چار انسانوں کا قتل ہے، انہیں ایک قتل کا جواب نہیں دینا، انہوں نے چار انسانوں کے قتل کا جواب دینا ہے۔“ یہ آواز اس کے دل سے اٹھ رہی تھی... اور دماغ اسے کہہ رہا تھا کہ وہ احتیاط کرے...... دنیا سامنے کھڑی ہے تماشا نہ بنائے۔

☆☆☆

کائناز کافی دیر سے اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی کیونکہ برہان اپنے ٹائم پر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد دادا کے پاس چلی آئی۔

''خیریت ہے بیٹا کوئی لطیفہ سن کر آئی ہو بہت خوش نظر آرہی ہو؟'' انہوں نے اس سے مذاق کیا۔

''دادا جان! سر ابھی تک نہیں آئے۔'' کائناز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ کائناز کی بات سن کر وہ ایک دم چونک پڑے...... جیسے انہیں بھی یاد آگیا ہو۔

''ارے ہاں بیٹا! تمہارے سر ابھی تک نہیں آئے۔ اب تو سات بجنے والے ہیں اور ان کا تو ٹائم چھ بجے کا ہے۔''

''جی دادا جان وہی تو کہہ رہی ہوں کہ دس پندرہ منٹ بندہ لیٹ ہوجاتا ہے تو کوئی فکر نہیں لیکن ایک گھنٹا ہوگیا، سر آئے نہ ان کا کوئی فون آیا۔ چلو اگر وہ لیٹ بھی تھے تو فون کرکے بتا دیتے اتنی دیر میں اپنا دوسرا کام ہی کرلیتی ایک گھنٹا ضائع ہوگیا۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ہوں......'' شاہ عالم نے ہنکارا ابھرا...... پھر کائناز کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''وہ روما کیا کررہی ہے؟''

''شاید وہ شاور لے رہی تھی۔ میرا خیال ہے اب تک نکل آئی ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں۔''

''لیکن...... تم کیا کروگی دیکھ کر، سر تو تمہارے آئے نہیں ہیں اگر وہ اپنا کوئی کام کررہی ہے تو اسے کرنے دو۔ کیوں ڈسٹرب کرتی ہو؟''

''دادا جان وہ سر کا نمبر آپ کے پاس تو ہے ناں کیا پتا وہ ٹریفک میں پھنس گئے ہوں جو بھی بات ہوگی پتا تو چلے گی......'' کائناز جاتے جاتے رک گئی پھر سوچتے ہوئے بولی۔

''لاؤ میرا موبائل اٹھا کر دو۔'' انہوں نے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کائناز سے کہا۔

کائناز چند قدم آگے بڑھی اور سائڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر دادا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شاہ عالم نے برہان کا نمبر سرچ کیا پھر ڈائل کرکے موبائل کان سے لگالیا۔

کائناز بڑی بے تابی سے انہیں دیکھ رہی تھی اسے بس اس بات کی پڑی ہوئی تھی کہ اسے کسی طرح پتا چل جائے کہ سر آرہے ہیں یا نہیں تاکہ وہ روما کے ساتھ اپنا کوئی اور کام شروع کرے۔

''بیٹا......! تمہارے سر کا تو موبائل آف ہے۔'' ایک دو بار نمبر پریس کرنے کے بعد انہوں نے اسے واپس رکھ دیا اور بڑی فکر مندی سے گویا ہوئے۔

''آف ہے؟'' کائناز نے بڑی حیرت سے شاہ عالم کی طرف دیکھا۔ شاہ عالم نے ہاں کے انداز میں گردن ہلائی جیسے کچھ سوچ رہے تھے۔

''اب بتائیں میں کیا کروں؟''

''تم جا کر اپنا کوئی اور کام کرلو......''

''دادا جان یہ کتنی غلط بات ہے...... سر نے اگر نہیں آنا تھا تو کم سے کم فون تو کرلیتے...... بتا دیتے۔'' کائناز کو اپنا وقت ضائع جانے کا جیسے بہت افسوس ہورہا تھا۔ یہ وقت وہ روما کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرکے بھی گزار سکتی تھی۔ فضول میں ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگوں میں درد ہوگیا۔

''بیٹا وہ بہت ذمّے دار بچہ ہے، اس کے ساتھ ضرور کوئی مسئلہ ہوا ہوگا۔ ورنہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ اسے اگر نہیں آنا ہوتا تو فون بھی نہ کرتا۔ مجھے تو پریشانی ہوگئی ہے کہ آیا بھی نہیں، فون بھی نہیں کیا اب موبائل بھی بند

ہے۔ میں نے تو دو تین دفعہ ٹرائی کرلیا۔ اللہ رحم کرے آج کل کالجوں، یونیورسٹیوں میں بہانے بہانے سے بس ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔''

''جی، کہیں یونیورسٹی میں ان کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہوگیا ہو۔'' کائناز نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اللہ نہ کرے...... اللہ کرے سب خیریت ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود کانٹیکٹ کرے گا، تم جاؤ اپنا کام کرو بیٹا...... اگر وہ آگیا تو پڑھ لینا، نہیں آیا تو پھر اللہ مالک ہے۔''

''جی دادا جان......'' کائناز گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی وہ بھی شاہ عالم کی طرح فکر مند تو تھی۔

☆☆☆

صابرہ ہوش میں آگئی تھی۔ ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد اسے فارغ کردیا گیا تھا۔ شبینہ اور برہان اسے گھر لے آئے تھے مگر ابھی تک صابرہ سکتے کی کیفیت میں تھی اس نے برہان یا شبینہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے سوچنے کے انداز اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے انداز سے یہ تو یقین تھا کہ وہ پورے ہوش میں ہے۔ اس کے الفاظ گم ہوگئے تھے بالکل ایسے ہی جیسے کوئی گھر سے جاتے ہوئے تالا لگانا بھول گیا ہو اور کسی موقع پرست کو گھر صاف کرنے کا موقع مل گیا ہو...... ایک لفظ بھی تو نہ بچا تھا بولنے کے لیے...... آخر وہ...... شبینہ یا برہان سے بات کرتی بھی تو کیا یہی ناں کہ وہ بری طرح لُٹ گئی ہے۔ اس بری طرح کہ جھولی میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ بچا...... چاروں طرف سے اٹھتی ہوئی انگلیاں، طعنے دیتی ہوئی آوازیں، چھلنی کرتے ہوئے طنز کے تیر اور اس کی زندگی میں بچا ہی کیا تھا۔ شبینہ نے اسے کمرے میں لاکر لٹا دیا تھا۔ عزیز رشتے دار اور محلے سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جو بھی سنتا تھا چلا آتا تھا۔ برہان اور شبینہ کو تو ہر آنے والا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں پتھر ہو اور وہ اسی وقت کا انتظار کررہا تھا۔ خبر ملتے ہی پتھر مارنے چلا آیا۔ ایسے مواقع پر کی جانے والی تعزیت سے یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تازہ تازہ زخم پر کوئی نمک چھڑک رہا ہو۔

حادثے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہوتا ہے کہ انسان پر کوئی ذمّے داری نہیں آتی...... سب لوگ مل کے نہ سہی، کچھ لوگ تو رونے والی شکل بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں، ہونے والے حادثے کی باتیں کرتے ہیں، جانے والے کوئی نہ کوئی بات ایسی کر جاتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ اسے جنتی ہونے کی بشارت دی جارہی ہو...... دوسرا حادثہ وہ ہوتا ہے جو کسی انسان کی غلطی سے پیش آتا ہے۔ اس حادثے پر بھی لوگ غم زدہ شکلیں بنا کر آتے ہیں لیکن ان کے چہرے کچھ اور ظاہر کررہے ہوتے ہیں۔

یہ حادثہ بھی ایسا ہی تھا لوگوں کو ہمدردی سے زیادہ اس بات کی پڑی تھی کہ آخر ایسا کیا ہوا کہ باپ نے بیٹی کو گولی ماردی، اپنی ہی اولاد کی جان لے لی۔ ضرور کوئی بڑی بات ہوگی۔ ہوسکتا ہے...... لڑکی میں کوئی ایسی بات ہو جو برداشت نہ ہوسکی ہو ورنہ، ماں باپ تو اولاد پر جان دیتے ہیں۔ اولاد کی جان نہیں لیتے۔

صابرہ خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر چند لمحے بعد ہی غافل تھی اور آنے جانے والوں کے سامنے برہان اور شبینہ تھے جو تعزیت کرنے والوں کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ جو کوئی بھی ان سے تعزیت کررہا ہے اس کے جواب میں وہ کیا کہیں...... ایک عجیب تماشا سا لگا تھا، آنے والوں کو اس بات کی کھوج تھی کہ جانے والی کے ساتھ کیا بیتی...... ایسا کیا واقعہ

پیش آیا۔

☆☆☆

اصیل خان مغرب کی نماز پڑھ کر سجدے میں گرا اپنے معمول کے مطابق گڑگڑا کر بڑی دلسوزی سے دعائیں کررہا تھا۔ وہ عالم استغراق میں تھا، اسے پتا بھی نہیں چلا کہ مہر جان کب پورے گھر میں گھومتی ہوئی لان میں چلی آئی تھیں اور انہوں نے سجدے میں گرے ہوئے اصیل خان کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا اور پھر بڑی حیرت سے بڑبڑائی تھیں۔

''ارے یہ کون ہے؟ میں تو اسے نہیں جانتی۔''

اصیل خان نے بڑبڑانے کی آواز سنی تو اس کا استغراق ٹوٹ گیا اس نے جلدی سے دعا تمام کی اور سجدے سے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں سے مہر جان کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی تھی اس کی نظریں حیران کھڑی ہوئی مہر جان کی نظروں سے ٹکرائیں تو یوں لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو ایک دم نظریں جھکا لیں۔

''بڑے میاں تم کون ہو؟''

اصیل خان جانماز سے اٹھ کر جانماز تہ کرنے لگا اور خاموش تھا۔

''تم کون ہو اور ہمارے گھر میں نماز کیوں پڑھ رہے ہو، میں نے تو پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔'' مہر جان اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔

اصیل خان نے بڑی بے اختیاری سے نظریں اٹھا کر مہر جان کی طرف دیکھا مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''آپ اندر تشریف لے جائیں آرام کریں۔'' اسے یہی جملہ سوجھا۔

''میں کیوں آرام کروں؟ تم کون ہوتے ہو، مجھے کہنے والے اور یہ بتاؤ تم نے...... گل جان کو دیکھا ہے؟ کب سے اسے ڈھونڈ رہی ہوں پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے۔'' مہر جان نے اسی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی' وہ شاید اپنے کمرے میں ہوں۔''

''میں بتا رہی ہوں تمہیں کہ میں پورے گھر میں ڈھونڈ چکی ہوں' تمہیں عقل نہیں آرہی...... اس لڑکی کی انہی باتوں پر غصہ آتا ہے، انٹر میں پڑھ رہی ہے مگر ابھی تک گڑیوں کی شادی کررہی ہے، بے وقوف پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی۔''

اصیل خان سر جھکائے مہر جان کی بات سن رہا تھا بات ایسی تھی کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مہر جان نے اصیل خان کو یوں خاموش کھڑا دیکھا تو پھر بولیں۔

''حاجی صاحب میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ کون ہیں؟ آپ سے بات کررہی ہوں میں...... جواب کیوں نہیں دیتے۔''

''جی......! میں نوکر ہوں۔'' اصیل خان کو مہر جان کے اصرار کے سامنے آخر اب کچھ تو کہنا تھا اتنا کہہ کر وہ بھی سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

''نوکر......! تمہیں کس نے نوکر رکھا ہے، میں نے تو پہلے تمہیں نہیں دیکھا...... کون لے کر آیا ہے تمہیں یہاں پر؟''

''آپ اندر چلیں، گل جان بی بی سے پوچھیں' وہ آپ کو سب بتا دیں گی آئیں میرے ساتھ......'' اصیل خان کو اب یہی سمجھ میں آئی کہ وہ خود اسے لے کر اندر چلا جائے۔

''کیوں، میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں؟ میں تو تمہیں نہیں جانتی۔'' مہر جان نے غصے سے کہا پھر سر سے پاؤں تک اصیل خان کو گھورا اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے چند قدم چل کر پھر رک کر اصیل خان کی طرف دیکھا اور بولیں۔

''وہ بڑے میاں...... تم کون ہو؟'' اصیل خان آہستہ قدموں سے ان کے پیچھے ہی آرہا تھا۔ ایک دم اپنی جگہ رک گیا پھر سوچا اور بغیر جواب دیے چل پڑا۔ مہر جان آگے بڑھ رہی تھیں اور اصیل خان ان کی تقلید میں چل رہا تھا۔ برآمدے تک پہنچ کر مہر جان نے پھر پلٹ کر دیکھا بلکہ اصیل خان کو سر سے پاؤں تک نظروں سے جیسے تولا۔

''بڑے میاں تم کون ہو؟''

''جی میں آپ کا غلام ہوں۔'' اصیل خان نے ایک گہری سانس لی...... مہر جان یہ جواب سن کر پہلے سے زیادہ حیرت زدہ ہوگئیں۔

''غلام! ارے تم غلام ہو......؟ اچھا، اچھا تم غلام ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پھر چل پڑیں اصیل خان نے ان کی پشت ہوتے ہی جیسے موقع غنیمت جانا اور اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف چل پڑا اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ مہر جان چلتے چلتے اس سے پھر یہی سوال دُہرائے گی...... اس سے بیشتر کہ مہر جان پلٹ کر اسے دیکھتیں وہ ان کی نظروں سے غائب ہوجانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

برہان گھر کے برآمدے میں پلنگ پر لیٹا ہوا اوپر چھت کی طرف گھورے جا رہا تھا...... شبینہ کافی دیر سے نظر نہیں آئی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی ہوگی...... صبح سے وہ مسلسل مصروف تھی۔ آنے جانے والوں کا رش اب کم ہوتا جا رہا تھا...... جو پہلے سے موجود تھے وہ اپنے، اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ دو تین عورتیں جو کافی دیر سے ٹوہ لینے کے چکر میں تھیں وہ بھی تھک کر آخر کار چلی گئی تھیں اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگا تھا۔

''کیا کرنا ہوگا......؟ اب کیا کرنا چاہیے......؟ ستارہ تو یوں آناً فاناً پردے کے پیچھے چلی گئی جیسے اس کا جنم ہی نہیں ہوا تھا۔ کسی کہانی کے کردار کی طرح جو ذرا دیر کے لیے کہانی کا حصہ بنا تھا...... جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔'' وہ نہ جانے کب تک اسی طرح مختلف قسم کی سوچوں میں گم رہا...... اس کی گہری سوچ کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب اس کے کانوں سے ماں کی آواز ٹکرائی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر صبح تک تو لازمی سوئیں گی...... لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''کیا بات ہے امی......؟'' وہ ایک دم پلنگ سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔

''برہان گھر کے چپّے چپّے پہ ستارہ کھڑی دیکھ رہی ہے۔'' صابرہ نے خالی' خالی نظروں سے برہان کی طرف دیکھا اور بہت وحشت زدہ آواز میں گویا ہوئی۔

''امی آپ خود کو سنبھالیں۔ امی دیکھیں اگر آپ ہمت ہار دیں گی تو میں اور شبینہ کیا کریں گے۔ امی آپ

ہمارے لیے خود کو سنبھالیں۔'' برہان نے ماں کو کندھوں سے تھام کر بڑے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

''بیٹا! ستارہ کا آخری دیدار نہیں کیا میں نے، میں نے ابھی تک ستارہ کو نہیں دیکھا جب تک میں اسے نہیں دیکھوں گی مجھے صبر کیسے آسکتا ہے۔'' صابرہ کی بولتے، بولتے آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''امی ستارہ کا پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد اسے گھر لاسکیں گے۔'' برہان نے کہا۔

''ہائے میری مظلوم بچی، اب ڈاکٹرز اسے چیریں پھاڑیں گے۔ اس کے باپ نے اس کے ساتھ کیا کم کیا ہے جو رہی سہی کسر یہ ڈاکٹر پوری کریں گے۔ یہ ڈاکٹر مرے ہوئے انسان کے ساتھ قسائیوں جیسا سلوک کیوں کرتے ہیں بیٹا...... پتا تو ہے سب کو کہ باپ نے اپنی بچی کی جان لے لی ہے...... اب کیا کھوج لگائیں گے، کیا ڈھونڈیں گے اس کے مردہ جسم میں!'' صابرہ دیوانہ وار کہہ رہی تھی۔

برہان نے بے اختیار ماں کو گلے سے لگالیا۔ صابرہ کے ایک، ایک لفظ نے جیسے اس کے دل میں سوراخ کردیے تھے۔

''امی، میری پیاری امی، دیکھیں ہمیں ایک دوسرے کو سہارا دینا ہے۔ امی ایک قیامت آئی اور آکر چلی گئی مگر ہم تو زندہ ہیں، ہمیں تو آخر کار صبر سے ہی کام لینا ہے۔'' اس نے ماں کو جیسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کہاں چلی گئی بیٹا...... قیامت...... قیامت تو اب عمر بھر کے لیے ٹھہر گئی ہے۔'' اسی وقت شبینہ گرتی پڑتی چلی آئی اور برہان کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی تھی۔

''یہ تو سو رہی تھیں انہیں کس نے جگادیا۔ کیسے جاگ گئیں امی، ڈاکٹر تو کہہ رہے تھے کہ امی آٹھ دس گھنٹے سوئیں گی۔'' شبینہ حیرت اور پریشانی کے عالم میں بے ربط بول رہی تھی۔

''ارے ڈاکٹروں کا بس چلے ناں تو مجھے زندگی بھر کے لیے سُلادیں۔ ڈاکٹروں کا نام نہ لینا...... اس وقت تو ہر ڈاکٹر مجھے قسائی دکھائی دے رہا ہے جو میری مظلوم اور معصوم بٹی کے جسم پر چیرے لگا رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا نکالنا ہے اس کے مردہ جسم سے...... ارے برہان اسے گھر لے آؤ بیٹا...... اس کا کفن دفن ہو...... میری بچی کو زندگی میں چین نہیں ملا مرنے کے بعد بھی اب تک اس کی روح بھٹک رہی ہے، اسے اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچادو تاکہ میری بچی سکون سے سوجائے۔'' صابرہ یوں بول رہی تھی جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ اپنے ہوش میں نہ ہو۔

''آئیں امی آپ لیٹ جائیں اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔'' برہان نے بہن کی طرف دیکھا اور پھر ماں کو اپنے بازوؤں میں لے کر بولا۔

''نہیں، نہیں، میں نہیں لیٹوں گی اور اب کوئی گولی نہیں کھاؤں گی۔ برہان میں نہیں سونا چاہتی۔ میں اپنی بچی کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں، مجھے اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کرنی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ برہان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شبینہ نے بھی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

برہان ماں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر ان کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن شبینہ ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے اپنے دل میں پریشانیاں اور حیرتیں بال کھولے ناچ رہی تھیں۔ گھر کے جس کونے میں نظر جاتی تھی ستارہ کھڑی نظر آتی تھی۔ پاؤں پٹختی ہوئی جھنجلاتی ہوئی اور کبھی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی۔

☆☆☆

جابر علی سر جھکائے لاک اپ کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں شام ڈھلتے ہی ایسی خاموشی چھا جاتی ہے جیسے ہر قیدی سانس روک کر اپنی سزا سننے کا منتظر ہو...... اسی گہری خاموشی میں اس نے بھاری بوٹوں کی آواز سنی تو وہ اپنے گہرے خیالات سے ایک دم باہر آگیا اور متجسس نظروں سے اُدھر دیکھا جدھر سے بوٹوں کی آواز آرہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ گہری سوچ کا تاثر زائل ہوگیا اور اس کی آنکھوں سے نفرت کے سوتے پھوٹ پڑے سامنے ایس پی شاہ زمان خان آکھڑا ہوا تھا۔ اسے سامنے پاکر بھی جابر علی اٹھ کر کھڑا نہ ہوا۔

''جابر علی میں تم سے بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں، تم غور سے میری بات سننا۔'' ایس پی شاہ زمان خان نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں جابر علی کو مخاطب کیا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی اب میرا اور تمہارا بات چیت کا کوئی رشتہ نہیں...... اپنی شکل گم کرو۔'' جابر علی جو سالوں سے ایس پی کی ماتحتی میں کام کررہا تھا جونیئر تھا آج اس نے سیلوٹ کرنے کے بجائے...... اس بری طرح سے ذلیل کیا تھا کہ سیلوٹ کے عادی شاہ زمان خان پر جیسے کڑی گزر گئی اس نے بڑی مشکل سے اپنے کھولتے ہوئے لہو کو قابو کرنے کی کوشش کی کہ کہیں لہو اس کی رگوں سے نہ پھوٹ پڑے۔

''میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ کل تم مجسٹریٹ کے سامنے وارث علی کا نام نہیں لوگے۔ صرف اعترافِ جرم کروگے۔''

''مجھے لاک اپ میں آنے سے پہلے ڈرنا چاہیے تھا شاہ زمان خان...... اب مجھے کس بات سے ڈرانے کی کوشش کررہے ہو...... جبکہ پھانسی کا پھندا میرے سامنے جھول رہا ہے۔ جس ایمانداری کی وجہ سے آج یہاں پہنچا ہوں، موت قبول کیا ہے وہ ایمانداری قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گی۔ تم آج تک اپنی مرضی کا کام مجھ سے نہیں کرواسکے۔ اب تو میں تمہارے اختیار میں نہیں ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔'' جابر علی نے اس لب و لہجے میں شاہ زمان خان سے بات کی جس لب و لہجے میں وہ اپنے گھر والوں اور جونیئر سے بات کرتا تھا۔

''زیادہ ولی اللہ بننے کی کوشش مت کرو جابر علی ابھی تمہارے دو بچے زندہ ہیں۔'' شاہ زمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''بلیک میل ہُوا نہ کبھی ہوں گا۔ مجسٹریٹ کے سامنے کئی اہم رازوں سے بھی پردہ اٹھاؤں گا۔'' جابر علی نے بھی اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا اس وقت اسے یاد نہیں رہا کہ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے بات کررہا ہے۔

''تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جابر علی۔'' شاہ زمان خان نے مذاق اڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''تو پھر تم میرے پاؤں چھونے میرے پاس کیوں آئے ہو جب کوئی ڈر خوف نہیں تو جاکر آرام کرو اور حرام کے مال سے اپنا پیٹ بھرو اور پھر لمبی تان کر سوجاؤ۔'' جابر علی نے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جیسے وہ ابھی کے ابھی سارے بدلے لے لینا چاہتا ہو۔

''دیکھ لو جابر علی ایک بیٹی اور بھی ہے۔'' اس دفعہ شاہ زمان خان کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔

''کل تمہاری یہ دھمکیاں بھی ریکارڈ کراؤں گا۔'' جابر علی نے شاہ زمان کی طرف پشت کرلی۔ شاہ زمان خان نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک نظروں سے تولا اور پھر انتہائی تلخ اور طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

''جابر علی بندھے ہاتھوں سے زمین پر پڑی تلوار دیکھتے رہو۔ ہم تمہیں بیان ریکارڈ کروانے نہیں

دیں گے۔''

یہ سن کر بھی جابر علی نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ شاہ زمان خان نے چند لمحے جابر علی کی پشت کی طرف دیکھا پھر واپس ہوگیا۔ اس کے بُوٹوں کی آواز سے جابر علی نے اندازہ لگایا کہ وہ واپس جارہا ہے۔ بوٹوں کی آواز غائب ہوتے ہی وہ پلٹا اور اس نے لاک اپ کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے سختی سے یوں تھام لیں جیسے اکھاڑ کر پھینک دے گا۔

☆☆☆

''یار! یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔'' کائناز بڑی پریشانی کی کیفیت میں روما سے کہہ رہی تھی...... ''ہمارا کل کتنا امپورٹنٹ ویک ہے سر کو بھی پتا تھا لیکن وہ پتا نہیں کہاں غائب ہوگئے۔ فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ دادا جان نے سونے سے پہلے تک انہیں ٹرائی کیا لیکن فون بند ہی ملا۔''

''پتا نہیں کہیں بے چاروں کی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔'' روما نے اپنے لہجے میں جی بھر کر ہمدردی سموتے ہوئے کہا۔

''ہاں ممکن ہے لیکن اگر طبیعت بھی خراب ہوتی تو وہ فون کرکے بتا سکتے تھے کہ میری طبیعت خراب ہے آج میں نہیں آسکوں گا۔ خود بھی فون کرکے نہیں بتایا اور اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے، مجھے تو پریشانی ہورہی ہے۔'' کائناز اسی طرح فکرمندی کی کیفیت میں بولے چلی جارہی تھی۔

''اب چھوڑو، رات ہوگئی ہے اس سے پہلے بھی تو سر کے بغیر ہم ٹیسٹ دیتے رہے ہیں جیسے تیسے پاس ہوجاتے ہیں اللہ مالک ہے۔'' روما نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا تھا۔

''سچی سچی بتاؤ روما...... تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہورہی؟'' کائناز نے بڑے غور سے روما کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یار مجھے سر سے پڑھتے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ان کے بغیر بھی تو گزارہ ہورہا تھا۔ اب میں خواہ مخواہ پریشان ہونے لگوں ابھی تک سر کے بغیر ہی میرا گزارہ ہورہا تھا ناں ایک دو دن ان سے پڑھنے سے مجھے کیا فرق پڑنا ہے۔''

''ہوں! تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لاجیکل ہے، سمجھ میں آتی ہے۔ مگر مفت میں ٹینشن تو ہوگئی ناں۔'' کائناز برا سا منہ بنا کر بولی۔

''اب یہ تمہارا شوق ہے۔'' روما نے کہا اور جمائی لیتے ہوئے لیٹ گئی۔

''ہاں ٹینشن لینے سے بھی کیا فائدہ...... شاید کل سر کا فون آجائے اور نہ آنے کی وجہ بتادیں۔'' کائناز نے روما کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

''تم نے جتنی دیر ان کے نہ آنے پر پر غور کیا ہے اتنی دیر میں تم لیکچر دُہرا لیتیں ناں تو شاید تمہیں زیادہ فائدہ ہوجاتا۔ اب سو جاؤ کائناز بچی مجھے بہت نیند آرہی ہے۔'' روما نے کروٹ لیتے ہوئے کہا تو کائناز بھی بڑی فرمانبرداری سے لیٹ گئی جیسے وہ روما کے کہنے کا ہی انتظار کررہی تھی۔

☆☆☆

شاہ عالم حسبِ معمول نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد لان میں بیٹھے ہوئے صبح کے تازہ اخبار کا مطالعہ کررہے تھے...... اخبار کے فرنٹ پیج پر نیچے کی طرف ان کی ایک خبر پر نظر پڑی انہوں نے اس خبر پر اسی طرح

ایک سرسری نظر ڈالی جس طرح معمول کی خاص خاص خبروں پر نظر پڑ جاتی ہے۔ خبر ان کے سامنے تھی۔

''انسپکٹر جابر علی کے ہاتھوں بیٹی کا قتل......'' شاہ عالم کے حساب سے یہ وہ خبر تھی جو کچھ عرصے کے بعد مختلف ناموں کے ساتھ سامنے آجایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ واقعات معمول کا حصہ بن گئے تھے لیکن انہوں نے جب ہیڈ لائن سے نیچے والی سطر پر نظر دوڑائی تو چونک پڑے۔ ''انسپکٹر جابر علی کے بیٹے برہان کا اسپتال کے باہر اخباری نمائندوں سے بات کرنے سے انکار۔'' اس سے نیچے والی لائن تھی۔ ''انسپکٹر جابر علی کا بیٹا برہان اخباری نمائندوں کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس واقعے کے بارے میں کوئی واضح خبر سامنے نہیں آئی۔ شبہ کیا جارہا ہے کہ شاید بدچلنی کے شبے میں باپ نے بیٹی کو قتل کیا ہے۔''

شاہ عالم، برہان کا نام پڑھ کر بری طرح چونک پڑے تھے ان کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''برہان...... کیا برہان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے، اس نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ اس کا باپ پولیس آفیسر ہے۔ نہیں، نہیں...... اللہ نہ کرے بڑا نیک بچہ ہے۔'' شاہ عالم جیسے اندر سے کانپ کر رہ گئے۔ وہ ذہن میں آنے والے خیال سے ہی خوفزدہ ہوگئے...... توبہ استغفار کرنے لگے کہ ان کا ذہن برہان کی طرف کیوں چلا گیا...... ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے برہان نام کا کوئی اور لڑکا ہو اور اس کا باپ بھی پولیس میں ہو...... اتنا شریف اور نیک بچہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کا بیک گراؤنڈ ایسا ہو۔'' ان کے ذہن نے جیسے اپنے خیال کو جھٹلانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔ اس کے باوجود ایک عجیب سی فکرمندی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

دل کہہ رہا تھا کہ برہان کو فون کرنا چاہیے کم از کم تسلی تو ہوجائے گی کہ یہ وہ برہان نہیں جس کے باپ کی خبر

اخبار میں لگی ہے۔ ان کی توجہ اخبار سے بالکل ہٹ گئی تھی۔ جیسے انہیں اس تازہ اخبار کی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے اخبار جتنا پڑھا تھا وہیں پر چھوڑ دیا پھر اپنا فون ہاتھ میں لے کر وہ تردد کا شکار ہوگئے آیا برہان کو فون کریں یا نہیں...... اگر اس نے کال ریسیو کر لی تو اس سے کیا بات کریں گے؟ کیا پوچھیں گے؟ یہی کہ...... آج اخبار میں خبر لگی ہے اس کا نام بھی آیا ہے، کیا وہ وہی برہان ہے؟ مگر اس طرح سے پوچھنا تو بہت معیوب بات ہے اگر یہ وہ برہان نہیں تو شرمندگی ہوگی...... کیا سوچے گا وہ؟ کہ میں نے اس کے بارے میں...... کیا کچھ سوچ لیا...... وہ اسی طرح ذہنی خلفشار کا شکار چند لمحے الجھتے رہے...... جب کسی پل چین نہ پڑا تو بالآخر برہان کا نمبر ملا ہی لیا۔

کل رات تک تو وہ برہان سے رابطہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہوا تھا اس کا نمبر مسلسل بند مل رہا تھا وہ کائناز کے اصرار پر اس کے نہ آنے کی وجہ پوچھنا چاہ رہے تھے لیکن اس وقت ان کی آنکھوں میں جوش وخروش کی کیفیت پیدا ہوئی کیونکہ رِنگ جارہی تھی۔ وہ ایک دم مستعد ہو کر بیٹھ گئے اور ان الفاظ کو ترتیب دینے لگے جو انہوں نے برہان کے ساتھ گفتگو میں استعمال کرنا تھے۔

بیل جاتی رہی پھر اس کے بعد ریکارڈنگ شروع ہوگئی......"آپ کے نمبر سے جواب وصول نہیں ہو رہا برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔"

شاہ عالم نے مایوسی کی کیفیت میں ایک نظر فون پر ڈالی اور کچھ سوچنے لگے۔

"اُف! یہ آج صبح، صبح کیسی خبر سامنے آگئی۔ کیا ناشتا؟ کیا کھانا؟ کیا آرام...... اللہ کرے یہ وہ برہان نہ ہو۔" انہوں نے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا کی۔ جیسے انہیں خوف محسوس ہو رہا ہو کہ اگر یہ وہی برہان ہوا تو نہ جانے کتنی بڑی قیامت برپا ہوجائے گی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے پھر اخبار اٹھا لیا اور اسی خبر پر نظر ڈالنے لگے۔ اب ان کی نظریں خبر کی تفصیل پر تھیں۔ تفصیل میں جابر علی کی بیٹی کا نام ستارہ لکھا ہوا تھا۔ شاہ عالم کو تو سوائے برہان کے اس کے کسی گھر والے کا نام نہیں معلوم تھا۔ باپ کا بھی نام نہیں صرف کام معلوم تھا۔ اس سے زیادہ انہیں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ ان کی عادت ہی نہیں تھی کہ غیر متعلقہ کھوج کرتے یا وہ تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو اُن کے نزدیک غیر ضروری تھیں۔ وہ اس بری طرح الجھ گئے تھے کہ انہیں ہوش ہی نہیں رہا کہ تینوں بچیاں ناشتے کی میز پر ان کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ انہوں نے خبر پر پھر نظر دوڑائی اور یوں تھکے، تھکے انداز میں اخبار میز پر رکھا جیسے ان کے اعصاب شل ہو رہے ہوں۔

☆☆☆

برہان بڑی عجلت کے انداز میں اپنی الماری سے شرٹ نکال کر پہن رہا تھا کہ شبینہ اندر چلی آئی۔ برہان نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو مسلسل جاگنے کی وجہ سے اس وقت برسوں کی مریضہ دکھائی دے رہی تھی اس کے ہاتھ میں برہان کا موبائل تھا۔

"بھائی وہ ساتھ والی ثمینہ آنٹی ناشتا لے کر آئی ہیں بہت اصرار کر رہی ہیں کہ تھوڑا بہت کھالیں۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"شبینہ میں اس وقت اسپتال جا رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے ابھی وہ بہت ٹائم لیں گے لیکن میری تسلی ہوجائے گی۔"

"بھائی آنٹی کہہ رہی ہیں کہ ناشتا میں اپنے ہاتھ سے بنا کر لائی ہوں، آپ لوگوں کو تھوڑا بہت کھانا پڑے گا۔ یہ آپ کا موبائل ہے۔ آپ کے فون پر رِنگ ہو رہی تھی مگر میں نے کال ریسیو نہیں کی۔" برہان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل لے لیا اور یوں گویا ہوا جیسے بکھرے ہوئے ذہن کو بڑی مشکل سے سمیٹ کر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"شبینہ، آنٹی سے میری طرف سے سوری کہہ دو۔ یقین کرو، میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا...... بھوک، پیاس کا احساس ہی نہیں ہے...... ذہن پتا نہیں کہاں...... کہاں گھوم رہا ہے۔"

"لیکن بھائی اس طرح سے تو گزارہ نہیں ہوگا بغیر کھائے پیے انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔" شبینہ بڑی دلسوزی سے گویا ہوئی۔

"ہاں تم کر لو ناں ناشتا، تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ بلکہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ امی کو بھی کچھ کھلا دو۔"

"آپ بیٹھ جائیں بھائی تھوڑا بہت لے لیں۔ شاید امی بھی کچھ کھالیں آپ کی خاطر کیونکہ انہوں نے بھی منع کر دیا ہے بلکہ وہ تو کھانے کے نام سے ہی ناراض ہونے لگیں کہ تمہیں کھانے پینے کی پڑی ہوئی ہے۔ ارے مجھے بھوک ووک کہاں لگ رہی ہے کہ میرا دھیان کھانے پینے کی طرف جائے...... جاؤ تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ دو...... کوئی میرے پاس نہ آئے۔ امی کی حالت ٹھیک نہیں ہے بھائی آپ انہیں چھوڑ کر اسپتال نہیں جائیں۔ اسپتال جانے کا فائدہ کیا ہے؟"

"لیکن شبینہ! اگر میں وہاں نہیں گیا...... تو تمہیں نہیں پتا وہ لوگ اور ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی مظلوم بہن کو اس کے اصلی ٹھکانے پر جلد سے جلد پہنچا دوں۔" اتنا کہہ کر اس نے یوں ہی سرسری سی نظر اپنے موبائل پر ڈالی اور آنے والی مس کالز دیکھیں تو چونک پڑا۔

"شاہ صاحب! شاہ صاحب نے کیوں صبح، صبح فون کیا...... کل تو میرا موبائل بند تھا مگر اب مجھے وہاں نہیں جانا...... کیا منہ لے کر جاؤں اب یہ وہ منہ ہی نہیں جو کسی کو دکھاؤں۔"

"یہ شاہ صاحب کون ہیں؟" شبینہ نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ ذہن پر زور ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے یہ نام سنا سنا سا لگ رہا تھا۔ شاید برہان نے ہی فون پر بات کرتے ہوئے ان کا نام لیا تھا۔

"میں جہاں ٹیوشن دینے جاتا ہوں...... یہ ان صاحب کا نام ہے۔ ان کی پوتی کو پڑھاتا ہوں۔" برہان نے اپنی شرٹ کا آخری بٹن بند کرتے ہوئے اب بہن کی طرف رخ موڑا اور گہری سانس لے کر گویا ہوا۔

"تو بھائی آپ اب ٹیوشن نہیں پڑھائیں گے؟"

"نہیں، میں گڑھے کھودنے کی مزدوری کر لوں گا لیکن شریفوں کے سامنے بیٹھ نہیں سکوں گا۔ نظریں نہیں ملا سکوں گا اور اب میں اس قابل ہی کہاں ہوں جو کسی کو پڑھا سکوں......" برہان نے ایسے لہجے میں بات کی کہ شبینہ کو یوں لگا جیسے اس کی رگ رگ میں انگارے اتر رہے ہوں۔ وہ جل کر بھسم ہو رہی ہو۔ درد مشترک تھا مگر برہان نے درد کو الفاظ دے دیے تھے جو ابھی تک وہ منہ سے نہیں نکال پائی تھی۔ برہان اس سے پہلے کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ اپنی جگہ ایستادہ تھی۔

☆☆☆

"دادا جان آج آپ صبح صبح اتنے سیریس کیوں نظر آ رہے ہیں؟ خیر تو ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟" کائناز، رابی اور روما، شاہ عالم کے ساتھ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر... موجود تھیں۔ نو کر ناشتے کے

لوازمات ان کے آگے رکھ رہا تھا۔ شاہ عالم گم صُم کھوئی کھوئی کیفیت میں اپنے آس پاس سے بار بار یوں بے خبر ہو جاتے تھے کہ خاص طور پر کائناز کو نوٹس لینا پڑا۔ اس سے شاہ عالم کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ کائناز بولی تو انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ اپنے چہرے سے پریشانی کی کیفیت ظاہر کر رہے ہیں۔ بڑی مہارت سے انہوں نے خود کو سنبھالا اور زبردستی مسکرائے۔

''بیٹا! کبھی کبھی سیریس ہونا بھی صحت کے لیے بہت اچھا ہے۔'' وہ اپنی طرف سے شگفتہ انداز میں بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کائناز کے تبصرے پر رابی اور روما نے بھی شاہ عالم کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ رابی حسبِ معمول صرف پورج باؤل میں لیے آہستہ آہستہ چمچ سے کھا رہی تھی جبکہ روما مارجرین سلائس پر لگا کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھانے میں مگن تھی۔

کائناز اور شاہ عالم کے درمیان ہونے والی بات نے اس کے کام میں بھی تعطل پیدا کیا۔ وہ سلائس ہاتھ میں لیے باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''بیٹا...... آپ ناشتا کریں، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔'' شاہ عالم نے روما کو ٹوک دیا...... روما نے جلدی سے اپنا سلائس پھر چائے کے کپ میں ڈبویا اور بولی۔

''کائناز...... تمہیں تو دادا جان سے بہت پیار ہے اسی وجہ سے تم ان کی چھوٹی سے چھوٹی کیفیت کا نوٹس لیتی ہو۔ دادا جان ٹھیک ہیں تمہیں بس یونہی کچھ محسوس ہوا ہوگا۔''

''اب تم لوگ تبصرے بند کرو، باتیں ختم، لیٹ ہو رہی ہو۔'' رابی نے کائناز اور روما کو احساس دلایا کہ وہ کالج جانے کے لیے جلد تیار ہو جائیں لیٹ ہو رہی ہیں۔

''ہاں بیٹا تم لیٹ ہو رہی ہو رابی ٹھیک کہہ رہی ہے جلدی سے ناشتا ختم کرو کالج کے لیے روانہ ہو، تم بتا رہی تھیں ناں کہ آج تمہارا میتھس کا ٹیسٹ ہے۔''

''اُف...... ! کیا یاد دلا دیا ناشتا تو پورا کرنے دیتے۔ میری تو تیاری بھی کچھ خاص نہیں ہے بہت ٹینشن میں ہوں۔''

''دادا جان یہ رات سے یہی بات کہے جا رہی ہے میں ٹینشن میں ہوں، میں اسے کہہ رہی ہوں کہ تم نے سر سے کتنے دن پڑھا ہے آخر تم سر کے آنے سے پہلے بھی تو ٹیسٹ دیتی رہی ہو کوئی پہلی دفعہ دو گی کیا......؟ لگتا ہے کہ جن کے پاس ٹینشن نہیں ہوتی انہیں ٹینشن لینے کی عادت ہو جاتی ہے۔''

☆☆☆

احمر کے ہاتھ میں انگریزی اخبار تھا، وہ آج یونیورسٹی وقت پر آ گیا تھا اس لیے کہ آج اسے لائبریری میں کچھ ضروری کتابیں تلاش کرنا تھیں۔ وہ لائبریری میں آیا تو اس وقت لائبریری بالکل خالی تھی۔ لائبریرین کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ احمر نے شیلف کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے تو صبح کے تازہ اخبارات پر اس کی نظر پڑی اس نے یونہی سرسری سا جائزہ لینے کے لیے ایک اخبار اٹھایا تو سائڈ میں ایک چھوٹا سا حاشیہ نظر آیا۔ جابر علی کی تصویر کے ساتھ خبر شائع ہوئی تھی۔ احمر اپنی جگہ پر جیسے پتھر کا ہو گیا، وہ جابر علی کا چہرہ کیسے بھلا سکتا تھا! اس رات جب وہ فائزہ اور امی کو شبینہ کے گھر لے کر گیا تھا تو اس نے جابر علی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے جس طرح کڑے تیور اور کھوجتی ہوئی شک آلود نظروں نے اس کا جائزہ لیا تھا ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ

کوئی وارداتیا ہو اور کوئی بڑی سی واردات کر کے یہاں چھپا ہوا ہو اور نظروں میں بالآخر آ گیا ہو۔ اس کا ذہن اپنے اسائمنٹ اور کتابوں سے یکسر ہٹ گیا اس نے بے اختیار اپنے شرٹ کی جیب پر ہاتھ رکھ کر موبائل کے اپنی جگہ ہونے کی تسلی کی کیونکہ خبر کے ساتھ ہی فائزہ کی شکل اس کے سامنے آ گئی تھی۔ فائزہ کے حوالے ہی سے تو وہ جابر علی اور شبینہ تک پہنچا تھا۔ شبینہ جس کا جھینپا، جھینپا، سہما، سہما روپ احمر کو اتنا بھایا تھا کہ اپنے سرکل میں موو کرنے والی ہر لڑکی اسے شبینہ کے سامنے پانی بھرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی یا پھر اس نے تصنع سے بھری ہوئی دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور دن اور رات تصنع اور ملمع کاری دیکھتے دیکھتے اس کی طبیعت اوبھ گئی تھی وہ شبینہ کی تلاش میں کہیں دور تک نہیں گیا بلکہ شبینہ تو اسے اسی دائرے میں کھڑی نظر آ گئی تھی جو دائرہ قدرت نے اس کے اردگرد کھینچا تھا۔ وہ جابر علی کی تصویر اور خبر کی طرف نہ جانے کتنی دیر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا کیونکہ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا کہ اسے کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا کہ یہ جابر علی نہیں ہے پھر نام بھی تو نیچے لکھا ہوا تھا۔ اس نے پھر اپنی شرٹ کی جیب پر ہاتھ رکھا جیسے اب وہ موبائل نکالنا چاہتا تھا اور فائزہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا کہ خیال آیا کہ فائزہ تو کالج میں ہوگی۔ یہ کیا ہو گیا......؟ یہ تین لفظ تھے جو بگولوں کی صورت میں اس کے اردگرد ناچنے لگے...... ان تین لفظوں کے علاوہ کوئی چوتھا لفظ اس کے ذہن میں داخل نہیں ہو پا رہا تھا۔

''بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟'' فائزہ پر تو جیسے چٹان آ گری تھی۔ آنکھیں پھاڑے موبائل کان سے لگائے بڑی بے اختیاری کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

''اب پتا نہیں فائزہ یہ وہی انسپکٹر جابر علی ہیں یا کوئی اور مگر تم شبینہ کے گھر فون کر کے پتا تو کرو...... کیا وہ آج کل کالج آ رہی ہے؟'' احمر گم صم کھوئی کھوئی کیفیت میں سوال کر رہا تھا۔

''بھائی وہ پرسوں تو آئی تھی مگر کل اور آج نہیں آئی......'' فائزہ نے فکرمندی سے اٹک اٹک کر یوں جواب دیا جیسے لفظوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے قابو میں کر رہی ہو۔ بڑی عجیب کیفیت تھی اس کی۔

''تم اس وقت کہاں ہو گھر پر یا کالج؟''

''بھائی ظاہر ہے اس وقت میں کالج میں ہوں۔''

''اوہ اچھا......! اصل میں...... مجھے نیوز پڑھ کر بہت شاک لگا اس لیے فوراً فون تمہیں ملایا کہ شبینہ نے خود تمہیں فون کر کے خدانخواستہ اس حادثے کی اطلاع تو نہیں دی؟''

''اللہ نہ کرے بھائی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اللہ کرے یہ کوئی اور انسپکٹر جابر ہو اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو شبینہ مجھے ضرور بتاتی لیکن...... وہ آج بھی کالج نہیں آئی۔ اس وجہ سے عجیب، عجیب سے خیالات تو آ رہے ہیں...... خیر میں اس کو فون کر کے پتا کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... بہرحال...... جو بھی خبر ہو مجھے ضرور بتا دینا، میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''جی بھائی مجھے جیسے ہی...... وہاں سے کوئی اچھی نیوز ملتی ہے۔ اللہ کرے اچھی ہی ہو...... میں آپ کو ضرور بتاؤں گی...... ورنہ آپ پریشان ہوتے رہیں گے۔ ٹھیک ہے بھائی...... خدا حافظ!'' یہ کہہ کر فائزہ نے اپنی طرف سے فون بند کر دیا تھا کیونکہ اسے شبینہ سے رابطہ کرنے کی جلدی تھی۔

فون بند کرتے ہی اس نے شبینہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا کیونکہ شبینہ کے پاس موبائل فون تو تھا نہیں...... چند لمحے وہ یہ بات سوچتی رہی اور فائزہ کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہونے لگی۔ جیسے ہی کال ریسیو ہوئی۔

فائزہ نے اپنے دل پر یوں ہاتھ رکھا جیسے وہ سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اپنا لہجہ نارمل بنانے کی کوشش کی۔

''ہیلو......!'' وہ جاننا چاہتی تھی کہ کال کس نے ریسیو کی ہے۔ دوسری طرف سے شبینہ ہی کی آواز ابھری۔

''ہاں! فائزہ میں شبینہ بات کر رہی ہوں۔'' شبینہ کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ خوشی، غم کسی قسم کا تاثر اس کے لہجے سے واضح نہیں تھا۔

''ہاں! شبینہ آج پھر تم کالج نہیں آئیں؟ ایک تو تم چھٹیاں اتنی کرنے لگی ہو پہلے بھی تمہارا اتنا ہرج ہوا ہے مجھے تو تمہاری فکر ہوگئی ہے...... کہ ایگزام کیسے دو گی؟ اور دیکھو ایگزام بھی سر پر کھڑے ہیں۔'' فائزہ اپنے لہجے سے کھوج کا تاثر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور بڑے نارمل انداز میں شبینہ سے بات کر رہی تھی۔

''بس......! فائزہ قسمت میں جتنی پڑھائی تھی ہوگئی۔'' شبینہ نے عجیب وغریب لہجے میں جواب دیا تھا۔ یہ فائزہ کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو شبینہ......؟ اللہ اللہ کر کے تو تم نے کالج آنا شروع کیا تھا۔ اب پھر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگیں...... یار کیا مسئلہ ہے اگر تمہارے ابو نے نہیں پڑھانا تھا تو پھر تمہیں ایڈمیشن ہی کیوں دلوایا تھا؟'' فائزہ پریشان ہوگئی تھی لیکن کوشش کر رہی تھی کہ اگر کوئی خاص یا اہم بات ہے تو اس کی اطلاع شبینہ کی طرف سے ہی آئے۔ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرے۔

''فائزہ ہمارے گھر میں قیامت آچکی ہے۔ باقی دنیا میں پتا نہیں کب آئے گی...... لیکن ہمارے حصے کی قیامت برپا ہو چکی ہے اب یوں لگ رہا ہے جیسے بس مر کے دوبارہ جی اٹھیں گے اور حساب کتاب دینا شروع کر دیں گے۔'' اتنا کہہ کر شبینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فائزہ کے اوسان جاتے رہے۔ وہ جو طفل تسلیاں اپنے آپ کو دے دے کر شبینہ سے بات کا آغاز ہوا تھا وہ طفل تسلیاں جھوٹی ہی ثابت ہوئیں۔ کچھ تو ایسا تھا جو اندیشوں کے قریب، قریب تھا۔

''شبینہ رو ؤمت مجھے بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے؟'' احمر کی دی ہوئی خبر میں جتنے الفاظ تھے وہ سانس روک کر نئے سرے سے جیسے گننے لگی۔ شبینہ کی سسکیاں اس کے کان کے پردے سے ٹکرا رہی تھیں اور اس کا دل نیچے کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے کہ جانے شبینہ کیا کہے؟ کیا کوئی نئی اطلاع یا پھر وہی جو ابھی چند منٹ پہلے احمر دے چکا تھا۔

''فائزہ میں تم سے فون پر زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ مجھ سے بات نہیں ہو پا رہی یوں سمجھو کہ میرا ذہن بالکل ماؤف ہے۔ بس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے کہ ستارہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی فائزہ...... اس وقت مجھ سے بات نہیں ہو رہی۔'' یہ کہہ کر شبینہ نے اسی طرح روتے ہوئے سسکیوں کے درمیان فون بند کر دیا تھا۔

فائزہ چند لمحے تو جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گئی ہو...... کچھ دیر اسی کیفیت میں کھڑے، کھڑے جب اسے دائیں بائیں سے کچھ طالبات کے تیز تیز بات کرنے کی آواز آئی تو جیسے اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ پہلا خیال اسے یہی آیا کہ احمر بڑی بے چینی سے اس کے فون کا انتظار کر رہا ہوگا۔

وہ مرے مرے قدموں سے اس طرف بڑھی جدھر اسے ایک سنگی بینچ خالی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے

کالج کے بڑے سے لان میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کچھ طالبات ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر بیٹھی تھیں کچھ پڑھ رہی تھیں اور کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ ساری دنیا جیسے اپنے معمولات میں مشغول تھی کسی کو خبر نہیں تھی کہ اسی کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی کے ساتھ کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آچکا ہے۔ وہ گرنے کے انداز میں سنگی بینچ پر بیٹھ گئی اور بھائی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆☆☆

فائزہ اور احمر جس وقت جابر علی کے گھر میں داخل ہوئے جو کچھ انہوں نے دیکھا...... دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

شبینہ کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں، ہونٹ اتنے خشک دکھائی دیے کہ ہونٹوں کی اصلی رنگت غائب ہو چکی تھی اور سفید پپڑیاں دور سے ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ صابرہ فرش پر بچھی دری پر بے ہوش پڑی تھی اور محلے کی چند عورتیں اسے گھیرے ہوئے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہی تھیں۔

فائزہ کو سامنے پا کر شبینہ کے جیسے سارے بند ٹوٹ گئے وہ بڑی بے اختیار... سی کیفیت میں فائزہ کے گلے لگ کر اس بری طرح روئی کہ فائزہ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

احمر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ گھر کے اندر مزید آگے بڑھنے کی اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شبینہ کے آنسو انگاروں کی طرح اس کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ آگے بڑھے اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے اشک پونچھ ڈالے۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے انکشاف ہوا تھا کہ شبینہ کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ ابھی تک تو وہ صرف یہ سمجھتا تھا کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے...... کیوں اچھی لگتی ہے؟ یہ سوال وہ اپنے آپ سے بھی کیا کرتا تھا...... لیکن اس وقت اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ شبینہ کی ذات تو اس کی پوری زندگی کا احاطہ کر چکی ہے۔ فائزہ نے جیسے ہی اسے بتایا کہ جو خبر اس نے پڑھی ہے وہ درست ہے، تو احمر چند منٹ بھی اس کے بعد نہیں رکا اور گاڑی لے کر فائزہ کو لینے کالج پہنچ گیا تھا۔

شبینہ کے گھر تک کا فاصلہ دونوں نے بڑی خاموشی سے طے کیا تھا۔ چونکہ دونوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس موضوع پر کیا بات کریں صرف حادثے کی اطلاع تھی حقائق سے تو بے خبر تھے۔

''پلیز شبینہ چپ ہو جاؤ کچھ بتاؤ تو سہی یہ سب کچھ کیسے ہوا...... ستارہ کی تو شادی ہوگئی تھی ناں...... ستارہ تو اس گھر سے جا چکی تھی پھر...... پھر کیا ہوا...... مرڈر تو اس کا اس کے گھر میں ہوا ہے ناں...... یہاں پر تو نہیں تھی وہ؟'' شبینہ نے روتے روتے اپنا سر ہلایا۔ آنسوؤں کی روانی میں اس کے الفاظ گم ہو رہے تھے۔

فائزہ کی کسی بات کا جواب دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ احمر کھڑا اسے بے بسی سے دیکھ رہا تھا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ شاید شبینہ کا بھائی یا کوئی ایسا مرد جو گھر میں موجود ہو اسے نظر آجائے تو وہ کوئی بات کرے، تعزیت کرے...... مگر دور دور تک سوائے عورتوں کے اسے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور فائزہ، شبینہ کے غم میں اس طرح کھو چکی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ بھائی بھی ساتھ آیا ہے۔

''شبینہ آنٹی بے ہوش ہیں...... کب سے بے ہوش ہیں کچھ کرو ناں، کیا آنٹی کو اسپتال لے کر چلیں؟ وہ تمہارے برہان بھائی کہاں ہیں؟'' فائزہ پریشان ہو کر شبینہ سے کہہ رہی تھی۔

''برہان بھائی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔'' شبینہ نے بدقت تمام کہا۔

''اسپتال؟'' شبینہ کا جواب فائزہ نے بھی سنا اور احمر نے بھی، فائزہ بول پڑی احمر خاموش تھا۔

''ہاں...... وہ ستارہ کا ابھی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا اس وجہ سے بھائی اسپتال میں ہیں۔''

''پوسٹ مارٹم......!'' احمر دور کھڑا اور سوچ رہا تھا۔ اب اسے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ جو کچھ اس نے اخبار میں پڑھا وہ اسی گھر کی کہانی ہے۔ دکھ کی لہریں اس کی رگِ جاں کو چھیدنے لگیں۔ شبینہ سے ایسا کوئی رشتہ یا تعلق استوار نہیں ہوسکا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس سے اپنائیت کی بات کرتا...... اسے تسلی دیتا، ڈھارس بندھاتا...... صبر کی تلقین کرتا۔

شبینہ اپنے غم میں اس بری طرح ڈوبی ہوئی تھی اسے پتا ہی نہیں تھا کہ فائزہ کے ساتھ احمر بھی آیا ہے اور فاصلے پر کھڑا ہوا مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''لیکن شبینہ آنٹی کو تو اسپتال لے جانا ہوگا ناں مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بے ہوش ہیں۔''

''فائزہ، امی ہوش میں آتی ہیں کوئی بات کرتی ہیں پھر روتے روتے بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کل سے یہی ہو رہا ہے۔''

''کل سے؟'' فائزہ نئے سرے سے حیران ہوئی۔ ''تو یہ حادثہ کل ہوا تھا؟''

''ہاں...... تم بیٹھو فائزہ سوری مجھے تو خیال ہی نہیں رہا......''

''نہیں...... نہیں شبینہ یہ وقت تکلفات کا نہیں ہے تم یہیں بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کچھ کھایا پیا...... تمہارے لیے پانی لاؤں؟'' شبینہ شدتِ غم سے نڈھال نظر آرہی تھی۔ عمر چھوٹی اور تجربے کا بھاری پتھر سر پر آن گرا تھا۔ بڑے بڑے دکھوں کا اس نے سنا تھا لیکن عزیز دوست کے دکھ کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ وہ اپنا ذاتی تجربہ ہی لگ رہا تھا۔

''نہیں تم میری فکر نہ کرو میں بہت ہمت سے کام لے رہی ہوں آخر امی کو بھی سنبھالنا ہے۔''

''انکل کہاں ہیں؟'' فائزہ کے منہ سے بلا سوچے سمجھے ہی نکل گیا۔ شبینہ نے آنسو بھری آنکھوں سے فائزہ کی طرف دیکھا اور یوں آنکھیں بند کرلیں جیسے ایک دم کسی نے چھری کا وار کیا ہو۔

''شبینہ میرے ساتھ وہ میرے بھائی بھی ہیں گھر میں اگر کوئی مرد ہو تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ جائیں گے۔ میں نے تو گھر میں بھی انہیں بتایا کہ میں تمہارے پاس آرہی ہوں۔ ممی اور پاپا کو...... ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے۔'' فائزہ کہہ رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں فائزہ...... یہ تو ایسی خبر ہے کہ تم نہیں بھی بتاؤ تو ان تک پہنچ جائے گی۔ سنتے تو یہی ہیں کہ عزت بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے اور ذلت یوں ایک دم سے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے جیسے ہم نے اس کا ادھار چکانا ہے۔''

صابرہ کی قبل از وقت سن رسیدگی، شبینہ کے ذہن میں اتر چکی تھی۔ ماں سے زیادہ اس کے کوئی قریب نہیں تھا اور ماں کے خیالات جیسے اس کا لباس بن چکے تھے ورنہ اتنی کم عمری میں وہ اتنی بڑی بات نہیں کرسکتی تھی۔

احمر کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے یہ سب سن کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ شبینہ اتنی سنجیدہ ہے اتنی بڑی، بڑی باتیں کرسکتی ہے۔

جاری ہے

عہد

سکینہ فرخ



''شکر ہے جان چھوٹی......'' عنبر نے پٹخنے والے انداز میں بیگ کو گھاس پر رکھا اور خود بھی پاؤں پسار کے وہیں بیٹھ گئی جہاں سارا گروپ پہلے ہی موجود تھا۔

''اُف شرم کرو...... کتابیں ہیں اس کے اندر......''

مناہل اپنے پھیلے ہوئے پیروں کو سمیٹتی ہوئی بولی جس کے پیروں کے پاس عنبر نے بیگ پٹخا تھا۔

''بھاری بہت ہے ناں...... آج لائبریری کی کتابیں واپس کرنے کے لیے بھر لائی ہوں اس

میں......'' عنبر قدرے شرمندگی سے بولی۔

''علم کا بوجھ زیادہ ہی ہوتا ہے......'' ردا ناصحانہ انداز میں بولی۔

''معاف کردو......ابھی کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، آج مجھے ایگزامز ختم ہونے کی خوشی منانے دو......'' عنبر نے جلدی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اُف...... کتنا مزہ آئے گا...... ایگزامز ختم، چھٹیاں شروع......'' نادیہ پُرجوش ہوکے بولی۔

''چھٹیاں بھی دسمبر کی...... ہائے کتنی مزیدار ہوتی ہیں سردیوں کی چھٹیاں......سردیوں کی تو ہر چیز ہی بڑی رومینٹک ہوتی ہے۔'' ہمانے گرہ لگائی۔

''سردیوں کی چاندنی، سردیوں کی بارشیں، سردیوں کی صبحیں، شامیں اور راتیں...... ایک عجیب سا سُرور ہوتا ہے سب میں۔'' نادیہ مسکرائی۔

''یہ دسمبر اور پھر نئے سال کا آغاز......سب کچھ ہی بڑا رومینٹک ہے...... میں تو مری جارہی ہوں ماموں کے پاس برف باری دیکھنے...... کتنا حسین ہوجاتا ہے مری دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں جب چنار برف کی چادر اوڑھ لیتے ہیں......مری کی اونچی اونچی سڑکوں پہ بادلوں کے ہمراہ واک کرنا کتنا اچھا لگتا......'' عنبر نے آنکھیں بند کرکے منظرکشی کی۔

''کیا عادل بھائی نے اپنا نام تبدیل کر کے بادل رکھ لیا ہے......؟'' ہمانے عنبر کو چھیڑا......ساری لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ سب جانتی تھیں عنبر بچپن ہی سے اپنے ماموں زاد عادل سے منسوب تھی، عنبر جھینپ کے رہ گئی۔

''میری بھی تو سنو، میری تو لاٹری نکل آئی ہے...... صبا نے مجھے اپنے پاس یو کے انوائٹ کیا ہے۔'' فرح نے اپنی بہن کا ذکر کیا جو چھ ماہ قبل اپنی پھوپی زاد سے شادی کے بعد یو کے سدھاری تھی۔

''سچ؟'' ساری لڑکیاں ایک زبان ہو کے چیخیں۔

''بالکل سچ...... میں بتا نہیں سکتی کہ میں کس قدر ایکسائٹڈ ہوں......اس دفعہ کی چھٹیاں تو یادگار ہوجائیں گی...... ذرا سوچو، کرسمس قریب ہے وہاں لوگ تیاریوں میں مصروف ہیں...... بازار سجے ہوئے ہوں گے، دھڑا دھڑ خریداری ہو رہی ہوگی۔ صبا نے وہاں کی باتیں بتا بتا کر پاگل کردیا ہے مجھے......اب جانے کا موقع ملا ہے میں تو سوچ، سوچ کے خوش ہو رہی ہوں......'' فرح کی آواز میں جوش بھرا ہوا تھا۔

''لکی ہو یار...... کب جارہی ہو......؟'' نادیہ نے رشک بھرے لہجے میں پوچھا۔

''پیپرز تیار ہیں، ٹکٹ تو ابا جان کے کوٹے کا مل جائے گا۔'' اس کے والد ائرلائن میں تھے۔ ''بس تھوڑی بہت تیاری کرنا ہوگی۔'' فرح نے جواب دیا۔

''کتنا مزہ آئے گا اسے، نئے سال کا سورج یہ وہاں دیکھے گی اور نیا سال انجوائے کرے گی۔'' ہما نے پُرجوش ہو کے کہا۔

''ہم سب تم سے جل رہے ہیں۔'' عنبر نے اسے چھیڑا تو وہ ہنسنے لگی۔

''ایک نیا سال یہاں بھی شروع ہوگا......لوگ گھروں میں دُبک کے بیٹھے اپنی، اپنی خیر منا رہے ہوں گے...... ماں باپ بچوں کو باہر نکلنے سے روک رہے ہوں گے کہ باہر نہ جانے اچانک کیا ہوجائے......کوئی گیس کو رو رہا ہوگا تو کوئی بجلی کا ماتم کر رہا ہوگا۔ کہیں فائرنگ ہو رہی ہوگی تو کہیں ہڑتال اور دھرنے کی تیاری کی جارہی ہوگی...... یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے۔'' مناہل نے سر جھٹک کے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے...... کچھ لوگ ایک دوسرے کو ڈرتے، ڈرتے نئے سال کی مبارک باد بھی دے رہے ہوں گے...... یہ مبارک باد پچھلے سال ہونے والے بم دھماکوں، فائرنگ اور سڑکوں پہ شُترِ بے مہار ٹریفک کی زد میں آنے سے بچ جانے کی خوشی میں ہوگی......'' عنبر نے ٹکڑا جوڑا۔''

''ہاں کوئی خوش نصیب ایسا بھی ہوگا جو اس مبارک دن بجلی اور گیس سے استفادہ کرنے کی کامیابی کی خوشی میں بغلیں بجا رہا ہوگا۔'' ہما بولی۔

''میں حیران ہوتی رہتی ہوں...... دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے......لوگ ترقی کے مدارج طے کرتے چلے جا رہے ہیں...... آسمان کو چھو لینے والی عمارتیں ہوں، نت نئی سائنسی ایجادات ہوں...... زندگی کو آسان اور خوشگوار بنانے والی اختراعات ہوں اصل زندگی تو وہی گزار رہے ہیں ہم تو...... ہم تو غار کے زمانے میں واپس جانے کی کوششوں میں مصروف ہیں...... اس شہر کو غور سے دیکھو، ساری رونق اور اطمینان یہاں سے رخصت ہوچکا ہے۔'' مناہل نے جذباتی انداز میں کہا۔

''دیکھو کتنی افسوسناک حقیقت ہے...... ایسی باتیں عمر گزار لینے والے بزرگ کہا کرتے ہیں، ہم تو نئی نسل کے نمائندے ہیں ہم کیسے مایوسی میں ڈوبنے لگے ہیں...... کبھی کبھی تو بہت ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔'' نادیہ افسردگی سے بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... یاسر میرا اکلوتا بھائی ہے......مگر ممی بابا اسے صرف اس لیے ملک سے باہر سیٹل کروا رہے ہیں کہ یہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے محفوظ مستقبل چاہتے ہیں۔ اس کے باہر جانے کے بعد وہ لوگ بھی یہاں سے شفٹ ہوجائیں گے......'' مناہل نے کہا۔

''جو جاسکتا ہے وہ جا رہا ہے...... جو نہیں جاسکتا وہ ذہنی مریض بنتا جا رہا ہے...... یہاں کی زندگی نارمل نہیں۔ ہے تو لوگ بھلا نارمل کیسے رہ سکتے ہیں؟'' ہما غصے سے بولی۔

''کبھی کبھی تو خبریں سن کے اور ٹاک شوز دیکھ کر

پانچ دعائیں جو رد نہیں ہوتیں

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حاجی کی دعا جب تک وہ (فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد) واپس نہیں آتا۔ مجاہد کی دعا یہاں تک کہ وہ واپس آجائے۔ مظلوم کی دعا یہاں تک کہ اس کی فریاد سننے میں آئے۔ مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ تندرست ہوجائے۔ بھائی کی دعا اپنے بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں۔ ان سب میں سے پہلی قبول ہونے والی دعا اپنے بھائی کے لیے ہے۔

انتخاب: بینا عباس، کراچی

اتنا ڈر لگتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔'' عنبر نے جھرجھری لی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو جب بھی میرے اوپر ایسا خوف کا دورہ پڑتا ہے تو ہر چیز سے طبیعت اچاٹ ہوجاتی ہے۔ زندگی ہی بے مقصد محسوس ہونے لگتی ہے۔'' نادیہ بولی۔

''ایسا اب سب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ سب ہی ایک عجیب سی غیر یقینی کا شکار ہیں...... چاہے بوڑھا ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد۔'' مناہل نے کندھے اچکائے۔

''میرے جو رشتے دار یو ایس اور یو کے میں رہتے ہیں اُن سے ہماری بات چیت ہوتی رہتی ہے، وہ تو بہت خوش ہیں......ایک با مقصد اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے پاس کرنے کو بہت سارا کام اور خرچ کرنے کو بہت سارا پیسہ ہے۔'' فرح کہہ رہی تھی۔

''یہاں تو نہ یکسوئی سے انسان کوئی کام ہی کرسکتا ہے اور نہ دل کھول کے پیسہ ہی خرچ کرنے کو موجود ہے...... چیزیں دیکھ دیکھ کر بس ترستے

رہو......'' عنبر نے منہ بنایا۔

''مسئلہ یہی تو ہے۔'' ردا نے پُراسرار انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ......کیسا مسئلہ؟'' کئی آوازیں ابھریں۔

''مطلب یہ کہ زندگی باہر بھی کچھ ایسی آسان نہیں ہے بلکہ بعض معاملات میں یہاں سے بھی مشکل ہے...... فرق صرف سوچ کا ہے، تربیت کا ہے، وہاں لوگ اپنی زندگیاں پلاننگ کے ساتھ گزارتے ہیں...... کام کے وقت صرف اور صرف کام...... اور کام بھی پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ اور تفریح کے وقت تفریح......اور یہاں ہم...... افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ محنت اور جانفشانی کا مفہوم بھولتے جارہے ہیں...... ہر کام کو ٹالنے والے انداز میں کرتے ہیں یا دیر تک لٹکائے رکھتے ہیں...... ہر وقت تفریح اور کھانا پینا چاہتے ہیں......لوگ دفتروں میں بیٹھ کر گپیں لگانے کے ساتھ ساتھ موبائل گیمز بھی کھیل رہے ہوتے ہیں...... ہمیں ہر وہ چیز چاہیے ہوتی ہے جو باہر کی دنیا میں کئی سال کی محنت کے بعد ایجاد کی جاتی ہے مگر ہم گھر بیٹھے اس کے حقدار بن جاتے ہیں...... چھوٹی سی بات یہ کہ ہم اس چیز کو اپنا حق سمجھ کے واویلا کررہے ہوتے ہیں جو درحقیقت ہماری ہے ہی نہیں۔'' ردا نے بات ختم کی۔

ساری لڑکیاں ایک دم خاموش ہوگئیں...... جیسے کچھ سوچنے لگی ہوں۔ اس خاموشی میں مناہل کی آواز ابھری۔

''لیکن اس میں ہمارا کیا قصور...... یہاں کے سسٹم کو بدلنا صرف ہمارے بس میں تو نہیں ہے۔ یہ سسٹم راتوں رات وجود میں نہیں آیا۔ کئی سال لگے ہیں اس کو خراب ہونے میں...... اور اس کا نتیجہ ایک اجتماعی خود غرضی اور بے حسی کی صورت میں نمودار ہوا ہے...... ہم بیرون ممالک کے لوگوں کے فیشن، ڈریسنگ اور کوکنگ میں تو نقل کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں مگر وہاں کے لوگوں میں موجود برداشت، خوش اخلاقی اور جانفشانی پر نظر نہیں کرتے بلکہ یہ تو ہماری اسلامی تعلیمات ہیں جنہیں ہم لوگوں نے خود ہی پسِ پشت ڈال دیا اور غیر مسلموں نے لے لیا۔ ہمارے پاس خواہ ایم اے، بی اے کی ڈگریاں موجود ہوں مگر ہمارا رویّہ ایسا ہوتا ہے جیسے ہم سے بڑا جاہل اور کوئی نہ ہوگا۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے، میں امی کے ساتھ گروسری لینے ایک مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گئی جہاں ہر وقت کافی رش رہتا ہے۔ ہماری ٹرالی سامنے سے آنے والی ٹرالیوں کی وجہ سے درمیان میں پھنس گئی۔ میرے سامنے ایک صاحب پینٹ شرٹ میں ملبوس، حلیے سے کھاتے پیتے مگر شکل پر خاصی رعونت لیے اپنی ٹرالی پکڑے کھڑے تھے' ان کی ٹرالی سامان سے لبالب بھری تھی...... اب صورتِ حال یہ تھی کہ اگر وہ اپنی ٹرالی تھوڑی سی بائیں طرف گھماتے تو ہماری ٹرالی آرام سے اس بھیڑ سے نکل جاتی...... میں نے ان سے انتہائی شائستگی سے درخواست کی کہ آپ اپنی ٹرالی تھوڑی سی کھسکالیں تاکہ ہمیں باہر نکلنا آسان ہوجائے...... جانتی ہو انہوں نے کیا فرمایا......؟ انہوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں نہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی...... بس ان کی عزت گھٹنے لگی کہ ایسا کرنے سے شاید ان کی ہتکی ہوجائے گی تڑ سے انتہائی جاہلانہ انداز میں بولے۔ ''میں کیوں اپنی ٹرالی اِدھر اُدھر کروں کوئی جگہ نہیں ہے اُدھر......'' اور انتہائی بدتمیزی سے وہیں جمے کھڑے رہے...... میں حیران رہ گئی...... اتنا چھوٹا سا معاملہ تھا، ان کا تھوڑا سا تعاون نہ صرف میری بلکہ پیچھے آنے والی کئی ٹرالیوں کا راستہ کھول سکتا تھا مگر ان کی حرکت سے ہمیں نہ صرف تکلیف پہنچی بلکہ ان کی گفتگو کے انداز سے میں شرمندہ الگ ہوگئی...... ہم جب دوسروں کا راستہ روک کے کھڑے ہوں گے تو ہمارا

سفر بھلا کیسے جاری رہ سکتا ہے......؟ اور ہم زندگی کے ہر معاملے میں دوسروں کے ساتھ ایسا ہی کررہے ہیں اسی لیے پریشان حال ایک اَن دیکھے دائرے میں گھومتے چلے جارہے ہیں اور منزل کا دور دور تک پتا نہیں......'' ردا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھ بیتا ہوا پورا واقعہ بتایا۔ سب کے چہروں پر ندامت کے سائے لرزنے لگے...... جیسے وہ سب ایک دوسرے کے پیروں پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہوں۔

''یاد رکھو...... خوشی پہ حق صرف اس کا ہوتا ہے جو دوسرے کو خوشی دے...... صلے کی تمنا وہ کرے جو محنت کرتا ہو...... اور محبت صرف اسی کو ملے گی جو دوسروں سے محبت کرنا جانتا ہو۔'' ردا نے سب کی طرف غور سے دیکھا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو......'' سب کی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''نیا سال شروع ہونے والا ہے، کوئی گھومنے پھرنے کا پروگرام بنائے گا، کوئی پارٹیاں انجوائے کرے گا...... کوئی اپنے گھر کو نئے انداز سے سجانے کی پلاننگ کررہا ہوگا...... کچھ نہیں تو کوئی نئے کپڑے ہی سلوا رہا ہوگا اور دوستوں کے لیے تحائف خرید رہا ہوگا...... ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا بھی ہوگا جو اِن سارے کاموں میں سے کچھ بھی نہیں کررہا ہوگا اور اس فرسٹریشن میں ہوگا کہ شاید میں بڑا بدقسمت ہوں کہ لوگ تو خوشیاں منارہے ہیں مگر میرے ہاتھ خالی ہیں...... لیکن ایک کام صرف ایک کام ایسا ہے جو سب کرسکتے ہیں......'' ردا پھر پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ سب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس برس کے غروب ہونے والے اور اگلے برس کے طلوع ہونے والے سورج کی درمیانی شب دو رکعت نمازِ نفل پڑھ کر گزشتہ برس کی گئی غلطیوں کی معافی مانگیں...اور آنے والے برس پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر گزار ہوں کہ اس نے زندگی کا ایک برس اور عطا کیا گویا ایک موقع اور دیا، اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا اور کچھ ایسا کرنے کا جس سے ہمارا اور ہمارے اردگرد کے لوگوں کا کچھ بھلا ہوجائے۔ کسی گرتے ہوئے کو سہارا مل جائے یا کسی ٹوٹے دل کو مرہم نصیب ہوجائے...... دوسروں کا بھلا کرنا ہماری اپنی راہوں کے کانٹے بھی دور کردیتا ہے...... تم نے سنا نہیں، کر بھلا ہو بھلا۔'' ردا نے ٹھہر ٹھہر کے اپنی بات مکمل کی۔

''سچی بات ہے...... نیا سال کیا ہے کچھ بھی نیا نہیں اس میں...... سورج وہی پرانا...... دن وہ جو ہزاروں دفعہ خود کو دُہرا چکے ہیں اور مہینہ وہ جو صدیوں سے بار بار آتا اور چلا جاتا ہے...... نیا سال کیا ہے ایک اور کیلنڈر، جس میں ہندسے خود کو بار بار دُہراتے ہیں...... ہاں نئے سال میں اگر کچھ نیا ہوسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف کوئی نئی سوچ، نیا ارادہ اور نیا عہد ہوسکتا ہے...... کچھ ایسا کرنے کا عہد جو پہلے کبھی نہیں کیا ہو...... چاہے وہ بظاہر کوئی معمولی سی نیکی ہو...... مگر ہو...... یقین کرو سال واقعی نیا ہوجائے گا۔'' مناہل نے ردا کا پیغام سمجھتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''اور نیا سال ہیپی بھی ہوجائے گا...... یعنی ہم خوش، سب خوش...... ہیپی ہیپی...... ہیپی نیو ائیر، اسے کہتے ہیں۔'' عنبر پُرجوش ہو کے بولی۔

''حدیثِ پاکؐ ہے کہ کسی کی راہ سے کانٹا ہٹانا بھی نیکی ہے......'' نادیہ نے سر ہلایا

''آؤ دوسروں کی راہیں کھوٹی کرنے کے بجائے راہوں سے کانٹے دور کریں...... کم از کم اتنا جتنا ہمارے بس میں ہے۔ چاہے ہمیں اس کا فوری کوئی صلہ ملے یا نہ ملے...... اصل اجر تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔'' ردا نے ہاتھ آگے بڑھایا نادیہ، ہما عنبر، مناہل اور فرح نے اپنے، اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

☆☆☆

ناولٹ

دوسرا اور آخری حصہ



رواج

مدیحہ عدنان

سارہ کے لیے سامنے کھڑی عورت اجنبی تھی۔ قیمتی ریشمی لباس اور سونے کے زیورات سے مزین، کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور ہر انگلی میں قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ بالوں کا اونچا سا جوڑا بنائے وہ ناقدانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ سارہ گھبرا کر اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔ وہ اس عورت کی شان و شوکت دیکھ کر متاثر ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد ان کے پیچھے سے ایک لڑکی نے سر نکالا۔



لیمن کلر کے بے حد اسٹائلش سے سوٹ میں ملبوس وہ قبول صورت سی لڑکی تھی، رنگ زیادہ گورا نہیں تھا، کندھوں تک آتے بال کھلے تھے اور کانوں میں ہیروں کے چمکتے ہوئے ٹاپس نمایاں تھے۔

''تو تم ہو سارہ......؟'' زائرہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

سارہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''جو لڑکیاں گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتی ہیں ان کی شکلوں پر اسی طرح پھٹکار برستی رہتی ہے۔'' زائرہ بیگم نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اسے اپنی شدید ہتک کا احساس ہوا۔

''تمہارے ماں باپ تو ساری دنیا سے منہ چھپاتے ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے جس دن تم پیدا ہوئیں اسی دن تمہارا گلا دبا دیتے تو اچھا ہوتا۔ کم از کم اپنے ماں باپ کی عزت کا ہی خیال کر لیتیں جب تمہارے باپ نے انکار کر دیا تھا تو کیا ضرورت تھی کورٹ میں جا کر نکاح کرنے کی۔ کیا مل گیا تمہیں شادی کر کے؟'' زائرہ بیگم کے الفاظ وہ پتھر تھے جو سارہ کی روح کو لہولہان کر رہے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ان دونوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''ماما......! کچھ لڑکیوں کو اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے اور نہ اپنے ماں باپ کی......'' نتاشا اسے تنفر سے دیکھ کے بولی۔

''آپ...... آپ کون ہیں؟'' سارہ کو بے حد غصہ آ رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ سامنے کھڑی عورت اور یہ لڑکی اس گھر کا اہم ستون ہوں گے۔

''میں شہریار کی چچی ہوں اور یہ شہریار کی منگیتر نتاشا ہے۔ ہمارا غائبانہ تعارف تو ہوا ہوگا۔ اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں...... تم کون سا حویلی کے اندر آئی ہو جو تمہیں سب کے متعلق علم ہو...... تم تو کبھی حویلی کے اندر نہیں آ سکتیں کیونکہ چوری چھپے کی گئی شادی کو یوں ہی چھپایا جاتا ہے۔ دنیا تو جانتی بھی نہیں کہ شہریار نے ایک عدد شادی بھی کر لی ہے۔ مردوں کی ایسی بہت ساری شادیاں ہوتی ہیں جو دنیا کی نظروں میں نہیں آتیں۔'' زائرہ بیگم کے لفظ لفظ میں نشتر چھپے تھے۔ سارہ سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

''آپ یہی سب کہنے یہاں آئی ہیں؟'' وہ ضبط کی آخری حدوں پر کھڑی تھی۔

''ہاں...... میں یہی سب کہنے یہاں آئی ہوں اور تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری یہ پیلی صورت دیکھنے آئی ہوں، مجھے تم سے بھلا کیا دلچسپی جو اس کباڑ خانے میں آتی...... ویسے تمہاری اوقات کے لحاظ سے تو یہ کمرا بہت بہتر ہے۔'' زائرہ بیگم نے چبا چبا کر کہا۔

''اور میں تو یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ گھر سے بھاگنے والیوں کی شکلیں کیسی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایسی لڑکیوں کو مار دیا جاتا ہے لیکن شہر والے شاید بے غیرت ہوتے ہیں۔'' نتاشا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

سارہ نے اپنا سر تھام لیا۔

''چلیں ماما......! زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ہمیں زیب نہیں دیتا...... ہماری تو نوکرانیاں بھی اس سے بہتر ہیں۔'' وہ دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

سارہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ ایسی ذلت اور تحقیر کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''ابو ٹھیک کہتے تھے، ان لوگوں میں انسانیت نام کو نہیں ہے۔'' اسے اپنے شفیق باپ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کا دل پگھل گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے غلط قدم اٹھایا ہے۔ جذبات میں آ کر عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ہاں، باپ سچ کہتے تھے لیکن وہ اس وقت انہیں اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ اسے شہریار... کا انتظار تھا۔ وہ اس سے صاف بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کمرے میں قید رہ کر تنگ آ چکی تھی۔ اس نے شادی کی تھی، خود کو کوئی سزا تو نہیں دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زائرہ بیگم اور نتاشا کی

باتیں پتھر کی طرح اس کے دل پر لگی تھیں۔

☆☆☆

سکندر شاہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے بیٹھے ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا، ان کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک کا کمرا تھا۔

''آئی ایم سوری مسٹر سکندر لیکن یہی حقیقت ہے...... لیکن آپ اللہ سے اچھی امید رکھیے، معجزے بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ سکندر شاہ کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ انہوں نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ انہیں اس طرح کی صورتِ حال سے بھی گزرنا پڑے گا۔

''میرے پاس کتنا وقت ہے ڈاکٹر؟''

سکندر شاہ کو اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''اندازاً چھ سے سات ماہ......''

''میں علاج کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''ضرور جائیں لیکن ہمارے پاس بھی وہی سہولیات ہیں جو باہر ہیں۔ ان رپورٹس کے مطابق باہر والے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ان فیکٹ خدا کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں ہر مریض سے یہی کہتا ہوں کہ ہمیں ہر حال میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیا خبر کب کوئی معجزہ ہو جائے۔''

سکندر شاہ نے سامنے پڑی فائل اٹھائی اور شکست خوردہ قدموں سے باہر نکلے۔ انسان کا غرور، طاقت، دولت سب تقدیر کے ایک جھٹکے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ سکندر شاہ چند لمحوں میں ہی ٹوٹ گئے تھے۔ ایسا بھی ہوتا ہے چند لمحے انسان کو سرتاپا بدل دیتے ہیں۔ انسان کی بے بسی اسے شکست خوردہ کر دیتی ہے۔ آج کا سکندر شاہ کل کے سکندر شاہ سے بالکل مختلف تھا۔ آج تو سکندر شاہ کے آنے کی کسی کو خبر بھی نہیں تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے لاؤنج میں داخل ہوئے۔

لاؤنج کے آخری کونے میں شانزے جھاڑو لیے سر جھکائے کھڑی تھی، فرش پر کرسٹل کے ایش ٹرے کے ٹکڑے پڑے تھے جو شاید صفائی کے دوران اس سے ٹوٹ گیا تھا۔ زائرہ بیگم اس کے قریب کھڑی اسے ڈانٹ رہی تھیں۔ یہ کوئی نیا منظر نہیں تھا لیکن آج سکندر شاہ اسے نظر انداز نہیں کر سکے۔

''نقصان کرنے کے سوا اور تجھے آتا ہی کیا ہے...... کم بخت پتا نہیں کب جان چھوڑے گی۔ جی تو چاہتا ہے ایک بار ہی تیرا گلا دبا دوں۔'' زائرہ بیگم غصے سے بولیں اور اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ کوئی انہونی سی ہوئی تھی۔ زائرہ بیگم کا اٹھا ہاتھ ہوا ہی میں معلق رہ گیا۔ وہ چونک کر پیچھے مڑیں تو جیسے پتھر کی ہو گئیں۔

ان کا ہاتھ کسی اور نے نہیں بلکہ سکندر شاہ نے پکڑا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔ سامنے کھڑی شانزے کے لیے بھی یہ منظر ناقابلِ یقین تھا۔

''آپ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔'' سکندر شاہ حکمیہ لہجے میں کہہ کر رکے نہیں...... زائرہ بیگم ابھی تک حیرانی کے سمندر میں غلطاں تھیں۔ ایسا کب ہوا تھا کہ ان کا ہاتھ کسی نے پکڑا ہو...... انہیں سکندر شاہ کا رویہ بے حد ناقابلِ فہم محسوس ہوا۔

سکندر شاہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر بے حد عجیب سے تاثرات تھے۔ زائرہ بیگم ان کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئیں۔

''آپ کو شانزے پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا...... زائرہ بیگم کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

''آپ نہیں جانتے، وہ بہت بے پروا ہے، قیمتی چیزیں توڑتی رہتی ہے، نقصان کرے گی تو سزا تو اسے ملے گی ناں۔'' زائرہ بیگم لمحے بھر کے لیے گھبرا گئیں۔

''ہم نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس طرح کے کام اس سے مت کروایا کریں، گھر میں نوکروں

کی کمی نہیں ہے، کم از کم آپ کو اتنا علم تو ہونا چاہیے کہ کس کا کیا مقام ہے۔ ہمیں آپ کی اس حرکت پر افسوس ہوا ہے، دوبارہ ہمیں ایسی شکایت نہ ملے۔ آپ ہمیں اچھی طرح جانتی ہیں، اس لیے آئندہ ہماری حکم عدولی کی کوشش نہ کیجیے گا۔'' سکندر شاہ نے بارعب آواز میں کہا۔ زائرہ بیگم کے ہاتھوں کے تو طوطے اڑ گئے۔ انہیں شدید توہین کا احساس ہوا۔ شانزے کی وجہ سے ان کی اتنی بے عزتی ہوئی انہیں اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔

''شاہ صاحب بات اتنی بڑی نہیں ہے، میں ماں ہوں اس کی اگر ماں بچوں پر ہاتھ اٹھائے تو اسے برا نہیں سمجھنا چاہیے۔'' وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے بولیں۔ سکندر شاہ نے انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''آپ اس کی ماں نہیں ہیں، زبردستی بنائے گئے رشتوں کا یہی حال ہوتا ہے، ہم نے ساری زندگی اس کے بارے میں نہیں سوچا۔ حیرت ہے ہمیں اپنی اولاد کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا......اب ہم اس کے بارے میں سوچیں گے جو کچھ ہوا اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ اس کی ماں کون تھی، کس خاندان سے تھی، ہمارے اس کے ساتھ کیا اختلافات تھے، ان سب باتوں کا ہماری اولاد سے تعلق نہیں ہے، ہم جو اس کے لیے بہتر سمجھیں گے وہی کریں گے۔'' سکندر شاہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔ زائرہ بیگم ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھتی رہیں۔ نہ جانے انہیں کیا ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں تو انہوں نے کبھی نہیں کی تھیں۔

''آپ زریاب کو فون کریں کہ وہ کل گھر آجائے۔'' انہوں نے اگلا حکم دیا۔ زائرہ بیگم نے محض سر ہلایا۔

''کل ہم نے شاپنگ پر جانا ہے، ڈرائیور اور گاڑی فارغ ہے کیا......؟'' انہوں نے اکتا کر موضوع بدلا۔

''ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کرتی ہیں آپ، کچھ اچھی چیزیں شانزے کے لیے بھی لے آئیں۔ وہ بھی اس گھر کی بیٹی ہے۔'' زائرہ بیگم نے پہلو بدلا، نہ جانے سکندر شاہ کو آج شانزے سے ہمدردی کا بخار کیوں چڑھا ہوا تھا۔ اب کیا ہو گیا تھا کہ ان کی سوئی شانزے پر ہی اٹک گئی تھی۔ زائرہ بیگم نے بہ مشکل خود کو کنٹرول کیا۔

''ہم نتاشا کے بارے میں جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' زائرہ بیگم کا دل دھڑکنے لگا۔

''جلدی ہی تو ہے ہمیں، اب تو ہمیں ہر بات کی جلدی ہے۔'' ان کا لہجہ پُراسرار ہو گیا۔ زائرہ بیگم کے سر میں درد ہونے لگا۔ آج کا تو دن ہی برا تھا۔ شانزے کو دی جانے والی اہمیت انہیں بری طرح کھل رہی تھی۔

''مکار، گھنی، میسنی، نہ جانے کب مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر باپ کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ میں ہی بے وقوف تھی جو اسے بے ضرر سمجھ بیٹھی تھی۔ کس قدر چالاک نکلی ہے، توبہ......توبہ......'' زائرہ بیگم غصے سے سوچ رہی تھیں۔

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' سکندر شاہ بیڈ پر لیٹ گئے۔

''ہاں، ہاں آپ آرام کیجیے، تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' زائرہ بیگم نے فوراً اٹھ کر چادر ان پر ڈالی۔ سکندر شاہ نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ نہ جانے کیوں آج ان کا ہر انداز اجنبی سا لگ رہا تھا۔ زائرہ بیگم اپنا غصہ دباتی باہر نکل گئیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالیں۔ کاریڈور کے آخری سرے میں انہوں نے پوچا لگاتی شانزے کو دیکھ لیا۔ انہوں نے سوہائی کو آواز دی اور اسے ہدایت کی کہ پوچا تم لگاؤ اور شانزے سے کہو وہ اپنے کمرے میں چلی جائے۔ شانزے حیرانی سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج زندگی میں پہلی دفعہ اسے سکندر شاہ ایک باپ کی طرح محسوس ہوئے، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج اسے سکندر شاہ کی آنکھیں باپ کی آنکھیں محسوس ہوئیں۔ باپ کی آنکھیں جن میں اس کے لیے شفقت تھی، ہمدردی تھی اور شاید محبت بھی تھی۔ سوہائی نے پوچا لگایا پھر سارہ کا کھانا لے کر اس کے کمرے میں آگئی۔ سارہ اس قید تنہائی سے اکتائی ہوئی تھی۔ سوہائی کو دیکھ کر اس نے اسے چند لمحوں کے لیے روک لیا۔

''شہریار صاحب کہاں ہیں؟'' اس نے... بے قرار ہو کر پوچھا۔

''وہ جی اپنے حویلی والے کمرے میں ہیں۔'' سوہائی نے جواب دیا۔

سارہ کو شدید غصہ آیا، شہریار کا موبائل بھی آف تھا۔

''وہ شانزے دوبارہ نہیں آئی، مجھے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ شہریار کی چچازاد ہے۔ اس حویلی میں اس کے ساتھ نوکرانی والا برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے...... آخر وہ اس گھر کی بیٹی ہے۔'' سارہ نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا۔

''وہ جی شاہ صاحب کی پہلی بیوی کی بیٹی ہیں، اس وجہ سے انہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی ماں کو حویلی والے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔'' سوہائی چور نظروں سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا شانزے کی ماں بہت بری عورت تھیں، کیا وہ خراب عورت تھیں؟'' سارہ نے خیال کے گھوڑے دوڑائے۔

''نہیں، نہیں جی...... وہ تو بڑی نیک عورت تھیں، پانچ وقت کی نمازی اور شریف عورت تھیں۔'' سوہائی رازدارانہ انداز میں بولی۔

''تو پھر کیا مسئلہ تھا، حویلی والے انہیں کیوں پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر وہ بے حد غریب... ہوں گی؟'' سارہ نے اندازہ لگایا۔

''نہیں جی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اونچے خاندان سے تعلق تھا ان کا۔'' سوہائی نے انکشاف کیا۔

''تو پھر کیا وجہ تھی، شانزے کی ماں کو کیوں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، کیا سکندر چچا نے خاندان سے بغاوت کر کے شادی کی تھی؟'' سارہ کا ذہن الجھ گیا۔

موتی مالا

☆ محبت جنہیں یاد کرتی ہے انہیں سدا سفر میں دوڑائے پھرتی ہے۔

☆ محبت صرف جوگ ہے۔

☆ ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔

☆ جو زندگی اندر مر چکی ہو اسے جھوٹ موٹ جیتے رہنا کتنا دشوار ہے۔

☆ جو دکھ کو گلے کا ہار بنا لیتے ہیں وہ کبھی دکھ سے نجات نہیں پاتے۔

☆ محبت کو پانے، منانے کے لیے ہی نہیں ناچا جاتا محبت پا کر بھی بندہ ناچ اٹھتا ہے۔

☆ پہلی محبت ان دیکھی سرزمین کے لیے کیے جانے والے سفر کی طرح ہمیشہ ہماری یادوں میں تازہ رہتی ہے۔

☆ جو چیز خواہش بھی ہو اور ضرورت بھی وہ محبت ہوتی ہے۔

☆ جڑیں سلامت ہوں تو ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی موسم بدلتے ہی پھول آجاتے ہیں۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

''نہیں جی، وہ تو اس شادی پر راضی بھی نہیں تھے۔ بس مجبوری میں کرنی پڑی۔ بس اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی جی، یہ حویلی کے راز ہیں، حویلی کے رازوں پر سے پردہ نہیں ہٹایا جاتا۔'' سوہائی نے کہا اور دروازے سے باہر جھانکنے لگی کہیں کوئی اس طرف تو نہیں آرہا۔ سارہ کو اس کہانی میں بے حد دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

''تو کیا وہ عورت سکندر چچا کو پسند کرتی تھی اور اسی نے شادی پر زور دیا؟'' سارہ نے ایک اور خیال ظاہر کیا۔

''نہیں جی، وہ تو بچپن سے اپنی خالہ کے بیٹے سے منسوب تھیں، اسی کو پسند کرتی تھیں، قسمت میں سکندر شاہ کا ساتھ لکھا تھا۔ تقدیر کے سامنے انسان کے ارادے دھرے رہ جاتے ہیں۔'' باہر سے کسی نے سوہائی کو آواز دی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ سارہ کے ہاتھ ایک جگسا پزل لگ گیا۔ اسے سکندر شاہ کی کہانی میں عجیب سی دلچسپی محسوس ہوئی۔

وہ کیا راز تھا جو شانزے کی ماں سے جڑا تھا، وہ حویلی کے رازوں کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔ وہ بہت بے صبری سے شہر یار کا انتظار کرنے لگی۔ یقیناً شہر یار سب حقیقتیں جانتا تھا۔ شہر یار دن کے اجالے میں تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی آمد ہمیشہ رات کو ہوتی۔ وہ اسے تسلیوں، وعدوں اور اچھے دنوں کے خواب دکھا کر چلا جاتا۔ سارہ کو اب اس نظر بندی اور تنہائی سے وحشت ہونے لگی تھی لیکن اسے امید تھی کہ اچھے دن بھی ضرور آئیں گے، وقت کے ساتھ لوگ اسے قبول کرلیں گے۔ تھوڑا وقت صبر سے کاٹنے کے بعد اسے اس کی قربانیوں کا صلہ ضرور ملے گا۔

رات کو شہر یار آیا تو وہ اسی کا انتظار کررہی تھی۔ وہ شاید بہت تھکا ہوا تھا اسی لیے آتے ساتھ بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''تمہاری چچی اور نتاشا آج یہاں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے بہت فضول باتیں کیں۔ ایسی زبان استعمال کی جو شریف عورتیں استعمال نہیں کرسکتیں۔ تم انہیں آرام سے بتادو کہ آئندہ اس طرح کی حرکت نہ کریں۔ میں اس گھر کی بہو ہوں، کوئی سڑک پر کھڑی لاوارث لڑکی نہیں کہ جس کا جو جی چاہے مجھے کہہ دے۔ میں صرف تمہارا لحاظ کرکے خاموش ہوگئی ورنہ زبان میرے منہ میں بھی ہے۔'' سارہ کو صبح کی بات یاد آئی تو اسے نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔ شہر یار نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا پھر نظریں پھیرلیں۔

''سارہ ...... وہ ہماری بڑی ہیں اور پھر اُن کی بیٹی کو چھوڑ کر میں نے تم سے شادی کی...... اتنا غصہ کرنا تو ان کا حق بنتا ہے، تم ان کی باتیں نظر انداز کردیا کرو۔'' سارہ افسوس سے شہر یار کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''انہوں نے میری انسلٹ کی ہے شیری......! اور ابھی تک وہ اپنی بیٹی کو تمہاری منگیتر کہتی ہیں، آخر مجھے حویلی کے اندر جانے کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ یہ شادی صرف میری پسند سے تو نہیں ہوئی، تمہاری پسند اور خواہش بھی تو شامل تھی پھر صرف مجھے ہی قصور وار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟'' سارہ کی آواز بھرا گئی۔

''ہر بات کا منفی پہلو مت دیکھا کرو یار...... ابھی حالات سازگار نہیں ہوئے۔ جب وقت آئے گا تو تمہیں حویلی کے اندر بھی لے جاؤں گا۔ ابھی اگر تم جاؤ گی تو روز روز لڑائی جھگڑا ہوگا۔ حالات مزید خراب ... ہوں گے، تمہیں کس بات کی ٹینشن ہے، یہاں آرام کرو، کھاؤ پیو، مزے سے رہو۔ نہ کوئی ذمّے داری، نہ کوئی کام، رات کو میں آجاتا ہوں، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' اس نے سارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ سارہ کے دل کو تسلی ہوئی، کچھ بھی تھا اسے شہر یار کی محبت پر شک نہیں تھا۔

''اچھا......! ایک بات تو بتاؤ، تمہاری کزن شانزے کے ساتھ یہاں نوکروں والا سلوک

کیوں کیا جاتا ہے۔ اس کی ماں کون تھی؟ وہ اور نتاشا دونوں سکندر چچا کی بیٹیاں ہیں پھر اُن کی حیثیت میں اتنا فرق کیوں ہے، مجھے لگتا ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی داستان ضرور ہے۔'' سارہ نے موقع پاتے ہی پُرتجسس انداز میں پوچھا۔ شہر یار نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''سارہ ان معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے، آئندہ اس قسم کے سوال مت پوچھنا۔'' یک دم ہی اس کا لہجہ درشت ہوگیا۔

''لیکن کیوں شیری، میں بھی تو اب اس خاندان کا حصہ ہوں، میں جاننا چاہتی ہوں کہ......'' سارہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ایک بار کہہ دینا کافی ہوتا ہے...... اگر تم نے دوبارہ اس موضوع پر کوئی سوال کیا تو میں اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' شہر یار نے روکھے انداز میں قدرے سختی سے کہا۔ سارہ خاموش ہوگئی۔ وہ اب اکثر شہر یار کے نئے، نئے روپ دیکھنے لگی تھی جو پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔

صبح ہوئی تو اسے گھر میں شور اور چہل پہل کا احساس ہوا اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو باہر کچھ لوگ مختلف انتظامات میں مصروف نظر آئے، وسیع وعریض لان میں رش سا لگا تھا یوں لگتا تھا آج کوئی خاص تقریب ہے...... اسے تجسس نے آن گھیرا...... سوہائی ناشتا لے کر آئی تو اس نے اسے پوچھا۔

''کیا آج گھر میں کوئی تقریب ہے؟''

''ہاں جی......! آج نتاشا بی بی کی شادی ہے، شاہ صاحب کی طبیعت خراب ہے اس وجہ سے جلدی شادی کرنا پڑی۔ آپ کے لیے حکم ہے کہ آپ بالکل باہر نہیں آئیں گی۔'' سوہائی یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

''نتاشا کی شادی؟'' سارہ حیران ہوگئی پھر اسے بہت سکون کا احساس ہوا۔

''چلو شکر ہے وہ بلا تو یہاں سے جائے گی۔'' اس نے سرشاری سے سوچا۔

سارا دن اسی چہل پہل میں گزر گیا، رات کو بے حد ہنگامہ برپا تھا، ساری حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنیاں رات کے اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ ڈھول باجوں کی آوازیں، فائرنگ اور پٹاخوں کی گرج اور لوگوں کا شور.. یوں لگتا تھا خاصے بڑے پیمانے پر تقریب کی گئی ہے۔ سارہ نے ہلکے سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اسے عجیب سا احساس ہوا...... کیا وہ ابھی تک اس خاندان کے لیے غیر ہی تھی، نتاشا کی شادی کی خوشی میں وہ اپنا غم بھول گئی۔ شہر یار آج رات نہیں آیا، یقیناً وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصروف ہوگا۔ اگلے دن بھی اسی طرح کا شور تھا، گویا حویلی کی ہر تقریب میں اس کے لیے نو انٹری تھی۔ آج شاید دوپہر کا کوئی فنکشن تھا جو شام ڈھلے ختم ہوگیا۔ شام کے بعد اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے کھول دیا گیا۔ سارہ چادر اوڑھ کر دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ چیزیں سمیٹی جاچکی تھیں لیکن حویلی کے جسم پر روشنیاں زیورات کی طرح ابھی تک چمک رہی تھیں۔ سوہائی کی نظر اس پر پڑی تو وہ گھبرا کر اس کی طرف دوڑی چلی آئی۔

''آپ باہر کیوں آگئیں بی بی جی؟'' وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تقریب تو ختم ہوگئی ہے، اب میرے باہر آنے پر پابندی کیوں؟'' سارہ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

سوہائی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک کونے سے شانزے نکلتی دکھائی دی۔ سبز گوٹے والے جوڑے میں ملبوس وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کناری لگا دوپٹا سلیقے سے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ کانوں میں سلور کلر کے جھمکے پہنے ہوئے تھے۔ وہ سارہ کو دیکھ کر اُدھر ہی آگئی۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو...... آج تو پہچانی ہی نہیں جارہیں۔''

شانزے اس کی بات پر دھیرے سے مسکرادی۔

''کس سے ہوئی ہے نتاشا کی شادی؟'' سارہ نے شانزے سے پوچھا۔

شانزے خاموش نظروں سے سارہ کو دیکھنے لگی۔ سوہائی نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔

''کیا ہوا، تم چپ کیوں ہوگئیں۔ بتانا نہیں چاہتی کیا...... نتاشا کی شادی کس سے ہوئی ہے؟'' سارہ کو اس کے تاثرات عجیب سے لگ رہے تھے۔

''نتاشا کی شادی شہریار بھائی سے ہوئی ہے۔''

الفاظ تھے یا بم جو عین سارہ کے سر پر پھٹے تھے۔

''نتاشا اور شہر یار......؟'' سارہ کا ذہن آندھیوں کی زد میں آگیا۔

''کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم شانزے......؟ یہ نہیں ہوسکتا۔'' سارہ کی کیفیت دیوانوں جیسی ہوگئی۔

شانزے نے سارہ کو بے حد افسوس سے دیکھا۔

''تایا جان نے شہر یار بھائی کو آپ سے اسی شرط پر شادی کی اجازت دی تھی کہ وہ بعد میں نتاشا سے شادی کریں گے۔ شہر یار بھائی نے اس شرط کو قبول کرلیا تھا۔'' شانزے نے ایک اور انکشاف کیا...... سارہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا۔

''اتنا بڑا دھوکا......! اتنی بڑی سازش......''

شانزے اس کا بازو تھام کر اسے اس کے کمرے تک لے آئی۔

''شہر یار ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ذکر تو کرتا......'' سارہ دھواں دھار رونے لگی۔ شانزے نے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگالیا۔

''قصور اُن کا نہیں ہے، حویلی کے کچھ اصول کبھی بدل نہیں سکتے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتے تھے۔'' شانزے نے اسے تسلی دی...... اس کا دل سارہ کے لیے افسردہ تھا۔

''شہر یار کہاں ہے اس وقت......؟'' سارہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اور نتاشا کچھ دیر پہلے ہی اسلام آباد کے لیے نکلے ہیں، وہاں سے وہ شمالی علاقہ جات جائیں گے۔ ان کی واپسی اب دس دن بعد ہی ہوگی۔ تایا جان نے بہتر سمجھا کہ کچھ عرصے کے لیے انہیں یہاں سے دور بھیج دیا جائے۔'' سارہ کے آنسو خشک ہوگئے۔

کیا وہ واقعی شہر یار کو نہیں جانتی تھی...... وہ دوسری شادی کرکے خوش تھا۔ سیر و تفریح کے لیے نکل چکا تھا۔ وہ تو دونوں طرف سے فائدے میں رہا...... نقصان تو اس کے حصے میں آیا۔ خسارے میں تو صرف وہ ہی رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بین کرے...... اتنے زور زور سے کہ اس حویلی کے درودیوار ہل کر رہ جائیں۔ اسے آج اپنے ماں باپ شدت سے یاد آرہے تھے۔ اس نے موبائل نکال کر ہما کو میسج ٹائپ کیا۔

''ہما! ابو سے کہنا کہ مجھے معاف کردیں...... میں نے ان کی نافرمانی کرکے بہت برا کیا...... وہ سچ کہتے تھے۔ ان کی ہر بات درست تھی۔ میں بہت بری بیٹی ہوں، بہت زیادہ بری...... میں گھر آنا چاہتی ہوں پلیز......'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

چند لمحوں بعد اس کے موبائل پر ہما کی کال آرہی تھی۔ اس نے شانزے کی طرف دیکھا...... وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ سارہ نے موبائل کان سے لگالیا۔

☆☆☆

گھر کافی حد تک سیٹ ہوچکا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جو تین بندوں کے لیے کافی تھا۔ شہر بانو... کو ہما نے سارہ کے فون کے متعلق بتایا تھا، وہ اُسی وقت سے پریشان تھیں۔

لاؤنج میں اسفند یار بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی۔ شہر بانو... ان کے ساتھ والے صوفے پر آبیٹھیں۔ ان کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔

''سارہ کا فون آیا تھا۔ اس نے ہما سے کہا کہ وہ آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے۔ اسے احساس ہوگیا ہے کہ اس نے غلطی کی، ان لوگوں کا سلوک اس کے ساتھ بے حد برا ہے اور شہر یار نے بھی اپنی کزن سے دوسری شادی کرلی کچھ بھی ہے، آخر کو وہ ہماری اولاد ہے...... ہم اسے اس مشکل میں کیسے دیکھ سکتے ہیں۔'' شہر بانو نے شوہر سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اخبار پر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا وہ بہت پہلے سے جانتے تھے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سارہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی لیکن اس نے انہیں بڑا دکھ دیا تھا۔

''ماں، باپ کے دل سے تو اس اولاد کے لیے بھی دعائیں نکلتی ہیں جو انہیں دکھ دیتی ہے۔ سارہ گھر آنا چاہتی ہے۔ اس نے جذبات میں آکر غلط قدم اٹھایا لیکن اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ وہ بہت مشکل میں ہے۔'' شہر بانو کا دل غم سے بوجھل تھا۔

''میں جانتا تھا کہ ایک دن یہی ہوگا...... اس وقت میری باتیں اسے بری لگ رہی تھیں۔ اس کا جرم بہت بڑا ہے، ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکالنا چھوٹی سی بات نہیں ہوتی۔ اسے پچھتانے دیں...... اس نے غلطی کی ہے تو سزا بھی اسے بھگتنی پڑے گی۔ میں اسے گھر آنے کی اجازت ضرور دوں گا لیکن ابھی نہیں...... ابھی اسے وہیں رہنے دیں تاکہ وہ حقیقتوں کا چہرہ غور سے دیکھ سکے۔'' اسفند یار نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا...... ان کے لہجے کی قطعیت نے مزید بحث کی گنجائش ہی ختم کردی تھی۔ شہر بانو کا دل اداس ہوگیا لیکن انہیں اسفند یار کے رویّے میں لچک کی امید بھی نظر آئی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن میں آگئیں۔ اسفند یار کی نظریں بدستور اخبار پر تھیں انہوں نے ایک بار بھی نظریں اخبار سے نہیں ہٹائیں۔ نہ جانے وہ واقعی اخبار پڑھ رہے تھے یا کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہما نے اپنے ماں باپ کی گفتگو کا ایک، ایک لفظ سنا تھا۔ چھوٹا سا فلیٹ تھا، آوازیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بخوبی سنی جاتیں۔ اسے سارہ کی حالت پر بے حد دکھ ہوا...... ایک غلط اور جذباتی فیصلے نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔

اس کے موبائل پر ازمیر کی کال آنے لگی تو وہ موبائل لے کر ٹیرس پر آگئی۔ چھوٹا سا بالکونی نما ٹیرس اس گھر میں کھلی فضا کی واحد جگہ تھا۔

''ہیلو ہما......! سوری اس وقت تمہیں ڈسٹرب کیا ہے، مجھے تم سے ضروری کام تھا۔'' ہما نے فون ریسیو کیا تو ازمیر نے چھوٹتے ہی کہا۔

''ہاں، ہاں کہو، میں سن رہی ہوں...... سب خیریت تو ہے ناں......؟'' ہما ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر بولی۔

''ہاں، مجھے اچانک گاؤں آنا پڑا ہے، یوں سمجھ لو بہت ایمر جنسی تھی۔ کل سب کی اسائنمنٹس ملیں گی تو میری اسائنمنٹ تم اپنے پاس رکھ لینا اور پلیز میری لیو ایپلیکیشن بھی دے دینا۔ میں شاید کچھ دنوں تک واپس نہ آسکوں......'' ہما چونک گئی، ازمیر کے لہجے میں عجیب سا تجسس تھا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے، میں یہ کام کردوں گی لیکن ہوا کیا ہے، کیا ایمر جنسی پڑ گئی تمہیں؟'' ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں کو اُڑا رہی تھی۔ اس نے بے اختیار دوپٹے سے بال چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا ہوں، واپس آکر بتاؤں گا لیکن فکر مت کرو، سب خیریت ہے، آکر کوئی خوش خبری ہی سناؤں گا۔'' ازمیر کے لہجے

میں مسکراہٹیں چھلک رہی تھیں۔
ہما نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اسے تشویش ہونے لگی، آخر ایسی کیا بات تھی جو ازمیر نے باوجود خوش ہونے کے نہیں بتائی، کوئی خوش خبری تھی، کہیں ازمیر کی منگنی تو نہیں ہو رہی....؟ اس کے دل کو زوردار دھچکا لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے یک دم اس کے وجود میں کپکپاہٹ بھر دی۔

''اگر اس کی منگنی ہو بھی رہی ہے تو اس بات سے بھلا مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا لیکن دل کہیں اندھیروں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سے خود ہی خوفزدہ ہو گئی۔

''نہیں، مجھے سارہ کی طرح کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا...... یہ محبت وحبت انسان کو کچھ نہیں دیتی...... الٹا زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ مجھے سارہ کی زندگی سے سبق لینا چاہیے۔'' ہما نے خود کو سمجھایا...... وہ ازمیر کو پچھلے چار سالوں سے جانتی تھی وہ بلاشبہ ایک بہترین لڑکا تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس سے آسانی سے متاثر ہو سکتی تھی۔ وہ کلاس کا سب سے ذہین اور سب سے ہینڈسم لڑکا تھا۔ اگر ہما کے دل میں اس کے لیے خاص جذبات ابھر آئے تھے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ہما نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا...... اسے اندازہ ہوا کہ بعض دفعہ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی انسان ذہن سے فیصلہ نہیں کر پاتا۔

ازمیر نے ہما کا فون بند کیا اور سیٹی پر کوئی دُھن بجاتا لاؤنج میں چلا آیا۔ جہاں ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔

''میرا تو بس نہیں چل رہا کہ ابھی بازار چلی جاؤں۔ اتنی شاپنگ کرنی ہے، خدا تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے اتنے برسوں بعد خوشی کا دن دکھایا ہے۔'' صائمہ دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ملازمائیں، مٹھائیوں کے ٹوکرے ٹیبل پر رکھ رہی تھیں۔ جہانگیر شاہ کے پہلو میں عماد مسکراہٹ دبائے بیٹھا تھا۔

''ابھی تو دیر ہو گئی ہے، کل صبح سویرے ہی تم لوگ بازار کے لیے نکل جانا...... جی بھر کر شاپنگ کرنا...... آخر جہانگیر شاہ کے بیٹے کی شادی ہے، کہیں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔'' جہانگیر شاہ..... بے تحاشا خوش تھے۔ ازمیر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''لیکن ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آخر سکندر شاہ اتنی آسانی سے کیسے مان گیا۔ اس نے تو منہ بھر کر انکار کر دیا تھا۔ کس چیز نے اسے یوں اچانک بدل دیا۔'' نبیلہ شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''جب خدا کا حکم ہو تو انسان کی کیا مجال کہ انکار کرے...... ویسے بھی انسانوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ایک پل کے لیے تو میں خود بھی حیران ہو گیا جب اس نے خود فون کر کے شانزے اور عماد کے رشتے کی حامی بھری...... خدا جانے کیا ماجرا ہے لیکن ہمیں اس سے کیا...... ہمارا مسئلہ تو حل ہو گیا ناں......'' جہانگیر شاہ نے منہ میں گلاب جامن رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ شخص اتنی بڑی چیز نہیں ہے، آپ لوگوں نے یونہی اسے ہوّا بنایا ہوا تھا۔'' ازمیر نے بھی مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''سچ کہا تم نے بیٹا، تقدیر لکھنے والے ہاتھ انسان کے نہیں ہوتے، اس لیے انسانوں سے ڈرنا بیکار ہے۔'' صائمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ آج بڑی خوشی کا دن تھا۔ سب کے چہروں پر رنگ تھے، خوشیاں تھیں، صائمہ آبدیدہ ہو گئیں۔ جہانگیر شاہ نے اٹھ کر بہن کو گلے سے لگایا۔ برسوں بعد اِک خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔ جن خواہشوں کے حصول کے لیے دعائیں مانگی جائیں، وہ خواہشیں انسان کو بہت عزیز ہوتی ہیں۔



سکندر شاہ بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ دنوں کی بیماری نے انہیں برسوں کے مریض کی طرح نڈھال کر دیا تھا۔ صوفے پر بیٹھا وکیل کچھ ضروری کاغذات تیار کر رہا تھا۔ سامنے ٹیبل پر چائے کے لوازمات رکھے تھے۔

''شاہ صاحب! وصیت تیار کرنے سے پہلے میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' سکندر شاہ نے سوالیہ نظروں سے وکیل کی سمت دیکھا۔

''جائیداد کی تقسیم میں شرعی احکامات کو مدِنظر رکھیے گا شاہ صاحب......! حق داروں کو ان کا حق انصاف کے ساتھ ملنا چاہیے تاکہ دنیا سے جاتے وقت انسان کے دل پر کوئی بوجھ نہ ہو اور...... پروردگار کے حکم سے روگردانی بھی نہ ہو۔'' سکندر شاہ نے عجیب سی نظروں سے وکیل کی سمت دیکھا اور تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔

''بعض فیصلے بہت مشکل ہوتے ہیں وکیل صاحب، انسان چاہتے ہوئے بھی انصاف نہیں کر سکتا۔'' سکندر شاہ کی آواز میں تھکن تھی۔

''اسی لیے میں نے آپ سے کہا کہ تمام فیصلے شریعت کے مطابق کیجیے...... جہاں خدا کے احکام نمایاں ہوں وہاں انسان کو اپنی مرضی نہیں کرنی چاہیے۔''

سکندر شاہ کچھ دیر خاموشی سے خلا میں دیکھتے رہے۔

''آپ وصیت لکھیے......'' انہوں نے بالآخر کوئی فیصلہ کر لیا...... وکیل صاحب نے فائل کھول کر قلم پکڑ لیا۔

باہر بیٹھی زائرہ بیگم عجیب شش و پنج میں گرفتار تھیں۔ سکندر شاہ کی طبیعت خراب تھی یہ اتنی تشویش کی بات تو نہیں تھی، اس عمر میں چھوٹی موٹی تکالیف چلتی رہتی ہیں۔ وکیل صاحب بھی اکثر و بیشتر مختلف کاموں کے سلسلے میں آتے رہتے تھے لیکن اس بار کچھ ایسا ضرور تھا جو انہیں چونکا رہا تھا۔ ان کی چھٹی حس کوئی الارم دے رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی لیکن

کچھ کھٹا کچھ میٹھا

ایک سردار جی کے چہرے پر زخم آیا تو نشان بن گیا۔ کسی نے کہا پلاسٹک سرجری کروا لو نشان مٹ جائے گا۔ وہ پلاسٹک سرجن کے پاس گئے انہوں نے سردار جی کو یقین دلایا کہ نشان مٹ جائے گا۔ سردار جی نے فیس پوچھی تو ڈاکٹر نے کہا پچاس ہزار۔ سردار جی کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر میں پلاسٹک اپنا لے آؤں تو پھر کتنی فیس ہو گی؟''

ڈاکٹر جل کو بولا۔ ''سردار جی، پلاسٹک لے کر میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں بس گھر میں چولھے پر گرم کرنا اور منہ پر چپکا لینا۔''

..........☆☆..........



بیوی۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔''
شوہر۔ ''اوہ، میں تو شاپنگ پر جانے کا سوچ رہا تھا۔''
بیوی۔ ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔''
شوہر۔ ''میں بھی مذاق کر رہا تھا چلو روٹی پکاؤ۔''
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کنارہ

سنو تمہیں علم ہے
کہ تم میری
محبت کا کنارہ ہو
اور
کنارے ساتھ چلتے ہیں
کنارے مل نہیں پاتے

مرسلہ: صائمہ سجاد، بنگش، کوہاٹ

سکندر شاہ کے کمرے سے کوئی گرین سگنل نہیں ملا۔
زریاب بیزاری سے بیٹھا موبائل پر کوئی گیم کھیل رہا تھا۔
''آپ نے یونہی ایمر جنسی میں مجھے بلوالیا...... سارا ٹرپ خراب ہوگیا۔ ایسا کون سا ضروری کام تھا جو میرے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔'' وہ چیونگم چباتے ہوئے بیزاری سے بولا۔
''بیٹا تمہارے بابا نے تمہیں بلوانے کی خاص تاکید کی تھی پھر اُن کی طبیعت بھی تو خراب ہے، نتاشا کی شادی بھی ہمیں جلدی میں کرنی پڑی۔'' زائرہ بیگم نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''بابا کو مجھ سے کیا کام پڑگیا، ماما میری بھی کوئی پرسنل لائف ہے، میں اس طرح کی ایموشنل بلیک میلنگ سے ڈسٹرب ہوتا ہوں۔ بابا کی طبیعت خراب ہے تو کسی ڈاکٹر کو بلوائیں، اس وکیل کو کیوں بلوالیا؟'' وہ پیر ہلاتے ہوئے بدلحاظی سے بولا۔
زائرہ بیگم خاموش ہوگئیں، تھوڑی دیر بعد سکندر شاہ نے انہیں اور زریاب کو اپنے کمرے میں بلوالیا۔ دلاور شاہ اور فرح بیگم بھی آگئے۔ سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
سکندر شاہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی اصل بیماری سے گھر والے ابھی تک لاعلم تھے۔
''شاہ صاحب نے اپنی وصیت تحریر کروائی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ سب بھی اس کے متعلق جان لیں۔'' وکیل نے فائل میں سے چند کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔
''ارے سکندر ابھی سے وصیت بنوانے کی کیا ضرورت تھی، اس عمر میں چھوٹی موٹی بیماریاں تو ساتھ چلتی رہتی ہیں۔'' دلاور شاہ نے اچنبھے سے کہا۔
''مجھے جلدی ہے بھائی صاحب! عمر کے اس حصے میں آکر میں نے جانا ہے کہ بعض دفعہ اہم معاملات میں جلدی کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔'' سکندر شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا...... ان کی آنکھوں کے حلقے گہرے ہوگئے تھے۔
''کیا ہوگیا ہے سکندر......! تم یوں حوصلہ ہارنے والے بندے تو نہیں تھے۔ سکندر شاہ کے قدموں سے تو زمین کانپتی تھی، اس نام سے ایک زمانہ ڈرتا تھا۔'' دلاور شاہ بھائی کے قریب آبیٹھے۔
''انسان کی اوقات اتنی نہیں ہوتی جتنی وہ سمجھ بیٹھتا ہے۔'' ان کے لہجے نے سب کو چونکا دیا۔ سکندر شاہ نے پل بھر کے لیے آنکھیں موند لیں۔
''آپ نے تو اس بیماری کو سر پر سوار کرلیا ہے، کل ڈاکٹر کے پاس چلیے گا۔ انشاء اللہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوجائیں گے۔'' زائرہ بیگم نے انہیں تسلی دی۔
''میں آپ سب کو بتانا چاہتا ہوں کہ شانزے کا رشتہ میں نے عماد شاہ کے ساتھ طے کردیا ہے اور اب جلد ہی اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
ان کی بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ بیوی بھی بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ سکندر شاہ کی شخصیت میں آیا یہ انقلاب سب کو حیران کررہا تھا۔
''سکندر! تم نے اتنا بڑا فیصلہ یوں اچانک اور اکیلے کرلیا...... کم از کم کسی سے مشورہ تو کرتے...... اور جہانگیر شاہ کے بیٹے سے رشتہ جوڑنے کے لیے تم کیسے مان گئے، کیا تم سب کچھ بھول چکے ہو......؟ سکندر ہم تمہارے اس فیصلے کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔'' دلاور شاہ کے لہجے میں بے پناہ حیرانی تھی۔ کوئی بھی سکندر شاہ سے اس اقدام کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔
''شانزے کے لیے جہانگیر شاہ کے گھر سے بہتر گھر نہیں ہوسکتا تھا۔ ہمیں احساس ہے کہ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے اسی لیے ہم نے ذاتی عناد کو بھلا کر پہلی بار اس کی بہتری کے لیے سوچا...... زندگی کا کوئی بھروسا نہیں...... نہ جانے ہمارے بعد

اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا...... کچھ بھی ہے آخر وہ سکندر شاہ کی بیٹی ہے۔'' زائرہ بیگم نے بے اختیار پہلو بدلا...... دلاور شاہ پُرسوچ نظروں سے چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگے۔
سکندر شاہ نے وکیل کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً وصیت کے کاغذات سامنے رکھے اور عینک لگا کر پڑھنے لگا۔
''سکندر شاہ صاحب نے اپنی تمام جائداد شرعی طریقے سے اپنے وارثوں میں تقسیم کردی ہے۔'' وکیل صاحب لمحے بھر کو رکے۔ زائرہ بیگم نے الجھے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا۔
''ان کے وارثوں میں ان کی ایک بیوی زائرہ شاہ' دو بیٹیاں شانزے شاہ اور نتاشا شاہ... اور......'' وکیل صاحب رک کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگے۔
شانزے کا نام سن کر زائرہ بیگم کے دل کو دھکا سا لگا۔ ایک بہترین رشتے کے ساتھ اسے جائداد میں بھی حصہ مل رہا تھا۔ ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔
''اور ان کے دو بیٹے زریاب شاہ اور ازمیر شاہ شامل ہیں۔'' زائرہ بیگم کے سر پر گویا کمرے کی چھت آگری۔
''ازمیر شاہ......؟'' ان کے ہونٹوں سے.... بے اختیار نکلا۔
''جی ہاں...... ازمیر سکندر شاہ......'' وکیل صاحب اطمینان سے بولے۔

☆☆☆

''ماما......! یہ بابا نے اچھا نہیں کیا...... ساری زندگی تو ان دونوں کو پوچھا نہیں اور جب جائداد کی تقسیم کا وقت آیا تو انہیں ہمارے برابر کا حصے دار بنادیا۔ دِس از ناٹ فیئر......'' زریاب سخت غصے میں تھا۔
''پتا نہیں تمہارے بابا کو اچانک کیا ہوگیا ہے۔ ازمیر شاہ کو تو شاید انہوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہوگا اور اس شانزے کو دیکھو...... کیسے مظلومیت کے ڈرامے رچا کے باپ کی ہمدردیاں سمیٹ لیں۔'' زائرہ بیگم کا بی پی ہائی ہورہا تھا۔
''میں شہر جارہا ہوں اور پلیز اب آپ مجھے جذباتی بلیک میلنگ کرکے دوبارہ مت بلوایئے گا۔'' وہ بدتمیزی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ زائرہ بیگم نے اپنا سر تھام لیا...... ہر بازی ہاتھ سے نکلتی جارہی تھی۔
شانزے ٹرے میں سوپ کا پیالہ رکھ کر باپ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔ شانزے نے پیالہ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔
''بابا جان سوپ پی لیجیے۔'' وہ دھیرے سے بولی تھی۔ وہ چند لمحے اسے یونہی دیکھتے رہے۔ نیلے رنگ کے ملگجے لباس میں ملبوس اس نے دوپٹا سر پر اوڑھا ہوا تھا۔ بالوں میں درمیان سے مانگ نکال کر کس کر چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اس کا صبیح چہرہ ہر قسم کی آرائش سے پاک چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔
وہ صائمہ شاہ سے کس قدر مشابہ تھی۔ سکندر شاہ نے بے اختیار نظریں پھیر لیں اور ازمیر شاہ...... انہیں سڑک پر ملنے والا وہ سرپھرا سا نوجوان یاد آیا...... سرخ وسفید چہرے والا وہ لڑکا جس کی بھوری آنکھیں سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ جس کے انداز کی بے نیازی نے انہیں بے تحاشا غصہ چڑھا دیا تھا۔ وہ ہو بہو ان کا عکس تھا...... سکندر شاہ کی جوانی...... ان کا بیٹا جسے انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا...... وہ کیسے باپ تھے...... اپنی اولاد کو اپنی انا پر قربان کردیا...... وہ کسی کو کیسے بتاتے کہ وہ سارا دن کیا سوچتے رہتے ہیں۔ اب تو سوچنے کا وقت ملا تھا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے گزر جاتے انہیں سوچتے ہوئے۔ انہیں خبر ہی نہ ہو پاتی۔ وہ زندگی کے کیسے دور میں داخل ہوگئے تھے۔ شاید زندگی کا آخری دور

انسان کو یونہی بدل دیتا ہے۔
کب کمرے کی روشنی اندھیرے میں بدل جاتی ...... انہیں علم ہی نہ ہو پاتا۔ ان کا ذہن کسی دوسری دنیا میں ہی سفر کرتا رہتا...... دوسری دنیا ماضی کی دنیا تھی۔

☆☆☆

سخاوت شاہ اپنے علاقے کے بڑے زمیندار تھے۔ ان کی دو ہی اولادیں تھیں...... جہانگیر شاہ اور صائمہ شاہ...... جہانگیر شاہ حال ہی میں شہر سے تعلیم مکمل کر کے آیا تھا۔ صائمہ شاہ کی نسبت بچپن سے ہی سیفی کے ساتھ طے تھی جو اس کا خالہ زاد تھا اور یتیم ہونے کے باعث ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ بالغ ہونے پر اس کا کمرا مردانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ صائمہ اور سیفی کی محبت وقت کے ساتھ پروان چڑھتی گئی۔ دونوں مطمئن تھے۔ انہیں زمانے اور ظالم سماج کا خوف نہیں تھا۔ سیفی اب شہر میں پڑھ رہا تھا اور چھٹیوں میں گاؤں آتا، صائمہ اس کے آنے کے دن گنا کرتی۔

''تمہاری اتنی کم چھٹیاں کیوں ہوتی ہیں؟ اتنے عرصے بعد گاؤں آتے ہو؟'' بالوں کی دو چٹیا بنائے، وہ دھانی رنگ کا آنچل اوڑھے موم کی گڑیا لگ رہی تھی۔ فضا میں مالٹوں کی مہک رچی بسی تھی۔ مالٹوں کے باغ میں درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا سیفی دھیرے سے مسکرایا۔

''فضول میں کالج سے چھٹیاں کروں گا تو پڑھائی کا حرج ہوگا پھر میں بڑا آدمی کیسے بنوں گا، تمہارے لیے بڑا گھر کیسے بناؤں گا؟'' اس نے شاخوں پر بیٹھے پرندوں کو دیکھ کر کہا۔

''میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے، تم خود کو ہم لوگوں سے الگ کیوں سمجھتے ہو۔ بابا جان تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔'' صائمہ نے انگلی پر آنچل کا کونہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں صائمہ......! میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں، تمہارے بابا کا سب کچھ جہانگیر بھائی اور تمہارا ہے، میرا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ میری عزتِ نفس کبھی یہ گوارا نہیں کرے گی کہ میں بالغ ہونے کے بعد بھی خالو جان پر بوجھ بنا رہوں...... تم فکر نہ کرو، میں تمہیں سب کچھ دوں گا لیکن اپنے بل بوتے پر۔'' سیفی نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ لیے۔ صائمہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

''بابا نے تمہیں کبھی غیر نہیں سمجھا سیفی۔'' صائمہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک مالٹا توڑ لیا۔

''یہ ان کا بڑا پن ہے، مجھے بھی اپنا بڑا پن دکھانا چاہیے۔'' سیفی نے نظریں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ صائمہ خوب صورتی اور معصومیت کا حسین امتزاج تھی۔ برف جیسی سفید رنگت، اماوس کی رات جیسے گہرے سیاہ بال، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کا سایہ رہتا...... سرخ گلابوں جیسے ہونٹ بلاشبہ وہ ایسی لڑکی تھی جس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔

''کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوب صورت لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔'' سیفی اسے دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا تھا۔ صائمہ بے اختیار ہنس دی۔

''میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں، دنیا میں تمہارے جیسا اچھا اور گبرو جوان اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے، دل میں عجیب سے وہم آنے لگتے ہیں کہیں کچھ ایسا نہ ہو جائے جو ہمیں جدا کر دے۔'' سیفی کا لہجہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ صائمہ کی ہنسی تھم گئی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو، ایسا کیوں ہو گا بھلا...... ہمارا ملن تو طے ہے، بعض دفعہ تم بہت منفی باتیں سوچتے ہو، ہمیشہ اچھا ہی سوچنا چاہیے۔''

صائمہ نے دہل کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''ہوں...... شاید میں کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتا ہوں، ہر چیز پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے، میری زندگی میں بہت محرومیاں آئی ہیں، شاید اس لیے دل میں خوف جڑ پکڑ لیتا ہے۔ تم نہیں سمجھو گی، محروم اور تنہا انسان بہت خوفزدہ رہتا ہے۔ والدین کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔'' سیفی نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے اس کی اداسی کو شدت سے محسوس کیا......

دفعتاً درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے کسی کی چاپ ابھری۔ سیفی سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والا گاما تھا۔ وہ گھبرایا ہوا سیفی کے نزدیک آیا۔ صائمہ نے بے اختیار دوپٹا سر پر اوڑھ لیا۔

''چھوٹے صاحب غضب ہو گیا جی۔''

گاما پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ صائمہ نے رخ بدل لیا۔ سیفی نے تشویش سے گامے کو دیکھا۔

''کیا ہوا گامے...... سب خیریت تو ہے ناں......؟''

''نہیں چھوٹے صاحب اب خیریت نہیں رہی۔ چھوٹے شاہ (جہانگیر شاہ) کا بہادر شاہ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، بات آگے تک بڑھ گئی، بہادر شاہ نے چھوٹے شاہ کو گالی دی بس چھوٹے صاحب برداشت نہیں کر سکے اور گولی چلا دی۔ بہادر شاہ کا بچنا مشکل ہے جی، گولی سیدھی دل پر لگی ہے۔'' گامانے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔

''اوہ خدایا......'' سیفی نے بے اختیار کہا......

صائمہ کا دل کانپنے لگا۔ واقعہ معمولی نہیں تھا۔ بہادر شاہ، حشمت شاہ کا چھوٹا بیٹا تھا اور حشمت شاہ ساتھ والے گاؤں کا بے تاج بادشاہ اور بڑا زمیندار تھا۔ وہ دونوں جلدی سے سفید حویلی پہنچے۔ سخاوت شاہ اپنے بیٹے جہانگیر شاہ پر خوب گرم ہوئے۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ جذبات میں آ کر اس نے انتہائی غلط قدم اٹھایا تھا۔

''اگر اس نے تمہیں گالی دی تھی تو تم بھی اسے گالی ہی دیتے۔ اس پر گولی چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہتھیار کو کھلونے کی طرح استعمال نہیں کیا کرتے...... تم جانتے نہیں ہو حشمت شاہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کے بیٹے پر گولی چلانے کا مطلب اپنی موت کو خود دعوت دینا ہے۔'' سخاوت شاہ بے حد غصے کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ جہانگیر نے نظریں نہیں اٹھائیں۔

''اگر بہادر شاہ کو کچھ ہو گیا تو تمہیں پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ زندگی اور موت کو کھیل سمجھ رکھا ہے تم نے...... ابھی پولیس آتی ہو گی اوہ خدایا! نہ جانے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے مجھے۔'' سخاوت شاہ کا تنفس تیز ہو گیا...... سیفی دوڑ کر ان کے لیے پانی کا گلاس لے آیا۔

''لے جاؤ اسے۔'' انہوں نے ہاتھ مار کر گلاس پرے پھینکا۔

''زہر لے آؤ میرے لیے، اب جو ہونے والا ہے...اسے دیکھنے سے بہتر ہے میں مر ہی جاؤں۔'' وہ گرج دار آواز میں چلّائے اور کرسی پر ڈھے گئے۔ سیفی تو تسلی کے دو لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ جہانگیر کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آ کر جہانگیر کو تھانے لے گئی۔ سخاوت شاہ کی ہمت ٹوٹ گئی۔ صائمہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ سیفی خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔ آناً فاناً اِک قیامت برپا ہو گئی تھی۔

''اچھا ہوا جہانگیر کی ماں پہلے ہی مر گئی...... یہ وقت دیکھنے کو زندہ نہ رہی۔ میں بدنصیب ان مصائب سے نمٹنے کو تنہا رہ گیا ہوں۔'' سخاوت شاہ نے خود کلامی کی...... جوان بیٹا جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا اور جرم بھی ایسا کہ جس میں بچنے کا چانس صفر تھا۔ بہادر شاہ کا انتقال ہو گیا اور دشمنی کی راہ کھل گئی۔ حشمت شاہ کسی صورت جہانگیر شاہ کو معاف کرنے پر

راضی نہیں تھا۔ وہ لوگ تو اس کے خون کے پیاسے ہورہے تھے۔ سخاوت شاہ دنوں میں ہی بوڑھے ہوگئے، سیفی ان کے ساتھ وکیلوں کے پاس چکر لگاتا، دیگر سرداروں کی منتیں کرتا، اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوا کہ وہ امتحان کی تیاری بھی نہ کرسکا۔ زندگی ایک دم بدل گئی تھی اور نہ جانے ابھی کیا کچھ بدلنا باقی تھا۔ سخاوت شاہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا۔ چند بڑے سرداروں کو بیچ میں ڈالا تاکہ مسئلے کا حل نکل آئے۔ جرگے نے حشمت شاہ کے سامنے دو آپشن رکھے...... ایک تو یہ کہ جہانگیر شاہ کو پھانسی ہوجائے، دوسرا یہ کہ سخاوت شاہ اپنی نہروالی زمین حشمت شاہ کے نام کردے۔ اس کے علاوہ سو تولے سونا یا اس کے برابر رقم اور اپنی بیٹی کا رشتہ حشمت شاہ کے بیٹے کو دے دے۔ حشمت شاہ ایک زمیندار تھا۔ وہ آدھی سے زیادہ جائداد اپنی عیاشیوں پر لٹا چکا تھا۔ اس نے جذبات کے بجائے عقل سے فیصلہ کیا اور دوسرا آپشن قبول کرلیا۔ سخاوت شاہ اس دن بہت روئے۔ بیٹا بھی عزیز تھا اور بیٹی بھی...... قسمت نے انہیں عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

''یہ ناانصافی ہے، خالو جان! صائمہ بے قصور ہے، وہ بھی آپ کی اولاد ہے، یہ کہاں کا دستور ہے کہ بھائی کے جرم کی سزا بہن کو دی جائے...... اگر جہانگیر بھائی نے جرم کیا ہے تو سزا بھی انہی کو ملنی چاہیے۔'' سیفی، سخاوت شاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''صائمہ میری بیٹی ہے، میں جو چاہے فیصلہ کرسکتا ہوں، مجھے اس بارے میں کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سخاوت شاہ نے رکھائی سے کہا...... انہوں نے سیفی کی حیثیت دو کوڑی کی کردی۔ سیفی کو اپنی ہتک کا شدید احساس ہوا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔

''خالو جان......! صائمہ وہاں مرجائے گی، وہ لوگ وحشی درندے ہیں۔ وہ صائمہ کو پل، پل اذیت دیں گے، صائمہ میری منگیتر ہے اور میری غیرت کبھی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہو۔ وہ بے قصور ہے، اسے ایسی کربناک سزا نہیں ملنی چاہیے۔'' سخاوت شاہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہوگئے۔

''اپنی حیثیت مت بھولو سیفی، یہ رشتہ ہم نے اپنی مرضی سے طے کیا تھا اور اب اپنی مرضی سے ختم کررہے ہیں، ہمیں حالات کے مطابق فیصلہ کرنا ہے، تم کیا سمجھتے ہو ہمارے لیے یہ فیصلہ آسان تھا۔ تم ابھی باپ نہیں بنے...... جب باپ بنوگے تب ہمارا درد سمجھوگے، ہم جیتے جی اپنے بیٹے کو پھانسی لگتے نہیں دیکھ سکتے۔ صائمہ کا رشتہ سکندر سے طے ہوا ہے اور ہماری معلومات کے مطابق وہ ایک معقول لڑکا ہے۔''

سیفی کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ فیصلے ہوچکے تھے اور اس کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ یہ فیصلے بدل سکتا۔ صائمہ نے اپنی محبت کی قربانی دے دی۔ وہ خاموشی سے دلہن بن کر حشمت شاہ کی حویلی میں آگئی۔ وہاں اس کا استقبال اِک خاموشی اور نفرت سے کیا گیا۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے تحقیر، نفرت اور غصہ تھا...... اسے پرانے اسٹور میں رکھا گیا۔ ٹھنڈی زمین پر اس کا بستر تھا۔ دھول مٹی سے اٹا چھوٹا سا اسٹور اس کا حجلۂ عروسی بنا۔ صائمہ کو اپنے نصیب پر رونا آگیا۔ بہادر شاہ کی ماں دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکی اور بے رحمی سے اسے پیٹنے لگی...تھپڑ، لاتیں، گھونسے، ڈنڈے، صائمہ کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ وہ خاموشی سے مار کھاتی رہی۔ جسم کی تکلیف نے روح کو بھی تارتار کردیا تھا۔

''دل پر گولی لگی تھی میرے بہادر کے، دل پر گولی لگی تھی میرے بہادر کے، تڑپ تڑپ کے جان دے دی اس نے، میرا بے گناہ گبرو جوان بیٹا یوں بے رحمی سے مارا گیا اور قاتل ابھی تک کھلے عام گھوم رہا ہے، تو قاتلوں کی لڑکی ہے، ہائے ربّا......!

میرے بیٹے کے قاتلوں کی لڑکی اب میرے گھر میں رہے گی، یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ گئی۔'' عالیہ بیگم کے بین شروع ہو گئے...... چیخ چیخ کے اس کا گلا بیٹھ گیا۔ اس نے صائمہ کے بال ہاتھوں میں جکڑ کے کھینچے۔ تکلیف کی شدت سے صائمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ زندگی نے اسے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس کی زندگی کے سیاہ ترین دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسے دن میں ایک وقت کھانا دیا جاتا وہ بھی ایسا جیسے جانوروں کو دیا جاتا ہے، اس کی حیثیت گھر میں نوکرانیوں سے بدتر تھی۔ اس کے ذمے سارے گھر کے کام تھے۔ شہزادیوں کی طرح رہنے والی لڑکی کنیزوں سے بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے بیٹیاں شاہوں کی ہوں یا کمیوں کی بعض دفعہ ان کے نصیب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ سیفی دل برداشتہ ہو کر شہر چلا گیا۔ اس نے جیسے تیسے امتحان دیے اور شہر میں ہی رہنے لگا۔ اس کا دل گاؤں سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک معمولی دکان پر... سیلزمینی کی نوکری کر لی۔

صائمہ کا جسم نیلوں سے بھرا رہتا۔ اس کے چہرے پر جا بجا نشان پڑ چکے تھے۔ اکثر رات کے آخری پہر سکندر شاہ نشے میں ڈوبا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوتا۔ اسے بری طرح زدوکوب کرنے کے بعد وہ صبح ہوتے ہی واپس چلا جاتا۔ صائمہ کا دل چاہتا کہ وہ مر ہی جائے۔ وہ اپنا حسین ماضی یاد کرتی جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اس کی زندگی میں رنگ ہی رنگ تھے۔ اس کے دل کا آسمان سیفی کی محبت کے سورج سے جگمگاتا تھا۔ سیفی کا نام دل کا درد مزید بڑھا دیتا۔

آہ محبت......

تیرے کتبے کے قریب کھڑی میں
اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہا رہی ہوں

☆☆☆

وقت گزرتا رہا، صائمہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ دن رات کی مشقت اور اذیت نے اس کے ذہن پر بھی برا اثر ڈالا تھا۔ دنیا نے اس سے اس جرم کا انتقام لیا تھا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس حال میں اس نے شانزے کو جنم دیا۔ شانزے کی آمد پر گھر کے کسی فرد نے خوش دلی کا اظہار نہ کیا، اسے سکندر شاہ کی بیٹی نہیں بلکہ صرف صائمہ کی بیٹی سمجھا جاتا۔ صائمہ کی روح روز کفن اوڑھتی اور کبھی نہ اٹھنے کی خواہش لیے سو جاتی۔ سیفی آخری بار گاؤں آیا اور اسے صائمہ کی بیٹی ہونے کی اطلاع ملی۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اس خبر کو سنا پھر اپنا سامان باندھ کر ہمیشہ کے لیے شہر آ گیا۔ اس کی انا پر گہری ضرب پڑی تھی، صائمہ کی یاد اس کے دل میں اُدھڑے زخم کی طرح تازہ تھی۔ آنے سے پہلے اس کی جہانگیر شاہ کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی جس کے بعد اس نے واپس گاؤں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہاں اس کا رہنا بیکار تھا۔ جہاں اس کی محبت کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا وہاں وہ بھلا کس طرح رہ سکتا تھا۔ سکندر نے کبھی شانزے کو اپنی بیٹی کا مقام نہ دیا۔ عالیہ بیگم اور حشمت شاہ نے بھی اسے حویلی میں داخل نہ ہونے دیا...... وہ صائمہ کے ساتھ ہی اسی اسٹور میں رہتی اور ملازموں کے بچوں کی طرح پلتی رہی۔ صائمہ دن بھر کاموں میں مصروف رہتی اور ننھی شانزے خاموشی سے کسی کونے میں پڑی رہتی۔ وہ قدرتی طور پر بڑی صابر بچی تھی۔ سخت جاڑوں کی راتوں میں صائمہ گودام سے خالی بوریاں لے آتی اور بستر کے اوپر بچھا دیتی۔ دو بوریاں ملا کر اس میں شانزے کو لپیٹ لیتی۔ گرمی کے موسم میں وہ اسٹور کا اکلوتا روشن دان کھول لیتی جہاں سے ہوا کا گزر ہوتا...... اور سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے کے باوجود اسے راتوں کو نیند نہ آتی۔ اس کے وجود کی خوب صورتیاں دھیرے

دھیرے ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی نشے میں مدہوش سکندر بھولے بھٹکے اس کے کمرے کا رخ کرتا اور وہ رات صائمہ کی روح کو مزید بوجھل اور جسم کو زخمی کر دیتی۔ پھر صائمہ کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ دلاور شاہ کا نہر کے پانی پر جھگڑا ہوا اور سخاوت شاہ کے دو بندے اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ سخاوت شاہ نے جرگہ بلوانے کے بجائے اپنے طور پر صلح صفائی کی کوشش کی، وہ پولیس اور جرگے کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ حشمت شاہ کو بھی بہتری اسی میں نظر آئی اور انہوں نے آپس میں شرائط طے کر لیں۔ صائمہ کو سخاوت شاہ کے گھر واپس بھیج دیا گیا اور شانزے کو حویلی میں ہی رکھ لیا گیا۔ صائمہ اس رہائی پر دھاڑیں مار کر روئی، ننھی شانزے اسے آس بھری نظروں سے دیکھتی رہی اور صائمہ کو تنہا ہی جانا پڑا۔ اس نے لاکھ منتیں کیں لیکن ظالم لوگوں نے شانزے کو اس کے ساتھ نہ جانے دیا۔ صائمہ حاملہ تھی اور اسے چار ماہ کا حمل تھا، چند ماہ بعد اس نے ازمیر کو جنم دیا تو اس کی ممتا کو قرار آیا۔ دونوں خاندانوں میں صلح کے باوجود اتنی کڑواہٹ تھی کہ وہ کبھی اپنے دلوں سے نفرت اور کدورت کو ختم ہی نہیں کر سکے۔ جہانگیر کو ہر دم احساسِ جرم ستاتا کہ اس کی وجہ سے صائمہ کو اتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں...... ازمیر کی پیدائش کے بعد سخاوت شاہ کے کہنے پر سکندر نے صائمہ کو طلاق بھیج دی۔

صائمہ نے سیفی کا بہت انتظار کیا لیکن وہ ایسا گیا کہ کبھی لوٹ کر نہ آیا، وقت گزرتا رہا، صائمہ کے زخم مندمل نہ ہو سکے۔ اس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ لی۔ ازمیر ہی اس کی کل کائنات تھا۔ جہانگیر شاہ کا احساسِ جرم وقت کے ساتھ بڑھتا رہا اور انہوں نے شانزے کو ہر صورت یہاں لانے کا فیصلہ کر لیا۔ سکندر شاہ نے دوسری شادی کر لی۔ وقت گزرتا رہا۔ نسلیں جوان ہو گئیں لیکن نفرت کی دیواریں نہ گریں۔

سکندر شاہ کے ذہن میں ماضی کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ انہوں نے جہانگیر شاہ کے ذریعے صائمہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں معاف کر دے۔ صائمہ نے بے حد حیرانی سے یہ پیغام سنا۔ کیا سکندر شاہ اس حد تک بدل چکا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ آج وہ اس عورت کی معافی کا محتاج تھا جسے کبھی اس نے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

سکندر شاہ کی بیماری زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ ہر ایک ان کی بیماری کا سن کر ششدر رہ گیا۔ وقت بدل چکا تھا۔ جب وقت بدل جائے تو انسانوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

سکندر شاہ کا ذہن ہر دم ماضی کا سفر کرتا رہتا۔ سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ شانزے ان کی دن رات خدمت کرتی۔ انہیں بیماری کے اس حصے میں آ کر احساس ہوا کہ ان کی یہ بیٹی اس قدر خدمت گزار اور سونے جیسے دل کی مالک ہے۔ نتاشا تو بس کھڑے کھڑے ان کا حال پوچھتی۔ سکندر شاہ کی بیماری کی وجہ سے شانزے کی شادی قدرے سادگی سے ہوئی۔ البتہ جہانگیر شاہ کی طرف سے ساری رسمیں دھوم دھام سے کی گئیں۔ صائمہ نے پہلی بار سرخ غرارے اور ڈھیر سارے زیورات پہنے شانزے کو دیکھا تو خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ بیس برس بعد اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ شانزے کے لیے ہر چیز بے حد قیمتی اور اعلیٰ لی گئی۔ اس کی محرومیاں ختم ہونے کا وقت تھا۔ شانزے جب ازمیر کے کندھے سے لگی تو دونوں بہن بھائی بے اختیار رو پڑے۔ نہ جانے قصور کس کا تھا لیکن جنہوں نے بیس برس دوریوں اور محرومیوں کی سزا کاٹی، ان کے دل کے زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکتے۔

☆☆☆

ازمیر کے اصرار پر ہما نے اس کی والدہ کو گھر

آنے کی اجازت دے دی لیکن اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر اس کے ابو نے انکار کر دیا تو وہ بھی اپنے قدم پیچھے ہٹالے گی۔ سارہ کا انجام اس کے سامنے تھا۔ وہ کسی صورت اپنے ماں، باپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ شہر بانو، ازمیر کی والدہ کی آمد کا سن کر خاموش ہو گئیں۔

ازمیر اور اس کی والدہ سہ پہر کے وقت آئے، بلیو جینز اور آسمانی شرٹ میں ملبوس دراز قد ازمیر بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ گرے ساڑی پر سیاہ شال اوڑھے صائمہ شاہ ایک بے حد گریس فل عورت کا تاثر دے رہی تھیں۔ بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ شہر بانو نے ان دونوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ ان کے نشست و برخاست اور بات کرنے کے انداز سے خاندانی رکھ رکھاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔ اسفند یار نماز پڑھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو بری طرح چونک گئے۔ ازمیر کے ساتھ بیٹھی صائمہ بھی بے اختیار کھڑی ہو گئیں۔ کہیں زلزلہ آیا تھا، در و دیوار مع تمام نفوس ہل سے گئے تھے۔ اسفند یار کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑے ہو گئے۔

''سیفی......'' صائمہ کے لب ہلے، حیرانی سی حیرانی تھی۔ ہما کے والد سیفی یعنی اسفند یار ہوں گے انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا، جس شخص کی آمد کا انہوں نے بیس برس انتظار کیا وہ آج ان کے سامنے ان کی ہونے والی بہو کے باپ کے روپ میں موجود تھا۔ وہ قسمت کے اس پھیر پر جتنا حیران ہوتیں کم تھا۔

''آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' شہر بانو نے ان دونوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ازمیر بھی اس صورتِ حال پر حیران و پریشان رہ گیا۔

''ہوں...... میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری پرورش میرے خالو جان کی تھی، یہ صائمہ شاہ ان ہی کی بیٹی ہیں۔ میری خالہ زاد......'' اسفند یار بروقت سنبھل کر بولے اور قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''اوہ...... کیسا اتفاق ہے، چلیں اس بہانے برسوں پرانے رشتے داروں سے تو ملاقات ہو گئی۔'' شہر بانو کو یک دم خوشی کا احساس ہوا۔ ہما کی سسرال اس کی ددھیال بھی تھی اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوتی ورنہ اجنبی لوگوں کے خیال سے ان کا دل ڈر رہا تھا۔

''بہت وقت گزر گیا تم پلٹ کر نہیں آئے سیفی...... شاید اپنی دنیا میں بہت مصروف ہو گئے تھے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی صائمہ کے لہجے میں گلہ سمٹ آیا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، وہاں حالات اس طرح کا رخ اختیار کر چکے تھے کہ میرا وہاں رہنا ناممکن تھا اور پھر کب تک انسان کسی پر بوجھ بن کر رہ سکتا ہے۔ شہر بانو میرے استاد کی بیٹی تھی، انہوں نے ہی میری شادی کروائی، تمہاری بیٹی کی پیدائش کے متعلق علم ہوا تھا پھر سوچا جب بیٹی ہو گئی تو سکندر اور اس کے گھر والے تمہیں آہستہ آہستہ قبول کر لیں گے، مجھے تمہاری علیحدگی کا بہت بعد میں علم ہوا۔''

اسفند یار، ازمیر کی موجودگی کے باعث محتاط انداز میں بات کر رہے تھے۔ صائمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بہت وقت گزر چکا تھا اب گلے شکوے کرنا فضول تھا۔

''میری بڑی بیٹی سارہ کی شادی سکندر شاہ کے بڑے بھائی دلاور شاہ کے بیٹے شہر یار سے ہوئی ہے۔ عجیب اتفاق ہے...... کاش یہ اتفاق میرے ساتھ نہ ہوتا۔'' اسفند یار کی بات پر صائمہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''لیکن میرے علم کے مطابق تو شہر یار کی شادی سکندر شاہ کی بیٹی نتاشا سے ہوئی ہے، میں اس

کی کسی اور شادی کے متعلق نہیں جانتی۔'' اسفند یار چند لمحے چپ ہو گئے کیا سارہ کی شادی ابھی تک خفیہ تھی یا اسے خفیہ رکھنے میں کوئی راز تھا۔ ان کا ذہن الجھ گیا۔

''تم نے دلاور شاہ کے گھر اپنی بیٹی کو کیسے بیاہ دیا سیفی؟'' صائمہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اسفند نے لمحے بھر کو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اک انی سے چبھی تھی دل میں......

''تقدیر کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے۔ ہم کتنی ہی کوشش کر لیں جو فیصلے اوپر لکھ دیے جاتے ہیں، انہیں بدل نہیں سکتے۔''

صائمہ سر جھکائے کچھ دیر سوچتی رہیں۔

''میں تم سے اپنے ازمیر کے لیے تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں سیفی۔'' اسفند یار نے ایک نظر سر جھکائے بیٹھے ازمیر کو دیکھا جو ابھی تک حیران بیٹھا تھا۔

''میں تمہیں انکار نہیں کر سکتا صائمہ......! برسوں بعد تم نے مجھ سے کچھ مانگا ہے۔''

صائمہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسفند یار نے ان کا مان رکھ لیا تھا۔ وقت گزر چکا تھا لیکن کچھ رشتوں کا رنگ ہمیشہ گہرا رہتا ہے۔ ازمیر کے چہرے پر...... بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

شہر یار آج بہت دنوں بعد سارہ کے کمرے میں آیا تھا۔ سارہ کی حالت دگرگوں تھی وہ اتنا رو چکی تھی کہ اب اس میں مزید آنسو بہانے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔

''ایسا کیوں کیا شیری تم نے...... جب تمہیں نتاشا سے ہی شادی کرنی تھی تو میری زندگی کیوں برباد کی؟'' سارہ کا چہرہ سُتا ہوا اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''تم میری محبت ہو سارہ......! نتاشا سے شادی میں نے مجبوراً کی ہے۔'' اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

''تمہارے لیے مجبوری کا لفظ اچھا نہیں لگتا شیری......! تم نے تو صرف پایا ہی پایا ہے، نقصان تو میرا ہوا ہے، قیدی تو میں بن کر رہ رہی ہوں، میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں، میں نہیں جانتی تھی کہ ماں، باپ کی نافرمانی کی ایسی سزا ملے گی مجھے۔ پتا نہیں ہم جیسی لڑکیوں کی آنکھوں پر محبت اور جذبات کی پٹی کیوں بندھ جاتی ہے؟'' سارہ کا گلا رندھ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے سوج چکے تھے۔ وہ ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں سے نہ واپس پلٹ سکتی تھی اور نہ آگے کوئی منزل نظر آتی تھی۔

''سارہ کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو، کچھ وقت لگے گا لیکن سب تمہاری حیثیت کو وقت کے ساتھ قبول کر لیں گے۔'' وہی جھوٹی تسلیاں اور کچے وعدے...... سارہ اب اس کی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ جھوٹے بہلاوے مت دو شیری...... تمہاری خاندانی بیوی گھر میں آ چکی ہے، میری حیثیت کے متعلق تو شاید باہر کے لوگ جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ میں تو بس ایک کنیز یا لونڈی کی طرح زندگی گزار رہی ہوں...... میں اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔'' سارہ کے لہجے کی تھکن بڑھ گئی۔ جبھی شہر یار کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ اس نے موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھا تو اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''میں پھر آؤں گا سارہ! پھر تفصیل سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' وہ عجلت میں کہتا باہر نکل گیا۔

سارہ ساکت آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہ وہی شخص تھا جس کی وفا پر اسے اندھا اعتبار تھا۔ جس کے وعدوں پر وہ بھروسا کر بیٹھی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مرد کے وعدے ساحل کی ریت پر

لکھی تحریر کی طرح ہوتے ہیں۔ حالات کی ایک تند لہر ان کا نام ونشان بھی مٹا دیتی ہے۔

☆☆☆

جہانگیر شاہ کی حویلی میں روز جشن کا سماں ہوتا...... لاؤنج ابھی تک سجا ہوا تھا۔ فضا میں گلاب اور موتیے کے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی، شانزے لائٹ پنک کلر کے کام والے لمبے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس سر پر دلہن کی طرح دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کے زیورات فانوس کی روشنی میں خوب چمک رہے تھے۔ سلیقے سے کیا میک اپ اس کے حسن کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ صائمہ اس کے قریب بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ گھر میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔

''لگتا ہے شانزے کی کھیر پکوائی کی رسم نہیں کی جائے گی، میں اپنی بیوی کے ہاتھ کے پکے کھانے، کھانے کو ترستا ہی رہوں گا۔'' عماد، صائمہ اور جہانگیر کو شانزے کے واری صدقے جاتے دیکھ کر وہ بولا۔

''بالکل تمہارا اندازہ درست ہے، یہ شانزے کی سسرال نہیں بلکہ اس کا میکا ہے۔'' جہانگیر شاہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بس اب ازمیر کا فرض باقی ہے، انشاء اللہ اس سے بھی جلد ہی سبکدوش ہو جائیں گے۔ اصل خدمت تو ہم ازمیر کی بیوی سے کروائیں گے۔'' نبیلہ نے ہنستے ہوئے ازمیر کو ٹھوکا دیا جو بڑی بے پروائی سے چلغوزے کھا رہا تھا۔

''امی سے پوچھ لیں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، آخر وہ سیفی ماموں کی بیٹی ہے، یہ گھر اس کا بھی سسرال نہیں بلکہ میکا ہوگا۔'' ازمیر مسکراتے ہوئے بولا۔

''بڑا عجیب اتفاق ہے، اتنے سالوں بعد سیفی کا پتا چلا اور وہ بھی اس طرح...... خیر جو ہو چکا ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اب ہم سب سیفی کے گھر جائیں گے، خون کے رشتے ٹوٹ نہیں سکتے...... سیفی کے گلے بجا تھے لیکن بعض دفعہ حالات اس طرح کا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ اپنے پیاروں اور عزیزوں کی مرضی کے خلاف فیصلے کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔'' جہانگیر شاہ یکلخت سنجیدہ ہو گئے۔ صائمہ نے سر جھکا لیا۔

''ازمیر کی پسند سیفی کی بیٹی ہوگی مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ بچھڑے رشتے دوبارہ جُڑنے کو ہیں۔ یہ سب شاید اسی طرح لکھا تھا ہم عام انسان ہیں تقدیر کے پھیر نہیں سمجھ سکتے۔'' صائمہ نے کہا پھر بے اختیار شانزے کی طرف دیکھا۔

''بیٹا تم تھک تو نہیں گئیں...... اس طرح دلہن بن کر بیٹھنا بھی کون سا آسان کام ہے، ہم اپنی خوشی کے لیے بچی کی جان کو مصیبت میں ڈال دیتے ہیں۔'' صائمہ نے فکر مندی سے شانزے کا چہرہ اونچا کیا۔

''نہیں امی! میں بالکل ٹھیک ہوں بھلا بیٹھ بیٹھ کر بھی کوئی تھکتا ہے۔'' شانزے مدھم سا مسکرائی...... درحقیقت وہ بہت خوش تھی۔ برسوں بعد اپنی ماں اور اپنے بھائی سے ملی تھی۔ عماد جیسا اچھا اور محبت کرنے والا شوہر نصیب ہوا تھا۔ جہانگیر اور نبیلہ جیسے شفیق ساس، سسر ملے تھے۔ یہ اس کے صبر کا ہی انعام تھا ورنہ اس کی زندگی تو لوگوں کے لیے عبرت کا نشان تھی۔ اب اس کی زندگی سے اندھیرے ختم ہو گئے تھے۔

''اور نہیں تو کیا، امیر بہوؤں کے یہی تو شوق ہوتے ہیں، اچھے، اچھے کپڑے پہن کر بن ٹھن کر بیٹھنا، خوب سارے زیور پہننا اور لوگوں کو آرڈر پاس کرنا، آپا بھی امیر بہو کی کیٹیگری میں شامل ہوتی ہیں۔'' ازمیر دھپ سے شانزے کے قریب آ بیٹھا۔

''آپ تو جانتی نہیں آپا اگر آپ کا رشتہ آسانی سے نہ ملتا تو بڑی جنگ وجدل ہوتی۔ ہم آپ کو اٹھا لے آتے۔ ہمارے لیے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔'' ازمیر، شانزے کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ شانزے مسکرا دی۔ اس نے ازمیر کے بازو سے سر ٹکا دیا۔ ایک بھائی کا سہارا کتنی

تقویت دیتا ہے اسے اب احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی جنت کے انتظار میں ایک طویل عرصہ جہنم میں گزارا تھا۔ اس کی آزمائش کا وقت ختم ہو گیا تھا اب اسے کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا، سارہ پر نتاشا کے پریگنینٹ ہونے کی خبر بجلی بن کر گری۔ نتاشا کا خوب خیال رکھا جا رہا تھا۔ سارہ کو شہریار سے اب کوئی امید نہیں رہی تھی۔

''تم نے نے مجھے ماں بننے کا حق نہیں دیا شیری...... تم نے نتاشا کو یہ حق دے کر ثابت کر دیا کہ تمہارے نزدیک میری حیثیت ایک لونڈی سے زیادہ نہیں ہے۔'' سارہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''سارہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری اولاد کی حیثیت بھی شانزے جیسی ہو...... اگر تم سے اولاد ہوتی تو حویلی میں اسے وہ نام اور مقام ملتا، وہ میرے اور تمہارے لیے ایک آزمائش ہوتی۔'' شہریار نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شیری، مجھے فالتو سامان کی طرح اس دڑبے میں قید کیے رکھا...... مجھے بنیادی سہولیات سے بھی محروم رکھا۔ میری کوئی ذمّے داری تم نے نہیں اٹھائی۔ تم نے دوسری شادی کر لی، میرا ارمانوں اور خواہشوں بھرا دل مُردہ کر دیا اور مجھے ماں بننے کا حق بھی نہیں دیا۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے شیری۔ ہما کا میسج آیا تھا، ابو نے مجھے گھر آنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں کچھ دیر کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں، میں تمہارے ہاتھوں کھلونا بنتے بنتے تھک چکی ہوں۔'' سارہ رونے لگی۔ شہریار شاید اپنے بچے کی آمد کی خوشخبری سے بہت خوش تھا۔ اس نے سارہ کو نہیں روکا۔ سارہ ایک بیگ میں اپنا ضروری سامان ڈالنے لگی۔

''ٹھیک ہے بہتر ہے کہ تم چند دنوں کے لیے اپنے ابو کے گھر چلی جاؤ۔'' وہ بہت آسانی سے مان گیا۔ ایک طرف سجی سجائی قیمتی کپڑوں اور زیورات سے آراستہ خاندانی بیوی تھی جو اسے اولاد کی خوشخبری دینے جا رہی تھی۔ دوسری طرف ملگجے لباس اور اجڑے حالوں میں لپٹی یہ لڑکی تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا لیکن مفادات محبت پر سبقت لے گئے۔ سارہ سر جھکائے واپس آ گئی، اس شادی نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ گھر میں کسی نے اس سے ماضی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گھر میں ہما کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شہر بانو اور اسفندیار نے سارہ کو معاف کر دیا تھا۔ سارہ نے شہریار کو فون کیا اور اس سے صاف الفاظ میں واپس جانے سے منع کر دیا۔

''میں واپس نہیں آنا چاہتی شہریار شاہ، میری آنکھیں دیر سے کھلی ہیں لیکن اب میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

''تم میری بیوی ہو سارہ! یہ فیصلہ تم اکیلے نہیں کر سکتیں۔'' شہریار کا لہجہ غضب ناک ہو گیا۔

''تمہاری بیوی ہوتے ہوئے میں کبھی ماں نہیں بن سکتی، میں ڈی گریڈ ہو کر زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں نے تم پر ایک دفعہ اعتبار کیا اور ٹھوکر کھائی۔ دوسری دفعہ اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتی۔ میں انسان ہوں شہریار، کوئی کھلونا نہیں۔'' سارہ نے خشک لہجے میں کہا۔

''سارہ تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہی ہو، مرد دو شادیاں کرتے ہیں، اس کو ایشو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہریار بیزار ہو گیا۔

''کیا تم میرے لیے نتاشا کو چھوڑ سکتے ہو؟ کیا مجھے حویلی میں اپنی خاندانی بیوی جیسا مقام دلوا سکتے ہو، کیا مجھے ماں بننے کا حق دے سکتے ہو، نہیں...... تم ایک کمزور مرد ہو جو صرف عورت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے...... تمہیں میرے دل کی کوئی پروا نہیں۔ تمہیں میرے دکھ درد سے کوئی سروکار

نہیں.....تم ایک خودغرض شخص ہو۔'' سارہ کے اندر کا لاوا باہر نکل آیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔'' شہر یار کو غصہ آ گیا۔

''ہاں تمہاری حویلی کے قید خانے میں رہ کر میرا دماغ خراب ہو چکا ہے، تم مجھے طلاق دے دو ورنہ میں خلع لے لوں گی۔'' سارہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ محبت کا تاج محل زمین بوس ہو گیا تھا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر فون بند ہو گیا۔

''کیا محبت کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے۔'' سارہ گم صم انداز میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کبھی یہ شخص اس کا عشق تھا۔ اس شخص کے لیے اس نے ماں باپ کا دل توڑا، گھر سے بھاگ کر شادی کی، دنیا اور زمانے کی پروا نہیں کی۔ نہ جانے لڑکیاں محبت میں اس قدر اندھی کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں کا کم و بیش یہی انجام ہوتا ہے۔ سارہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسے طلاق کے کاغذات مل گئے۔ اس دن وہ بے تحاشا روئی......محبت کے اس پُر خار سفر میں اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ ایسی محبتیں انسان کو کچھ نہیں دیتیں۔ کاش لڑکیاں یہ بات وقت سے پہلے ہی سمجھ جایا کریں۔ سارہ کو اب پچھتاوے کی آگ میں جلنا تھا۔

☆☆☆

سکندر شاہ بے حد نحیف ہو چکے تھے۔ موت قریب ہو تو انسان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ زائرہ شاہ ان کے قریب دلگرفتہ سی بیٹھی تھیں انہوں نے جو چاہا تھا ویسا ہی ہوا۔ شہر یار نے سارہ کو طلاق دے دی، اب سب کچھ نتاشا کا تھا لیکن انسان جیسا چاہتا ہے ویسا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نتاشا کا ابارشن ہو گیا اور رپورٹس کے مطابق وہ شہر یار کو کبھی صحت مند اولاد نہیں دے سکتی تھی کیونکہ یہ کزن میرج کا معاملہ تھا۔ شہر یار ایک جذباتی اور جلد باز شخص تھا۔ اس کی متلون مزاجی نے ہمیشہ اسے نقصان پہنچایا۔ زائرہ بیگم کے آگے ان کے اپنے اعمال آ رہے تھے۔

''صائمہ سے کہنا مجھے معاف کر دے۔'' سکندر شاہ بار بار یہی الفاظ دُہراتے۔

''اوہو......وہ عورت کوئی ولی تو نہیں ہے، جس نے آپ کو معاف نہ کیا تو غضب ہو جائے گا۔ آپ اس کا خیال ذہن میں کیوں لاتے ہیں۔'' زائرہ بیگم نے غصے بھری جھلاہٹ سے کہا۔

''میں اس کا اور اس کے بچوں کا قرض دار ہوں۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولے۔

''جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا قصور نہیں تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ آپ سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتے، شانزے اپنے گھر میں خوش ہے، اسے اور ازمیر کو آپ نے ان کا حق دے دیا۔ اب کس بات کی ٹینشن ہے۔'' وہ بیزار ہو گئیں۔

سکندر شاہ نے آنکھیں موند لیں۔ کھڑکی کے پار اداس شام جھانک رہی تھی۔ بیس برس جس عورت کو نہیں سوچا آج اس کے سوا کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا تھا۔ ایسا کیوں تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ صائمہ نے ان کا پیغام سن کر بے اختیار جواب دیا۔

''جس عورت کو کل تک پیر کی جوتی کے برابر سمجھتے تھے آج اس کے منہ سے نکلے دو لفظوں کے محتاج کیوں ہو سکندر شاہ......سکندر شاہ تو کبھی کسی کا محتاج نہیں ہوا۔'' سکندر شاہ نے یہ پیغام سنا اور اِک اداس سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ کناروں سے سیاہ ہوتے ہونٹ مسکراتے ہوئے عجیب سے لگتے تھے۔

''مرد ہمیشہ کسی نہ کسی روپ میں عورت کا محتاج ہوتا ہے۔'' انہوں نے کہتے ہوئے آنکھیں موند لیں پھر بے اختیار کلمہ پڑھا اور آنکھیں کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو گئیں۔

(ختم شد)

محبت کا دیوتا

مصباح نوشین



وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ ایک اچھی شکل صورت کی لڑکی تھی بے حد پُرکشش آنکھیں لیے جو اَب محبت کی ویرانی نے اجاڑ دی تھیں...... چہرے پر شباب تو تھا پر گلال نہیں...... محبت میں تنہا ہونے کے احساس نے تمام رعنائی و دلکشی غصب کرلی تھی۔

''میرا دل سفید آبدار موتی کے مانند شفاف تھا شہزاد علی...... مگر تمہاری محبت نے اسے داغدار کردیا......'' آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر نگاہ جماتے اس نے ہولے سے کہا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''تم نے شادی کرلی شہزاد علی...... اتنے برسوں کا میرا انتظار لاحاصل ہی رہا......'' قطرہ قطرہ پگھلتی

رات میں اس نے شہزاد علی کی تصوراتی تصویر پر نگاہیں جمائے سوچا اور بھیگتی رات میں لمحہ بہ لمحہ قطرہ قطرہ جلتے رات بِتادی اس رات کی اذیت باقی ہر گزری اذیت سے سوا تھی۔

انتظار ختم ہو گیا اور دامن خالی رہا اس نے شہزاد علی کو پانے سے پہلے کھو دیا۔ اس کی محبت کی کہانی فقط اتنی سی ہی تھی مگر...... شاید اس محبت کی شدت اتنی نہیں تھی۔ بارہ سال کا طویل عرصہ اس نے فقط ایک ہی شخص کو مانگتے اور سوچتے بِتایا۔ اسے اظہار سے زیادہ دعاؤں پر یقین تھا مگر وہ پھر بھی خالی ہاتھ رہی...... کیا جان لیوا احساس تھا۔

''شہزاد بھائی کی بیوی انہی کی طرح بے حد حسین ہے گُل۔'' کسی کا کہا ہوا جملہ کانوں میں گونجا...... آنسو خون کا قطرہ بن کے گل کی آنکھ سے گرا۔

''کیوں نہ ہوتی خوب صورت...... شہزاد بھائی کی پسند کوئی معمولی تھوڑی ہوتی ہے۔'' کسی اور نے کہا۔

''ہاں......'' گل نے سسکی کو لبوں میں دبوچا۔ ''عام لوگ اور عام چیزیں اسے اٹریکٹ ہی کہاں کرتی تھیں۔ ورنہ یکطرفہ محبت کی بھٹی میں وہ یوں پل پل جل تو نہ رہی ہوتی......''

شہزاد علی...... بڑے ابا کا ذہین ترین اور عزیز ترین اسٹوڈنٹ...... غیر معمولی ذہانت، خوب صورتی کا حامل...... لڑکیوں کی پہنچ سے دور...... بالکل دیوتا جیسا...... یوں جیسے کوئی دیو مالائی حسن رکھنے والا شہزادہ...... جو ہر خوبی میں یکتا و مکمل ہو...... گل نے اسے بڑے ابا کی اسٹڈی سے کس شانِ بے نیازی سے نکلتے دیکھا تھا اور اس نے اپنا دل اس کے قدموں میں ریشم کے لچھوں کے مانند الجھتا محسوس کیا مگر ریشم کے الجھے لچھے تو نرم و نازک انگلیوں کی جنبش سے کھل جایا کرتے ہیں۔ گل نے کبھی اس سے بات نہیں کی، کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی مگر اس کے رعبِ حسن کے آگے اس نے ہر آن اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا تھا۔ وہ بارہ برس سے ان کے گھر آرہا تھا اکثر گل کو لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف دیکھتا...... کبھی مسکرا بھی دیتا...... اور گل گنگ ہوئی حیرتوں کے پہاڑ تلے دبی کئی کئی دن نکل ہی نہ پاتی...... روئی کے نرم گالوں کے مانند دنوں ہواؤں میں تیرتی پھرتی...... شہزاد علی جیسے حسن کے دیوتا کی نگاہ گل جیسی عام لڑکی کی طرف کیا اٹھی وہ عام سے خاص بن گئی۔ شہزاد علی جیسے غیر معمولی آدمی کی نظر اس کی طرف اٹھی تھی پھر وہ عام تو نہیں رہی تھی۔ شاید کوئی بھی نہ رہتا وہ تو پھر گل تھی نرم و نازک احساسات رکھنے والی کمزور عام سی لڑکی...... برسوں کسی فرضِ عبادت کی طرح اس نے شہزاد علی سے محبت کی تھی فقط اس آس پر کہ شاید اس کی محبت کی تپش شہزاد علی کے دل تک بھی رسائی حاصل کر جائے اور اسے دیوتا کے من کے سنگھاسن پر نہ سہی چرنوں ہی میں جگہ مل جائے مگر......

☆☆☆

وہ دو دن سے اپنی محبت کا سوگ اکیلے کمرے میں بند منا رہی تھی۔ محبت کے اس سفر میں وہ تنہا فگار ہو چکی تھی۔

''گل......'' ایمان بھاگتے ہوئے خوشی سے چہکتے اسے پکار رہی تھی اور وہ تکیے میں سر دیے اپنی ناکام محبت پر ماتم کناں تھی۔ ایمان کمرے کا دروازہ کھول کر دھپ سے اس کے قریب آگری تھی۔

''اٹھو...... تم کیا کل سے کمرا بند کیے لیٹی ہو...... شہزاد بھائی نے اپنی شادی کی تصویریں میل کی ہیں...... آؤ مل کے دیکھتے ہیں۔'' وہ اس کی حالت سے بے خبر تھی اسی لیے اسے کانٹوں پر رقص کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ گل کی نسبت وہ شہزاد علی کے کافی قریب تھی بلکہ ان کے دوستوں میں شمار ہوتی تھی سو اس کی خوشی بامعنی تھی۔

''تم جاؤ...... میرا موڈ نہیں ہے، سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔'' اس نے بہ مشکل تمام لہجے کو متوازن رکھتے انکار کیا۔

''کیا ہوا......؟ مجھے کہا ہوتا میں چائے بنا دیتی......'' وہ فوراً ہی پریشان ہوئی۔

''نہیں تم پریشان مت ہو...... میں دوا لے لیتی ہوں ابھی ٹھیک ہو جائے گا...... تم جا کے پڑھو تمہارے ایگزامز ہونے والے ہیں۔'' اس نے بہ مشکل اسے ٹالا۔

''ایسے کیسے چلی جاؤں میں گل......'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ماتھا چھوا پھر ٹھٹک گئی۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی۔

''ارے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ میں عرفان بھائی سے کہتی ہوں وہ تمہیں ابھی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔'' وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔

''ایمان...... کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے...... میں چائے کے ساتھ پین کلر لے لوں گی تو شام تک بالکل فریش ہو جاؤں گی......''

عرفان کے ساتھ جانے کے خیال سے ہی گل نے اپنی جان فنا ہوتی محسوس کی وہ تو پہلے ہی زخم زخم ادھڑ رہی تھی ایسے میں عرفان کی محبت چھلکاتی نگاہوں کا سامنا دوبھر محسوس ہو رہا تھا سو اس نے قطعیت سے منع کر دیا۔

''بہت ضدی ہو تم گل......!'' ایمان منہ بنا کے اٹھ گئی مگر پندرہ منٹ بعد چائے کے مگ کے ساتھ دو سینکے توس اور پین کلر بھی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم نے ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا...... پہلے ہلکا پھلکا کچھ کھا لو پھر دوا لے لینا۔''

گل نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر عرفان کے لیپ ٹاپ سمیت موجود تھی۔ جس میں شہزاد علی کی شادی کی تصاویر تھیں، ایمان اسے وہی دکھانے لائی تھی۔

''شہزاد بھائی کی دلہن اتنی پیاری ہے گل کہ نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی چہرے سے۔ ایسی ملائی جیسی جلد اور رنگت ہے کہ حد نہیں......'' ایمان کے تبصروں پر گل کی نظریں بے ساختہ لیپ ٹاپ کی اسکرین کی جانب اٹھیں اور گویا ساکت ہو گئیں۔

''شہزاد بھائی ایسی ہی بیوی ڈیزرو کرتے تھے یقیناً!'' ایمان بے حد خوش تھی۔

''خاص لوگ، خاص لوگوں کے لیے ہی بنتے ہیں اور انہی کے ساتھ جچتے ہیں۔'' تانیہ شہزاد کے حسین چہرے پر نگاہ پڑتے گل نے دلگرفتگی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

''اب کیسی طبیعت ہے گل؟'' وہ کچن میں کھڑی اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ جب اس کی آہٹ پر چونکی مگر مڑی نہیں۔ عرفان کا اس طرح حال پوچھنا اسے کھلا تھا۔ گل کو ناچار مڑنا پڑا۔

''جی اب بہت بہتر ہوں۔'' اس کا سر جھک گیا۔ عرفان کی لو دیتی خمار آلود آنکھوں میں مچلتے جذبات دیکھنے کی تاب کہاں رہی تھی۔ وہ جو کسی اور کی محبت بھری نگاہوں کی منتظر تھی عرفان کی نظریں کیسے سہہ پاتی۔

''ایک کپ چائے مجھے بھی مل سکتی ہے کیا؟'' عرفان کے سوال پر گل نے آہستگی سے سر ہلایا اور اپنے لیے بنایا ہوا کپ اسے تھما دیا۔

''نہیں یہ تم خود پیو، تم نے اپنے لیے بنائی ہے، مجھے اور بنا کر دے دو۔'' عرفان نے چائے لینے سے انکار کرتے ہوئے ڈائننگ چیئر کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔ گل کے لیے انکار کی گنجائش ختم ہو گئی اس نے اپنا کپ کاؤنٹر پر رکھا اور اس کے لیے چائے بنانے لگی۔

''تم نے شہزاد علی کی بیوی کو دیکھا گل...... کیسی لگی وہ تمہیں؟'' گل کا جی چاہا... چائے کا ساس پین اٹھا کر فرش پر پٹخ دے ہر کسی کے پاس صرف ایک ہی قصہ تھا۔ تانیہ شہزاد کی خوب صورتی کا قصہ...... اور سبھی لوگ اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے میں مگن تھے۔

''ہوں...... آپ بھی متاثرین میں شامل ہو گئے......؟'' کپ میں چائے انڈیلتے اس نے اپنے اندر کا زہر باہر نکالا۔

''نہیں، میں ظاہر سے متاثر نہیں ہوتا باطن کی گہرائی میں جھانکتا ہوں۔'' لحہ کی لحہ گل نے نگاہیں اٹھا کے دیکھا وہ اسی کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ گل نے جلدی سے نگاہیں جھکاتے اسے کپ تھمایا، عرفان کی دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں کپ پکڑتے وقت گل کے ہاتھ سے مس ہوئیں اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''گل......'' اس نے باہر جاتی گل کو پکارا۔ ''تمہیں تو اب بھی بخار ہے...... ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا تم نے؟''

''کچھ مرض لاعلاج ہوتے ہیں ان کا علاج دنیا کے کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا۔'' عرفان کی فکر مندی پر گل نے بڑی دلگرفتگی سے سوچا اور جواب دیے بغیر باہر نکل آئی...... مگر رات تک وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی...... سارے گھر والے بے حد پریشان تھے گل نیم بے ہوشی کی حالت میں بے سُدھ سی پڑی تھی...... ڈاکٹر کو عرفان گھر لے آیا تھا اس نے میڈیسن لکھ کر دینے کے ساتھ انجیکشن بھی لگا دیے تھے مگر بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پندرہ روز گزر گئے اسے اندر ہی اندر گھلتے...... وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کے رہ گئی تھی پر کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ بخار کی اصل وجہ کیا تھی۔

☆☆☆

وہ آنکھیں موندے شہزاد علی کے بارے میں سوچنے میں مگن تھی جبھی کوئی دستک دے کر اندر آیا تھا۔ گل نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور منجمد ہو گئی۔

جس شخص کو دن رات دیوانوں، پاگلوں کی طرح سے سوچا تھا چاہا تھا، وہ مجسم حقیقت کا روپ

دھارے اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ نوکرانی اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر جا چکی تھی۔ گل نے آنکھیں مسلتے اس کے پہلو میں دیکھا اس کا پہلو خالی تھا...... گل نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا جو پہلی بار اس کے سامنے اس کے کمرے میں کھڑا صرف اسی سے ملنے آیا تھا۔

''کیسی ہیں گل آپ؟'' گل کو حیران دیکھ کر وہ ہولے سے ہنسا اور چند قدم آگے اس کے قریب بڑھ آیا۔ گل کی سانسیں تھمنے لگیں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں اسے اتنے قریب سے دیکھ بھی پائے گی۔

''لگتا ہے آپ کو کافی شاک لگا ہے مجھے یہاں دیکھ کر......؟'' وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے فوراً ہی سنجیدہ ہوا تھا۔ گل نے سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں سر کو نفی میں جنبش دی گویا ذرا سی تاخیر سے اس کی محبت کا دیوتا روٹھ نہ جائے۔

''تو کیا خوشی ہوئی ہے؟'' اب کی بار وہ آنکھوں میں شرارت لیے اسے دیکھ رہا تھا گل نے... فی الفور سر اثبات میں ہلایا۔

''میں تمہیں اچھا لگتا ہوں ناں گل......؟'' وہ اپنی مقناطیسی آنکھیں گل کے چہرے پر ٹکائے گویا اسے ہپنا ٹائز کر رہا تھا گل ساکت ہو گئی تو گویا اسے سب خبر تھی اور وہ پھر بھی انجان رہا۔

''کیوں......؟'' گل کے اندر سوالات سر ابھارنے لگے۔

''میں جانتا ہوں گل...... تمہارے خاص جذبات جو تم میرے لیے رکھتی ہو...... سچ مانو تو میں تمہارے جیسی لڑکی کے خالص جذبات کی بے حد قدر کرتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ تمہارے جیسی لڑکی کے ساتھ انجانے میں، میں زیادتی کر گیا ہوں...... اور اب میں اس کا مداوا کرنا چاہتا ہوں......'' اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ گل ایک ٹرانس کی کیفیت میں بیٹھی اس کے دلربا مالائی نقوش دیکھتی رہی۔ کس قدر خوب صورت چہرہ تھا اس کا۔

''مداوا......؟'' گل کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

''ہاں مداوا...... میرا دل بہت وسیع ہے گل...... میں نے شادی کر لی ہے تو کیا ہوا...... مگر میں تانیہ کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی محبت اور وقت دے سکتا ہوں۔ جب تک تم چاہو...... اور جب جی بھر جائے تو بغیر کوئی گلہ کیے ہم اپنا راستہ الگ کر سکتے ہیں۔'' وہ خاموش ہوا تو گل نے اپنی پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا...... دیوتا کا اصل چہرہ خود اسی نے نوچ کر اس کے سامنے کر دیا تھا جو کتنا مکروہ اور غلیظ تھا کہ گل کو گھن آنے لگی تھی۔ جبھی نوکرانی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''بی بی جی خیریت ہے ناں......؟'' اسے کچھ انہونی لگی...... شہزاد اپنے گال پر ہاتھ رکھے کمرے سے جا چکا تھا مگر جاتے، جاتے اس کی نگاہیں گل کو کوئی خوفناک پیغام دے چکی تھیں۔

☆☆☆

اس روز بڑے ابا نے شہزاد علی اور اس کی دلہن کو کھانے پر بلایا تھا۔

گل جان بوجھ کر سامنے نہیں گئی تھی بلکہ وہ اوپر ٹیرس پر چلی آئی تھی۔ جہاں چاند اس کے رت جگوں کا گواہ بنا آج بھی موجود تھا۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ کے ساتھ مگن کھڑی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ پر چونکی...... پلٹ کر دیکھا تو شہزاد علی اس کے نزدیک تر تھا وہ بچ کر نکلنا چاہ رہی تھی مگر اس نے راستہ روک لیا۔

''بہت نظر بچا کر آیا ہوں...... میں تو اس روز تم سے اظہارِ محبت کرنے آیا تھا مگر...... مگر تم... نے۔'' شہزاد کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

''تم کیا سمجھتی تھیں میں بارہ سال تمہارے جذبوں سے ناواقف رہا......؟ میں تمہاری تڑپ سے آگاہ تھا مگر تم جیسی عام سی لڑکی کو لفٹ کرا دیتا تو تم سر

پر ہی چڑھ جاتیں...... ہاں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے تم سے دوستی کر لینی چاہیے تھی تاکہ تمہارے معمولی حسن سے بھی فیضیاب ہوجاتا مگر مجھے موقع نہ مل سکا۔ چلو کوئی بات نہیں اب بھی وقت ہے، یاد رکھو تمہارا تھپڑ ادھار ہے اس کا بہت خوب صورت بدلہ چکا سکتا ہوں اگر تم چاہو تو۔'' وہ اس کی سانسوں کی حدت محسوس کرسکتی تھی۔

گل کے وجود میں جانے کہاں سے طاقت بھر آئی تھی کہ اسے زور سے دھکا دیتی وہ اس کے چُنگل سے بھاگ نکلی تھی۔ دیوتا کا اصل چہرہ آشکار ہوچکا تھا اس کا اصلی چہرہ اتنا گھناؤنا اور مکروہ تھا کہ گل کو اپنی محبت پر بے حد شرم آئی...... وہ جسے بہت خاص مانتی تھی حقیقت میں کتنا کریہہ تھا کاش اسے خبر ہوجاتی۔ بارہ سال اس نے اس کے حسن سے محبت کرتے تیاگ دیے تھے وہ ظاہر سے متاثر ہوجانے والوں میں سے تو نہ تھی پھر وہ دھوکا کیوں کھا گئی۔ شاید وہ یہ بھول گئی تھی کہ انسان دیوتا جیسے اوصاف رکھنے کے باوجود بھی دیوتا نہیں بن جاتا...... وہ انسان تو کیا شیطان بن جاتا ہے۔

گل پھولی سانسوں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔ دو دن اس کی کیفیت عجیب رہی، پہلے وہ مرگِ محبت پر سوگ منارہی تھی مگر اب دو دنوں سے شکر ادا کررہی تھی۔ اگرچہ اسے ازسرِنو تکلیف کا شدت سے احساس ہوا تھا...... اس کی محبت کا دیوتا کتنا سطحی اور گھٹیا سوچ کا حامل شخص نکلا تھا مگر اس نے کبھی اس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہی نہیں تھی وہ تو بس ظاہر پر فدا ہوئی تھی اور اسی پر برسوں فدا رہی تھی اور اب اسی کا سوگ منارہی تھی ایک خیال برق کوندے کے مانند اس کے ذہن میں لپکا۔

''میں ظاہر سے متاثر نہیں ہوتا باطن کی گہرائی میں جھانکتا ہوں۔''

''عرفان......'' گل نے منہ ہی منہ میں اس سچے انسان کا نام دُہرایا جو گل پر جان چھڑکتا تھا اور جبھی اس کے لیے فیصلہ کرلیا۔ ہاں عرفان کی محبت کو قبول کرنے کا فیصلہ...... کیونکہ وہ شہزاد علی کو یہ باور کروانا چاہتی تھی کہ وہ ظاہر پر نہیں باطن سے محبت کرنے والی ہے...... اور وہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ خاص اور خالص لڑکی ہے اور ایسے ہی خالص باطن رکھنے والوں کو پسند کرتی ہے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر عرفان کا نمبر ملایا اس نے فون دوسری ہی بیل پر اٹھالیا تھا۔

''کتنی دیر لگے گی عرفان آپ کو آنے میں؟''

گل نے لہجے کو بشاش کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹا۔

''آدھا گھنٹا ہے خیریت......؟'' عرفان کو... بے حد حیرت ہوئی گل نے اسے کبھی کال نہیں کی تھی بلکہ وہ تو اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔

''ہاں بالکل خیریت ہے، آپ بڑے ابا اور ایمان کو پھوپی کے گھر سے لیتے آئیے گا، میں آپ کا انتظار کررہی ہوں......'' دھیمے سے لہجے میں کہتے اس نے عرفان کو ازحد حیران کیا تھا۔

''انتظار...... تم میرا انتظار کررہی ہو گل؟''

عرفان پر تو جیسے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی گل پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''ہاں...... اور میں آپ کا انتظار اسی طرح ہر روز آپ کے آفس سے واپس لوٹنے پر کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کے جملے میں جانے کیا تھا کہ عرفان مسرتوں میں ڈوب گیا۔ عرفان کا جواب سنے بغیر ہی اس نے فون بند کردیا تھا، دو آنسو موتیوں کی لڑیاں پروتے گل کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ یہ آنسو محبت نہ ملنے کے نہیں بلکہ اس کی خودساختہ محبت کے دیوتا سے چھٹکارا پانے کے تھے۔ یہ آنسو شکرِ الٰہی کے آنسو تھے، یہ آنسو ندامت کے تھے کہ اس نے بہت وقت یونہی کیوں گنوادیا تھا۔

☆☆☆



روزی کی تلاش

سیما یاسمین مجتبیٰ

میں اس وقت صدر (کراچی) کے ٹھاٹھیں مارتے انسانی سمندر سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص مجھ سے بری طرح ٹکرا گیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا...... اس کا حلیہ خاصا پریشان کن تھا۔ چہرے پر دکھ کے گہرے سائے، آنکھوں میں ویرانی، بال بکھرے ہوئے، میلی سی شرٹ کے کونے پینٹ سے باہر کو لٹکے ہوئے اور تمام وجود پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی جیسے اپنے اردگرد سے غافل ہو۔

اس ظاہری حلیے کے باوجود وہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والا بھی نظر آرہا تھا۔

''معاف کیجیے گا...... میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔'' میں نے اس کی پریشان صورت دیکھ کر معذرت کی۔ اس نے چونک کر گہری اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور خشک لبوں سے بولا۔

''غلطی میری تھی...... نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ آپ سے اس ... بری طرح ٹکرا گیا۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس کی شکل اب پوری طرح میرے سامنے تھی، وہ تقریباً پچیس، چھبیس سال کا نوجوان تھا جس کی گندمی رنگت اس کی اداسی نے گہنا دی تھی۔ اس کا جواب سن کر میں مسکرا دیا۔

''تم اتنے دبلے پتلے ہو اور میں اچھا خاصا ہٹا کٹا...... خیریت تو مجھے تمہاری پوچھنی چاہیے کہ میری ٹکر سے کوئی ڈینٹ وینٹ تو نہیں پڑا۔'' وہ بھی... بےاختیار مسکرا دیا۔ جیسے گہری سیاہ بدلی سے پل بھر کو دھوپ نکل آئی ہو۔

''تم مجھے کچھ 'اپنے' اپنے سے لگے ہو...... کیا وجہ ہے کیوں اس قدر پریشان نظر آرہے ہو...... چلو چل کر چائے پیتے ہیں اور تم مجھے اپنی پریشانی کی وجہ بھی بتانا...... شاید میں تمہارے کچھ کام آسکوں......'' میں بےساختہ کہہ اٹھا۔

''ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں...... پھر بھلا آپ میرے کام کیوں آنا چاہتے ہیں؟'' وہ ایک دم تلخ ہوگیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ مت! جانتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ اس قابل نہیں رہا کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان پر اعتماد کرسکے مگر یہ دیکھو! یہ میرا کارڈ ہے...... میں ایک معروف اخبار کا صحافی ہوں۔ لوگوں کی پریشانیوں سے دکھی ہوجاتا ہوں اور اگر اُن کی کوئی مدد کرسکوں تو ضرور کرتا ہوں...... بس اسی لیے تم سے بھی مخاطب ہوا۔'' وہ میرا پریس کارڈ ہاتھ میں پکڑے غور سے دیکھتا رہا۔

''سلیم خان، سینئر کرائم رپورٹر۔'' جتنی دیر وہ کارڈ کی طرف متوجہ رہا میں اسے بازو سے تھامے قریبی ٹی ہاؤس میں لے آیا اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے ویٹر کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بری طرح چونکا۔

''اوہ......! آپ مجھے ریسٹورنٹ میں لے بھی آئے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''چلو بیٹھو اور بتاؤ کیا کھانا پینا پسند کرو گے تاکہ تمہارا ذہن جاگے۔'' میں نے محظوظ نظروں سے اس کی بوکھلاہٹ پر کہا۔

''سلیم صاحب، واقعی میں کچھ زیادہ ہی الجھ گیا ہوں اور ہاں میرا نام شہزاد خان ہے۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

''شکر ہے ابھی تمہیں اپنا نام تو یاد ہے۔''

''درست فرمایا آپ نے اگر کچھ دیر اور یہ... بےحسی کا عالم رہتا تو شاید پاگل ہی ہوجاتا۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''اتنی مایوسی اور اس عمر میں...... خیریت تو ہے؟''

... میری بات پر اس نے گہری سانس کھینچی۔

''کیسی خیریت؟'' اپنے شہر کوہاٹ سے یہاں دو ماہ سے بھٹکتا پھر رہا ہوں صرف روزی کی تلاش میں......''

''ہاں یہ روزی یا روزگار جو بھی کہہ لو اس کے لیے لوگ نہ جانے کن کن گاؤں شہروں سے کراچی آتے ہیں، جوتیاں چٹخاتے ہیں پھر کہیں جا کر روزی حاصل ہوتی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''آپ نے درست کہا یہاں روزی تلاش کرنا آسان نہیں، مجھے تو اب تک اس کی جھلک بھی نظر نہیں آئی۔'' وہ جلتی بجھتی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

''پہلے اطمینان سے یہ کھاؤ پیو اور اللہ پر بھروسا رکھو، تمہیں روزی ضرور ملے گی۔'' میں نے سموسے اور

چائے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور وزیٹنگ کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے گھر کا پتا، فون نمبرز اس پر لکھے ہیں۔ مجھ سے رابطے میں رہنا شاید میں تمہارے لیے کچھ کرسکوں اور......'' کچھ سوچ کر میں چونکا۔ ''تم کس قسم کی نوکری چاہتے ہو؟''

''نوکری......!'' وہ بھی چونکا۔ میں ہنس دیا۔

''ہاں بھئی، تمہارا نوکری، روزگار کو روزی روٹی کے حوالے سے روزی کہنا مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ اپنی زبان میں بتادو کیا تعلیم ہے، کس قسم کی روزی تمہیں چاہیے؟''

''قسم کیسی وہ تو ایک ہی قسم کی ہے، بےمثال اور شاندار۔'' وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''بس، بس۔'' میں نے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔ ''اتنا اونچا مت اڑو اگر کوئی معمولی روزگار مطلب روزی بھی فوراً مل جائے تو ٹھکرانا نہیں۔ رزق میں برکت ہوتے دیر نہیں لگتی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے میں کمپیوٹر کی مختلف فیلڈز میں مہارت رکھتا ہوں جیسے گرافکس، ویب سائٹ میکنگ، ڈیزائننگ وغیرہ۔ اس لیے مجھے تو ایسی ہی شاندار روزی ہی چاہیے جو کبھی میرے پاس تھی۔'' اس نے پھر اداس سی گہری سانس بھری۔

''ہاں بھئی زندگی میں نوکری چھوٹنے کا غم کسی کی موت کے صدمے سے زیادہ ہوتا ہے۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی انسان بےبس ولاچار ہوجاتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

چائے پینے کے ساتھ ساتھ میں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی اور وہ بھی گرم جوشی سے حامی بھرنے لگا۔

☆☆☆

وہ جمعے کا دن تھا اور میں نمازِ جمعہ سے فارغ ہوکر مسجد سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

''سلیم بھائی، السلام علیکم۔'' میں چونک کر پلٹا۔

''اوہ شہزاد...... وعلیکم السلام۔'' وہ میرے گلے لگ گیا۔

''سوری، میں آپ کے گھر نہ آسکا وہ دراصل روزی......''

''معلوم ہے روزی روٹی کی تلاش وجستجو تمہارے ہوش اڑائے ہوئے ہے۔'' میں نے اس کی گرم جوشی پر اسے شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''ویسے آج ماشاء اللہ بہت بہتر نظر آرہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے تمہاری دوستی ہوگئی ہے۔''

''میں نے زندگی کو کبھی دشمن نہیں سمجھا پھر یہ میرے ساتھ کیوں دشمنی پر تلی ہوئی ہے۔ سمجھ نہیں پارہا۔'' وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بولا۔

''چلو آج تم میرے ساتھ ہی میرے گھر چلو پھر ہم تفصیل سے باتیں کریں گے۔'' وہ مان گیا اور ہم رسمی باتیں کرتے گھر تک پہنچ گئے۔

میں نے صحن میں تخت پوش پر بیٹھی سبزی کاٹتی اپنی بیگم سے اس کا تعارف کروایا اور کھانے پر کچھ اہتمام کرنے کا کہہ کر اسے بیٹھک میں لے آیا۔

''سلیم بھائی، کتنی نفاست اور سکون ہے اس کمرے میں۔'' وہ میری سادہ سی بیٹھک کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے توصیفی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''تمہارا حسنِ نظر ہے ورنہ سوائے سادگی اور ہماری بیگم کے سلیقے کے یہاں آج کل کے حساب سے کوئی لگژری نہیں۔'' میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ہنس پڑا۔

''کچھ نہ ہوکر بھی سب کچھ ہے یہاں، مجھے آپ کے گھر آکر بہت اچھا لگا۔''

''شکریہ۔''میں نے پردے کے پیچھے سے چائے اور گھر کے بنے رولز کی ٹرے بیگم سے لیتے ہوئے اس کے سامنے رکھ دی تو وہ چونکا۔

''ارے یہ تکلف کیوں...... آپ نے کھانے کا بھی......''

''بس... بس۔''میں نے اسے چپ کروادیا۔''یہ سب میں اپنے مطلب سے کر رہا ہوں تاکہ تم سے تمہاری روزی کی تلاش کی تفصیل جان سکوں اور جو کچھ تمہارے لیے میں نے دوچار دوستوں سے کہہ کر کیا ہے ان دفتروں کے نام پتے تمہیں دے دوں تاکہ تم وہاں بھی قسمت آزمالو شاید روزی مل ہی جائے۔''

''آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کر ڈالا۔''وہ پہلی بار بھرپور انداز میں ہنسا اور جیسے نکھری سے دھوپ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''تم تو ایسے ہنس رہے ہو جیسے میں پاگل ہوں اور کوئی حماقت کر بیٹھا ہوں۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''شاید میرے اچھے دن قریب ہیں کہ آپ جیسے مخلص دوست بلکہ بھائی میرے لیے اتنی فکر کر رہے ہیں۔'' پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔''سوری، میں نے ایسا کچھ غلط نہیں سوچا آپ جیسا کہہ رہے ہیں بلکہ آپ کے منہ سے روزی کا لفظ اور میرے لیے اتنی فکر پر نہ جانے کیوں دل بے حد خوش ہوگیا۔ اچھا لگا آپ کا خیال کرنا اور روزگار کو میرے لفظوں میں روزی کہنا۔''

''میرے خیال میں پریشان رہتے رہتے تم کچھ سنک گئے ہو۔ یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے؟''میں نے تشویش ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بچوں کی طرح معصومیت سے دیکھنے لگا۔

''معاف کروں گا مگر ایک شرط پر کہ اپنی روزی میرا مطلب ہے نوکری نہ ملنے کی وجہ سے اتنے پریشان کیوں ہو؟ سب تفصیل بتاؤ مجھے۔ کیا گھر میں زیادہ پریشانی ہے پھر تمہاری تعلیم بھی اچھی ہے۔ کوہاٹ میں بھی تمہیں اچھی خاصی سروس مل سکتی تھی اور کراچی...... گھر سے اتنی دور کیوں رُلنے چلے آئے؟''میں نے اسی طرح مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

''سب قسمت کا کھیل ہے مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ کبھی اس طرح رُلتا پھروں گا روزی مطلب روزگار کے لیے۔''وہ گہری سانس لیتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہنے لگا۔

''اچھا اب اتنی سنجیدگی کی ضرورت نہیں، یہ بتاؤ کراچی کیوں آئے، گھر والے زیادہ پریشان ہیں کیا؟ تم تو ایسے شکستہ نظر آتے ہو جیسے یہ دنیا کا آخری سرا ہو اور تمہارے پاس واپسی کا راستہ نہ ہو؟'' اس کی اس حد درجہ سنجیدگی پر میں نے پھر مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

''سلیم بھائی، کسی نے سچ کہا ہے کہ اوپر سے گرنے میں چوٹ زیادہ لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔''وہ اداس مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

''مجھے روزی کوہاٹ میں اس وقت ملی جب میں یونیورسٹی میں اپنے فائنل میں تھا۔ زندگی کو خوشگوار انداز میں گزارنے کی سب سہولیات مجھے حاصل تھیں۔ میں زندگی سے بہت خوش تھا۔ دوست احباب میری قسمت پر رشک کرتے تھے۔ میں بھی بہت مطمئن تھا۔ تب میری صحت بھی بہت اچھی تھی اور میں اپنی روزی سے بہت خوش اور زمانہ بھولا ہوا تھا۔''

''تمہیں نظر لگ گئی شاید خود اپنی۔''میں.... بے ساختہ کہہ اٹھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''سب کچھ ہی بہت اچھا تھا۔ میں مزید ترقی کے لیے بے حد محنت کر رہا تھا اور جب میرے پروموشن کا وقت آیا تو اچانک ہی ایک قریبی عزیز نے ایسا چکر چلایا کہ روزی مجھ سے چھوٹ گئی، سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ میں سنبھل نہیں

پا رہا تھا کئی جگہ جاب ڈھونڈی۔'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔''یوں سمجھ لیں کہ ایک دم زمین پر آگرا تھا۔ روزی کی بہت تلاش کی مگر شاید گردشِ دوراں کے حصار میں آگیا تھا...... نہیں ملی، ڈگری ہاتھ میں تھی، گولڈ میڈل سینے پر سجا مگر میں تہی دامن ہو چکا تھا۔ وہ خوب صورت خواب...... زندگی کا پہلا خواب اپنا من پسند ایسا ٹوٹا کہ کرچیاں مجھے لہولہان کر گئیں۔''

''تم نوجوانوں کے ساتھ یہی پرابلم ہے۔ اس قدر جذباتی ہوتے ہو کہ ذرا سی ٹھیس پہنچی اور کسی شیشے کے آبگینے کی طرح بکھر گئے۔ ارے بھئی، یہی زندگی ہے اتار چڑھاؤ لیکن...... اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہو۔''میں نے اسے پھر اداسی کے بھنور میں ڈوبتے دیکھا تو بول اٹھا۔

''آپ نے ٹھیک کہا، مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے لیکن پہلی پہلی چوٹ شاید اسی طرح توڑ دیتی ہے۔ بہرحال اب میں کافی نارمل ہوں۔'' وہ بھی خود کو سنبھال چکا تھا۔

''شکر ہے اللہ کا۔''میں نے ذومعنی جملہ کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''سچ کہہ رہا ہوں جبھی آپ مجھے کراچی میں دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دوستوں نے کہا تھا کہ یہاں روزی ملنا آسان ہے تو تلاش مجھے یہاں لے آئی۔''

''ہاں سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے، ضرور کامیاب ہوگے۔''میں نے جلدی سے کہا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا اور مزید گفتگو سے پہلے بیگم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی اور ہم دونوں کھانے کے کمرے میں آگئے جہاں بیگم کے ہاتھ کے بنے پکوان دسترخوان پر سجے خوشبو دے رہے تھے۔

''بھائی، آپ نے خود یہ ڈشز بنائی ہیں؟'' وہ خوشدلی سے بیگم سے مخاطب ہوا۔

''ہاں بیٹا، اتنے عرصے بعد مجھے اپنے بیٹے

جیسا کوئی مہمان خاطر کرنے کے لیے ملا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''آپ کا بیٹا کہاں ہے؟'' شہزاد میری طرف پلٹا۔

''ہم سے الگ رہتا ہے، اس کی بیوی کو ہمارا رہن سہن کم حیثیت لگتا ہے، وہ اچھی جاب میں ہے۔'' میں نے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ۔'' شہزاد کے چہرے پر ناگواری کے سائے پھیل گئے۔ ''کس کی کیا حیثیت ہے یہ تو اللہ کے پاس جا کر ہی معلوم ہوگا۔'' بیگم نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح پُرخلوص لہجے میں بولا۔

''مجھے تو آپ دونوں کے خلوص سے محسوس ہوتا ہے کہ ایسے امیر لوگ نایاب ہیں۔'' بیگم نے اسے نم آنکھوں سے بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ اس کی خواہش پر بیگم بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئیں۔ وہ دل کھول کر بیگم کے ہاتھ کی پکی سبزی، دال کی تعریف کر رہا تھا اور وہ بہت عرصے بعد خوشی سے چمکتے چہرے سے اس کی پلیٹ میں بار بار کھانا ڈال رہی تھیں۔ ہم نے خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت عرصے بعد اپنے گھر کے کھانے کی لذت محسوس کی ہے، کچھ زیادہ ہی کھالیا۔''

''دو منٹ ٹھہرو، سبز چائے پیتے جاؤ۔ کھانا ہضم ہوجائے گا۔'' بیگم نے جلدی سے کہا۔ وہ فوراً مان گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا شکریہ آج عرصے بعد میری بیگم دل سے خوش نظر آرہی ہیں ورنہ تو بیٹے کے جانے کے بعد بجھ کر رہ گئی تھیں۔'' میں نے رکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری تلاش میں مخل نہ ہو رہے ہوں... ہم دونوں میاں بیوی تو جب تک یہاں ہو آتے رہنا۔''

''کیوں نہیں...... یہ تو میرے بھائی، بھابی کا گھر ہے ضرور آتا رہوں گا۔'' وہ بھرپور محبت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''کل میں کوفتے اپنی خاص ریسپی سے بناؤں گی ضرور آنا بیٹا۔ رات کو ہم تینوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔'' بیگم سبز چائے لے آئی تھیں اور اس کا جواب سن کر وہیں میرے برابر بیٹھ گئیں اور اسے مخاطب کر کے بولیں۔

''ضرور آؤں گا بس دعا کیجیے گا کہ کل میرا وہ مقصد پورا ہوجائے جس کے لیے یہاں آیا ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

بیگم نے اسے دل کی گہرائیوں سے دعا دی اور وہ خوشی، خوشی ہم سے جدا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آج خاصا پُرسکون اور خوش تھا۔

☆☆☆

''بیگم دعا کیجیے اس کی دلی مراد پوری ہوجائے۔ کیا پتا کہاں کہاں سرگرداں پھر رہا ہوگا شاید آنہ سکے۔'' اگلی شام مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ آئے گا اس لیے بیگم کی بار بار دروازے کی طرف اٹھتی نگاہوں کو دیکھ کر بولا۔

''السلام علیکم!'' کھلے دروازے میں وہ ہاتھوں میں کچھ پیکٹ پکڑے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا۔

''آؤ بھئی، بڑی عمر ہے تمہاری...... تمہی کو یاد کر رہے تھے ہم دونوں۔'' میں آگے بڑھا۔

''بھابی یہ کچھ گرم گرم جلیبیاں اور برفی ہے۔'' وہ بیگم کی طرف پیکٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ارے مجھ سے کہتے ان سے منگوالیتی۔ ابھی نوکری نہیں ملی اور فضول خرچی شروع کردی۔'' بیگم نے اسے ڈانٹا۔

''یہ رزق ہے فضول خرچی نہیں بس میرا دل چاہا تو لے آیا۔ اپنے گھر کے لیے ہمیشہ انسان کچھ رکھتا ہے اگر آپ لوگ مجھے اپنا سمجھتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو میں اور بیگم بھی مسکرا کر رہ گئے۔

''آج دل اس موگرے، چنبیلی سے مہکتے صحن میں بیٹھنے کو چاہ رہا ہے۔ بہت تازگی اور خوشگوار مہک ہے یہاں۔'' وہ صحن میں پڑی بید کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ جو تم چنبیلی، موگرے اور وہ رات کی رانی اور گلاب کے کھلے پھول پودے دیکھ رہے ہو یہ سب بھی بیگم کا شوق ہے۔'' میں نے دیوار کے ساتھ بنی کیاری کی طرف اشارہ کیا۔

''واقعی بھابی نے اس گھر کو جنت کا ٹکڑا بنادیا ہے۔ مجھے روزی مل جائے تو......'' وہ خوش دلی سے بولتے بولتے رکا۔

''تمہاری محبت ہے بیٹا تمہیں اچھا سا روزگار مل جائے تو خوب صورت سے لان کا گھر لینا۔ میں اس میں تمہارے لیے بہت پیارے پیارے پودے لگادوں گی۔'' بیگم چائے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

''اس کے لیے یا تو مجھے کراچی میں رہنا ہوگا یا آپ دونوں کو کوہاٹ لے جانا پڑے گا اپنے ساتھ۔'' وہ پُرخلوص نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ بیگم مسکراتی ہوئی کچن سے اٹھتی خوشبو محسوس کرتے ہوئے اُدھر پلٹیں اور وہ میرے قریب جھکتے ہوئے بولا۔

''سلیم بھائی، مجھے ایک دوست نے ایک جگہ کا پتا دیا ہے جہاں کل مجھے روزی ملنے کی قوی امید ہے۔ بس دعا کریں کہ......''

''جبھی اتنے خوش ہو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے...... کیا کوئی جان پہچان نکل آئی ہے؟'' میں مسکرایا۔

''میری تو نہیں ہے لیکن میرے دوست کی ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

اس رات ہم تینوں نے بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا پھر اس کا لایا ہوا میٹھا بھی سبز چائے کے ساتھ نوش جاں کیا۔ وہ اپنے گھر والوں اور کوہاٹ کے بارے میں ہمیں بہت خوب صورت باتیں بتاتا رہا۔ اس کی گفتگو نے ہمارے مرجھائے دلوں کے بوجھ کو ہلکا کردیا پھر اچانک ہی میرا بیٹا ساجد آگیا اور شہزاد کو ہم سب کی محبتوں میں گھرا دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

وہ اپنی ماں کے گلے مل کر سسک اٹھا۔ مجھ سے بھی بار بار معافیاں مانگتا رہا۔ تب ہی شہزاد نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور وہ تیزی سے شہزاد کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

''تھینک یو دوست۔ تم میرے لیے نجات دہندہ بن کر آئے۔ آج میں نے دیکھا بابا اور امی جان کے ساتھ تم کتنے خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ واقعی میں اپنی جنت سے اپنی بدقسمتی سے نکل گیا تھا اور جب اپنے نشیمن کو آندھیوں کی زد پر دیکھا اور تم ملے اور آج میں تمہارے کہنے پر یہاں آیا تو احساس ہوا کہ کتنے گھنے شجر سایہ دار سے نکل کر میں دھوپ کی تیزی میں اپنی مَن مانی سے جھلس رہا تھا۔ واقعی والدین جیسی نعمت کا نعم البدل نہیں۔''

''تم ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہو؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟'' میں نے ان دونوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''بس جس دن بھابی کے ہاتھ کا نمک کھایا تو حقِ نمک ادا کرنے ساجد کے پاس پہنچ گیا۔'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''ان کا ایڈریس آپ کے ایک پڑوسی سے حاصل کیا جو ان سے دعا سلام رکھتے ہیں اور پھر ان سے ملا۔ ہماری باتیں ہوئیں ان کی اپنے گھر میں بیوی سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ تب انہیں احساس ہوا کہ والدین کتنی بڑی نعمت ہوتے ہیں کہ اولاد کی ہر بلا اپنے سر لے لیتے ہیں۔ قصہ مختصر میں نے آپ دونوں سے ملاقات کی تفصیل نہیں بتائی۔ بہت باتیں ہوئیں ہمارے درمیان اور آج میرے ہی کہنے پر یہ باہر سے ہی اپنی جنت کا نظارہ کر رہے

''تھے اور پھر اس میں داخل ہو گئے۔''

''امی بس آپ بہت اکیلی رہ لیں، آپ اور بابا میرے ساتھ چل کر رہیں گے ورنہ پھر یہ شہزاد آپ دونوں کو کوہاٹ لے جائے گا۔'' ساجد نے.... بے حد لاڈ سے اپنی ماں سے کہا۔

''بیٹا تمام عمر اسی گھر، آنگن کی خوشبو کے حصار میں گزری ہے اب کسی اور جگہ دل نہیں لگے گا۔ تم اپنے گھر میں خوش رہو جب چاہو بہو اور بچوں کے ساتھ ملنے آجایا کرو۔'' بیگم مسکرادیں اور میں نے پیار سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تو کچھ دنوں کے لیے کل سے یہاں رہنے آرہا ہوں۔ وانیہ کا جو دل چاہے کرے۔'' میری بات پر وہ منہ بنا کر بولا۔ شہزاد مسکرادیا۔

''دوست کل سے کیا آج سے ہی وانیہ بھائی یہاں رہنے آرہی ہیں۔ میری ان سے بھی تفصیلی بات ہوچکی ہے۔ تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔'' ہم سب ہنسنے لگے۔

''یہاں بھی وہ تیز نکلی۔'' ساجد نے سر ہلایا۔ ماحول کو خوشگوار مہک کے ساتھ چھوڑ کر شہزاد چائے پی کر اپنے دوست سے ملنے اور ہم سے دعا میں یاد رکھنے کی تلقین کر کے چلا گیا۔

''رحمت کا فرشتہ تھا ہمیں خوشیاں دے کر چلا گیا۔ اللہ اس کی دلی مراد بھی اسی طرح پوری کردے۔'' بیگم نے اسے پیار سے جاتے دیکھتے ہوئے کہا پھر ساجد کی طرف دیکھنے لگیں۔

''فکر نہ کریں امی، آپ کی دعا اُسے ضرور کامیاب کرے گی۔'' ساجد مسکرایا۔

پھر ہم لوگ ساجد... وانیہ اور بچوں کی آمد، ہمارے ساتھ رہنے اور ہمارے ان کے ہاں آنے جانے میں ایسے مگن ہوئے کہ دنیا کو بھول گئے۔ شہزاد سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا کوئی فون آیا۔ میں جب فون کرتا تو اس کا فون بند ملتا۔ کچھ دن تک میں بھی اپنے گھر کی خوشیوں میں گھر کر کچھ اور نہ سوچ پایا۔

☆☆☆

وہ تیز سردیوں کی شام تھی اور ہم سب مع ساجد، وانیہ اور ان کے دونوں بچوں کے کمرے میں لحاف میں بیٹھے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے اور مزے دار باتوں میں مشغول تھے کہ اتنے میں گیٹ کی گھنٹی بجی۔

''کون آگیا؟ میں دیکھتا ہوں۔'' ساجد نے ماں کی گود سے سر اٹھایا۔ وہ مزے سے ان کے ہاتھ سے مونگ پھلیاں کھا رہا تھا اور بیوی سے کہتے ہوئے میری جانب دیکھ رہا تھا، میں مسکرادیا۔

''تم پڑے رہو میں جاکر دیکھتا ہوں۔'' میں نے دروازہ کھولا تو مغرب کے جھٹ پٹے کے باوجود سامنے شہزاد کا ہشاش بشاش چہرہ کھلی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ نظر آیا۔

''ارے شہزاد ہے۔'' میں خوشی سے چلّایا۔ پلک جھپکتے میں بیگم، ساجد اور باقی سب دروازے پر شہزاد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ ہزار ہا سوال کررہے تھے۔

''کہاں تھے، ہمیں بھول گئے، معلوم ہوتا ہے روزی شاندار ملی ہے۔ چہرہ حلیہ بتارہا ہے۔'' وہ سب کی خوشیوں بھری پزیرائی سے بے حد متاثر نظر آرہا تھا۔

''شہزاد میاں یہ تمہارے پیچھے کون کھڑا ہے؟'' اتنی دیر میں بیگم نے اِدھر اُدھر جھٹ پٹے کی سرمئی نارنجی مائل مدھم ہوتی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ سامنے اور اس کہانی کا ڈراپ سین کرو۔'' شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ تب ہی ایک گلابی سی نازک حسین لڑکی آسمانی شلوار سوٹ اور میچنگ لانگ سوئٹر میں ملبوس ہمارے سامنے آتے ہوئے اپنی روشن آنکھیں نیچے کیے ہوئے مدھر لہجے میں بولی۔

''السلام علیکم، میں روزی ہوں۔''

''کیا......؟'' ہم سب یوں اچھلے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

''سلیم بھائی اور بھابی یہی وہ روزی ہے جس کی تلاش مجھے اپنے گھر، شہر سے دور یہاں کی خاک چھاننے کے لیے لے آئی......'' شہزاد خوشی سے روشن آنکھوں سے بولا۔

''مگر تم تو روزگار یعنی نوکری کو روزی کہتے ہو کیونکہ اردو تمہاری مادری زبان نہیں اور تمہارے منہ سے ہم سب کو روزی، نوکری کو کہنا اتنا اچھا لگا کہ روزی سب کی زبان پر چڑھ گیا اور اب یہ......''

''شہزاد بیٹا تم ذہنی طور پر ٹینشن میں تو نہیں ہوناں؟'' بیگم نے پہلے سب کو اندر آکر سکون سے بیٹھنے کو کہا اور کمرے میں ہی وانیہ کی مدد سے سب کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولیں۔ سب ہی اس سوال پر ہنسنے لگے۔ تب شہزاد نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''روزی اور میں کالج لائف سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی ساتھ پڑھے اور جب شادی کے لیے ہماری بات فائنل ہونے کا وقت آیا تو......''

''تو انہوں نے بہت بڑی حماقت کی کہ رشتہ اپنی مما کے ذریعے بھیجنے کے بجائے اس شخص کے ہاتھ بھیجا جو ہم دونوں سے جلتا تھا مگر یہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس کے اتنے دوست تھے کہ میری بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور اس شخص نے میری بیوہ ماں کے کان ان کے خلاف بھرے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ ہم الگ مذہب کے ہیں اس لیے ان کی مما شدید ناراض ہیں اور کبھی رشتہ نہیں لائیں گی بلکہ اپنی برادری میں شادی کررہی ہیں۔'' روزی نے یہاں سے کہانی کا سرا پکڑا۔ ہم سب سکتے میں رہ گئے۔ وانیہ نے روزی کو پانی پلایا اور بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر حوصلہ دیا۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

''بس، پھر میری مما نے اپنے کالج کی ٹیچنگ کی

تعلیمات ختمی مرتبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ظلم اور بخل کی تباہ کاریاں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہوگا اور بخل سے بچو، کیونکہ بخل نے ان لوگوں کو ہلاک کردیا جو تم سے پہلے تھے، اس نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا اور حرام چیزوں کو حلال سمجھا۔'' (صحیح مسلم)

انفاق اور بخل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے اترتے ہیں تو ان میں سے ایک کہتا ہے کہ خدایا، خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے کہ خدایا بخیل کا مال ضائع کردے۔'' (صحیح بخاری)

قرآن اور علم دین سیکھنے کی فضیلت

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''اے ابوذر اگر تو صبح جاکر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو یہ نوافل کی رکعت پڑھنے سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول ہو یا نہ ہو، یہ ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔'' (ابن ماجہ)

دن کے آغاز میں سورۂ یٰسین کی تلاوت

حضرت عطا بن رباحؒ کہتے ہیں کہ مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہنچا ہے کہ جو شخص سورۂ یٰسین کو شروع دن میں پڑھے گا تو اس کی تمام دن کی ضروریات پوری ہوجائیں گی۔ (دارمی)

بدترین چوری

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ ''بدترین چوری کرنے والا وہ شخص ہے جو نماز میں سے بھی چوری کرلے۔'' صحابہ نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے چوری کس طرح کرے گا؟'' ارشاد فرمایا: ''اس کا رکوع اور سجدہ اچھی طرح سے نہ کرے۔''

انتخاب: فاطمہ بلال، کینیڈا

جاب چھوڑ دی اور مجھے خاموشی سے کراچی اپنے بڑے بھائی، میرے ماموں کے پاس لے آئیں۔'' روزی رکتے ہوئے بولی۔ ''میری ممانی مسلمان ہیں۔ ماموں نے بھی دینِ اسلام اسٹڈی کرکے اپنالیا تھا تو مما ان سے دور ہوگئی تھیں مگر وقت کے اتار چڑھاؤ نے ان کی سوچ کو یکسر بدل دیا اور وہ ماموں کے پاس مجھے لے کر آگئیں۔'' روزی نے مدھم مسکراہٹ سے کہا۔

''پھر ماموں، ممانی کی پاکیزہ، خوشگوار زندگی، خیالات، انسانیت سے مزین جذبوں نے مما کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے قرآنی تعلیمات سیکھنا اور سمجھنا شروع کردیں اور پھر ان کو بھی اسلام میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔''

''سبحان اللہ!'' ہم سب نے بے ساختہ کہا۔

شہزاد نے روزی کی طرف دیکھا۔

''تم نے تو مجھے یہ سب بتایا نہیں۔'' روزی مسکرائی۔

''ابھی ہمیں دیر کتنی ہوئی تھی پھر تم فیوچر میں کیا کرنا چاہیے کے فیصلے پر پہنچنے سے پہلے یہاں آنا چاہتے تھے۔''

'' اور بیٹا تمہارا کیا معاملہ ہے؟'' جبھی میری بیگم بول اٹھیں۔

''میں تو پہلے مسلمان ہوچکی تھی۔ جب پہلی بار کالج میں تقریبِ میلاد کی محفلیں اٹینڈ کیں اور درسِ قرآن حاصل کیا اب فاطمہ میرا نام ہے مگر یہ شہزاد روزی ہی کہتے ہیں مجھے کیونکہ......'' روزی پُرسوز مسکراہٹ سے بولی۔

''تم ہو بھی تو گلاب کی روزی سی کلی۔'' وانیہ مسکرائی اور اس کو سراہتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ہم سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور سب شہزاد کی طرف متوجہ ہوئے۔

''اب تم بتاؤ کب اور کیسے اپنے والدین اور روزی کی فیملی کو آپس میں قریب لاؤ گے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔''

''یہ کیا بتائیں گے۔ یہ جو گردشِ زمانہ کی سزا انہوں نے پائی ہے اس میں ان کے ڈیڈی اور بعد میں مما بھی شامل ہوگئیں اور ان دونوں کا پلان تھا کیونکہ یہ اپنے دوستوں پر بہت یقین رکھتے تھے بنا دیکھے پرکھے۔'' روزی جلدی سے بولی۔

''ذرا تفصیل بتاؤ۔'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا روزی مسکرائی۔

''جب میری مما بہت غصے میں تھیں تو میں نے شہزاد کے فادر کو خاموشی سے فون پر سب تفصیل بتادی۔ وہ لوگ مجھ سے کئی بار مل چکے تھے اس لیے ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ خیر میری فون کال کے دو دن بعد وہ دونوں ہمارے گھر آئے اور میری مما سے معافی مانگی اس تکلیف کے لیے جو اُن کے بیٹے کی وجہ سے ان کو پہنچی۔ مما کا غصہ بھی حقیقت جان کر اور انکل، آنٹی کے پیار بھرے رویّے پر صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا مگر شہزاد کے ڈیڈی کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ شہزاد کو اندھے اعتماد کی دنیا سے نکالنا پڑے گا ورنہ اور پتا نہیں کیا، کیا پرابلم اٹھانا پڑتی۔ اس لیے سب سے پہلے ان دونوں نے میری ممی کو باقاعدہ میرا پروپوزل دیا جو ظاہر ہے میری خوشی کی خاطر فوراً قبول کرلیا گیا۔ شہزاد کی ممی نے اپنی خوب صورت رِنگ میری انگلی میں ڈالتے ہوئے مجھے اپنی بہو کے طور پر قبول کرلیا۔ کیک، منہ دکھائی، ہم نے سب مزے لوٹے۔''

''ایک ایک بدلہ گن، گن کے تم سے لوں گا، شادی ہوجانے دو۔'' شہزاد نے سرگوشی میں کہا۔

''ہوں......ہم نے سن لیا بے شرم۔'' ساجد نے شرارت سے کہا اور شہزاد سرخ چہرے کے ساتھ جھینپ کر ہنس دیا۔ روزی نے بیگم کی بنائی گلابی چائے پیتے ہوئے کہا۔

''اور پھر ڈیڈی کے پلان کے مطابق ممی مجھے لے کر میرے ماموں کے پاس کراچی آگئیں اور پھر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ شہزاد صاحب نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ ان کے ایک دوست ڈیڈی کو ان کے لمحے، لمحے کی خبر دیتے تھے...... اور مما ہمیں بتاتی رہتی تھیں اور جب پتا چلا کہ کس طرح شہزاد اس گھر میں خلوص سے اپنی جگہ بنا پائے اور صدقِ دل سے مجھے تلاش کرتے کرتے بے حال ہوچکے ہیں تو میری مما کو محسوس ہوا کہ سب مل کر ان کو کچھ زیادہ ہی سزا دے رہے ہیں اور ہمارا دینِ اسلام تو ویسے بھی ایثار و درگزر کا سبق دیتا ہے۔ میری مما نے ان کے والدین کو کال کرکے ڈراپ سین کی خواہش ظاہر کی۔ ان کی مما بھی کافی پریشان تھیں ان کی حالت سن کر پھر ان کی اسی مشترکہ دوست کے ذریعے ڈراپ سین ہوا۔ ممی، ڈیڈی وہاں پہنچ گئے اور خود سامنے آئے بغیر مجھے اور مما کو بھی وہاں بلالیا پھر ان کو آنا تھا اور جب یہ آئے تو مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے پھر ڈیڈی، مما کو اپنے ہاں دیکھ کر چونکے اور میری مما کو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچے پھر ڈیڈی نے ان کی خوب کھنچائی کی۔ مما سے انہوں نے معافی مانگی تو انہوں نے اپنے ہونے والے داماد کی حیثیت سے پیار سے معاف کردیا اور پھر ہم سب میرے ماموں کے گھر ڈنر پر جمع ہوئے جہاں مما اور ڈیڈی نے مجھے اپنی بہو پہلے ہی مان لینے کا انکشاف کیا اور پھر وہ لوگ واپس کوہاٹ روانہ ہوگئے کیونکہ ڈیڈی اپنا بزنس اتنے عرصے تک نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہم دونوں واپسی سے پہلے سلیم بھائی، بھابی آپ لوگوں سے ملنے آگئے۔''

''تم دونوں دو دن بعد جاؤ گے شہزاد میاں کیونکہ میں بھی تو اپنی روزی بہو کے ساتھ کچھ ارمان پورے کرنا چاہوں گی۔'' میں نے بیگم کی طرف دیکھا وہ روزی اور شہزاد کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ساجد اور وانیہ نے بھی زور دیا اور شہزاد اور روزی ہمارے پاس ٹھہر گئے۔

ان دو دنوں میں میری بیگم نے وانیہ کے ساتھ مل کر ساجد کی مدد سے شہزاد کے لیے قیمتی شیروانی کا برائیڈل سوٹ لیا اور روزی کے لیے بھی بہت حسین برائیڈل سوٹ اور جیولری کا خوب صورت سیٹ لیا پھر ان کی واپسی کی شام سے پہلے ان کو رات کے کھانے پر ان کے گفٹس دیے۔ وہ دونوں بے حد حیران رہ گئے۔

''ویسے مجھے تمہاری روزی اور روزگار کی تھیوری ہمیشہ محظوظ کرتی رہے گی۔'' میں نے شہزاد سے کہا۔

''سلیم بھائی، ایمان داری سے سوچیں شاندار روزگار اور لڑکی آسانی سے نہیں ملتے۔ تو میں غلط کب تھا۔'' شہزاد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دونوں کا قہقہہ گونجا سب نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

''یہ بھی میں تمہیں شادی کے بعد سمجھاؤں گا کہ میں یہاں روزگار کے لیے پریشان تھا۔'' شہزاد نے شرارت سے روزی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا میرے لیے نہیں پھر اتنا بڑا ڈراما کیوں کیا سب کے سامنے۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''دیکھا ہم بھی اپنے ترکش میں کچھ تیر رکھتے ہیں۔'' شہزاد نے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا روزی سوچ میں پڑ گئی۔

''ارے بیٹی، جب میں شہزاد سے ملا تو سمجھا کہ یہ نوکری کی تلاش میں یہاں آیا ہے اور پہلے یہ اپنا راز، راز ہی رکھنا چاہتے تھے یوں روزی، روزی کرکے جاب کی بات کرتے تو بھئی میں ان سے یہی کہہ رہا ہوں کہ اچھی روزی اور روزگار دونوں ہی گردشِ دوراں کے بعد ملتے ہیں۔'' میں جلدی سے بولا۔ سب محظوظ ہوکر ہنس پڑے اور روزی کے چہرے پر بھی بڑی شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی جس پر شہزاد کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 11

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی او ربدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہر زاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربان خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کر لیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پاسکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ بینش سوچتی ہے کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اتنی پریشان ہو رہی تھیں۔ فہد، ڈاکٹر نادیہ سے، اسپتال میں ملتا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے جاتی ہیں، نگین اپنی ساس کے ساتھ لڑکی دیکھنے جاتی ہے تو اسے بینش بہت پسند آتی ہے، نگین اس کے پاس میرال صلاح الدین کا ایک ہینڈ آؤٹ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے ساری معلومات لے کر آکر حمزہ کو بتاتی ہے۔ زرنگار، مہر زاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہر زاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ثمرین، دانیال سے کہتی ہے کہ بینش اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ زرنگار، مہر زاد کو میسج کرتی ہے کیونکہ وہ تقریباً پندرہ دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ بینش، مہر زاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ اس نے نادر سے غلط بیانی کی تھی کہ وہ زلزلہ زدگان کے مددگاروں میں شامل نہیں تھی۔ وہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہر زاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کر سکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ امراؤ بیگم چھوٹے صاحب کے ساتھ زرنگار کو بھیجنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہر زاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ فہد اس کی بات سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، نگین کو فون کرتی ہے تو نگین بتاتی ہے کہ اس کا بھائی حمزہ کب سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ بینش اسے ایک نمبر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ فوراً اس پر رابطہ کرے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست جی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

اب آگے پڑھیں

زوئی نے غیر ارادی طور پر نادر کی طرف دیکھا۔ ''یہ وہی ہے، وہی۔'' اس کے منہ سے الفاظ سرسراتے ہوئے نکلے۔

''کون وہی؟'' نادر نے بھی چونک کر اس... طرف دیکھا جدھر زوئی دیکھ رہی تھی۔

''وہ جو اندر گئی ہے ابھی۔'' زوئی نے تیز قدموں سے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ نادر اس کے پیچھے دوڑتے قدموں سے چل رہا تھا۔ اگرچہ اسے زوئی کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کی بات میں کچھ خاص ضرور تھا۔

ڈیپارچر لاؤنج میں گہما گہمی، شور اور روشنیاں تھیں۔ زوئی کی متلاشی نظریں آتے جاتے، گھومتے پھرتے لوگوں میں گھومتی کسی ایک چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ دبئی جانے والی فلائٹ کے بارے میں اناؤنسمنٹ جاری تھی اور لوگ باگ اپنا سامان ہاتھ میں اٹھائے کچھ ٹرالیز پر لوڈ کروائے تیزی سے اندر جا رہے تھے مگر وہاں اسے وہ چہرہ کہیں نظر آیا تھا جس کے پل کی پل کو نظر آنے نے اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار تیز کر دی تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون شر شر کرتا جیسے اس کے چہرے میں سمٹ کر اسے تمتمانے لگا تھا۔

''کون نظر آ گیا تمہیں؟'' اس کے عقب میں کھڑے نادر نے پوچھا۔

''وہی......'' زوئی نے اپنے گالوں کی حدت کو ہاتھوں سے دبا کر کم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہی کون؟'' نادر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زوئی کی حالت اس کے لیے ناقابلِ فہم ثابت ہو رہی تھی۔

''وہی لڑکی میرال۔'' زوئی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی جو لینڈ کروزر سیدھی ائرپورٹ بلڈنگ کے اندر تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلی گئی تھی اسی میں سے میرال باہر نکلی تھی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے بھلا، وہ گاڑی تو وی آئی پی موومنٹ پر تھی۔ اسی لیے تو اسے کہیں روکا نہیں گیا۔ میں اسے پچھلے کئی سگنلز سے دیکھ رہا تھا۔'' نادر نے کہا۔

''وی آئی پی موومنٹ؟'' زوئی نے بے یقینی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ''میرال اور وی آئی پی موومنٹ......؟'' وہ حیرت زدہ تھی۔

''جس گاڑی کا ذکر تم کر رہی ہو وہ تو بہرحال کسی وی آئی پی کی گاڑی تھی۔'' نادر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے علم نہیں کہ اس میں وہ لڑکی بیٹھی تھی یا کوئی اور اہم شخصیت۔''

''حیرت ہے۔'' زوئی نے سر جھٹکا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرال کسی ایسی گاڑی سے نکل سکتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے تمہاری نظر دھوکا کھا گئی ہو اور وہ میرال نہ ہو۔'' نادر نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔'' زوئی نے اوپری دل سے کہا جبکہ وہ جانتی تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ اس کی نظر نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔

''چلیں...... پھر کہیں تمہاری دوست انتظار کر کے چلی نہ جائے۔'' نادر نے کہا اور ڈیپارچر لاؤنج سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

''چہرہ ڈھانپ لو بی بی۔'' زوئی، نادر کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی والی تھی جب اس کے کان میں کسی کے سرگوشی میں کہے الفاظ پڑے۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔ دو مردوں کے درمیان

ایک لڑکی چہرے پر دوپٹے سے نقاب کیے ڈیپارچر لاؤنج سے باہر جانے والے راستے پر چل رہی تھی۔

''یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔'' زوئی کے دل نے چلّا کر کہا۔ وہ کپڑوں کے اس رنگ کو خوب پہچانتی تھی جو لینڈ کروزر سے باہر نکلنے والی لڑکی نے پہن رکھے تھے۔

''میرال۔'' زوئی نے بے اختیار بلند آواز میں کہا۔ تیز قدموں سے ڈیپارچر لاؤنج سے باہر جاتی لڑکی کے قدم دو سیکنڈز کے لیے رکے اور نقاب سے اوپر ان آنکھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا یقیناً وہ آواز لگانے والی کی سمت کا اندازہ کر رہی تھی۔

''میرال۔'' زوئی ایک بار پھر چلّائی لیکن اس بار اس کے اور لڑکی کے درمیان دو قوی ہیکل امریکی حائل ہو گئے اور جیسے ہی وہ دونوں درمیان سے ہٹے میرال لاؤنج سے باہر جا چکی تھی۔ زوئی نے اپنے شانے سے لٹکتے پاؤچ پر ہاتھ رکھا اور تیز قدموں سے چلتی اس لاؤنج سے باہر نکلی۔ نادر باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''سنگاپور سے آنے والی فلائٹ کب کی آچکی زوئی۔'' نادر کہہ رہا تھا اسی دم نہ جانے کس سمت سے وہی لینڈ کروزر نکل کر ان دونوں کے قریب سے گزر گئی۔

''اس فلائٹ کو چھوڑو نادر، فوراً باہر نکل کر ٹیکسی پکڑو۔ ہمیں اس لینڈ کروزر کے پیچھے جانا ہے۔'' زوئی نے نادر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہاری دوست......'' الفاظ نادر کے منہ میں ہی رہ گئے۔ زوئی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی... ائرپورٹ کی اندرونی حدود سے باہر لے آئی تھی۔ باہر بے شمار ٹیکسیاں تھیں جن میں سے ایک انہیں فوراً مل گئی تھی۔ زوئی ہی نے ٹیکسی ڈرائیور کو بتایا تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا۔

☆☆☆

''سوری میم آپ اس فلائٹ سے دبئی نہیں جا سکتیں۔'' نہ جانے کس سرکاری محکمے کا یونیفارم پہنے وہ شخص اسے ایک ایسی بات بتا رہا تھا جس کے الفاظ سیدھے اور ان کے معنی صاف سمجھ میں آنے والے تھے لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ الفاظ کسی اجنبی زبان میں کہے گئے ہوں جب ہی تو انہیں سمجھنے میں اسے دقّت ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھی نہیں؟'' اس نے سر ہلا کر پوچھا تھا۔ اس شخص نے جو پاسپورٹ اور ٹکٹ اس کے ہاتھ میں واپس پکڑائے تھے ان کے مندرجات میں کچھ غلطی تھی یا وہ سرے سے جعلی تھے۔ اس کا ذہن گھومنے لگا تھا۔

''مطلب میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' وہ شخص یقیناً اس کی سراسیمگی کو سمجھ چکا تھا۔ اسی لیے نرمی سے بولا تھا پھر اس نے ایک دفتر نما کمرے میں بٹھا کر اسے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اس وقت وہ دبئی چھوڑ کسی بھی دوسرے ملک نہیں جا سکتی تھی اگرچہ اس کے کاغذات میں کوئی غلطی اور خرابی نہیں تھی مگر اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل تھا۔

''ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ان لوگوں کے نام شامل ہوتے ہیں میم جن کی بیرونِ ملک روانگی پر اس وقت تک پابندی ہوتی ہے جب تک ان کا نام اس لسٹ سے خارج نہیں ہو جاتا۔'' وہ افسر تفصیل سے اسے وہ بات سمجھا رہا تھا جو اسے خود سے بھی معلوم تھی۔

''لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' اس نے حیرت زدہ نظروں سے اس افسر کو دیکھا تھا۔ ''میرے خلاف کوئی جرم ثابت ہوا ہے یا میں کسی offensive act میں ملوث ہوں؟''

''وجہ تو خیر میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔'' اس شخص نے سر ہلایا۔ ''لیکن اتنا بتاتا چلوں کہ آپ کا نام ایک بہت اہم جگہ سے فوری آرڈر کے ذریعے اس لسٹ میں ڈلوایا گیا ہے۔ آج شام تک اس لسٹ میں آپ کا نام شامل نہیں تھا۔''

''لیکن میں تو ایک عام سی پاکستانی شہری ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' وہ روہانسی ہونے لگی تھی۔ یہ صورتِ حال انتہائی غیر متوقع اور ذلت آمیز تھی۔

''آپ ایک عام پاکستانی شہری نہیں ہیں میم۔'' وہ افسر زیرِ لب مسکراتا ہوا بولا۔ ''آپ ایک وی آئی پی وہیکل (گاڑی) کے ذریعے ائرپورٹ پہنچی ہیں اور ایک وی آئی پی اتھارٹی کے آرڈر پر آپ کا نام ایمرجنسی میں اس لسٹ میں ڈلوایا گیا ہے۔ آپ کیسے خود کو عام پاکستانی شہری کے طور پر متعارف کروا سکتی ہیں؟''

''میری سمجھ سے یہ صورتِ حال بالاتر ہے۔'' اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا آئی فون، اس کا رابطہ اس نمبر پر کروانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا جو وہ مسلسل ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ کو جو لوگ ائرپورٹ چھوڑنے آئے تھے انہیں یہیں روک لیا گیا تھا تاکہ آپ کو واپسی میں آسانی ہو۔ اب تک وہ لوگ بھی صورتِ حال سے واقف ہو گئے ہوں گے۔'' اس آفیسر نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں متانت سے بتایا۔ ''آپ کیا لیں گی میم، چائے، کافی یا کوئی کولڈ ڈرنک؟''

''کچھ بھی نہیں، بہت شکریہ۔'' وہ تپے ہوئے انداز میں بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں اس حُسنِ سلوک پر آپ کی ہمیشہ مشکور رہوں گی۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ ہاتھ میں دبوچا اور تیزی سے چلتی ہوئی اس دفتر سے باہر نکل گئی۔

''اس سائڈ پر میم۔'' آفیسر نے تیزی سے باہر نکل کر اسے لاؤنج سے باہر نکلنے کا ایک مختلف راستہ دکھایا۔

''بہت شکریہ۔'' وہ رکھائی سے بولی اور اسی راستے پر چل دی جس سے اندر آئی تھی۔

''میم آپ وی آئی پی ایگزٹ سے باہر جائیں گی۔ ایک وی آئی پی وہیکل (گاڑی) وہاں آپ کی منتظر ہے۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔'' آفیسر اس کے پیچھے چلتے ہوئے تیزی سے کہہ رہا تھا۔

''بہت شکریہ۔'' ذلت اور شرمندگی کا احساس اسے اس افسر کی کوئی بات سننے نہیں دے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس وقت ڈیپارچر لاؤنج میں موجود ہر شخص اس پر دانت نکالے ہنسے چلا جا رہا تھا۔

''میم، آئی ایم سوری لیکن یہ بھی سخت قسم کے آرڈرز ہیں۔'' وہ شخص اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔'' اس نے رک کر چلّاتی آواز میں اس افسر سے کہا تھا اور اپنی ہائی ہیلز پر ٹھک، ٹھک کرکے چلتی باہر نکل گئی۔

''چلیں بی بی، فوراً نکلیں۔'' وہ دو شخص جو اسے ائرپورٹ تک لے کر آئے تھے بے چینی سے اس کے منتظر کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کے زرد پڑتے چہروں پر جیسے رونق آگئی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان چلتی لاؤنج سے باہر نکل رہی تھی۔

''میرال۔'' اس پُرشور لاؤنج میں اس کے کانوں میں اپنا نام لیتی ایک آواز پڑی۔ اس کے چلتے قدم لاشعوری طور پر رکے تھے اور اس نے پلٹ کر عقب میں موجود لوگوں پر نظر ڈالی تھی۔ وہ ان گنت لوگ تھے۔ ان گنت چہرے، مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے چہرے بھی اور اس کے ملک سے تعلق رکھنے والے چہرے

بھی۔ ان میں سے ایسا کون ہوسکتا تھا جو اس کا نام جانتا تھا۔ اس کی متلاشی نظریں کسی ایسے چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''جلدی بی بی جلدی۔'' اس کے دائیں بائیں چلتے مردوں میں سے ایک نے کہا اور اس نے اپنا دھیان سامنے کرتے ہوئے قدم تیز کر دیے تھے۔

''میرال۔'' اسے لگا اس پُرشور جگہ کے کسی کونے سے اسے ایک مرتبہ پھر پکارا گیا تھا لیکن اس بار اس نے اسے اپنی سماعت کا دھوکا قرار دے کر پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہی لینڈ کروزر جو اسے لے کر یہاں آئی تھی۔ ان تینوں کے نظر آتے ہی تیزی سے چلتی ان کے قریب آ کر رک گئی تھی اور پل کے پل میں وہ تینوں اس پر سوار ہو کر ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔

اس کے ساتھ موجود دو مردوں کے خیال میں وہ ائرپورٹ سے صاف اور بروقت نکل آئے تھے۔ ان دونوں کو یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ دو مختلف حیثیتوں کی گاڑیاں عین اسی وقت ان کی گاڑی کے پیچھے ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلی تھیں اور ان کے روٹ پر ان کا تعاقب کرنے میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

''میرا نام حمزہ محمود ہے، میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دانیال نے فون کال کے دوسری جانب سے آنے والی آواز سنی اور اسے یاد کرتے میں دقت محسوس ہوئی کہ کیا وہ اس نام کے کسی شخص کو پہلے سے جانتا تھا یا نہیں۔

''میرا ریفرنس، میرال صلاح الدین والا کیس ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دوسری جانب سے اس کی مشکل خود ہی حل کر دی گئی۔

''جی ضرور۔'' دانیال نے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''فرمائیں آپ اس سلسلے میں کیوں ملنا چاہتے ہیں اور اس ریفرنس سے آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''عجیب سا ہی اتفاق ہے۔ میری ایک کزن سے آپ کی ایک کلاس فیلو کی اتفاقاً ملاقات میں یہ معاملہ ڈسکس ہوا اور اسی ذریعے سے مجھ تک بھی پہنچا۔''

''ہم...... مم م......'' دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے ہونٹ دبائے اور اپنے ہاتھ بالوں میں چلاتے ہوئے اپنے مخاطب کی بات پر غور کرنے لگا۔

''ایسا ہے کہ آپ کسی بھی شام میرے گھر آ کر مجھ سے مل سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں آپ کی دلچسپی کس اینگل سے ہے لیکن ظاہر ہے دلچسپی ہے جبھی آپ نے مجھے کال کی ہے ناں اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے مل لینا چاہیے۔''

''بہت شکریہ!'' حمزہ نے کہا۔ ''میں آج کل ہی میں آپ سے ملتا ہوں۔''

''ماما کے منع کرنے کے باوجود بینش کے ذریعے یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی۔'' فون بند ہونے کے بعد دانیال نے سوچا۔ ''Ahh this woman lot خواتین جتنی بھی کوشش کر لیں باتیں ان کے پیٹ میں ٹھہر ہی نہیں سکتیں۔'' اسے یہ بات سوچتے ہوئے ہنسی بھی آ رہی تھی اور جھلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''تمہارے ذریعے سے اگر وہ ہینڈ آؤٹ کسی تک پہنچ گیا تھا تو تمہیں اس کا ذکر مجھ سے کرنا چاہیے تھا

بینش۔'' اس سے اگلے روز یونیورسٹی کیفے میں بیٹھے ہوئے دانیال نے بینش سے کہہ ہی ڈالا۔ وہ خفگی کا اظہار کر رہا تھا یا شکوہ کر رہا تھا اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

''تمہارے منع کرنے سے پہلے ہی وہ ہینڈ آؤٹ ایک مہمان کے ہاتھ لگ گیا تھا اور کیونکہ پہلے کا لائحہ عمل ذرا مختلف تھا اس لیے میں نے انہیں اس کی تفصیل بھی بتا دی تھی۔'' بینش کو عجیب سا احساسِ شرمندگی ہوا۔

''ٹھیک ہے مگر مجھے بتا دینے میں کوئی حرج تو نہیں تھا۔''

''بس ایسے ہی۔'' بینش کو سمجھ نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ ''میری غلطی ہی سمجھ لو کہ میں نے دانستہ ذکر نہیں کیا۔''

''میں یہ بات صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انسان کو زندگی کے معمولی سے معمولی معاملے میں بھی fair and honest ہونا چاہیے۔'' دانیال نے نرمی سے کہا۔ ''چاہے دوسرے کو اس معاملے میں ہماری ایمانداری کا احساس نہ بھی ہو پھر بھی ضمیر مطمئن رہتا ہے۔''

''مجھے بہت افسوس ہے کہ......'' بینش بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

''یہ جو چھوٹی، چھوٹی باتیں ہوتی ہیں ناں چھوٹے، چھوٹے معمولات...... نیک نیتی انہی سے شروع کرنی چاہیے۔ جب ان معمولات میں عادت پختہ ہو جاتی ہے تو زندگی کا ہر معاملہ سچا اور کھرا ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسا ہو جائے تو زندگی سہل ہو جاتی ہے۔ ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر روزمرہ کے معمولات سے لے کر بڑے، بڑے معاملات میں بھی انسان اپنا ذہن و دل مضبوط محسوس کرتے ہوئے ثابت قدم رہنے لگتا ہے۔ لغزش اور گھبراہٹ اسے چھو کر بھی نہیں گزرتی۔'' بینش نے حیرت سے دانیال کو دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' دانیال نے سر ہلا کر گویا اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''یہ میرا ذاتی تجربہ ہے جسے عقل کی بات کی طرح تمہیں سنا رہا ہوں۔ یہ کلیہ گرہ سے باندھ کر تو دیکھو میری بات کی سچائی پر یقین نہ آ گیا تو جو چور کی سزا وہی میری سزا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں، میں بے یقینی کا شکار نہیں ہوں۔'' بینش نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''البتہ میں حیران ضرور رہ جاتی ہوں جب تم ایسی باتیں کرتے ہو۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''تمہارا عمومی رویہ بہت ایزی گو لکی قسم کا ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے علم و حکمت کی باتوں کی توقع کرنا عجیب سی بات لگتی ہے۔ میں تمہاری شخصیت کے ان دونوں بالکل متضاد رُخوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔''

''میرا وہ رخ عام دوستوں کے لیے ہے اور یہ رخ شاید صرف تمہارے لیے ہے۔'' وہ بھی بے پروائی سے بولا مگر اس کے لہجے میں سچائی بھی تھی۔ ''کم از کم اس ڈیپارٹمنٹ میں صرف تمہارے لیے۔''

''میرے لیے؟'' بینش کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ''میں تو ایک بالکل عام سی لڑکی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اتنی عام کہ اکثر مجھے بڑی، بڑی باتوں کی سمجھ بھی نہیں آتی اور ان کو نہ سمجھ پاتے ہوئے میں سوچتی ہوں کہ میں یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ ایسی بڑی، بڑی باتوں کو سمجھنے کے لیے مغز ماری کرنے نہیں آئی اسی لیے ان پر غور کرنا تو در کنار انہیں دھیان سے سنتی بھی نہیں۔''

''نہیں بینش تم عام سی لڑکی نہیں ہو۔'' دانیال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت خاص ہو۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اور تم کیوں خاص ہو یہ میں وقت آنے پر تمہیں بتاؤں گا۔''

یہ ایسی غیر واضح اور مبہم بات تھی کہ بینش اس کا فوری نہ بعد میں کوئی مطلب نکال پائی تھی لیکن پھر بھی نہ

جانے کیوں اس بات میں ایک عجیب سی خوشی اور سکون کا احساس تھا جب ہی وہ اس کے حصار سے نکل نہیں پاتی تھی۔

☆☆☆

وہ شہر کی ایک جانی پہچانی معروف شاہراہ تھی جو اپنے دونوں جانب جابجا نصب برقی قمقموں کی روشنی میں رات کی تاریکی میں بھی اتنی واضح پہچانی جاتی تھی جتنی دن کی روشنی میں۔ وہ اس شاہراہ کو خوب پہچانتی تھی' وہ اس کا راستہ نہیں تھی۔

''یہ ہم کدھر جارہے ہیں؟'' اس نے گھبرا کر بلند آواز میں پوچھا تھا۔ اس کا مخاطب گاڑی چلانے والا شخص تھا یا وہ دومرد جو اسے ائرپورٹ سے نکال کر لائے تھے یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

''خاموش رہو بی بی، ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہمیں کدھر جانا ہے۔'' ان دونوں مردوں میں سے ایک بولا۔

''نہیں...... مجھے کچھ عجیب سا احساس ہورہا ہے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف دیکھا۔ اس کے فون کے سگنلز بند تھے۔ اس جگہ پر اس وقت بغیر کسی خاص دن یا وجہ کے سگنلز بند ہوجانا ایک اور عجیب بات تھی۔

''گاڑی روکو، واپس موڑو...... مجھے میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔'' اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''تمہارا گھر!'' دوسرا مرد زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''کون سا گھر؟'' اس نے مارے ہنسی کے اپنی آنکھوں میں اتری نمی کو انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''امراؤ بیگم کا ٹھکانا یا سردارزادے کا محل، کس گھر کی بات کررہی ہو زرنگار؟''

خطرے کا ایک شدید احساس برقی کرنٹ کی طرح اس کے پورے جسم میں دوڑا۔

''کہاں لے جارہے ہو تم مجھے؟'' اس نے کڑک کر پوچھا۔

''لے کر نہیں جارہے، لے آئے ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔ گاڑی اس معروف شاہراہ پر واقع میل ہا میل پر پھیلی ایک معروف عمارت کے نہ جانے کون سے گیٹ کے سامنے رکی اور گیٹ کے فوراً کھل جانے پر اندر داخل ہوگئی تھی۔

''سرکاری عمارت ہے بی بی، پُرسکون ہوجاؤ۔ ہوسکتا ہے تمہارے خوابوں کا سوداگر آج کی رات تمہارے ساتھ یہیں گزارنا چاہتا ہو۔'' وہ شخص جو اس پر استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور اترنے کے بعد اس نے پچھلا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

اس کے ساتھ پچھلے چند دنوں سے کیا ہورہا تھا۔ اس نے واقعات کے انہونے پن پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ مہرزاد کہاں تھا اور اس نے اسے اس عجیب وغریب صورتِ حال کا شکار کیوں ہونے دیا تھا۔ اگر وہ یہیں کہیں تھا اور اسی کے کہنے پر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا تھا جس کا اس نے اس ایک گھنٹے میں سامنا کیا تھا تو پھر اس نے اس سے براہِ راست رابطہ کیوں منقطع کر رکھا تھا جبکہ اس کے فون کے سگنلز ابھی تک بند تھے۔

''میں نہیں اتروں گی۔'' اس نے گاڑی سے اترنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ایمرجنسی میں اِدھر لانا پڑا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم تمہارے استقبال کے لیے یہاں ریڈ کارپٹ

نہیں بچھا سکے۔'' وہی شخص مزید استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ہاں اگر دبئی چلے جاتے تو چاروں طرف تمہارے راستے پر ریڈ کارپٹس اور گرین سگنلز ہی بچھے ہوتے۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ غرّا کر بولی۔ ''گاڑی یہاں سے واپس نکالو اور مجھے امراؤ بیگم کے ٹھکانے پر چھوڑ آؤ۔''

''امراؤ بیگم اور اس کا ٹھکانا تو بہت پیچھے رہ گیا بی بی۔ اب آگے کی طرف دیکھو۔ بدلے ہوئے نقشے پر نظر ڈالو۔'' وہ شخص دانت نکوستے ہوئے بولا۔ ''لیکن پہلے یہاں قدم تو رنجہ فرماؤ۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔

''اوئے اللہ داد، اُدھر سے دو گارڈ اِدھر بلوالو، لگتا ہے شہزادی کو اڑن قالین سے اتارنے کے لیے زبردستی کرنا پڑے گی۔'' اس شخص نے خود کوئی کوشش نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو آواز دے کر کہا۔

''حکم سرکار!'' اس شخص کی آواز آئی اور اسی کے اشارے پر سرکاری وردی میں ملبوس دو نچلے درجے کے اہلکار زرنگار کو گاڑی سے باہر نکالنے کے لیے گاڑی کے قریب آئے تھے۔

☆☆☆

''بہت بڑی گڑبڑ ہے صاحب، وہ لوگ اسے بڑے گھر لے آئے ہیں۔''

''تم لوگ......'' اپنے مزاج کے خلاف مہرزاد کے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکلی۔ ''سب تمہاری غفلت اور حماقت کا نتیجہ ہے۔''

''صاحب ہم وہاں چوکنے کھڑے تھے۔ بی بی نے وی آئی پی ایگزٹ سے باہر آنے سے انکار کردیا تھا۔ ہم سیکورٹی آفیسر کا پیغام سن کر فوراً گاڑی باہر نکال کر عام راستے پر لے آئے تھے لیکن ہمارے اشارے سے پہلے ہی بی بی دوسری گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔''

''تم جانتے ہو جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں، میں تم لوگوں کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔'' مہرزاد کی آواز بلند ہوئی۔

''جی صاحب۔''

''اپنی آوازیں گم کرو۔'' وہ غصے میں تقریباً پاگل ہونے لگا تھا۔ اس کی جیت کی پہلی ہی رات پارٹی کے اندر سے ہی اسے ایک ایسے محاذ پر چیلنج کردیا گیا تھا۔ جس کا تعلق اس کی انتہائی ذاتی زندگی سے تھا۔ وہ منصوبہ اتنی ہوشیاری سے بنایا گیا تھا اور اتنا پرفیکٹ تھا کہ اس کی ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زرنگار کا نام ای سی ایل میں ڈلوا کر اس نے اپنے تئیں اس منصوبے کو فوری طور پر ناکام بنادینے کی ایک سعی تو کی تھی مگر منصوبہ بنانے والوں نے یقیناً اپنا پلان بی بھی اتنا ہی منظم بنا رکھا تھا جتنا کہ پلان اے...... اس کا زرنگار سے رابطہ مسلسل منقطع تھا یقیناً جس گاڑی میں وہ اسے بٹھا کر لے گئے تھے اس کے سسٹم میں جیمرز بھی موجود تھے اور جہاں وہ اسے لے گئے تھے وہاں ان کا اپنا راج تھا۔ وہ بیک وقت کئی چیلینجز کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ مخالفین کو چت کرنے کے سارے گُر اسے ازبر تھے مگر دوستی کا نقاب پہنے اپنوں کو ایکسپوز کرکے ان سے ٹکر لینے کے لیے بہت سے سبق پہلے پڑھنے کی ضرورت تھی۔ پارٹی کی عزت بچانا اور اس کی صفوں میں اتحاد کا تاثر دیتے ہوئے ان نئے محاذوں پر لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے کارہائے منصبی کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ انجام دینا سب ہی کچھ اکٹھا اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ کیا کرنے والا تھا، اسے کیا کرنا چاہیے تھا، اس بار

دوسروں کی طرح اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔



''اوہ میرے خدا!'' زوئی نے ٹیکسی سے باہر نکل کر ایک ہاتھ دروازے پر رکھتے ہوئے دوسرا اپنے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ایک بڑی سرکاری عمارت ہے، ہے ناں نادر؟'' اس نے ٹیکسی میں بیٹھے نادر سے کہا۔

نادر کی نظریں مسلسل ٹیکسی کے میٹر پر جمی تھیں۔ کتنے کلومیٹر کا فاصلہ وہ طے کر چکے تھے اور انہیں ٹیکسی والے کا کیا حساب چکانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی جیب میں اتنے پیسے تھے بھی کہ نہیں جن سے وہ زوئی کے اس ایڈونچر کا خرچہ پورا کر سکتا تھا۔

''نادر یہ کون سی جگہ ہے، کیا یہ ایک سرکاری رہائش گاہ ہے؟'' زوئی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''جی مس، یہ یقیناً ایک سرکاری رہائش گاہ ہے۔'' نادر کے بجائے ٹیکسی والے نے جواب دیا جو ایک چینی لڑکی کو اردو بولتے سن کر یقیناً محظوظ ہو رہا تھا۔

''ہم اس کے اندر نہیں جا سکتے کیا؟'' زوئی نے گویا معصومیت سے پوچھا۔

''اس کے اندر جانے کے لیے تو خصوصی اجازت نامہ لینا پڑتا ہے مس۔'' ٹیکسی والے نے کہا۔

''زوئی تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اب یہاں رکنا ہے یا گھر جانا ہے؟'' نادر کی نظریں ٹیکسی کے میٹر سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں جو مسلسل چلے جا رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا وہ اس عمارت کے اندر کیا کر رہی ہے۔'' زوئی کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔

''زوئی تمہیں فوری طور پر سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔ بہت رات بیت چکی، اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' نادر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''غالباً ہماری طرح وہ گاڑی بھی اس گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی۔'' ڈرائیور نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا جو کہیں سے ریورس ہو کر سیدھی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔

''میں نے نوٹ کیا ہے یہ گاڑی بھی اندر گئے بغیر ہی واپس مڑی ہے۔ یہ کبھی ہم سے آگے کبھی پیچھے رہتی رہی ہے سارا راستہ۔ اس میں سے کوئی شخص بھی اتر کر اندر نہیں گیا۔'' ٹیکسی والا ذہین اور قیافہ شناس لگ رہا تھا۔

''ہم اس ملک کے عام شہری ہیں زوئی، ہم پر اس عمارت کے دروازے نہیں کھل سکتے، پلیز واپس گاڑی میں آ جاؤ ہمیں اب گھر جانا چاہیے۔'' نادر نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''لیکن نادر۔'' زوئی نے بے بسی سے اس عمارت کی فلک بوس دیواروں، ان دیواروں میں بنی چوکس گاہوں اور ان چوکس گاہوں میں مستعد کھڑے باوردی اہلکاروں کو دیکھا اور اسی بے بسی کے ساتھ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

''اگر وہ مجھے دیکھ لیتی تو مجھے یقین ہے پہچان بھی لیتی اور اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی وجہ سے ہم لوگ کس مصیبت میں پھنس چکے ہیں تو یقیناً ہماری مدد کرتی۔'' گھر واپسی کے راستے میں زوئی بار بار اسی قسم کی بات کرتی رہی تھی جبکہ نادر خاموش تھا۔ اس نے زوئی کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

گھر پہنچ کر اپنی جیب اور زوئی کے چھوٹے سے بٹوے میں موجود ایک بڑے نوٹ سے لے کر چھوٹے، چھوٹے نوٹوں اور سکوں تک کی گنتی کر کے ٹیکسی ڈرائیور کو بطور کرایہ پکڑانے کے بعد نادر، زوئی کے ساتھ مرے

قدموں سے چلتا گھر کے اندر داخل ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ بھوک کے مارے اس کے پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے نادر لیکن نہ جانے کیوں میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" زوئی نے کچن میں گھستے ہوئے کہا۔

"ٹیکسی والے کو دیکھو ہم پر ترس بھی نہیں آیا، سکے تک لے گیا۔" نادر نے جوتے کی ٹھوکر سے کچن میں رکھی نیچی پیڑھی کو اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹیکسی والے نے ہم پر کوئی ڈاکا نہیں ڈالا نادر، اس نے اپنا کرایہ وصول کیا صرف، گھر سے ائرپورٹ کا کرایہ تو معلوم تھا۔ ائرپورٹ سے اس ٹیکسی کو رِنگ روڈ پر ہم نے چڑھایا تھا۔ تم جانتے ہو ناں وہ فاصلہ کتنا تھا اور اس روڈ سے یہاں واپسی تک کا راستہ میٹر کے ساتھ ساتھ چلیں تو کتنا ہے۔ اس نے اپنا وہی کرایہ لیا ہے جو بنتا تھا۔" زوئی نے حسبِ عادت ٹیکسی والے کی طرف داری کی۔

"اس کا میٹر بہت تیز تھا اور دماغ اس سے بھی زیادہ تیز۔" نادر نے برتنوں والے ریک سے ایک پلیٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "کیسا تمہیں مشورہ دے رہا تھا کہ ایسی عمارتوں تک جانے والی مشکوک گاڑیوں کا تعاقب کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یہاں تو بے گناہ بندہ سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔"

"بس نادر......" زوئی کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں افسردگی جھانکنے لگی۔ "مجھے رات بھر اس افسوس کے مارے نیند نہیں آئے گی کہ وہ مجھے نظر بھی آئی اور میں اس سے مل نہیں پائی۔"

"نہیں زوئی۔" نادر نے چولھے پر رکھے فرائنگ پین میں آلو قیمے کا سالن ڈال کر چمچ سے اسے الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہمیں اس گاڑی کا تعاقب ہی نہیں کرنا چاہیے تھا اور تمہیں بھی اب تک جان لینا چاہیے کہ جس لڑکی کی تم نے مدد کرنے کی کوشش کی اور جو اس کوشش کے دوران دوبارہ اغوا ہوگئی......اب وہ عام سی لڑکی نہیں رہی۔" اس نے گرم آلو قیمہ پلیٹ میں نکالتے ہوئے زوئی کی طرف دیکھا۔ "اس لڑکی کی ہوا اونچی ہوچکی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کوئی خوش قسمتی رہی ہے یا بدقسمتی ہے لیکن اس کا تعلق اب صاحبِ اختیار لوگوں کے ساتھ بن چکا ہے۔ اب اسے دیکھ کر شناسائی کا دعویٰ کرنا تمہارے لیے اور تمہارے توسط سے میرے لیے خاصا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"میں نے... شناسائی کا دعویٰ کر کے اس سے کیا لینا ہے نادر، میں تو صرف ایک ثبوت ایک گواہی کے لیے اس کے پیچھے گئی تھی۔ اگر وہ گواہی ہمیں مل جاتی تو اس مسلسل تفتیش سے ہماری جان چھوٹ جاتی۔" زوئی نے ٹوسٹر سے ٹوسٹ نکالتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

"ہوں۔" نادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج والے واقعے کے بعد جو مجھے نظر آرہا ہے وہ کوئی خاص حوصلہ افزا نہیں ہے زوئی۔" اس نے زوئی کی طرف دیکھا۔ "وہ لڑکی یا تو اپنی مرضی سے یا حالات کے جبر کا شکار ہوکر بہت بڑے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ اس کا ہم عام لوگوں کے ہاتھ لگنا ناممکن نظر آتا ہے۔ اب اللہ ہی ہے جو مدد کرے اور ہم اس بند گلی سے باہر نکل آئیں۔"

"مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے نادر۔" زوئی کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر افسردگی کی لہر دوڑی۔ "میری وجہ سے تم کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔"

"ایک تو تم......" نادر نے کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر زوئی کو مصنوعی غصے سے گھورا۔ "خدا کے

واسطے اس طرح افسردہ ہونے کی کوشش نہ کیا کرو۔ اس ایکسپریشن کے ساتھ تمہاری ناک اور بھی چپٹی نظر آنے لگتی ہے اور آنکھیں مزید سکڑ کر بالکل چُنیاں ہوجاتی ہیں۔"

زوئی نے اس مذاق پر ناراض ہوکر نادر کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے سے نظریں ملنے پر وہ دونوں بیک وقت ہنس دیے۔ ہنسی جس کی اس تناؤ کی گھڑی میں ان دونوں کو ہی بہت سخت ضرورت تھی۔

☆☆☆

"میں جانتا ہوں در پردہ مجھے اس کارنر سے چیلنج کیا گیا ہے......لیکن اچھا ہوتا یہ چیلنج سیاسی نوعیت کا ہوتا نجی نوعیت کا نہیں۔"

"کم آن مہرزاد، تم ایک فضول سے ایشو کو نجی نوعیت مت بناؤ یار۔"

"آپ نہیں جانتے سر، میرے لیے یہ ایشو کتنا اہم ہے۔"

"ریڈ لائٹ ایریا کی ایک معمولی سی کال گرل کو ذاتی ایشو بنانا تم جیسے سرداروں کا شیوہ نہیں۔"

"آئی ایم سوری سر، میں بہت مشکور رہوں گا اگر آپ اس لڑکی کا اس بیک گراؤنڈ کے ساتھ تذکرہ نہ کریں تو...... یہ میری prestige اور honour کا معاملہ ہے اور میں بتاتا چلوں کہ میں اس پر کمپرومائز نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس صرف اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اسے پارٹی کا معاملہ سمجھ کر اگر پارٹی کے ٹیبل پر حل کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میرے پاس اس کے حل کے لیے بے شمار آپشن موجود ہیں۔"

"ہوں......لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ صوبائی معاملہ ہے، وفاق کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں بنتا۔"

"سر کس کو بتا رہے ہیں آپ، نمبر ایک وہ وفاق کا نمائندہ ہے نمبر دو پارٹی کا ممبر ہے، نمبر تین آپ کا ذاتی دوست ہے اور اس سے آپ کے تعلقات کی نوعیت کو میں خوب جانتا ہوں، نمبر چار آپ پارٹی کے سربراہ ہیں، آپ کے ایک نوٹس سے سارا معاملہ حل ہوسکتا ہے۔ نمبر پانچ اگرچہ میرا اور آپ کا ساتھ بہت لمبا نہیں لیکن اب تک آپ میرے مزاج سے خاصے واقف ہوچکے ہوں گے۔ اگر نہیں تو آپ کے پاس آپ کے خاص لوگوں کی جو personality assessment فائلز پہنچتی ہیں ان میں میرا پروفائل دیکھ لیجیے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ میں اس معاملے پر کس حد تک ایکٹ اور ری ایکٹ کرسکتا ہوں۔"

"کم آن مہرزاد، ابھی تم ایموشنل ہو رہے ہو اس معاملے کو تھوڑا اور وقت دو۔ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے چائے کی پیالی میں طوفان کا ہے کو اٹھاتے ہو بابا۔ تم ماشاء اللہ سے جوان ہو کیا پرسنیلٹی ہے تمہاری، ایک سے ایک لڑکی پٹ سے تمہاری گود میں گرنے کو تیار ہوگی پھر اس ایک لڑکی کے لیے......ہُنہ"

"پلیز سر میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور دل سے کرتا ہوں۔ اس لڑکی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر کے مجھے کسی گستاخی پر مجبور نہ کیجیے، پلیز یہ میری آپ سے ریکوئسٹ ہے۔"

"اوہ......اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی کوئی خاصے کی چیز ہے۔ دیکھنا پڑے گا پھر تو اسے۔"

"نہیں سر اسے کوئی نہیں دیکھے گا اور صبح تک اسے اس عمارت سے محفوظ و مامون باہر ہونا چاہیے۔"

"your tone is quite demanding"

"I know it is sir لیکن ایسا ہی ہے اور اگر میری ڈیمانڈ ریجیکٹ ہوتی ہے تو پھر میرا استعفیٰ کل

دوپہر بارہ بجے تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وزارت، اسمبلی، ممبر شپ اور پارٹی رکنیت ہر چیز سے...... کیونکہ ایسا کرنے کے بعد ہی پھر میں ذاتی حیثیت میں براہِ راست اپنے آپشنز استعمال کرنے کی پوزیشن میں آسکتا ہوں۔''

''ارے بابا کیا مصیبت ہے، رٹو طوطے کی طرح گردان کرتے ہیں سب لوگ پارٹی کو جوان خون کی ضرورت ہے۔ نہیں جانتا کوئی کہ جوان خون کیسا گرم اور نان کمپرومائزنگ ہوتا ہے۔ ارے بابا میرا سوہنا سائیں تم میرے کو بیچ میں مت ڈالو تو کیا ہی اچھا ہوگا۔ ایسا کرو کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے رابطہ کرو۔ وہ لوگ آپس میں نمٹا و مٹالیں گے معاملہ۔''

''سر مجھے ٹالیں مت، میں بالکل بھی پرائم منسٹر ہاؤس نہیں جارہا۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں اور مجھے یہاں ہی سے حکم جاری کروانا ہے۔''

''تم جانتے ہو مہرزاد خان تمہاری ٹون اتنی ڈیمانڈنگ کیوں ہے۔ یہاں جس جگہ شیر بھی ہلکی سی آواز نکالتے ہوئے کانپتے ہیں تم اتنی بلند آواز اور اتنے اعتماد کے ساتھ بات کررہے ہو۔''

''میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں سر۔''

''تم اپنی حیثیت، اپنے بیک گراؤنڈ، اس سیاسی نقشے پر اپنے مضبوط مہروں کے بل پر سر اٹھائے بیٹھے ہو لیکن مجھے کہنے دو کہ تم ان سب کو stake پر لگارہے ہو۔''

''میں جانتا ہوں سر۔''

''ایک لڑکی کے پیچھے کشتیاں جلانے والا سردارزادہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں میں۔''

''آئندہ کبھی دوبارہ بھی نہیں دیکھیں گے سر لیکن ابھی تو آپ کو دیکھنا اور ماننا پڑے گا۔''

''اچھا چھری تلے دم تو لو سائیں، ابھی تو وہ اگلے مسئلے سے باہر نہیں نکلا اس کے خلاف فتوے دے رہے ہیں مولوی لوگ۔''

''میں نے اسے مشورہ نہیں دیا تھا بے تکان بولنے کا سر...... وہ اس کا ہیڈک ہے، فی الحال تو آپ میرا ہیڈک دور کریں۔''

''ارے بابا سویا پڑا ہوگا ابھی تو...... جگاؤں کیا اس وقت اسے؟''

''وہ اس وقت نہیں سوتا سر، یہ تو اس کے جاگنے اور رت جگا منانے کا وقت ہے...... ہاں دن میں جاگتا نہیں ملے گا وہ آپ کو۔''

''تم تو بھئی مہرزاد خان بچوں جیسی ضد کرنے بیٹھ گئے۔ اُدھر کے حالات معلوم ہیں ناں تمہیں، وہ چھوٹا صاحب تاک لگا کر بیٹھا رہتا ہے اِدھر یہ ڈگمگائے گا اُدھر اس کا داخلے والا لعن طعن شروع کردے گا۔''

''مت الجھائیں سر، مت الجھائیں۔ I need action اگر نہیں ہوسکتا تو بھی بتائیں اور اجازت دیں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''اچھا بابا...... رکو، رحیم داد ملاؤ ذرا بڑے صاحب کو۔''

''تھینک یو سر۔''

☆☆☆

''میری تو سمجھیں شامت آچکی ہے چھوٹے صاحب۔ ساری کی ساری وزارتِ اطلاعات ونشریات

ڈنڈا لے کر اس غریب خانے کے پیچھے پڑگئی ہے۔''

''بھگتنا تو پڑے گا امراؤ بیگم۔ تمہارے ہاں سے اس کی معشوقہ غائب ہوئی ہے، وہ زخمی شیر چین سے تھوڑی بیٹھے گا۔ تم سے تو پوچھے گا ہی پوچھے گا۔''

''ارے شکر ہے خود نہیں آگیا پوچھنے، میری تو اس کو دیکھ کر عام حالات میں ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ زخمی ہو کر تو وہ اور بھی خونخوار ہوچکا ہوگا۔''

''ہاہاہا...... بے چارے کے ستارے بلند ہوتے ہی گردش میں آگئے۔ وزارت کا پریشر اسے اپنے ذاتی مسئلے کی طرف دھیان دینے دے گا نہ وہ اس مسئلے سے دھیان ہٹا سکے گا۔ وزارت اور امارت دونوں ہی اس کے پیر کی زنجیر بن کر رہ جائیں گی۔ والد صاحب وزیر تھے تو اس کے ثمر لوٹنا اور بات...... خود وزارت کا قلمدان تھامنا اور بات۔ اس کا تو نشہ ہی الگ ہے، دونوں میں سے ایک نشے کا انتخاب کرنا پڑے گا تو وزارت اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن کر رہ جائے تو نام بدل دینا میرا۔ رہی تم...... تو تم اس سردارزادے سے جان چھوٹ جانے کا کچھ تاوان بھر لو چند دن پھر نہ سردارزادہ تمہاری راہ میں آئے گا نہ ہی اس کی معشوقہ۔''

''ارے میں قربان جاؤں آپ کے حضور، آپ سے بات کر کے دل کا بوجھ قدرے کم ہوگیا ورنہ کل سے تو مانو جان ہلکان ہوئے جارہی تھی، سب لڑکیاں الگ پنجرے میں بند کر رکھی ہیں گویا کاروبار مندا پڑا ہے۔ دے وردی والے پر وردی والا ریڈ کیے جارہا ہے، وفاق ہی نہیں صوبہ بھی بڑا سرگرم ہے حضورِ والا۔''

''ارے ان صوبے والوں (گالی) کی تو دوڑیں لگتی ہی رہنی چاہییں۔ سنتی نہیں قبلہ والد صاحب کے بارے میں کیسی، کیسی موشگافیوں پر کمر باندھ رکھی ہے منحوسوں نے۔''

''سب نے نہیں حضورِ والا، آپ سب پر تو ایک ہی بھاری ہے وہی بس آپ سمجھ جائیں......''

''بس پھر دوڑیں بھی تو اسی کی لگی ہوئی ہیں۔ سردارزادے کے ماموں جان ہاٹ لائن پر بیٹھے ہیں۔ اُدھر صوبے والا چھوٹا صاحب خود مانیٹر کررہا ہے سارے معاملے کو بس نہیں چل رہا میرا کہ یہ خبر پریس تک پہنچا ڈالوں مگر پریس کم بخت سب کا سب اس کی وزارت کے انڈر آتا ہے۔''

''وہ سب چھوڑیں، یہ بتائیں لڑکی خیریت سے دبئی پہنچ گئی ناں؟''

''ہاں وہ تو پہنچ گئی کب کی۔ برج خلیفہ کے نظارے کررہی ہوگی اس وقت کہیں بیٹھی۔ اس کی فکر مت کرو بس تم اور تمہارے بندے اپنے پیروں سے نہ ہلنا۔ یاد رکھنا تمہارے سر پر ہم موجود ہیں، ہمارے ہوتے ہوئے ہماری آنٹیوں اور باجیوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔''

''ارے میں صدقے جاؤں حضور۔ میرے دل کو تو ٹھنڈ پڑگئی آپ کی بات سن کر یونہی ہاتھ تلے رکھیے گا ہم معصوموں کو۔''

''فکر ہی مت کرو آنٹی امراؤ بیگم، ہم غلام، ہم خادم۔''

☆☆☆

''میرے پاس ایک اہم خبر ہے سر، اگر کہیں تو گوش گزار کردوں؟'' نادر نے حمزہ محمود کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کہو پلیز۔'' حمزہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا تمہاری بیوی کے لیے...

فی الحال اس سے زیادہ ریلیف میں دلوا نہیں پاؤں گا۔''

''میں اس کی بات کرنے نہیں آیا، خبر دینے آیا ہوں سر۔'' نادر نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر گزشتہ رات ائرپورٹ پر پیش آنے والے واقعے کی آغاز سے آخر تک کی تفصیل حمزہ کو سنانے لگا۔

''کیا تمہاری بیوی کو یقین ہے کہ وہ وہی لڑکی تھی؟'' حمزہ نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

''اسے سوفی صد یقین ہے سر، کل رات اس لڑکی کا نام لے کر پکارنے پر وہ لڑکی مڑ کر پکارنے والے کو تلاش کرتی نظروں سے دیکھتی بھی رہی لیکن شور، ہجوم اور شاید خود بھی جلدی میں ہونے کی وجہ سے وہ اسے اسپاٹ نہیں کرسکی۔'' نادر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہوں۔'' حمزہ نے کہنیاں اپنی کرسی کے بازوؤں پر ٹکا کر چہرہ دونوں ہاتھوں کی آپس میں پیوست انگلیوں پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے اسے وہاں زبردستی لے جایا گیا ہوگا، یا وہ اپنی مرضی سے گئی؟''

''مجھے تو ایسا وہم نہیں ہوا کہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہوگا وہ آزاد اور اپنی مرضی کی مختار نظر آرہی تھی۔'' نادر نے یقین سے کہا۔

''اچھا۔'' حمزہ نے سر ہلایا اور پھر نادر کی طرف دیکھنے لگا۔ ''تھینک یو فار دی انفارمیشن۔'' اور پھر اس نے پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتے ہیں کہ اب اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔''

''لڑکی کل رات تو یقیناً اس عمارت کے اندر تھی اب کا مجھے معلوم نہیں ہے سر لیکن صورتِ حال واقعی ایسی ہے تو ہم غریبوں کا اس منظر میں کیا کام رہ جاتا ہے۔'' نادر نے پوری بات میں سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کمزور سی کوشش کی۔

''نہیں نادر۔'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''جب تک معاملہ پوری طرح کُھل نہیں جاتا کسی کو بھی کلیئرنس سگنل نہیں دیا جاسکتا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' نادر اپنی پوزیشن فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''اوکے، اینڈ وِنس اگین تھینک یو۔'' حمزہ نے کہا اور اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

''میرال صلاح الدین میری بچپن کی دوست تھی۔ میں ہر صورت میں اس کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔'' میرال صلاح الدین کے بارے میں سوشل ویب سائٹ پر بنائے گئے صفحے کے ان باکس میں میسجز میں یہ پیغام پڑھتے ہوئے عافیہ چونکی تھیں۔ انہوں نے پیغام بھیجنے والی کی آئی ڈی کلک کی اور اس کا مکمل پروفائل ان کے سامنے تھا۔ وہ ایک معروف شخص تھا۔ وہ اسے ٹیلی ویژن اسکرین پر مختلف کوکنگ شوز میں دیکھ چکی تھیں۔

''اگر یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے تو یہ بہت ایفیکٹو ثابت ہوسکتا ہے۔'' انہوں نے دانیال سے کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ ان باکس تو ایسے کئی میسجز سے بھرا پڑا ہے جو اس سے شناسائی کے دعویدار ہیں۔'' دانیال نے جواب دیا۔

''لیکن یہ ایک جانا پہچانا فگر ہے۔ یہ غلط بیانی نہیں کرسکتا۔'' عافیہ نے کہا۔

''جانے پہچانے فگرز کی بھی کئی فیک آئی ڈیز ہوتی ہیں ما ما جو دراصل ان کی نہیں ہوتیں۔ عام لوگ ان کے

نام سے بنالیتے ہیں۔''

''جو بھی ہے، میں اس کے پیغام کو جواب دیتے ہوئے اس سے اس کا پرسنل کانٹیکٹ نمبر مانگنے لگی ہوں۔ دیکھو کیا جواب آتا ہے۔'' عافیہ نے اس پیغام کا جواب ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔

''آج شام شاید وہ لڑکا حمزہ محمود بھی ہم سے ملنے آئے، وہی جو میرال کو اس کے بقول کب سے ڈھونڈ رہا ہے۔'' دانیال نے بتایا۔

''آنے دو، ہر اس شخص کو آنے دو جو اس سلسلے میں کچھ جانتا ہے۔ یونہی انسانوں کی زنجیر بنتی جائے گی پھر وہ سردار زادہ جو اَب منسٹر بن چکا ہے کہاں تک resist کرے گا۔'' عافیہ کا ذہن ایک اور ہی تصویر بنا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنے سامنے قطار در قطار صوفوں پر بیٹھے لوگوں کے چہروں کو دیکھا۔ یہ سب اس کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ ان میں سے دو اس کی ماں کے ماں جائے تھے، دو باپ کے۔ ایک ماں کا ماموں، تین باپ کے کزنز، دو اس کے اپنے بہنوئی، چند کزنز، اس کی ماں کے اعلان کے مطابق اس کا متوقع سسر، دو سالے، دو ہم زلف بھی انہی چہروں میں موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک خاندان، ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مشترکہ مفادات کی محبت نے انہیں ایک مٹھی میں باندھ رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو صرف ایک رات قبل اس کی وزارت کے نشے میں مدہوش ایک اور فتح کا جشن مناتے ہوئے فائرنگ، ڈھول تاشے، رقص و سرود کے ذریعے اس احساسِ فتح کا اعلان کرتے پھر رہے تھے لیکن اس وقت ان سب کے چہرے لٹکے ہوئے اور زبانیں ہکلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''اوئے خاناں، جوانی کے اتھرے گھوڑے کو لگام دینی کیوں نہیں سیکھی تو نے اب تک؟'' اس کی ماں کی ماں کا ماں جایا جو اس خاندان اور قبیلے کا معتبر ترین شخص گردانا جاتا تھا بڑھاپے کی کھوکھلی آواز میں اپنے تئیں اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

''مہر زاد خان، ایک لڑکی کی خاطر تو بڑے گھر جاکر ایسی دبنگ بولی بول آیا۔ اوئے خان، اوئے خاناں اپنے بڑوں کی بیٹھک بٹھا کر مشورہ تو کیا ہوتا۔ اس قسم کے مسئلے یوں جذبات کے ذریعے حل نہیں کیے جاتے، ہم سے پوچھا تو ہوتا آدھی صدی جتنا پرانا تجربہ ہے اس تیرے چچا کو۔ کیوں کی کرائی پر مٹی ڈالنے پر تلا ہوا ہے۔'' ایک اور بڑھاپا زدہ آواز آئی۔

''مجھ سے کہا ہوتا۔'' متوقع سسر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں حالات کا جائزہ لے کر خود بات کرلیتا۔'' وہ اپنی محبت اور تعلق کے اظہار کے طور پر اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''بڑے صاحب کی پوزیشن جانتے ہو تم، اِدھر تم ہو اور تمہارے پیچھے ہم سب۔ اُدھر وہ ہے اور اس کے پیچھے اندر کے بہت سے معاملات کا علم نہ اِدھر پیر رکھتے بنتی ہے نہ اُدھر پیر رکھتے بنتی ہے۔ بڑے صاحب کو ڈالے بغیر براہِ راست بات کر کے بھی تو بات بن سکتی تھی۔''

''آپ کا مطلب ہے اس شخص سے میں کوئی ایسی ڈیل کرلیتا جس میں کچھ دو اور کچھ لو کا اصول چل رہا ہوتا؟'' اس نے مضبوط آواز میں کہا۔ ''ہرگز نہیں۔'' اس کے لہجے میں اپنے خاندان اور قبیلے کا روایتی ضدی، انا پرست سردار بول رہا تھا۔ ''اس نے اَن فیئر گیم کھیلی ہے۔ میں اسے فیس ٹو فیس جواب دوں گا، مجھے پشت سے آئے وار کا مقابلہ کرنا آتا ہے۔ میں پیٹھ سہلانے تک وقفہ کرنے کا بھی قائل نہیں۔''

''تم پارٹی میں اپنی موجودہ پوزیشن کی illusion (خود فریبی) کا شکار ہو رہے ہو مہر زاد خان۔'' اویس خان جو اس کا بہنوئی اور متوقع سالا تھا رسان سے بولا۔ ''بے شک اس وقت پارٹی کو تمہاری شدید ضرورت ہے لیکن پارٹی ٹینشن وائر کے دوسرے سرے پر موجود حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ پارٹی ہیڈ کو کوئی ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کیوں کرتے ہو جو دونوں کا گھونٹ بھر جائے۔''

''مجھے نہ دلیل چاہیے، نہ مصلحت کے سبق۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے نہ فیکٹس سننے ہیں نہ ہی فگرز۔ میں اعصاب کی جنگ لڑنے کے لیے ایک دم تیار ہوں۔ آپ سب کو میرا ایک ہی جواب ہے۔'' اس نے ان سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نو کمپرومائز۔'' اس نے ان سب کے چہروں کے ردِعمل کو جانچا۔ ''آپ کی مرضی ہے میرا ساتھ دیں، آپ کی مرضی ہے میرا ساتھ چھوڑ جائیں۔ ہر دو صورتوں میں، میں آپ کا ممنون ہی رہوں گا۔''

''ایک معمولی سی لڑکی کے لیے اتنا بڑا فساد مہر زاد خان؟'' اس کا ایک ماموں زاد مارے اضطراب کے اپنی جگہ سے اٹھ کر چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم حکم کرو ہم ہیروں اور نگینوں جیسی لڑکیاں تمہارے لیے حاضر کر دیں گے مگر خدا کے واسطے اس معمولی لڑکی کی خاطر اتنی محنت سے کمائی وزارت کو داؤ پر مت لگاؤ۔''

''ہمارے خاندان کے مردوں کو لڑکیوں کی کچھ کمی ہے کیا خاناں!'' بزرگوار کھوکھلی آواز میں بولے۔ ''ہم سب اپنے، اپنے وقت اپنی، اپنی گرل فرینڈز کے لیے جذباتی تو ہوتے ہی تھے مگر سیاسی مفادات میں گرل فرینڈز ایکسچینج کر لینا بھی ہماری روایت رہی ہے۔''

''نانا جان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا۔'' مہر زاد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ بزرگوار کی بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ''برائے مہربانی آپ لوگ اپنا یہ اجلاس کلوز کر دیں۔ میں خوب جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔''

''تم آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو مہر زاد خان۔'' ایک اور ماموں زاد اس کے قریب آ کر بولا۔ ''ہم تمہارے جلتے ہوئے ہاتھ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ میری اطلاع کے مطابق تمہارے بندے ان سے بھی رابطہ کر رہے ہیں جو شمال کے پہاڑوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دیکھ بھال کے خاناں ایک گولی اُدھر جا سکتی ہے تو کسی گولی کا رخ اِدھر بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں نے کہا ناں میں اعصاب کی یہ جنگ لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔ آپ لوگ میری سپاہ بننے سے پہلے ہی بصد شوق اپنے ہتھیار لپیٹ سکتے ہیں۔'' اس نے بازو کمر کے پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہو نہیں سکتا ناں۔'' متوقع سسر اس کے برابر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''ہم تو ایک بار تمہیں نتائج و عواقب سے آگاہ کرنا چاہتے تھے لیکن اگر جنگ ہی لڑنی ہے تو پھر لڑنی ہے۔ ہماری روایت میں اعلان جنگ کے بعد retreat کر لینے کی کوئی مثال تو ہے ہی نہیں ماموں جان۔'' پھر انہوں نے بزرگوار کی طرف دیکھا۔ ''بڑے گھر تک یہ پیغام پہنچ جانا چاہیے کہ قبیلہ، برادری، خاندان سب مہر زاد خان کے پیچھے کھڑا ہے۔ بات ایک معمولی لڑکی کی نہیں، بات ان فیئر گیم کی ہے۔ لڑکی کو شام تک کی تاخیر کیے بغیر مہر زاد کے پاس ہونا چاہیے۔''

''ہاتھ ہولا رکھ خان...... ہاتھ ہولا رکھ۔'' بزرگوار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس وقت ان کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے باز کے جیسا لگ رہا تھا جو اپنے شکار پر حملہ کرنے سے پہلے عمر بھر کے تجربوں کا نچوڑ حاصل کرنے

پر غور کرتا ہے۔

''وہ اور اس کا بیٹا اس وقت فیڈرل کیپٹل میں ہی موجود ہیں اور اس وقت ان کی گاڑی بڑے گھر کی طرف جا رہی ہے۔'' اویس خان نے اپنا بلیک بیری چیک کرتے ہوئے اطلاع پہنچائی۔

''ہوں۔'' بزرگوار نے سر ہلا دیا۔ ''گویا وہ طلب کر لیے گئے ہیں۔ مبارک ہو مہر زاد خان۔'' پھر انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری ڈیمانڈ میں رس محسوس کر لیا گیا ہے۔''

☆☆☆

اسے معلوم تھا کہ وہ کس جگہ لے آئی گئی تھی لیکن اسے اب تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر اور کیوں وہاں لائی گئی تھی۔ وہ تین کمروں کا ایک چھوٹا سوئٹ تھا جہاں اسے رکھا گیا تھا اور سوئٹ کے اردگرد اونچے، اونچے درخت اور گھنے پودے اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پار کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔

''گڑبڑ ہے اور بہت بڑی گڑبڑ ہے۔'' اس کا دل بار بار کہتا تھا۔ ''لیکن اس گڑبڑ کا کوئی فوری نتیجہ سامنے کیوں نہیں آ رہا۔'' پھر اسے خیال آتا امراؤ بیگم کے ہاں اس کے فون پر آنے والے اس خصوصی نمبر کے میسج سے لے کر اب تک جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ سردار زادہ مہر زاد خان کے مزاج کا عکاس نہیں تھا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک خصوصی نمبر کو ہیک کر کے اسے کہیں اور سے کسی اور کی طرف سے میسج کر کے اُلو بنا لیا گیا تھا۔ یقین نہ آنے کے باوجود وہ رہ، رہ کر سوچتی اور سوچ، سوچ کر پچھتاتی تھی۔ امراؤ بیگم کا ایسے نہال ہو کر اسے دبئی جانے کا مژدہ سنانا۔ ائرپورٹ پر ہونے والا واقعہ اور اس واقعے سے آگے کا قصہ پھر اس کا دل اپنی عقل پر ماتم کرنے کو چاہتا۔ وہ سیکیورٹی آفیسر اسے بار بار وی آئی پی ایگزٹ سے باہر نکلنے کو کہہ رہا تھا لیکن اس نے اس کے برعکس اپنی عقل کی تقلید کی تھی اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں تھا اسے یہاں کس لیے لایا گیا تھا۔

''دیکھو، جس کسی کے بھی کہنے پر تم لوگ مجھے یہاں لائے ہو مجھے اس سے ملوا تو دو۔'' اس نے اس بیڈ روم کے بیڈ کی شیٹس بدلنے والی لڑکی سے کہا جو اس صبح اس کے لیے ناشتا لے کر آئی تھی۔

''مجھے معلوم ہو تو ملواؤں ناں۔'' لڑکی نے مختصر جواب دیا تھا۔

''اس عمارت کا جو بھی بگ باس ہے اسے تو تم جانتی ہوگی؟'' اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''اس کو میں بھی جانتی ہوں، میں نے ٹی وی پر اس کی شکل دیکھ رکھی ہے یقیناً اسی کے کہنے پر ہی مجھے یہاں لایا گیا ہوگا۔''

''اس عمارت کے بگ باسز کے چہرے تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔'' وہ لڑکی ذرا سا مسکرا کر بولی۔ ''اور اس عمارت کا کیا ہے، اتنی بڑی عمارت ہے یہ کہ اس کے مختلف حصوں میں کہاں، کس کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں یہ بگ باس کو تو کیا شاید اس کے سیکیورٹی اسٹاف کو بھی علم نہ ہو۔''

''لیکن کوئی بھی ہے، ہے تو سہی...... کہاں ہے؟ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' وہ دل کے سارے اندیشے پسِ پشت ڈال کر بولی۔

جواب میں وہ لڑکی مسکرائی اور بیڈ سے اتاری شیٹس کا گولا بنا کر بغل میں دبائے وہاں سے چلی گئی۔

''یا اللہ!'' اس نے اوپر دیکھا۔ ''یہ اتنے سالوں سے مسلسل میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مصیبت میں ہوں مگر مصیبت آ چکتی ہے نہ مصیبت سے جان چھٹتی ہے۔ قید خانے کا وہ روزن جس سے چھن کر روشنی کی لکیر اندر

آنے لگی تھی وہ بھی نہ جانے کدھر اپنی سمت بدل گئی ہے۔ اب جو آس پاس نظر دوڑاتی ہوں تو روشنی تو ہے مگر کہاں سے آ رہی ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے سوچا۔

''اب یہ عمارت ہے۔'' اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ ''کہ اک طلسم ہوش ربا ہے یا ایلس کا ونڈر لینڈ......نہیں۔'' پھر اس نے سر ہلا کر اپنی تصحیح کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ تو وہ مینار ہے جو بے دریچہ اور بے در ہے جہاں سے میری آواز کسی سمت بھی نہیں جا سکتی۔'' اس کا سوچ، سوچ کر ماؤف ہوتا ذہن الٹی سیدھی باتیں سوچے چلا جا رہا تھا۔

''لیکن وہ کدھر ہے؟'' پھر اسے اس کا خیال آیا جو روشنی کی لکیر بن کر قید خانے سے اندر آیا تھا۔ ''سردار زادہ مہرزاد خان جس کا دل میرا مفتوحہ قلعہ بن چکا تھا اور جو میرے بارے میں ہر سوچ کو ایک پھول سے تشبیہ دیتا سوچوں اور خیالوں سے اپنا باغ سجا رہا تھا......'' آہ سردار مہرزاد صاحب، میں نے کہا تھا ناں کہ کیچڑ میں کھلے پھول تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آپ کو کیچڑ میں اترنا پڑے گا۔ بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے پہلے اپنی نظروں کو بدصورتی دیکھنے کا عادی بنانا پڑے گا۔'' اس نے تصور ہی میں مہرزاد خان کو مخاطب کیا۔ ''لیکن میں بھول گئی مجھے آپ کو یہ باتیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپ تو ان تلخ حقیقتوں کو خود ہی جان چکے تھے جب ہی تو بار بار مجھے یاد دلاتے تھے کہ آپ فرشتہ نہیں انسان ہیں اور میرے پاس آنے سے پہلے آپ کو اپنے نفس کو کیسے تھپک، تھپک کر سلانا پڑتا ہے......پھر خوب دیکھے آپ نے میرے کارڈز، ہارے ہوئے تاش کے پتّے اور ان پتوں سے سجائے زمیں بوس محل یقیناً حقائق کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی موجودہ حیثیت کا وقار قائم رکھنے کی خاطر آپ نے میری ٹیبل سے اپنے پتے اٹھا لیے جب ہی تو آج میں یہاں ہوں، وہاں جہاں نہ میزبان نظر آتا ہے نہ اس کی میزبانی۔''

''انسانوں کے متعلق سوچے چلی جاؤ گی تو سوچ کے دریا بہتے ہی چلے جائیں گے، کیوں اس کے بارے میں نہیں سوچتیں جو دریاؤں کے آگے بند باندھتا ہے۔'' اسی دم جیسے اچانک کوئی اس کے بہت قریب سے بولا تھا۔ اس نے چونک کر اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آواز آئی تھی۔ اس سمت کوئی ذی روح موجود نہیں تھا پھر اس نے اس آواز کی شناخت کرنا چاہی جو مانوس سی لگتی تھی مگر اس نے اس پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

''دعا جیسی عظیم طاقت دنیا میں کوئی دوسری نہیں، جس نے دعا کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا راستے اس کے لیے دشوار ہوتے چلے گئے اور تم تو میری بچی، میری دعا کے حصار میں ہو۔ دیکھنے کے لیے میں نہیں رہوں گا مگر تم دیکھو گی کہ اپنے اللہ کے حضور تمہارے لیے مانگی میری دعا کہاں، کہاں تمہارا حصار بنتی ہے۔'' غور کرنے اور دھیان دینے پر اسے اس بات کا حرف، حرف یاد آ گیا جسے سننے کے بعد بوا جی نے کہا تھا کہ اس روز انہیں یوں لگا جیسے موت کا خوف اُن کے دل سے زائل ہو گیا تھا۔

''میں صرف تمہاری وجہ سے ہی تو مرنے سے ڈرتی تھی۔'' ایک بار بعد میں انہوں نے اسے کہا تھا۔ ''صوفی صاحب نے تمہیں وہ دعا دے کر مرنے کا ڈر میرے دل سے نکال دیا۔''

''چاہے آپ سے پہلے مجھے موت آ جائے۔'' وہ جو ایبٹ آباد سے نکلنے اور ایک اجنبی جگہ پر سیٹل ہو جانے کی وجہ سے بوا جی سے دل بھر کر ناراض تھی پٹاخ سے بولی تھی۔

''اللہ نہ کرے جو تمہیں ابھی سے موت آ جائے۔'' انہوں نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''بھلا موت آئے کیوں نہیں؟'' وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ ''پڑھائی چھوٹ گئی، شہر چھوٹ گیا، سہیلیاں

چھوٹ گئیں، آپ لے آئیں مجھے دست کاری اسکول میں سوئیوں اور دھاگوں سے آنکھیں پھوڑنے کے لیے......اس سے بہتر نہیں بندہ مر ہی جائے۔ اچھا ہے جوانی کی موت آ جائے بہتیرے گناہوں سے بچ جاؤں گی۔''

''پڑھائی چھوٹ گئی، شہر چھوٹ گیا، سہیلیاں چھوٹ گئیں۔ ایک نہ چھوٹا تو تمہارا منہ بھر کر ہر بات بول دینا نہ چھوٹا۔'' انہوں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی دوسرا اپنے جیسا بدقسمت دیکھوں تو نہ بولوں ناں۔'' وہ منہ پھلا کر بولی تھی۔ ''جب چاروں طرف نظر ڈالنے پر خود سے بڑھ کر بدقسمت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تو خود ہی کو کوسوں گی ناں، اپنی قسمت ہی کو تو کوسوں گی ناں۔''

''یا اللہ، اسے معاف کر دینا۔'' بوا جی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا تھا۔ ''یہ نہیں جانتی خوش قسمتی کیا ہوتی ہے اور بدقسمتی کیا شے ہے۔ الٰہی اسے اتنے رنگ لگا کہ کم از کم خوش قسمتی سے تو واقفیت حاصل کر ہی لے۔ جب وہ واقفیت حاصل ہو جائے گی تو بدقسمتی کی سمجھ بھی آپ سے آپ آ جائے گی۔''

''ارے جائیں، آپ کا تو کام ہی عمر بھر ہاتھ اٹھا، اٹھا کر دعا کرنا ہی ٹھہر گیا ہے۔ کوئی نہیں ہوتیں دعائیں قبول، بڑے اللہ والے بنتے ہیں صوفی صاحب وہ بے چاری آنٹی جن کا بیٹا کوما میں پڑا ہے، ہڈی پسلی تک جس کی ٹوٹ چکی ہے انہیں بھی دعا کی ہی تسلیاں دیے چلے جاتے ہیں......''بیٹی ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہے۔'' اس نے صوفی صاحب کے لہجے میں کہا۔ ''اتنی ہی طاقت ہوتی دعا میں تو وہ بے چاری تو دعائیں کر کر کے دیکھ نہیں کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔ اب تک ان کا بیٹا اٹھ کر بیٹھ نہ چکا ہوتا۔ صوفی صاحب نے ان آنٹی کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگایا ہوا ہے جس دن ان کا بیٹا ختم ہو جائے گا اور ان کی آس کا خاتمہ ہو گا تو سر ہلاتے ہوئے کہہ دیں گے بیٹی اللہ کی یہی رضا تھی اور اس کی رضا کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔''

''بولے جاؤ بولے جاؤ، بغیر وقفے کے بولے جاؤ۔'' بوا جی اس کی تقریروں پر سہم جاتی تھیں۔ ''جب اپنے بول کی فصل کاٹنی پڑی تب سمجھ آئے گی تمہیں کہ کیسے کفر کے کلمے پڑھتی تھیں تم اور اللہ نہ کرے جو عافیہ بیٹی کا بیٹا یوں ختم ہو جائے۔ صوفی صاحب نے اسے دعا کے لیے کہا ہے ناں تو دیکھ لینا انشاء اللہ وہ اسی دعا کی برکت سے نہ صرف اٹھ کر بیٹھے گا بلکہ ایک نارمل اور چلتا پھرتا انسان بنے گا پھر سے۔''

''نارمل انسان تو نہیں frankenstein بن جائے تو کچھ کہا نہیں جا سکتے۔ جتنے تجربے ڈاکٹروں سمیت صوفی صاحب اس پر کر رہے ہیں، امکان تو یہی ہے کہ وہ فرینکنسٹین بن جائے گا اس دور کا۔''

''ہماری، ہم سب کی گناہ گار آنکھیں دیکھیں گی اسے زندہ اور چلتے پھرتے انشاء اللہ۔ تم بھی اِدھر ہی ہو اور میں بھی اِدھر ہی ہوں، دیکھ لینا تم، ہم سب دیکھیں گے۔'' بوا جی نے طیش میں آ کر گویا اسے چیلنج کیا تھا۔

اور آنے والے دنوں میں ہی بوا جی کو صوفی صاحب خواب میں مل کر عافیہ آنٹی کے بیٹے کے ساتھ خیریت کے زندگی کی نوید سنا گئے تھے۔ صوفی صاحب کے وصال پر اس نے پُریقین عافیہ آنٹی کو دیکھا تھا اور وہ دل میں کئی بار تمسخرانہ ہنسی بھی ہنسی تھی۔

''انسان کی ضعیف الاعتقادی کی کوئی حد بھی ہے۔'' اس نے سوچا تھا اور ایک بار پھر بوا جی کے سامنے ان کے، صوفی صاحب کے اور عافیہ آنٹی کے یقین کا مذاق اڑاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''ہاں یہ اچھی بات ہے کہ مکمل نراش سے پہلے آس کی ڈور ہلتی رہے ورنہ انسان کے دن کیسے گزریں،

ورنہ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اِدھر ڈاکٹرز وینٹی لیٹر سے ہٹائیں گے اُدھر عافیہ آنٹی کے بیٹے کی مصنوعی زندگی رک جائے گی۔''

''ہم بھی اِدھر ہی ہوں گے تم بھی اِدھر ہی ہوگی اور ہم سب صوفی صاحب کی طرف سے دی گئی نوید کو حقیقت میں ڈھلتا دیکھیں گے۔'' لیکن بوا جی اپنے دعوے کی تکرار کرتی رہ گئیں اور وہ خوف ناک منظر پیش آ گیا جس نے ان کی اپنی زندگی کی بنیادیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

''اُف!'' وہ جھرجھری لے کر حال کی دنیا میں واپس آئی۔ لرزتی، ہلتی، کانپتی زمین، آن کی آن میں زمیں بوس ہوتی عمارتیں، ریت، پتھر، سیمنٹ، کنکریٹ ریزہ ریزہ ہو کر آپس میں مدغم ہوتے جا بجا تا حدِّ نظر زمین پر بکھر گئے تھے اور ان کے منوں ٹنوں وزن کے نیچے دبے گرم، نرم بچے، جوان، بوڑھے جسم سسکیاں لیتے زندگی کو پکار رہے تھے، گوشت اور خون کے لوتھڑے جسموں کے اعضا ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ ختم ہوتی کئی انسانی زندگیاں، ملبے، لاشیں، ٹوٹے، بکھرے اعضا، فلک بوس عمارتیں، مکانات زمین کے اندر کئی کئی فٹ نیچے گڑ چکے گھر جن میں محبوس نہ جانے کتنی زندگیاں آخری سانسیں لے رہی تھیں اور کتنی ہی ایسی زندگیاں بھی ہوں گی جنہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا ہوگا کہ وہ آخری سانس تھی جو انہوں نے لمحہ بھر پہلے لی تھی۔

خاک اور خون کا وہ منظر جس میں وہ اپنے زخمی جسم، زخمی ہاتھوں کے ساتھ پتھر کی ان شگافتہ وشکستہ دیواروں کو دیوانہ وار ڈھانے کی کوشش کر رہی تھی جن کے اندر بوا جی دب گئی تھیں۔ بوا جی، ان کے دست کاری اسکول کا اسٹاف، بچیاں سب کی سب ایک ساتھ دنیا چھوڑ گئی تھیں اور وہ برہنہ پا، پتھروں، سنگریزوں اور دھول پر اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھرتی تھی۔

''کوئی ہے جو اُن سب کو بچالے، کوئی ہے جو اُن دیواروں کو گرادے جو اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی ہی جیسے پاتال میں جاگری تھیں۔''

''بات سنو، بات سنو بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ دیکھو ایک اور زلزلہ آرہا ہے۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، کلمہ، بہ آواز بلند کلمہ پڑھو سب کے سب۔'' مقامی اور قومی زبان میں کہے الفاظ اس کے کانوں میں پڑتے تھے مگر اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور شاید بھاگتے، بھاگتے ہی گر گئی تھی۔

اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک ایسے کیمپ میں لیٹے پایا جس میں اسی کی طرح کے اور بھی کئی زخمی پڑے تھے اور کئی مہربان چہرے ان پر جھکے ہوئے تھے۔ بوا جی کے بقول اپنے بولے کی فصل کاٹنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ جسے آج سے پہلے ہر دوسرا انسان خوش قسمت اور اپنا آپ ہمیشہ بدقسمت لگا کرتا تھا اس کا قسمتوں کا حساب لگانے کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی و ہوش میں بوا جی کو آوازیں دیتی تھی شاید اس لیے... بھی کہ عمر بھر ان کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

بدقسمتی بوا جی کا یوں دنیا سے چلا جانا تھا یا اس کا اکیلے دنیا میں زندہ رہ جانا۔ خوش قسمتی اس کی زندگی تھی یا بوا جی کا اسے یوں بے یار و مددگار دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ جانا تھا۔ آنے والے سال، دن اور مہینے اس کو ایک، ایک چیز کی تفصیل اور حقیقت بتانے والے تھے اور وہ اس امدادی کیمپ میں سر، ہاتھ اور پاؤں بستر پر پٹکتی چلاتی تھی۔ وہی نہیں اس کے اردگرد اس المناک واقعے کے بعد زندہ بچ جانے والا ہر شخص روتا تھا، چلّاتا تھا اور پکارتا پھرتا تھا۔

''یہ علاقہ میدانِ حشر ہے اور یہاں موجود ہر شخص اپنی، اپنی قبر سے نکل کر وحشت ناک نظروں سے

سامنے کا منظر دیکھتا ہے۔'' امدادی کیمپ میں زخمیوں کی عیادت کے لیے آنے والے ایک مشہور اسکالر نے کہا تھا۔

وہ کتنے دن وہاں یونہی پڑی رہی تھی اسے یاد نہیں تھا۔ اس کے ڈاکٹر کہتے تھے وہ جسمانی سے زیادہ ذہنی طور پر مجروح ہے اور اسے نارمل ہونے کے لیے بہت سا وقت چاہیے مگر اپنے ''بولوں'' کی فصل کاٹنے کا وقت آن پڑنے پر وہ امتحان در امتحان سے گزرنے کے عمل میں داخل ہو چکی تھی۔ جب ہی تو امدادی کیمپ کی طبی امداد اس کے لیے ناکافی قرار دے کر اسے کسی بہتر اسپتال میں لے جانے کا کہہ کر اٹھانے والے لوگ وہاں گھس آئے تھے۔ اس امدادی کیمپ سے باہر دنیا کے حالات کیا تھے، اس قیامتِ صغریٰ نے علاقے کا کیا حال بنا رکھا تھا، اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم تو صرف اتنا تھا کہ وہ وہاں سے شفٹ کی جارہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں شفٹ کیے جانے سے آگے جو کچھ ہوا تھا اس نے قیامتِ صغریٰ سے ماؤف ذہن کے سوتے حیرت انگیز طور پر کھول دیے تھے۔ وہ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر اس سے اگلے سے اگلے ہاتھ میں منتقل ہوئی۔ اس روز اس عمارت کے نہ جانے کون سے پوشیدہ کونے میں مقید تھی۔ ہاتھ در ہاتھ منتقل ہو جانے کا یہ زمانہ اور سفر وحشت ناک تھا، اس کی آنکھوں نے دنیا کے کئی رنگ دیکھ ڈالے تھے اور ذہن ہزار ہا تجربوں سے گزر چکا تھا۔

''مصیبت سے جان چھٹتی تھی نہ مصیبت آ چکتی تھی۔'' وہ امراؤ بیگم کے گیسٹ ہاؤس کی مقیم تھی مگر گیسٹ ہاؤسز کے نگینوں کے مخصوص تجربوں سے محفوظ بھی تھی' اس کی مخصوص تربیت مکمل کرنے کے بعد جب امراؤ بیگم اسے اپنے مہرے کے طور پر متعارف کروانے کا آغاز ہی کر رہی تھی۔ اس کے گیسٹ ہاؤس میں سردار مہر زاد خان نے قدم رکھ دیا تھا اور اس کی نظر نے زرنگار کے روپ میں چھپی میرال صلاح الدین کو تاڑ لیا تھا۔

''مصیبت آتی تھی نہ مصیبت سے جان چھٹتی تھی۔'' مہر زاد خان نے ایک ہزار راتوں کا معاوضہ امراؤ بیگم کو پیشگی پکڑا کر مصیبت کو آنے سے بظاہر تو روک دیا تھا مگر مصیبت سے جان چھوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ وعدے، یقین اور تسلی دلاتا رہا تھا اور وہ اس کے گمان میں پھنسی نہ جانے کدھر آ پھنسی تھی جہاں میزبان نظر آتا تھا نہ مہمانداری کا کوئی سبب۔

''وہ بھی تو منسٹر بن چکا ہے، ہوسکتا ہے یہاں بھی اسی کے اشارے پر لائی گئی ہوں۔'' سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔ ''لیکن اگر ایسا ہے تو وہ خود کہاں ہے، وہ ای سی ایل کیا ہے اور فون سگنلز کیوں غائب ہیں؟'' وہ خطرے میں تھی، خطرے سے باہر تھی یا خود کسی کے لیے خطرہ تھی؟ اس بلند چار دیواری والی وسیع و عریض عمارت کے کسی خفیہ گوشے میں مقید اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

☆☆☆

ایسا کیا تھا جو معمول سے مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ یشل نے پلازمہ اسکرین پر مہر زاد خان کی وہ میٹنگ یا بریفنگ براہِ راست دیکھتے ہوئے سوچا تھا جو الیکٹرانک میڈیا کے معروف ٹاک شوز اور نیوز اینکرز کے ساتھ خصوصی طور پر منعقد کی گئی تھی۔ بظاہر مہر زاد خان ہر سوال کا فوری اور برجستہ جواب دے رہا تھا اور اس کا ہر جواب نپا تلا اور برموقع معلوم ہو رہا تھا مگر کچھ ایسا ضرور تھا جو یشل کو غیر معمولی لگ رہا تھا۔

''اس اعتماد کے اندر ایک عجیب سا کنفیوژن نظر آرہا ہے اور اس ٹھہراؤ کے پیچھے ایک عجیب سی عجلت محسوس ہو رہی ہے جیسے وہ سب کے درمیان موجود سب کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں ہے، جیسے اس کا دل چاہ رہا ہے کہ یہ سب جلدی سے ختم ہو جائے۔'' یشل نے تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے اپنے

آئی فون پر مختصر یادداشت لکھی۔ ''کچھ ایسا ضرور ہے جو اس کے ساتھ کسی گڑبڑ کی نشان دہی کر رہا ہے۔''

''اگر چہ یہ بہت اندر کی خبر ہے اور ابھی تک بوجوہ منظرِ عام پر نہیں آسکی لیکن کیا یہ سچ ہے کہ وزارت کا حلف اٹھانے کے بعد ایک رات کے اندر ہی اندر آپ کے کسی معاملے پر پارٹی ہائی کمان سے اختلاف پیدا ہو چکے ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے پارٹی کے مقتدر رہنما اس وقت حرکت میں ہیں؟'' ایک بڑے نیوز چینل کے مقبولِ عام ٹاک شو کے مشہور اینکر نے اچانک مہرزاد خان سے سوال پوچھا۔ سوال تیکھا تھا اور غیر متوقع بھی۔ الیکٹرانک میڈیا سے متعلق حکومت کی تازہ پالیسیز پر بات کرتے ،کرتے اس اینکر نے یہ سوال اچانک کیا تھا یقیناً اسے اپنے پاس موجود رابطے کے کسی ذریعے پر اچانک ہی کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔

''آپ لوگوں کو اختلافات کی خبروں میں صلح صفائی کی خبروں کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔'' مہرزاد خان نے اس غیر متوقع سوال پر چونکے بغیر مسکرا کر جواب دیا تھا۔ یشل نے دیکھا اس کی نظریں ایک مخصوص جگہ پر رکی ہوئی تھیں یقیناً اس اینکر کے ہاتھ میں کوئی مواصلاتی آلہ موجود تھا اور وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''بھائی میں تو ابھی تازہ واردانِ وزارت میں سے ہوں۔ اختلافات کی بات کر کے کیوں میری دال میں کنکر ڈھونڈتے ہو۔'' اس نے بات اڑاتے ہوئے کہا اور چہرے کا رخ کسی دوسرے اینکر کی طرف موڑ لیا۔

''آپ پارٹی کے لیے امید کا نشان ثابت ہو رہے ہیں۔ پارٹی کی عوام میں روز بروز کم ہوتی مقبولیت اور گرتی ہوئی ساکھ کو بڑھانے اور سہارا دینے کے لیے پارٹی کی ہائی کمان کی نظریں آپ پر جمی ہوئی ہیں، ایسے میں آپ کے ہائی کمان سے اچانک کسی مسئلے پر اختلاف کی خبر خاصی تعجب خیز ہے۔'' دوسرے اینکر نے پہلے والے سے کیو لیتے ہوئے اپنی تشویش داغی۔

''خیر کے کلمے منہ سے نکالنا سیکھیں سائیں، اختلافات نہ تو او ور نائٹ پیدا ہوئے ہیں نہ ہی او ور نائٹ ختم ہو جاتے ہیں اور میں نے تو ابھی کل ہی آپ سب کے سامنے وزارت کا حلف لیا ہے۔ جہاں اختلاف ہوتے ہیں وہاں حلف نہیں ہوتے، اتنا تو معلوم ہی ہوگا آپ لوگوں کو۔'' اس نے اس بار بھی رسان سے جواب دیا تھا۔

''وہ خود سے سوال کرنے ...... والوں کو تو ٹال گیا لیکن یہ سچ ہے کہ اس بحر کی موجوں میں کہیں نہ کہیں تلاطم ضرور موجود ہے اور اس چیز کا خطرہ مجھے بہت پہلے سے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا مزاج، اس کی سیلف ٹریننگ، اس کے نظریات، راست گوئی اور نان کمپرومائزنگ رویہ خود اس کے لیے بہت سے مسائل کھڑا کر سکتا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سب مل کر راتوں رات ہی اس کے لیے مسائل کھڑے کر چکے ہیں۔ مسائل کی نوعیت کیا ہے، یہ میں نہیں جانتی لیکن میری دعا ہے کہ اس کا تعلق زرنگار سے نہ ہو۔'' یشل نے اس دن کا فائل نوٹ لکھا اور اپنی فائل میں محفوظ کر لیا۔

☆☆☆

''میرا نام حمزہ محمود ہے۔''

''اور میں فہد ہوں۔''

''آپ دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئی، میں دانیال جہانگیر ہوں اور یہ میری والدہ مسز عافیہ جہانگیر ہیں۔''

جاری ہے

دوستی کا دیا

ہما وجاہت



''شکر ہے سر ظہور کی کلاس ختم ہوئی۔ جمائیاں لے لے کر تو میرا منہ تھک گیا۔ یار انہیں آج تک لیکچر دینا نہ آیا۔ چلو ذرا چائے پیتے ہیں، آنکھیں کھلیں تو دوسری کلاس لینے کے قابل ہوں۔'' دانش جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا کلاس سے نکلا۔

ہم تینوں کلاس کے بعد کینٹین کی طرف جانے لگے تو راستے میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ڈین سر مصطفیٰ راؤنڈ لیتے لیتے رک گئے۔

''جنٹلمین! کہاں کی تیاری ہے؟'' ہمارے پاس آکر بڑے پُرجوش انداز میں کہنے لگے۔

"بس سر ذرا کینٹین تک جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"ینگ مین مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں، تم نے ہمارے کالج کا نام روشن کرنا ہے، تم تینوں اس کالج کے ذہین ترین اسٹوڈنٹس میں سے ہو۔ اس دفعہ ٹاپرز میں نام آنا چاہیے۔" ڈین صاحب نے بڑے تپاک سے مرتضٰی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"جی سر، انشاءاللہ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

"شاباش! مجھے تم تینوں سے یہی توقع ہے۔" سر مصطفٰی یہ کہہ کر اپنے راؤنڈ پر چلے گئے۔ ڈین صاحب بہت ہی نفیس اور دوست آدمی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم رکھا۔ خصوصاً ہمارے ساتھ تو وہ بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے اندر آگے سے آگے بڑھنے کا جذبہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔

"اوئے چھوٹے! تین زبردست سی چائے اور ساتھ گرما گرم سموسے لے آ۔" دانش نے آرڈر دے کر انگڑائی لی اور ٹی وی پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں دیکھنے لگا۔

"اف، یہ ہماری ٹیم کو کیا ہو گیا ہے؟ ہمیشہ انڈیا سے ہار کر واپس آ جاتی ہے، غیرت تو نام کو نہیں رہی اب ان میں۔"

"نہیں دانش یہ بات نہیں، کھیل میں ہار جیت ہوتی ہی ہے۔ اس کے لیے ٹیم کے ساتھ عوام کو بھی اب دل بڑا کر لینا چاہیے۔" انہی باتوں کے دوران بھاپ اڑاتی چائے اور مزیدار سموسے بھی آ گئے۔

"لو جی شروع ہو جاؤ! ان سموسوں کے آگے تو ایمان سے ہر چیز ہیچ لگتی ہے۔" میں نے مزے لے کر کہا اور ہاتھ بڑھانے ہی لگا تھا کہ دانش نے فٹافٹ سب سے بڑا سموسہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور ساتھ وہ سی، سی کرنے لگا۔ گرما گرم سموسہ جھٹ منہ میں جو ڈالا تھا۔

"بڑا بدتمیز ہے تو...... ہمیشہ یہی کرتا ہے اچھی چیز فوراً اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیتا ہے، چل اِدھر دے یہ سموسہ تُو وہ چھوٹا والا کھا۔" میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے سموسہ لیا اور کرسی کھسکا کر پیچھے کر لی۔

"کیسی باتیں کرتا ہے تیمور، تو نے کھایا میں نے کھایا ایک ہی بات ہے، چل کیا یاد کرے گا۔ کھا کھل کے کھا۔ میرا والا بھی لے لے۔"

"جتنا ٹائم تم دونوں اس ناچیز سموسے پر ضائع کر رہے ہو ناں لگتا ہے اگلی کلاس لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ بہت امپورٹنٹ لیکچر ہے اور میں مس نہیں کرنا چاہتا۔"

"یار مرتضٰی! تمہیں تو بس پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ ذرا زندگی بھرپور انجوائے کرو، ہنسو کھیلو، یہ کیا باسٹھ سال کا بوڑھا بابا بنے پھرتے ہو۔"

"دیکھو دانش! میں تمہاری اور تیمور کی طرح امیر باپ کا بیٹا نہیں، میں ایک سیلف میڈ انسان کا بیٹا ہوں اور مجھے اپنی زندگی اور گھر والوں کے خواب پورے کرنے کے لیے بہت محنت کرنی ہے اور آگے جانا ہے۔" یہ کہہ کر مرتضٰی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے اسے روک لیا۔

"مرتضٰی تم نے تو برا منا لیا۔ دانش کی تو عادت ہے بکواس کرنے کی۔ چلو چھوڑو جلدی کھاؤ اور کلاس لینے چلو۔ واقعی یہ لیکچر بہت امپورٹنٹ ہے۔ ہمیں فائنل پروجیکٹ میں مدد دے گا۔"

ہم تینوں اپنی کلاس کی طرف چل پڑے اور دانش سارے راستے ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھ سے اور مرتضٰی سے معافیاں مانگتا رہا اور ہنساتا رہا۔

☆☆☆

میں یعنی تیمور رضا، دانش حیدر اور مرتضٰی کمال تینوں گہرے دوست تھے۔ ہماری دوستی کا یہ سلسلہ پہلی کلاس سے لے کر ماسٹرز تک یونہی برقرار رہا بلکہ وقت کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ

ہمارے طبقاتی فرق نے بھی اس پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہی تھی کہ ہمارے ماں، باپ نے کبھی امیری، غریبی کو اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی ہماری پرورش ایسی کی تھی۔

میں اور دانش کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے پر اس کے باوجود ہم سلجھے اور تمیز دار تھے۔ میرے ابو کا فیملی بزنس تھا۔ بچوں کے کپڑے بنا کر ایکسپورٹ کرتے تھے جبکہ دانش کے ابو پرائیویٹ بینک میں وی پی کی پوسٹ پر تھے۔

دوسری طرف مرتضٰی تھا۔ سرکاری اسکول کے ٹیچر کا بیٹا جو پل پل حسرتوں اور غریبی میں جیا تھا پر اس میں آگے بڑھنے کی شمع بجھ نہ پائی تھی بلکہ یہ اور لو دینے لگی تھی۔ اس کے والدین نے اپنی غریبی کے باوجود بچوں کی پڑھائی کے ساتھ سمجھوتا نہ کیا اور مرتضٰی نے بھی اپنی غریبی کو اپنی کمزوری نہیں بنایا تھا۔ اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور سلجھاؤ تھا اور آنکھوں کی چمک کچھ کر دکھانے کا عزم رکھتی تھی۔ ہم تینوں پڑھائی میں شاندار تھے پر وہ ہم سب میں زیادہ ذہین تھا۔ اس کی وجہ...... وہ تمام خواب تھے جو اس کے والدین نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے دیکھے تھے اور یہ خواب ہی مرتضٰی کمال کا قیمتی اثاثہ تھے۔

☆☆☆

آخر کار ہم نے اپنے والدین اور اساتذہ کے تمام خواب پورے کیے۔ فائنل رزلٹ آ چکا تھا اور ہر دفعہ کی طرح مرتضٰی نے پہلی، میں نے دوسری اور دانش نے پانچویں پوزیشن لی تھی۔ مرتضٰی کو گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ یہ دن ہماری زندگی کا بہت یادگار دن تھا...... ہماری کامیابی کا دن۔ آج کے بعد ہمیں ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا تھا۔ عملی زندگی، اپنے خوابوں کو حقیقت کی شکل دینی تھی۔ ہم پُرعزم تھے، پُریقین تھے پر ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے بچھڑنے کی اداسی بھی تھی کہ نہ جانے اپنی منزلوں کو ڈھونڈتے، ڈھونڈتے ہم کہاں سے کہاں چلے جائیں۔

"آج ہم مل کر یہ عہد کرتے ہیں کہ وقت کا دھارا ہمیں بہا کر جہاں بھی لے جائے، خواہ ہم ترقی کی جس منزل پر ہوں، ہم ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔" میں نے مرتضٰی اور دانش کا ہاتھ پکڑا اور بڑے عزم اور جذبے سے اس دوستی کو آخری سانس تک نبھانے کا وعدہ کیا۔

"ہم ہر خوشی اور غمی میں مضبوطی سے جڑے رہیں گے، یہ فاصلے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور کوئی لڑکی بھی ہماری دوستی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔" دانش نے فضا میں اپنا ہاتھ بلند کر کے پُرجوش انداز میں کہا۔

"یار ایک تو، تُو گھوم پھر کر لڑکی کو بیچ میں لے آتا ہے۔ اس سنجیدہ موضوع میں صنفِ نازک کی مداخلت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے سخت بیزار ہو کر کہا تو مرتضٰی بھی ہنسنے لگا۔

"یہ مداخلت کی وجہ سے ہی پانچویں پوزیشن پر آیا ہے ورنہ ٹاپ نہ کر لیتا۔"

"تم دونوں تو ٹھہرے بدذوق لوگ...... میں آخر اپنے جذبات کیوں ختم کروں۔ میرے نزدیک تو وہ مرد ہی نہیں جسے صنفِ نازک میں کشش نہ محسوس ہو۔"

"سن برخوردار! دلچسپی ہر مرد کو ہوتی ہے پر اس طرح کے جذبات کا عامیانہ اظہار نہ کیا جائے۔ عزت اسی میں ہے جو تُو اپنی ایسی باتیں کر کے ہر دفعہ گنوا چھوڑتا ہے۔" مرتضٰی نے قہقہہ لگایا۔

"دانش تیری وجہ سے سارا ماحول خراب ہو گیا، ہم اتنے سنجیدہ اور ایموشنل ہوئے تھے۔ چل اب سزا کے طور پر ہمیں برگر کھلا۔" میں نے فوراً ٹوکا۔

"سنجیدہ نہیں رنجیدہ کہو۔ ایک تو میں نے تم لوگوں کا موڈ اچھا کیا ورنہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے والی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ اب برگر بھی میں کھلاؤں؟ نہ بھئی نہ......

امریکن سسٹم کرتے ہیں اپنا، اپنا کھاتے ہیں۔“
”ٹھیک۔“ ہم تینوں نے حامی بھری اور ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

وہ دن ہماری آزادی، لاابالی پن اور مستی کا آخری دن تھا۔ آگے زندگی بہت سی کٹھنائیاں اور امتحان لیے کھڑی تھی۔ میں پڑھائی کے بعد اپنے والد کے بزنس میں شامل ہوگیا۔ ابو نے امریکا میں اپنی گارمنٹ پروڈکٹس متعارف کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اسے میں نے سنبھالنا تھا۔ سو چند مہینوں میں، میں نے اپنے بزنس کا شاندار آغاز کیا۔ کلائنٹس ہمارے پہلے سے تھے سو مجھے وہاں قدم جمانے میں مشکل نہیں ہوئی۔

دانش کا ہمیشہ سے باہر سیٹ ہونے کا ارادہ تھا۔ وہ انگلینڈ میں جاب ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ پر اس نے اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اچھی جاب کے ساتھ اعلیٰ ڈگری بھی ہو سو اس نے ایم فل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا۔

مرتضیٰ کو پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی۔ اس کی قابلیت اور گولڈ میڈل نے اس کی کامیابی کی منزلوں کو آسان بنا دیا۔ اسے نہ صرف یونیورسٹی کی طرف سے گھر ملا بلکہ میڈیکل اور گاڑی کی سہولت بھی مہیا ہوئی۔ اس کی محنت اور جستجو نے آج وہ دن دکھایا تھا کہ چھوٹے سے مکان میں رہنے والا آج اپنے گھر والوں کو زندگی کی آسائشیں اور خوشیاں دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے مقابلے کے امتحان کی بھی تیاری شروع کردی۔ اگلے چند سالوں میں ہم تینوں اللہ کے فضل سے اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ ہوگئے۔ زندگی کا کام ہے چلنا سو وہ بڑی برق رفتاری سے چلتی جارہی تھی۔ پر اس گزرتے وقت نے ہمیں اور قریب کردیا تھا۔ ہماری دوستی فاصلوں کی محتاج نہیں تھی۔ فیس بک اور اسکائیپ نے یہ فاصلے مٹا دیے تھے۔

میں اور دانش ہر سال پاکستان کا چکر لگاتے تو تینوں آپس میں ملنا نہیں بھولتے تھے۔ باہر جا کر اپنوں سے دور ہو کر ہی اپنوں کی قدر ہوتی ہے۔ انسان ان رشتوں کو ملنے کے لیے ترس جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ باہر کی سرزمین کی رعنائیاں بھی ہمیں وطن کی مٹی سے دور نہ کرسکیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم تینوں کی شادیاں ہوگئیں۔ ماشاءاللہ سے بچے ہوگئے اور ہم اپنی، اپنی فیملی میں مصروف ہوگئے۔ شکر ہے ہم تینوں کو بہت ہی سلجھی اور ملنسار شریکِ حیات ملیں جنہوں نے ہماری دوستی کو اور مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اب بھی جب ہم فیملیز کے ساتھ ملتے تو کوشش ہوتی کہ ہماری یہ ملاقات یادگار بن جائے۔

جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے، ذمے داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ اب پاکستان کا چکر کم لگتا تھا۔ دو تین سال گزر جاتے، گرمیوں کی چھٹیوں میں بیوی بچے تو پاکستان چلے جاتے پر کام کے بوجھ نے ہمیں مجبور کردیا تھا۔ اسے چھوڑ کر جایا نہیں جاسکتا تھا۔

☆☆☆

ایک دن میرا دل بہت بے چین اور اداس تھا۔ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر میں نے دانش کو انگلینڈ فون ملایا۔

”کیا حال چال ہے یار......؟ بڑا عرصہ گزر گیا تیری شکل دیکھے اور تیری بونگیاں سنے ہوئے۔ چل پاکستان چلنے کا کوئی پروگرام بناتے ہیں۔“

”ہاں یار کیوں نہیں...... میرا بھی اب دل اداس ہے اور میں کام کے بوجھ سے ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں۔ ویسے بھی گوریاں دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا۔ مشرقی حسن کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔“

”یہی انداز تو تیرا میں یاد کرتا ہوں.. پھر کیا خیال ہے اگلے ہفتے کی ہی کوئی سیٹ نہ بک کروائی جائے۔ میں ہنس پڑا۔“ دونوں پلان بناتے ہیں اور اس دفعہ مرتضیٰ کو سرپرائز دیتے ہیں۔“

”ہاں! ہمیں اچانک دیکھ کر بڑا خوش ہوگا، ٹھیک ہے میں اپنا شیڈول چیک کرتا ہوں اور اگلے ہفتے ٹائم نکالتا ہوں۔“

☆☆☆

یوں ہم نے پانچ سال بعد دوبارہ پرانی محفلوں کو گرم کرنے کا پروگرام بنایا اور اگلے ہفتے میں امریکا سے اور تین دن بعد دانش انگلینڈ سے پاکستان پہنچا۔ ان پانچ سالوں نے ہمیں کافی تبدیل کردیا تھا۔ دانش کی قلمیں سفید ہوگئی تھیں اور ایک عدد چشمے کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔

”اوئے دانش تمہیں تو چشمے سے شروع سے بڑی چڑ تھی کہ کوئی تمہیں چشمودین نہ کہے۔“

”یار تب کی بات اور تھی، چشمہ لگانے سے لڑکیاں گھاس نہیں ڈالتی تھیں پر اب تو اس عمر میں چشمہ بڑا گریس فل لگتا ہے۔“

”عمر تیری بڑھی ہوگی میں تو اب بھی خود کو ینگ اور energetic سمجھتا ہوں۔“ میں ذرا اکڑ کر بولا۔

”young energetic boys کی نہ تو توند نکلی ہوتی ہے اور نہ ہی ٹنڈ لشکارے مار رہی ہوتی ہے۔ وڈا آیا young تے energetic“

”دانش یہ تو زیادتی ہے توند تو نکل آئی ہے کہ سارا دن آفس میں بیٹھے رہنا اور کھانا پینا...... پر میرا ماتھا ذرا سا کیا بڑا ہوگیا تو نے ٹنڈ ہی بنا ڈالی۔“ میں نے مصنوعی شکوہ کیا تھا۔

”یار ہنسی مذاق ہی تو ہماری دوستی کا خاصہ ہے، دل پر نہ لے تو، تو اب بھی ہینڈسم لگتا ہے جس پر کبھی کالج کی لڑکیاں فدا ہوتی تھیں۔“

”دیکھا مرتضیٰ ٹھیک ہی کہتا تھا، دانش کی تان لڑکی پر ہی آکر ٹوٹتی ہے، مجھے بتا کس دن مرتضیٰ سے ملنے جانا ہے۔“

”کس دن کا کیا مطلب......؟ کل ہی چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے کل، شام دونوں وہاں پہنچ کر اسے سرپرائز دیتے ہیں۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

پر ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہمارے بجائے تقدیر ہمیں ایک بھیانک سرپرائز دینے والی تھی جس نے ہمیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔

☆☆☆

اگلے دن ہم ٹھیک پانچ بجے مرتضیٰ کے دروازے پر تھے۔ بھابی ہمیں دیکھ کر حیران ہوگئیں۔ بڑا پُرتپاک استقبال کیا اور بیٹھک میں بٹھا کر کہنے لگیں۔

”بھائی صاحب یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا جو اتنے سالوں بعد پاکستان کا چکر لگا ہی لیا۔ ایمان سے سب بڑے ہی اداس تھے۔ مرتضیٰ تو آپ دونوں کو دیکھیں گے تو ان کی تو عید ہوجائے گی۔ میں ابھی بلاتی ہوں انہیں۔“

بھابی چائے کا پوچھ کر مرتضیٰ کو بلانے چلی گئیں۔ دونوں بچے ہم سے بہت محبت سے ملے، ہم جو تحائف چاکلیٹس، پھل وغیرہ لائے تھے انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اتنی دیر میں بیٹھک کا دروازہ کھلا تو یہ کیا......؟ ایک کمزور سا شخص پیلا چہرہ، بالوں میں سفیدی نمایاں وہیل چیئر پر بیٹھا کمرے میں داخل ہوا جو خستگی اس کے چہرے پر تھی وہ ہمیں حیران اور ششدر کردینے کو کافی تھی۔ کیا یہ مرتضیٰ تھا؟

بھابی ویل چیئر دھکیلتی ہمارے پاس لائیں تو مرتضیٰ کی بے رونق آنکھوں میں ایک دم چمک سی ابھری۔ وہ جوش میں اٹھ کر گلے ملنا چاہتا تھا پر نقاہت کے باعث واپس وہیل چیئر پر ڈھے گیا۔

”تیمور، دانش تم دونوں اچانک یہاں؟ یقین نہیں آرہا۔“ ہم دونوں پریشانی میں صوفے سے اٹھ چکے تھے اور بے یقینی کی کیفیت میں اپنے جگری دوست کو اس حالت میں دیکھ رہے تھے۔

”مرتضیٰ یہ تمہیں کیا ہوا؟ ان پانچ سالوں میں

"ہماری تقریباً روز ہی بات ہوتی تھی، تم نے کبھی ذکر تک نہیں کیا کہ تم اتنے بیمار ہو، کیا ہوا ہے تمہیں؟ کب سے... یہ حالت ہے؟" دانش تڑپ کر بولا۔

"صبر، صبر یار تم تو شروع ہی ہو گئے، سانس تو لو، مجھے اچھی طرح تم دونوں کو دیکھنے تو دو، یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔" مرتضیٰ نے ماحول کو بہتر بنانے کی ناکام کوشش کی۔

"بعد میں...... ؟ اور کتنا بعد میں میرے دوست! تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور اب بھی کترا رہے ہو۔" میں اس کی بات سن کر غصے میں آ گیا۔

"اسی لیے نہیں بتایا کہ پردیس میں بیٹھے تم دونوں میرے لیے پریشان ہو گے۔ مجھے احساس ہے ناں تم دونوں مجھے کتنا چاہتے ہو تو اپنوں کو تنگ کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔" مرتضیٰ وہیل چیئر چلاتا ہمارے پاس آیا اور ہم دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"لیکن یار ذکر تو کرتے، کچھ تو بتاتے، تیرے لیے سب کچھ چھوڑ کر آ جاتے..... تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے تو تنگ کرنے کی بات کرتا ہے۔ تیرا سہارا بنتے، کوئی ڈاکٹر ڈھونڈتے۔" میں نے بڑی بے تابی سے کہا کہ اس کی یہ حالت میں قطعاً برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

"تم لوگوں کو اسی لیے بتانا نہیں چاہتا تھا ورنہ تو تمہاری بھابی نے بڑا اصرار کیا تھا۔ چھوڑو اب یہ بیماری خدا کی طرف سے آئی ہے، انشاء اللہ وہی اب شفا بھی دے گا۔ علاج کروا رہا ہوں پہلے سے فرق ہے۔" صاف لگ رہا تھا مرتضیٰ بات ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟"

کتنی دیر تو وہ خاموش رہا جیسے الفاظ اکٹھے کر رہا ہو۔ ہمت پیدا کر رہا ہو ہمیں بتانے کی اور جب بولا تو یوں لگا جیسے ہمارے سروں پر بم پھٹ گیا ہو۔

"مجھے نفرائٹس ہے، میرا ایک گردہ فیل ہو گیا ہے اور دوسرے کی کارکردگی بڑی تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ بہت علاج کروایا پر اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ پچھلے تین سالوں سے ڈائیلاسز کروا رہا ہوں۔ اب ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ جان بچانی ہے تو ایک ہی حل ہے۔"

"کیا......؟"

"کڈنی ٹرانسپلانٹ!" شکستہ سے الفاظ مرتضیٰ کی زبان سے ادا ہوئے۔

"اتنی بڑی بیماری تو اکیلے جھیل گیا؟ آج مرتضیٰ تم نے ہم دونوں کو پرایا کر دیا یار۔" اتنا کہہ کر دانش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل تھا کہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ مرتضیٰ جانتا تھا کہ یہ ناراضی نہیں اس کی بیماری کے دکھ کے آنسو ہیں...... پر اب ہم دونوں کو تسلی دینے کی شاید اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ خود بھی ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم نے کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا؟ کوئی second opinion لی؟"

"تم second opinion؟ میں اتنے ڈاکٹروں کو چیک کروا چکا ہوں، سب مانے ہوئے ڈاکٹرز ہیں، ان سب کا ایک ہی مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے ٹرانسپلانٹ کروا لو۔"

"جب تمہیں پتا ہے تو دیر کیوں کی؟ کوئی ڈونر ڈھونڈو! یا تم ہمت ہار چکے ہو، اس بیماری کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے؟ مرتضیٰ تیرے حوصلے کی تو ہم داد دیا کرتے تھے۔ اب کیوں اتنا مایوس ہو گیا ہے۔"

"نہیں میرے بھائیو مایوس نہیں ہوا، جب کوئی راستہ نہ دکھے تو پھر صبر کر لینا چاہیے۔ میں بھی خدا کی مرضی جان کر اس پر راضی ہو گیا ہوں۔ جہاں تک ٹرانسپلانٹ کا سوال ہے تو وہ بھی اتنا آسان نہیں۔ پوری دنیا میں لا پاس ہو چکا ہے کہ اپنے عزیز و اقارب کے علاوہ کوئی اور گردہ ڈونیٹ نہیں کر سکتا۔"

"تو تم نے اپنے رشتے داروں سے بات کی؟ تمہاری تو بہنیں تھیں۔" میں نے پوچھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ بھلا اپنی زندگی داؤ پر لگانے کے لیے کبھی کوئی رضامند ہوا ہے۔ کوئی میرے لیے اپنی صحت کیوں خراب کرے۔ ویسے میں نے اپنی طرف سے ایک دو قریبی رشتے داروں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی پر جواب کا مجھے پہلے سے ہی علم تھا اور رہی بات بہنوں کی تو دونوں ہی کو شوگر ہے۔" مرتضیٰ پھیکی ہنسی سے بولا۔

"اس سب کے باوجود تم سہتے رہے اور ہمیں بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"بس اسی لیے تو میں live chat میں نہیں آتا تھا کہ تم لوگوں کو پتا نہ چلے۔"

"اب بس تیری ایک نہیں چلے گی، میں اور دانش فیصلہ کریں گے کہ اب کیا قدم اٹھانا ہے۔ تم تو ہمیں بھول گئے پر ہم نہیں بھول سکتے۔" میں نے بڑے عزم سے کہا۔

"نہیں، میں بھولا نہیں ہوں۔" مرتضیٰ کمزور دلیل پیش کرنے لگا تو دانش نے ٹوک دیا۔

"رہنے دے دیکھ لیا ہم نے، میرا ایک کزن ایک بڑے اسپتال میں اسپیشلسٹ ہے، تم اپنی تمام فائلز اور رپورٹس مجھے دو، اس سے مشورہ لے کر دیکھتے ہیں، وہ کیا کہتا ہے۔ اب تیرا علاج ہم کروائیں گے۔"

"دانش بات علاج کی نہیں، میں بھی یہاں کے بہترین ڈاکٹر سے علاج کروا رہا ہوں۔ مجھے پیسے کی تنگی نہیں ہے مسئلہ صرف ڈونر کا ہے جو ناممکن ہے۔"

"اگر اللہ کی ذات پر بھروسا ہے تو مان لو کہ ڈونر بھی اللہ عطا کرے گا۔ میں تجھے یوں پل پل مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میری دوستی کی توہین ہے۔"

ہم کیا سوچ کر مرتضیٰ سے ملنے آئے تھے اور کیا لے کر واپس جا رہے تھے۔ بڑے اداس ہو کر ہم نے الوداع کہا۔ سارے راستے ہم خاموش رہے کہ کچھ کہنے کے لیے اب باقی نہیں بچا تھا۔ ہمارا قریبی

پُرسوز غزل

زندگی سے بیزاری بڑھ گئی ہے
اندر سے شاعری مر گئی ہے
کیسے پرکھوں میں اب زمانے کو
میری ساری طراری مر گئی ہے
ہُڑک اٹھتی نہیں اب جانے کی میکے
میری ماں پیاری جو مر گئی ہے
عید کا دن اور وہ کسی اور کے ساتھ
مہک مہندی کی ساری مر گئی ہے
مت پوچھ سکھی گزرے برسوں کا حال
میری تو ہنسی ہی ساری مر گئی ہے

شاعرہ: عنبرین کاظمی اشک، فیصل آباد

دوست ہمارا بھائی آخری سانسیں لے رہا تھا اور ہم بے بس تھے۔ میں نے دانش کو گھر ڈراپ کیا اور بے مقصد سڑکوں پر گاڑی چلاتا رہا۔

☆☆☆

ہم تینوں ہنستے کھیلتے بچپن سے لے کر اب تک ایسے جیے تھے کہ کبھی گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم میں سے کوئی بچھڑ کر چلا جائے گا۔ ہم تین جسم اور ایک جان تھے۔ ہماری خوشیاں اور ہمارے غم سانجھے تھے۔ آج مرتضیٰ کی یہ حالت دیکھ کر میں ابھی تک شاک میں تھا۔ دل تھا کہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ہم تینوں کا ساتھ اب بہت کم رہ گیا ہے۔ وہ ہمیں چھوڑ کر جا رہا تھا یہ ہم سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ پر حقیقت سامنے تھی اپنی بھیانک صورت لیے جس سے نظریں چرانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے باپ نے تو کسی طرح اسے پڑھا لیا تھا اور خود مرتضیٰ نے محنت کر کے یہ مقام بھی حاصل کر لیا تھا مگر اب اس کے بچے کیا اس کے سائے سے بھی محروم ہونے جا رہے تھے بس اس سے آگے میں نہیں سوچ سکا۔

اگلے دن میں نے دانش کے ساتھ مرتضٰی کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔ اسے ایک لمحے کو بھی آنکھوں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے باہر لے جائیں گے اور اپنی نگرانی میں اس کا علاج کروائیں گے۔ جب ہم دونوں اس کے گھر پہنچے تو بھابی ہمیں اس کے کمرے میں ہی لے گئیں۔ وہ لیٹا آرام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی ہماری طرح ساری رات سو نہیں سکا۔

''اوہ میرے شیر برادر کیا حال ہے؟'' دانش نے آگے بڑھ کر اسے لیٹے لیٹے ہی گلے لگایا۔

''شیر کہاں کا یار......؟'' مرتضٰی کی نحیف سی آواز نکلی۔

''ہم نے کل ساری رات یہی سوچا کہ تمہاری بیماری کا کیا علاج کیا جائے۔ مجھے تو یہی بہتر لگا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ امریکا لے جاؤں۔ ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے۔ شاید وہاں ہمیں کوئی ایسا حل مل جائے کہ تمہاری دوسری کڈنی بچ جائے اور اس کی کارکردگی کو یہیں روک لیا جائے۔'' میں نے اسے امید کی کرن دکھائی۔

''نہیں، میں اب اور محتاج نہیں بننا چاہتا، میں پہلے ہی شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ اپنی جوان بیوی کو میں نے اس عمر میں بیوگی کا خوف دے چھوڑا ہے۔ میرے بچے مجھے ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ پتا نہیں کل ابو کو دیکھ سکیں گے کہ نہیں۔ اب میں تم دونوں کو بھی اسی سولی پر لٹکا دوں۔ خدا کے لیے تمہارا یہ جذبہ ہی میرے لیے کسی انعام سے کم نہیں، اب اور کسی پہ میں بوجھ نہیں بن سکتا۔''

''کیسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو تم، اللہ نہ کرے تمہارا سایہ کبھی تمہارے بیوی بچوں پر سے اٹھے۔ کیوں اتنا غلط سوچتے ہو۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ اس کی یہ باتیں سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

''غلط نہیں یار، میں روز جیتا ہوں اور روز مرتا ہوں، میری بیوی جب چھپ، چھپ کر روتی ہے تو کیا اس کی آنکھوں کی سرخی کو میں دیکھ نہیں سکتا؟ جب ساری، ساری رات وہ سجدے میں گری گڑگڑاتی رہتی ہے تو اس کی تڑپ کو کیا میں محسوس نہیں کر سکتا؟ میرے بچے جب باپ سے کھیلنے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کو ترستے ہیں تو کیا ان کے معصوم مرجھائے چہروں کو نظر انداز کر سکتا ہوں؟ نہیں میرے دوستوں نہیں۔'' مرتضٰی کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

''میں مرنا نہیں چاہتا، میں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں، ان کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں، میں نے جیسے سسک سسک کر اپنا بچپن گزارا، میں نہیں چاہتا وہ بھی اپنا بچپنا کھوئیں۔ میں تم سب کو چھوڑ کے جانا نہیں چاہتا پر میرے سامنے کالے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں، میری خوشیوں، میرے ارمانوں کی دھجیاں بکھیرتی یہ حقیقت میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔''

یہ کہنا تھا کہ مرتضٰی کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ کمر پکڑ کر دُہرا ہو گیا اور درد سے کراہنے لگا۔ بھابی بھاگتی ہوئی آئیں اور پریشانی میں اس کی کمر سہلانے لگیں۔

''کیا ہوا ہے آپ کو......؟ بتائیں ناں؟'' وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔

''د......درد ہو رہا ہے......ک......کچھ کرو۔''

میں نے اور دانش نے فوراً اسے پکڑ کر گاڑی میں لٹایا اور تیز رفتاری سے گاڑی چلا کر ایمرجنسی میں لے گئے۔ نرسوں نے فوری طور پر درد رفع کرنے کی دوا ڈرپ کے ذریعے دی اور نیند کی دوا کے اثر سے اسے نیند آنے لگی۔ ڈاکٹر کو فوراً بلوایا گیا۔ اسی ڈاکٹر سے مرتضٰی اپنا علاج کروا رہا تھا۔ وہ بھی اپنے مریض کی حالت دیکھ کر فکرمند ہو گیا۔ اس نے نرس کو کچھ ہدایات اور ٹیسٹ لکھ کر دیے اور ہمیں اپنے کمرے میں بلایا۔

''جی، آپ کیا لگتے ہیں مریض کے؟'' ڈاکٹر

نے پوچھا۔

''ہم دونوں اس کے رشتے دار ہیں۔ اس کی بیماری کا سن کر کل ہی پردیس سے آئے ہیں۔''

''آپ کو اب پتا چلا ان کی بیماری کا؟ وہ تو پچھلے تین سالوں سے زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے حیرانی سے ہمیں دیکھا اس کے اس طرح دیکھنے پر ہمیں واقعی شرمندگی ہوئی۔

''بس ڈاکٹر صاحب......! یہی اس نے غلطی کی کہ کسی کو اطلاع نہ کی۔''

''دیکھیں مسٹر ویسے تو زندگی اور موت کا مالک پروردگار ہے پر جو کنڈیشن آج میرے سامنے ہے، وہ بہت تشویش ناک ہے۔ ان کا ایک ہی گردہ کام کر رہا ہے جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ درد ہونے کا مطلب ہے کہ اب گنجائش پہلے سے کم رہ گئی ہے۔ ان کا فوراً ٹرانسپلانٹ ہو تو زندگی کی صورت بن سکتی ہے۔'' ڈاکٹر خود آج کافی پریشان لگ رہا تھا۔

ہم کیا کرتے کیا نہ کرتے۔ بالکل صحرا میں بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح تھے۔ جنہیں اپنی منزل کا تعین کرنا مشکل لگ رہا تھا اور زندہ رہنے کے لیے سامان بڑی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ میں ویٹنگ روم میں بیٹھا خالی الذہن آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اپنا غم کس سے بانٹتا دانش تو خود میری جیسی کیفیت میں مبتلا تھا۔

اس وقت مجھے خدا کے علاوہ کوئی اپنا ساتھی نہ لگا۔ یہ وہ ہستی تھی جس سے میں اپنا غم ہلکا کر سکتا تھا۔ دانش اسپتال میں مرتضٰی کے پاس ٹھہرا اور میں گھر آ گیا۔ دل تھا کہ کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ دماغ تھا کہ فوری کوئی حل چاہتا تھا، میں نے وضو کیا اور نماز ادا کی اور رو رو کر مرتضٰی کی صحت کی دعائیں مانگیں اور اُدھر ہی بیٹھ کر آیتِ کریمہ کا ورد کرنا شروع کیا۔

آج میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ خدا سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے جائے نماز بچھائی تو میرا پور پور مرتضٰی کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔ میں نے سسک، سسک کر خدا سے اپنے دوست کی سانسیں مانگیں۔ میں نے اس دن پہلی بار جانا کہ واقعی خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو ہمیں تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اور ہمارے دلوں کے حال کو ہم سے پہلے جان لیتا ہے۔ خدا نے مجھے ایسا راستہ دکھایا کہ امید کی کرن میرے سامنے جگمگانے لگی۔ میں نے آدھی رات کو دانش کو فون کیا تو پتا چلا کہ ڈاکٹر نے مرتضٰی کو دو دن کے لیے روک لیا تھا اب اس کے پاس اس کی بیوی تھی دانش کی حالت بھی مجھ جیسی ہی تھی۔ میں نے اسے دل کی بات بتائی تو وہ مجھے کہنے لگا کہ ایک بار پھر سوچ لوں۔ جلد بازی سے کام نہ لوں...... پر میں کیسے دوبارہ سوچ سکتا تھا۔ یہ فیصلہ تو میرے خدا کا فیصلہ تھا۔ جو قادرِ مطلق ہے، تمام جہانوں کے مالک کی یہی رضا تھی اور میں اس پر مطمئن تھا۔

☆☆☆

میں نے اگلے دن ہی جا کر ڈاکٹر سے مرتضٰی کا علاج باہر کرانے کی بات کی اور اسے اشارہ بھی دیا کہ جلد ہی ڈونر کا انتظام بھی ہو جائے گا پر ڈاکٹر نے کہا کہ جب تک مرتضٰی کی حالت سنبھل نہیں جاتی اور ہمیں یقین نہیں ہو جاتا تب تک سفر کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اب مرتضٰی کب تک سنبھلتا یہ ایک نشان تھا۔

دوسری طرف میں اور دانش صرف ایک مہینے کی چھٹی لے کر آئے تھے وقت تھا کہ پانی کی طرح بہے جا رہا تھا۔ پر ابھی کرنے کو بہت کچھ باقی تھا۔ دانش بھی بڑا فکرمند تھا۔

''یار میں تو اپنی چھٹی کی توسیع بھی نہیں کروا سکتا اور اس صورتِ حال میں اپنے جگری دوست کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''فکر نہ کر...... انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جائے گا۔ میں نے سوچا ہے تم تو اپنا آفس جوائن کرو، میرا تو بزنس ہے میں یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ فلائٹ اپنی آگے کروا لیتا ہوں اور اس کے باہر جانے

کے کچھ انتظامات مکمل کروالیتا ہوں۔ تب تک امید ہے مرتضیٰ کی حالت بہتر ہوجائے گی تو سفر کے بارے میں بھی معلوم کرلوں گا پر تمہیں دوبارہ ضرور آنا پڑے گا میرے بھائی۔"

"دوبارہ آنا مسئلہ نہیں ہے، تم دونوں کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" دانش نے میرا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے دبایا۔

"یار جان کی نہیں صرف ساتھ کی ضرورت ہے۔"

"انشاءاللہ یہ ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔"

دانش ہفتے بعد انگلینڈ واپس چلا گیا۔ اس دن میں نے خود کو بہت تنہا محسوس کیا۔ ہم دونوں کا ساتھ بڑی ڈھارس تھی ایک دوسرے کے لیے...... پر مجبوریاں بھی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں، سب سے پہلے تو میں نے سوچا کہ پاسپورٹ بنوایا جائے اس کے بعد ہی انتظامات کا سلسلہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

میں نے بھابی سے مرتضیٰ کے تمام کاغذات لیے اور پاسپورٹ آفس پہنچا۔ بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ اندر پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اتنے سال باہر رہ کر سسٹم اور نظم وضبط کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ یہاں کا نظام بے ہنگم لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اندر پہنچ کر کاؤنٹر کے آگے لمبی قطار میں جگہ بنائی۔

میں نے ارجنٹ پاسپورٹ کی درخواست دی تھی جو کم از کم 15 دن میں ملا، پاسپورٹ آفس میں جو بیتی وہ الگ داستان ہے۔ اب ویزا لینا بہت آسان تھا کیونکہ علاج کی غرض کے لیے ایمبیسی جلد ویزا لگا دیتی ہے۔

رفتہ رفتہ مرتضیٰ کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ یہ بھی معجزہ ہی تھا۔ وہ بول رہا تھا، کھا پی رہا تھا پر سفر کے قابل پھر بھی نہیں تھا۔ اب میری چھٹی بھی ختم ہو رہی تھی۔ میں نے مرتضیٰ کو الوداع کیا اور جلد دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ اتنے عرصے میں، میں... چاہتا تھا کہ امریکا کے انتظامات کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں۔

ہمیں ڈاکٹر کے سفر کے لیے اجازت نامے کے ساتھ ساتھ ان تمام ائرپورٹ پر مرتضیٰ کے لیے طبی سہولیات کی ضرورت بھی تھی۔

میں تمام امور پر کام کر رہا تھا، میں اور دانش روز فون کر کے بھابی اور ڈاکٹر سے مرتضیٰ کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ جب سے ہم نے اللہ کے کلام پر توکل کیا تھا مرتضیٰ کی صحت میں معجزاتی طور پر بہتری آنی شروع ہوگئی تھی۔ بے شک اللہ ہی کارساز ہے۔ ناامیدی میں امید دلانے والا سوائے اس ہستی کے اور کوئی نہیں۔

اس تمام مرحلے کو تین مہینے لگے۔ تین مہینے بعد میں اور دانش دوبارہ پاکستان آرہے تھے۔ اب منزل ہمارے سامنے تھی۔ حوصلے اور عزم سے ہمارے دل سرشار تھے اور خدا پر کامل یقین تھا کہ جس مقصد کے لیے ہم مرتضیٰ کو امریکا لے کر جارہے ہیں۔ انشاءاللہ اس میں اللہ ہمیں کامیاب وکامران کرے۔ اسپتال سے اجازت نامہ بنوایا، ائرپورٹ پر اس کی دیکھ بھال کا انتظام اور انتہائی نگہداشت میں اسے امریکا لے کر جانا سب کٹھن مراحل تھے پر جب اللہ کا ساتھ شاملِ حال ہو تو تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔

امریکا کے نامور گردے کے اسپتال میں مرتضیٰ کے لیے تمام بکنگ ہوچکی تھیں بس ہمارے پہنچنے کے ہفتے بعد مرتضیٰ کا کڈنی ٹرانسپلانٹ تھا۔

☆☆☆

یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ ہماری زندگی کے مشکل ترین دن تھے، اللہ کے کرم سے مرتضیٰ کا آپریشن سو فیصد کامیاب رہا اسے ایک گردہ لگا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کے بعد آئی سی یو میں شفٹ کر دیا اور ایک مہینے تک اس کی حالت کا معائنہ کرنا تھا۔

جب مرتضیٰ کو اگلے دن ہوش آیا تو کسی کو اپنے پاس نہ پا کر گھبرا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب میرے دوست تیمور اور دانش کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی کسی کو بھی آپ سے ملنے کی اجازت نہیں دو دن بعد جب آپ کو کمرے میں شفٹ کریں گے تو آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

تین دن بعد مرتضیٰ کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کیا گیا تو وہ... ہم دونوں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ دانش بھی اس کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا اور جذباتی ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے پورا یقین تھا خدا ہم تینوں کو کبھی الگ نہیں کرسکتا اور آج تمہاری زندگی کی صورت میں خدا نے مجھے بہت قیمتی تحفے سے نوازا ہے۔"

"یہ سب تم دونوں کی محنت اور کوششوں کا ہی نتیجہ ہے ورنہ میں نے تو اپنی بیماری سے سمجھوتا کرلیا تھا۔" پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر دانش سے پوچھا تھا۔ "یہ تیمور نظر نہیں آرہا؟ کیا گھر گیا ہوا ہے؟"

"تیمور تمہارے ساتھ والے کمرے میں داخل ہے، اس نے آج دوستی کا حق ادا کر دیا۔ یہ حوصلہ جو اس نے دکھایا ہے شاید ہی کوئی دکھا سکتا۔"

"کیا مطلب......؟" مرتضیٰ حیرانی سے دانش کو سن رہا تھا۔

"تیمور نے ہی اپنا ایک گردہ تمہیں ڈونیٹ کیا ہے۔"

مرتضیٰ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے دوست نے اپنی دوستی کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے دی۔ وہ قربانی جو شاید اس کے سگے بہن بھائی بھی نہ دے پاتے۔ وہ حوصلہ ایک غیر نے پیدا کیا تھا محض دوستی کے رشتے کی خاطر! آج اسے یقین آگیا کہ خون کے رشتے ہی سچے نہیں ہوتے، خلوص کے رشتے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں، مرتضیٰ کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے آنسو تھے اور الفاظ نہیں تھے جس سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کر پاتا۔

"بس یار رونے کے دن ختم ہوئے، اب ہم مل کر پھر سے اپنی زندگی جئیں گے۔" دانش نے اس کے کاندھے کو تھپتھپا کر کہا۔

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ ڈونر کوئی امریکا کا رہائشی ہے جو اپنی خوشی سے گردہ دینا چاہتا ہے اور فارم پر تو نام بھی اور تھا یہ سب اچانک کیسے ہوگیا؟ تیمور نے گردہ دیا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اس نے اپنے گھر والوں سے پوچھا؟" مرتضیٰ ابھی تک اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

"تم نے جیسے بڑا بتا دیا تھا ہمیں اپنی بیماری کا......! زیادہ ذہن پر زور مت دو، طبیعت خراب ہوجائے گی، انشاءاللہ تیمور کو کچھ دنوں میں ڈسچارج کردیں گے تو تفصیلاً بات کریں گے بس تم خدا کا شکر ادا کرو، جس نے وسیلہ بنایا۔" دانش نے اسے تسلی دی اور ہلکی پھلکی باتیں کر کے اس کا دھیان بٹایا۔

☆☆☆

جب مجھے ڈسچارج کیا گیا تو میں بہت نقاہت محسوس کر رہا تھا پر مرتضیٰ سے ملنے کو بے چین تھا۔ میں جب اسے دیکھنے گیا تو خوشی ہوئی کہ اس کی صحت میں بہتری آرہی تھی جو کہ بہت حوصلہ افزا بات تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مرتضیٰ خوشی سے چہک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز بھرا گئی تھی۔

"تیمور میرے دوست، میرے بھائی، تم سے ملنے کو میں کتنا بے تاب تھا بتا نہیں سکتا۔ تم دونوں نے جو قربانی میرے لیے دی ہے میں مرتے دم تک اس کا قرض نہیں اتار سکتا۔ میں...... میں میرے پاس الفاظ......الفاظ نہیں ہیں۔"

مرتضیٰ کی ہچکی بندھ گئی تھی اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ماحول رنجیدہ ہوگیا۔ ہم بھی رو پڑے۔ یہ وہ آنسو تھے جو کتنے مہینوں سے ہمارے اندر جمع ہو رہے تھے۔ ان کا بہہ جانا ہی اچھا تھا۔

"یاروں میں کس طرح تم دونوں کا شکریہ ادا کروں۔" وہ سرتاپا شکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اوئے، میں نے تو صرف تم دونوں کو خون ہی دیا ہے، میرا شکریہ رہنے دے بس مجھے آئرن کی گولیاں خرید دینا۔ تیرا شکریہ پورا ہوجائے گا۔" دانش نے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے اپنی ازلی مزاحیہ طبیعت کا نمونہ چھوڑا اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔

"تم کسی موقع پر ہنسی مذاق سے باز نہیں آتے۔ پر یہ سب ماجرا کیا ہے اب تو مجھے بتادو۔" مرتضٰی آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

"یار مرتضٰی تمہیں ہم دونوں میں سے کسی کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، یہ ہمارا فرض تھا اب ہمیں شرمندہ نہیں کرو، دراصل جب ہم دونوں کو تمہاری بیماری کا پتا چلا تو مانو ہم پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بڑی بے بسی تھی۔ بس پھر خدا سے التجا کی اور دیکھو نتیجہ تمہارے سامنے ہے، ہر کام اللہ کے فضل سے آسانی سے ہوتا چلا گیا۔

"میں نے پاکستان میں ہی اپنے ارادے سے دانش کو آگاہ کردیا تھا اور وہ بھی راضی تھا۔ ہم جب تمہاری رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے ہمارے تمام ٹیسٹ کروائے۔ حیرت کی بات بتاؤں اس دن ہمیں پہلی بار پتا چلا کہ ہم تینوں کا بلڈ گروپ A+ ہے یہ وہ پہلی کڑی تھی جو خدا نے ملائی تھی۔ ہمارے گردوں کی screening ہوئی، کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر نے دوبارہ بلایا تو تمام رپورٹس کی بنیاد پر انہوں نے میرا گردہ ڈونیٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ ویسے تو دانش کی بھی تمام رپورٹس صحیح آئی تھیں پر بلڈ پریشر کی وجہ سے اسے خطرہ ہوسکتا تھا۔"

"تم اب آرام کرو تیمور تمہاری سانس پھولنے لگی ہے، باقی میں بتاتا ہوں۔" دانش نے میری حالت دیکھ کر بات آگے بڑھائی۔ "مرتضٰی تمہارے تمام کاغذات بنوا کر ہم نے اس شعبے کے قابل ترین ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور انتظامات مکمل کروائے۔ اس سے بہت درخواست کی کہ فارم میں تیمور کا نام نہ ظاہر ہو پہلے تو وہ نہ مانا پر بہت اصرار کرنے پر اس نے اجازت نامے پر ہم دونوں کے دستخط لیے اور دوسرے کاغذات پر تمہارے دستخط لیے اسی لیے تمہیں پتا نہیں چل سکا کہ کون تمہیں گردہ دے رہا ہے۔"

"یہ کوئی قرض نہیں ہمارا فرض تھا۔ دوستی میں اگر احساس باقی نہ رہے تو لعنت ہے ایسی دوستی پر۔" ہم تینوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میں نے مرتضٰی کا ہاتھ تھاما اور کہا۔

دانش نے ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "آج ہم تینوں ایک بار پھر اکٹھے ہیں اور آخری سانس تک اکٹھے رہیں گے۔"

"انشاءاللہ۔" ہم یک زبان ہوکر بولے۔

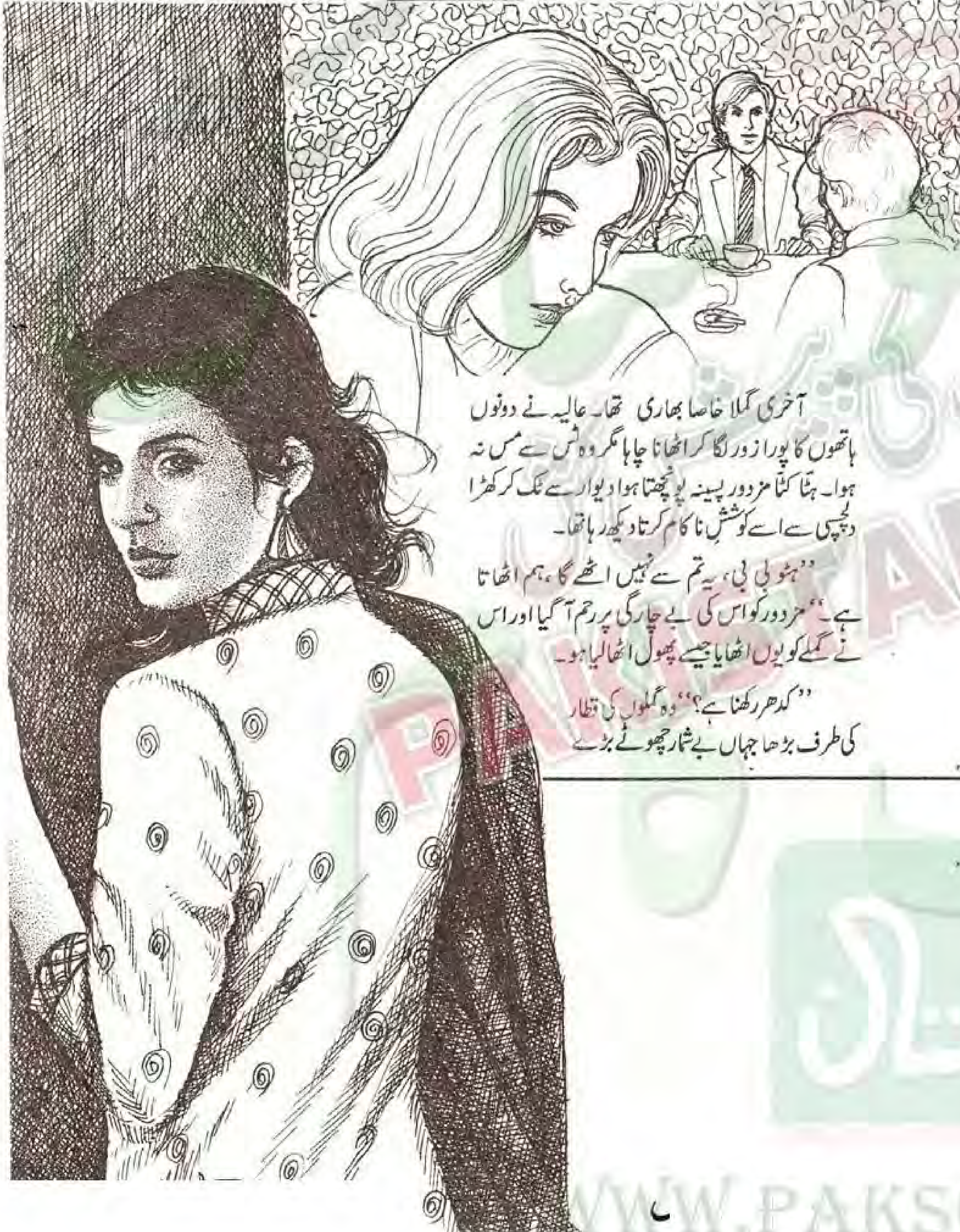
☆☆☆

اس کے بعد مرتضٰی کی صحت میں بہت بہتری آئی۔ وہ اپنے پاؤں پر چلنے لگا تو مہینے کے بعد اسے پاکستان جانے کی اجازت مل گئی۔ تمام عمر کے لیے پرہیز، احتیاط اور دوائیاں اس کی ضرورت بن گئیں پر زندگی کے لیے یہ کوئی برا سودا نہیں تھا۔ دانش نے مرتضٰی کو پاکستان چھوڑا اور واپس انگلینڈ چلا گیا۔ میں ایک گردے کے باوجود صحت مندی کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہ احساس مجھے ہمیشہ پُرسکون اور مطمئن رکھتا ہے کہ میری یہ کوشش کسی کی زندگی کا باعث بنی ہے۔ ہر رشتے میں محبت قربانی اور احساس ہی اسے خوب صورت بناتا ہے اور اسے مضبوط کرتا ہے، آج یہی احساس اور خلوص سے بھرپور ہماری دوستی ہم تینوں کا قیمتی اثاثہ ہے۔ سچ ہے۔

دوستی ایسا ناتا جو سونے سے بھی مہنگا
جو سونے سے بھی مہنگا

مرد کی جوتی

گل رعنا



آخری گملا خاصا بھاری تھا۔ عالیہ نے دونوں ہاتھوں کا پورا زور لگا کر اٹھانا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہٹا کٹا مزدور پسینہ پونچھتا ہوا دیوار سے ٹک کر کھڑا دلچسپی سے اسے کوشش ناکام کرتا دیکھ رہا تھا۔

"ہٹو بی بی، یہ تم سے نہیں اٹھے گا، ہم اٹھاتا ہے۔" مزدور کو اس کی بے چارگی پر رحم آگیا اور اس نے گملے کو یوں اٹھایا جیسے پھول اٹھالیا ہو۔

"کدھر رکھنا ہے؟" وہ گملوں کی قطار کی طرف بڑھا جہاں بے شمار چھوٹے بڑے

گملے رکھے ہوئے تھے۔

''اُدھر۔'' کھسیا کر عالیہ نے جگہ بتائی۔ اس نے گملا جگہ پر رکھا اور دھم دھم کرتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔

چھوٹے سے صحن میں جیسے بہار آ گئی تھی۔ لال گیروا پھرے ہوئے لال' لال گملوں میں ہرے ہرے پتوں کے درمیان میں گلاب، چنبیلی اور موتیا کے پھول دمک رہے تھے۔ اسے شروع سے پیڑ پودوں کا شوق تھا۔ اماں کے گھر میں تھی تو بڑے سے صحن میں چار اطراف کیاریاں بنا کر ابا نے اس کے لیے ڈھیروں پھولوں کے پودے لگوائے تھے۔ اس کی تین بہنوں میں سے کسی کو ایسا شوق نہیں تھا۔ بس وہ تھی کہ بارش، پھول، چاندنی راتوں کی دیوانی تھی۔ چار بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اللہ نے اماں، ابا کے آنگن میں بلال کو اتارا تھا مگر جانے کیا بات تھی۔ بلال کی آمد بھی ابا کی نظر میں اس کی اہمیت کم نہ کر سکی۔ وہ اس کے ہر شوق کی دل کھول کر ہمت افزائی کرتے۔ بڑی تینوں بہنوں کی شادیوں کے بعد وہ اور بلال خوب مزے کرتے۔ اردو ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد اس کا ارادہ جاب کرنے کا تھا مگر اس سے پہلے ہی ذیشان کی اماں نے اسے اپنی کسی جاننے والی کے گھر میلاد میں نعت پڑھتے سن لیا وہ تو مانو دیوانی ہو گئیں۔ جھٹ پٹ اس کا کھوج نکال کر اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ دھمکیں۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر اس معاملے میں ابا بھی اماں کے ہم نوا نکلے اور یوں چھ ماہ میں وہ ذیشان کی دلہن بن کر ذیشان کے گھر پہنچ گئی۔

سلجھی ہوئی نرم طبیعت کا مالک ذیشان اسے پا کر نہال تھا۔ ماں باپ کی رائے اور مرضی پر چلنے کا صلہ اسے خوب ملا تھا۔ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہنیں اپنے، اپنے گھر میں پُرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں۔ عالیہ کا واسطہ نرم خو کھلے دل و دماغ والے ساس سسر سے پڑا تھا۔ زندگی میں کوئی تلخی نہ تھی، کوئی الجھن نہ تھی۔ سوا سال کے بعد اللہ نے اس کی جھولی میں گول مٹول سلمان ڈال دیا۔ ساس سسر پوتے کے دیوانے......

عالیہ نے خوش اسلوبی سے سارا گھر سنبھال رکھا تھا مگر قدرت کے کھیل نرالے۔ سلمان کی تیسری سالگرہ منائے پانچ دن ہی گزرے تھے کہ کسی عزیز کی شادی میں حیدرآباد جاتے ہوئے ذیشان کی بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ تین دن، تین راتیں عالیہ اور اس کے ساس سسر پر قیامت بن کر گزریں۔ ذیشان زخموں سے چور آئی سی یو میں ہوش و حواس سے بیگانہ پڑا تھا۔ کوئی مَنّت، کوئی عبادت، کوئی دعا کچھ بھی قبول نہ ہوئی تیسرے دن ذیشان خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

عالیہ پر تو جو بیتی سو بیتی اس کی ساس کا تو جیسے دماغ الٹ گیا۔ عالیہ نے ہمیشہ ان کی محبت دیکھی تھی اب نفرت دیکھی تو جیسے جیتے جی مر گئی۔

''منحوس، ڈائن...... میں نے کتنا کہا تھا کہ تو بھی ذیشان کے ساتھ شادی میں چلی جا مگر نہیں، تجھے تو اپنا بیٹا پیارا تھا۔ سلمان بے آرام ہوگا پرائے گھر میں۔ ارے اگر تو ساتھ ہوتی تو میرے بیٹے پر آئی بلا تجھ پر پڑ جاتی۔ ہائے میرا بچہ...... اس بڑھاپے میں دغا دے گیا۔ ارے لوگو! بیویاں تو اپنے شوہروں پر جان نچھاور کرتی ہیں۔ ایک یہ خود غرض، مطلب پرست...... پوچھو کیا، کیا عیش نہیں کروائے ذیشان نے اسے مگر مصیبت کے وقت اس نے میرے بچے کو اکیلے بھیج دیا۔'' وہ زار زار رو رہی تھیں۔ عالیہ چور بن جاتی۔ اس کے اپنے دل کا گھاؤ اتنا بڑا تھا مگر ساس نے تو اسے کھل کر رونے بھی نہ دیا۔

سسر نیک آدمی تھے کبھی بہو کو پیار کرتے، پوتے کو سنبھالتے کبھی بیوی کی دل جوئی کرتے مگر ساس کا رویہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔

ذیشان کے چالیسویں کے دن ساس نے یہ پروا کیے بغیر کہ اس کی عدت کے دن ہیں اسے گھر

سے نکال دیا۔ صدمے نے ان کا دماغ بالکل ہی الٹ دیا تھا۔ وہ عالیہ کا سایہ بھی اپنے گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ نندوں اور سسر کے سمجھانے پر کہ تھوڑے دن گزریں گے تو ان کا صدمہ ہلکا ہو جائے گا تم واپس آ جانا۔

عالیہ نے مختصر سا سامان سمیٹا اور میکے آ گئی۔ اس کی شادی کے دو سال بعد بلال کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ گھر میں اب امی سے زیادہ دخل بھاوج ماہ نور کا تھا۔ بلال، امی اور ابا نے کھلے دل سے عالیہ کا استقبال کیا مگر ماہ نور کے ماتھے کی شکن گہری ہو گئی۔

عدت کی مدت گزارنے تک عالیہ کا اپنی دونوں نندوں اور سسر سے فون پر رابطہ رہا۔ بڑی نند سیما نے بتایا کہ اماں کی طبیعت قدرے بحال ہو رہی ہے اور اب کبھی کبھی وہ اپنے پوتے سلمان کا پوچھ لیتی ہیں۔ عالیہ کے دل میں امید کی جوت جاگی۔ اسے وہ گھر اس گھر میں گزارے ذیشان کی قربت میں مہکتے لمحے بہت یاد آتے تھے۔ اس کا دل چاہتا وہ اس کمرے میں جہاں وہ دلہن بن کر اتری تھی، ذیشان کی یادوں سے گلے مل کر خوب روئے۔

ایک دن سیما کا فون آیا کہ اماں نے اسے بلایا ہے۔ خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھلے وہاں ذیشان نہ تھا اس کے عزیز و اقارب تو تھے۔ وہ گھر تو تھا جسے سلمان کا گھر کہنے میں اسے فخر ہوتا۔ باپ کا گھر بیٹے کا ہی ہوتا ہے ناں۔ وہ روتے دل کے ساتھ وہاں پہنچی۔

ساس نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی اور سلمان کو لپک کر گلے لگا لیا پھر جو پھوٹ، پھوٹ کر روئیں تو سارا گھر رو پڑا۔

''عالیہ، میں نے تمہیں یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ اپنا سامان یہاں سے اٹھا لو۔ شوہر کے مرنے کے بعد اب تمہارا اس گھر پر کوئی حق نہیں۔ ویسے بھی آج نہیں تو کل تم نے دوسری شادی تو کرنی ہی ہے

لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس گھر میں سیما کو رکھ لوں۔ ویسے بھی وہ کرایے کے گھر میں رہتی ہے۔ بیٹی سے بڑھ کر بڑھاپے میں ماں باپ کی خدمت کون کرسکتا ہے۔ تم چاہو تو وہ سب سامان بھی لے جاؤ جو ذیشان نے تمہارے لیے خریدا تھا مطلب زیور، کپڑے سب کچھ......'' وہ تو ششدر اُن کی شکل دیکھ رہی تھی۔ کہاں وہ محبت، وہ پیار لٹانے والی اور کہاں یہ کرخت چہرے اور کرخت لہجے والی اماں۔

''میں اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے باپ کے گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ میں کوئی دوسری شادی کرنے والی نہیں۔ میں سلمان کو پڑھا لکھا کر بڑا کروں گی۔ اسے باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گی۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا مت کریں اماں پلیز......'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''نہیں بی بی نہیں، فیصلہ تو ہو چکا۔ اب سیما ہی اس گھر میں رہے گی۔''

''مگر اماں میں...... میں کہاں جاؤں؟''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔'' اماں نے کندھے اچکائے۔ سیما چور بنی ایک طرف کھڑی تھی۔ بھائی کی جدائی کے ساتھ ساتھ بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجے کی دربدری اسے اچھی تو نہیں لگ رہی تھی مگر یہ دنیا مطلب کی ہے۔ چار بچے نکما شوہر، کرایے کا گھر بہت سی سہولتیں اماں کے گھر میں مل سکتی تھیں۔ اسے بھاوج کے دکھ سے بڑے اپنے مسائل نظر آ رہے تھے۔

عالیہ نے بہت منت سماجت کی مگر فیصلہ ہو چکا تھا۔ ایک فیصلہ عالیہ نے خود سے کیا۔ پڑھی لکھی باشعور عورت تھی نہ وہ سسرال میں رہے گی نہ میکے میں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر زندگی گزارے گی۔

اماں، ابا اور بلال سب ہی اس کے اس فیصلے پر خفا ہوئے۔ اس نے سب سے پہلے اپنی ڈگری جھاڑ پونچھ کر نکالی۔ اپنی پرانی سہیلی کی وساطت سے شہر کے ایک نامور اسکول میں جاب حاصل کرنے کے بعد اس نے اسی سہیلی کی بہن کا ایک کمرے کا گھر کرایے پر حاصل کرنے کا فیصلہ کیا 120 گز کے گھر میں صحن سے زینہ نکال کر چھت پر ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ سامنے صحن چھوڑ دیا گیا تھا۔ کمرے کے برابر میں چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ کمرے میں ہی اٹیچڈ باتھ روم بھی تھا۔

سو آج عالیہ اپنے نئے آشیانے میں منتقل ہوئی تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا تھا۔ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا پہلے باپ کا گھر پھر بھائی کا گھر پھر بیٹے کا گھر مگر ابھی تو بیٹا بہت چھوٹا تھا۔ وہ خود اپنی ماں کے گھر میں تھا، ماں کی آغوش میں تھا۔ ماں کی بانہوں کے حصار میں تھا۔ گملے سنوار کر رکھ دیے تو اسے کمرے کی سیٹنگ کا خیال آیا۔

ابا اور بلال بھائی روز ہی اس کی خیر خبر لینے آجاتے تھے۔ کئی بار سسر صاحب بھی آئے۔ سلمان کے لیے بہت سارے گفٹس لے کر...... عالیہ نے مروت میں منع نہیں کیا آخر حق تو اُن کا بھی بنتا تھا۔

اس کے الگ رہنے سے سب سے زیادہ خوشی ماہ نور کو تھی۔ اتوار کے اتوار وہ سلمان کو لے کر میکے جاتی تو وہ اس کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتی۔ کھلے دل کا عالم تو اللہ ہی کو پتا تھا یوں زندگی کے تھال میں عمر کے سکے گرتے چلے گئے۔ سلمان کی پانچویں سالگرہ آ پہنچی۔ وہ ہمیشہ کی صابر شاکر اپنی نوکری اپنی چھوٹی سی چار دیواری میں قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔

سلمان کی سالگرہ اس نے اماں، ابا، بلال، بہنوں اور ماہ نور کے ساتھ منائی تھی۔ کھانا کھا کر بلال گاڑی نکالنے لگا تاکہ اسے اس کے گھر چھوڑ دے تو اماں نے اس سے ایک عجیب بات کہی۔ اس کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''اب کب تک یوں تنہا زندگی گزارو گی۔ سلمان کو بھی باپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ ہم

تمہاری دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''اماں......!'' وہ سکتے میں آگئی۔ ''اماں...... سلمان کو باپ کی ضرورت ہے؟ کیوں...... کیوں اماں میں نے اس کی زندگی میں کس چیز کی کمی چھوڑ دی ہے۔ ماں اور باپ دونوں بن کر اسے پال رہی ہوں۔ کسی کی محتاجی نہیں ہے۔ میں کیوں اسے سگے سوتیلے رشتوں میں الجھاؤں؟'' وہ پھٹ پڑی۔

''بس کرو بی بی بس، بہت تمہاری ضد پوری کرلی ہم نے۔ تنہا رہنے کا شوق بھی پورا کردیا ہم نے تمہارا۔ ناجیہ کے دیور کا رشتہ آیا ہے تمہارے لیے۔'' انہوں نے اس کی منجھلی بہن کا نام لیا۔

''وہ...... وہ اماں وہ تو شادی شدہ ہے، بچوں والا ہے۔'' وہ شاکڈ رہ گئی۔

''شادی شدہ ہے نہیں...... تھا، طلاق دے دی اس نے اپنی بیوی کو اور رہے بچے تو تم بھی تو بچے والی ہو۔''

''مگر اماں، وہ تو مزاج کا بھی بہت تلخ ہے۔ ہمیشہ اپنی بیوی کو مارا پیٹا کرتا تھا۔'' بہن کا دیور ہونے کی وجہ سے وہ اس کے سسرالی عزیزوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ امجد اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا اور اماں اسے کیا مشورہ دے رہی تھیں۔

''ہاں تو جب عورت کی زبان چلتی ہے تو مرد کا ہاتھ تو چلے گا ہی۔'' اماں نے بے پروائی سے ہاتھ جھٹکا۔ ''خیر میں نے اور تمہارے ابا نے فیصلہ کرلیا ہے کہ......''

''فیصلہ...... کیسا فیصلہ اماں......؟ مجھے کبھی دوسری شادی نہیں کرنی۔'' وہ غصے سے چلائی۔

''ارے بس کرو عالیہ ابھی سلمان چھوٹا ہے۔ آسانی سے سوتیلا باپ قبول کرلے گا۔ بڑے ہونے پر اور مسئلے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔''

''اماں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میری چاند، میری بچی۔'' اماں نے اسے [illegible] کر حلقہ [illegible] لیا۔ ''عورت کتنی بھی پڑھ لکھ جائے، کتنی طاقت ور ہو جائے، کتنی ہی پیسے والی ہو...... ہوتی آخر کمزور عورت ہی ہے اور وہ عورت جس کے ذمے ایک معصوم بچے کی پوری زندگی کی ذمے داری ہو...... سوچو ابھی تو تم جوان ہو، ہاتھ پیروں میں دم ہے۔ کما رہی ہو کل کو بڑھاپا ہوگا۔ ناتوانی ہوگی بیٹے کی شادی کردو گی وہ گھر بہو کا ہوگا جسے تم نے سدا اپنا سمجھا تھا پھر...... پھر کیا کرو گی۔ میری بچی جب ہی تو کہتے ہیں مرد کی جوتی بھی بھاری ہوتی ہے۔'' وہ عجب مثال دے رہی تھیں۔

''عقل مندی سے فیصلہ کرو۔ شوہر والی کہلاؤ گی۔ راج پاٹ والی کہلاؤ گی۔'' اماں پتا نہیں کیا، کیا بول رہی تھیں مگر عالیہ کے دماغ میں ایک ہی جملہ اٹک گیا تھا۔

مرد کی جوتی...... مرد کی جوتی اور اب یہ جوتی ہمیشہ اُس کے سر پر پڑنے والی تھی۔

وجۂ تسمیہ

ایک صاحب کی ملاقات کافی عرصے بعد اپنے دوست سے ہوئی تو انہیں ایک دفتر میں معمولی نوکری کرتے دیکھ کر وہ حیرت سے بولے۔

''آپ نے تو بہت اچھی بوتیک کھول رکھی تھی...... اور آپ کے بوتیک کے کپڑے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔''

دوست نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا...... ''ہاں میری بوتیک بہت اچھی چل رہی تھی...... مگر میری سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اس لڑکی سے شادی کرلی جس کی سات بہنیں اور آٹھ بھابیاں تھیں...... تو پھر کس کا بوتیک فائدے میں چل سکتا تھا۔''

مرسلہ: شمسہ رضوان، کراچی

منی ناول



کبھی منزل ، کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے
یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا ہے

راہِ زیست کبھی پُرخار و پُرپیچ تو کبھی رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی راہ پر سفر کرتے ہوئے اجنبی مسافروں سے آشنائی، کبھی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو کبھی راہ گم کردیتی ہے... ایسے ہی ایک مسافر کا دلگداز احوال جو منزل پر پہنچا تو ضرور مگر کیسے...؟

شوبز کی دنیا کے اسرار سے پردے اٹھاتی، گراتی ایک دل فریب روداد

فاران کو اس کے اتنے شدید ری ایکشن کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بہت ٹھٹک کر زنیرا کی جانب دیکھا جس کا چہرہ رنج اور غصے کے زیرِ اثر سرخ ہو رہا تھا اور آنسو اب بھی اس کے رخساروں کو تر کر رہے تھے۔ آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشت لیے وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ فاران نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جیسے اس کی بات کو اگنور کیا اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ زنیرا وہیں گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ کتنی بڑی بات کہہ دی تھی اس نے بنا سوچے سمجھے۔ اگر فاران جذبات میں آکر اس کی کہی ہوئی بات کو پوری کر دیتا تو...... اس نے ایک جھرجھری سی لی۔

"میری روشانہ کا کیا ہوتا، وہ تو ہم لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بکھر رہی ہے اگر میرا فاران سے ہمیشہ کے لیے تعلق ٹوٹ جاتا پھر تو اس کی شخصیت بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ فرحان ابھی بہت معصوم ہے وہ بڑا ہو کر کتنے ہی سوالات کا سامنا خود بھی کرتا اور مجھے بھی کٹہرے میں کھڑا ہونے پر مجبور کرتا...... ابھی میرے دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں انہیں ماں اور باپ دونوں کی ہی ضرورت ہے۔ میں اتنی خود غرض کیسے بن گئی تھی۔ اپنے بچوں کے متعلق بھی نہ سوچا۔ ان کے فیوچر، ان کی خوشیوں کو میں اپنے غصے کی نذر کرنے چلی تھی۔ فاران نے میری عزتِ نفس کو مجروح کیا ہے۔ میری اتنی شدید محبت کی کیسے توہین کی ہے۔ اگر اسے مجھ سے سچی محبت ہوتی تو وہ مجھے میری ساری خطاؤں سمیت ہمیشہ اپنے دل میں بسا کر رکھتا۔ میرے آنسو، میرا ڈپریشن، میری خفگی میری جیلسی اگر اسے پریشان کرتے تھے، ٹینشن میں مبتلا کرتے تھے تو میری وفائیں، میرا عشق، میرا جنون، میری قربانیاں بھی تو اسے معلوم تھیں۔ میں جو اس کے کسی عورت کو تعریفی نظروں سے دیکھنے پر بگڑ جایا کرتی تھی اور وہ میری نیچر کو سمجھتے ہوئے میری اس جیلسی کو کتنا انجوائے کرتا تھا......اور مجھے مناتا تھا لیکن اب اسے یہ سب کسی خرافات سے کم نہیں لگ رہا شاید میری محبت، میری دیوانگی پر اس کے فینز کا جنون اور پیار غالب آ گیا ہے، بے پناہ شہرت اور اہمیت پا کر اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ اسے ایک ڈپریسڈ عورت پر ضائع کرے جو اس کے پیار اس کی توجہ کی اتنی عادی تھی کہ اب وہ اس کی دوری اور بے اعتنائی سہہ نہیں پا رہی......" وہ حد درجہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہی تو ہے۔ بے شمار حسین لڑکیوں کا کریز بن جانے والے شخص کو بھلا اب مجھ میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ٹھیک ہے فاران اب ہم ایک ہی چھت تلے ضرور رہیں گے لیکن دو اجنبیوں کی طرح...... اب میں نہ کبھی آپ سے آپ کی محبت مانگوں گی اور نہ ہی اپنے لیے وقت...... اب میں اپنی روشی اور فرحان کے لیے اس گھر میں رہوں گی۔ آپ نے میری محبت اپنے دل سے مٹا دی۔ اپنے الفاظ سے مجھے میری ہی نظروں میں حقیر کر دیا لیکن پھر بھی میں آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے میری زندگی میں آئے ایک بہت جذباتی اور کمزور لمحے کو اپنی... سمجھداری سے ٹال دیا۔ ورنہ میرا وہ احمقانہ مطالبہ پورا کرنا آپ کے لیے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن آپ نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا...... اس لیے نہیں کہ ابھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں میری محبت باقی رہ گئی ہے بلکہ آپ اپنے بچوں کی ماں کو اُن سے جدا کر کے انہیں توڑنا نہیں چاہتے۔ آپ نے آج ثابت کر دیا کہ آپ ایک بہت اچھے باپ ہیں تبھی تو اُن کی خاطر ایک ناپسندیدہ شخصیت کو اپنے گھر، اپنی زندگی میں برداشت کرنے پر آمادہ ہیں ورنہ اس سے اچھا موقع مجھ سے چھٹکارا پانے کا بھلا آپ کو کہاں مل سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میری حیثیت آپ کی نظروں میں محض گھر کے کسی فالتو

سامان سے زیادہ نہیں ہوگی اور آج میں نے طلاق کا مطالبہ کر کے آپ کے لیے ایک اور جواز پیدا کر دیا ہے کہ آپ مجھ سے مزید خفا ہو جائیں۔ مجھے بالکل تہی داماں کر دیں لیکن فاران اب آپ کی خفگی، آپ کی نفرت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اب کسی قسم کی جیلسی مجھے پریشان نہیں کرے گی۔ آپ کا کہا ایک ایک لفظ انگارہ بن کر اس محبت کو بالکل خاکستر کر گیا ہے جو کبھی میرے سانس لینے کا موجب ہوا کرتی تھی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے گھاس پر اسی طرح دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت بیت چکا تھا اسے کچھ بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ رات کی سیاہی آہستہ، آہستہ دن کی روشنی کو اپنے آنچل میں چھپاتی ہوئی اس کے پھولوں سے مہکتے ہوئے لان میں... اتر آئی تھی۔ اندر بچوں کے ہنسنے اور کھلکھلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اپنا پسندیدہ کارٹون دیکھنے میں وہ اتنے محو تھے کہ انہیں اپنی مما کی غیر موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ فاران اپنے بیڈ روم میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے بہت خاموش سا لیٹا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیا تھا اس نے زنیرا سے...... اتنے دنوں کی گھٹن آج رنگ لے ہی آئی تھی۔ دس سال کی خوب صورت اور حسین رفاقت کبھی اس کے لیے اتنی بد صورت اور عذاب کے مانند ہو جائے گی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ان دو تین سالوں میں جیسے اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات، جذبات، احساسات سب ہی میں بہت تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ زندگی کے اس نئے موڑ پر ابتدا میں زنیرا نے بھی قدم بہ قدم اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا بہت ساتھ بھی دیا تھا۔ ہمت اور حوصلہ بھی بڑھایا تھا اور اپنی نیچر کے برخلاف پریوں کی اس فیلڈ میں صرف فاران کی خوشی کی خاطر اسے اس پرستان کا راجا اِندر بنا ہوا دیکھ کر بھی اپنے لبوں کو سی کر اس کی کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ فاران کی محبت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی البتہ اپنی شدید مصروفیات کی بنا پر اب وہ اسے پہلے کی طرح بھرپور توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ جسے زنیرا سمجھنے کو تیار نہیں تھی اور پھر آئے دن اس کے مشہور ہوتے اسکینڈلز بھی اسے پریشان کرنے لگے تھے۔

فاران لاکھ اسے سمجھاتا کہ یہ سب فلم کی پبلسٹی کے لیے کیا جاتا ہے اور ان ہیروئنز کا اس سے کوئی واسطہ نہیں لیکن زنیرا کا موڈ دنوں آف رہتا۔ اسے یقین تھا کہ رپورٹرز کچھ نہ کچھ دیکھ کر ہی یہ سب کچھ لکھتے ہیں۔ وہ اس دن کے واقعے کے بعد پھر کبھی فاران کی فلم کے کسی بھی سیٹ پر نہیں گئی تھی۔ اسے شیرازی سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد تھا اسی لیے فاران سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے وہ اپنے دکھ، اپنے آنسوؤں کو دل میں چھپا کر ایک عجیب سی گھٹن کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ جسے فاران نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ شہرت کا چڑھتا نشہ اسے کسی اور ہی دنیا کا باسی سمجھنے میں بہت اہم کردار ادا کر رہا تھا جہاں ہر سو لوگ اس کی پزیرائی کے لیے بے قرار نظر آتے تھے۔ ہر عمر اور دونوں صنف سے تعلق رکھنے والے مداح جب والہانہ انداز میں اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے...... اس سے آٹوگراف لینا باعثِ فخر گردانتے تو اسے اپنے آپ پر بے انتہا رشک آتا۔ شیرازی نے سچ ہی کہا تھا کہ اس کی شخصیت اس کی پرسنالٹی میں اتنی کشش اور جاذبیت تھی کہ اس سے کم عمر ہیرو بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں پا رہے تھے...... باہر کی خوب صورت دنیا سے جب وہ گھر واپس لوٹتا تو زنیرا کا مرجھایا ہوا سراپا اور ڈپریسڈ انداز جیسے اسے اپنے اعصاب پر سوار ہوتا ہوا محسوس ہوتا...... اب تو وہ اسے صفائیاں دے، دے کر بھی بیزار ہونے لگا تھا۔ اسے مناتے، مناتے اب وہ تھکنے لگا تھا۔

خوشبوؤں میں بسی ہنستی مسکراتی اپنی خوب صورت کو اسٹارز کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ جتنا

چاق و چوبند رہتا تھا گھر میں اسے اپنے وجود پر ایک عجیب سی پژمردگی طاری ہوتی محسوس ہوتی اور پھر زنیرا کو اپنی سالگرہ والے دن بالکل پرانے والے روپ میں دیکھ کر فاران کو جو خوشی ملی تھی، اسے زنیرا نے کچھ ہی لمحوں بعد واپس لے کر اسے جس اذیت اور تکلیف سے دوچار کیا تھا بس اسی روز سے جیسے زنیرا اس کے دل سے اس کی زندگی سے نکل سی گئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اس کے لیے اب کسی قسم کے جذبات اپنے دل میں محسوس ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ ہاں البتہ اپنے بچوں سے محبت کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔

باہر کی رنگین جگمگاتی دنیا سے واپس گھر لوٹنے کو اب اس کا من نہیں کرتا تھا بس بچوں کا پیار اسے کھینچ لاتا تھا...... اور آج زنیرا کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے اسے ذرا بھی تو اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ یہ وہی زنیرا تھی جس کی آنکھ میں آیا ایک آنسو بھی وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اب اس کے آنسوؤں سے تر چہرے نے بھی اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی۔ کیا وقت اور حالات انسان کے جذبات اس کے احساسات بدلنے پر اتنے قادر ہو جاتے ہیں۔ زندگی اپنے جادوئی آئینے میں ایسے ایسے ناقابلِ یقین مناظر چھپا کر رکھتی ہے جن کا انسان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا...... اور اس وقت فاران کے گھر کا یہ خاموش منظر چلّا چلّا کر بتا رہا تھا کہ یہ گھر جو کبھی محبتوں اور خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا آج وہاں سوائے دکھوں اور رنجشوں کے اور کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

اجمل صاحب جب گھر میں داخل ہوئے تو ایک عجیب سے سناٹے نے ان کا استقبال کیا تھا۔ انہوں نے بڑے اچنبھے سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ صحن میں جلتے ہوئے بلب کی مدھم سی روشنی کے علاوہ باقی دونوں کمروں میں مکمل اندھیرا تھا۔

اتنی جلدی تو اس گھر کے مکین کبھی نہیں سوئے تھے۔ شہزادی اور رانی کی باتیں اور ہنسی تو انیسہ کے بار بار ٹوکنے اور تنبیہ کرنے پر بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ٹی وی بھی ماں کے منع کرنے کے باوجود دیکھنا بند نہیں ہوتا تھا۔ البتہ جب اجمل صاحب گھر میں داخل ہوتے تھے تو ٹی وی کی آواز دھیمی ضرور کر دی جاتی تھی۔ انیسہ ان کے آتے ہی بیٹیوں کو آواز دینا شروع ہو جاتیں۔

''ارے شہزادی دیکھو تمہارے ابا آ گئے ہیں۔ جلدی سے کھانا گرم کر دو۔'' کبھی رانی کو پکارتیں۔

''رانی تمہارے ابا اپنی چپل ڈھونڈ رہے ہیں صفائی میں کہاں چھپا کر رکھ دی تم نے۔'' اور دونوں لڑکیاں ہنستی مسکراتی ایک دوسرے سے نوک جھوک کرتی۔ اپنے ابا کے کام کیے جاتیں اور ساتھ ساتھ ان سے ڈھیر ساری باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ انیسہ بھی اپنے شوہر کی خاطر داری میں ایک پیر سے کھڑی رہتیں۔ جانتی تھیں کہ وہ آفس کے تھکا دینے والے کام کے بعد ٹیوشن بھی پڑھا کر آ رہے ہیں۔ انہیں اپنے شریکِ حیات پر پیار آنے کے ساتھ ساتھ بہت ترس بھی آتا تھا جو اُن لوگوں کی خاطر اتنی زیادہ محنت کر رہے تھے...... لیکن آج اپنے پُر رونق گھر میں ایک مدقوق سا بلب اپنی ملگجی سی روشنی بکھیرتے ہوئے انہیں کسی بہت بڑی انہونی کا احساس دلاتے ہوئے بری طرح دہلا گیا۔

''انیسہ......'' انہوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر بہت زور سے بیوی کو پکارا۔ وہ بدستور صحن میں ہی کھڑے تھے پتا نہیں کیوں اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ان کی...... کچھ ہی لمحوں بعد انیسہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر آئیں...... ان کی متورم آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ بن کہے ہی جیسے انہیں کوئی بری خبر سنا رہا تھا۔

''کیا بات ہے انیسہ، سب خیر تو ہے ناں......؟''

وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں کر پائے۔

''اجمل ہم لوگ بہت پریشانی میں پڑ گئے ہیں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں......'' انیسہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہیں صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں۔ ان کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اصل حقیقت کو چھپا کر اس اچانک صورتِ حال کو کسی اور طرح سے اپنے شوہر تک پہنچانا اس وقت انہیں دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ کتنا مارا تھا انہوں نے شہزادی کو اس کے رونے چلانے کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا ان پر بس دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت اس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ رانی الگ زار و قطار رو رہی تھی۔

''اماں...... کیا آپ میری شادی فقیر محمد سے کریں گی؟'' ماں جب شہزادی کو مار مار کے تھک سی گئی تو۔ رانی نے بہت سہمے ہوئے انداز میں رو رو کر ماں سے پوچھا تھا اور جواباً وہ اسے بے بسی سے بس دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ کبھی کبھی اولاد اپنے ماں باپ کے لیے ایک ایسی آزمائش بن جاتی ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں کہ کاش وہ بے اولاد ہی رہتے۔ انیسہ بھی اس وقت سوچ کی اس نہج پر تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں ان کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں لیکن دونوں کے دلوں کی کیفیت مختلف تھی۔ ایک کے آنسو بے بسی میں ڈوبے ہوئے تھے اور دوسری ان کی مار کی چوٹ کھا کر رو رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی غصے اور بغاوت کے شعلے دہکتے محسوس ہو رہے تھے۔ شوہر کے آنے سے پہلے انہیں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا تھا۔ فقیر محمد کا حتمی لہجہ انہیں بتا گیا تھا کہ شہزادی اب اسے کسی بھی حال میں قبول نہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے وعدے کی ایک کچی ڈور انہیں تھما گیا تھا کہ وہ اجمل صاحب سے اس ناگوار قصے کا ذکر نہیں کرے گا۔ انیسہ جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے رانی کے لیے بھی فقیر محمد کے رشتے سے انکار کر دیا تو کہیں وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ اجمل صاحب سے بدتمیزی کر کے نہ لے۔ اگرچہ فقیر محمد فطرتاً بہت اچھی فطرت کا انسان تھا۔ لالچ اور طمع سے دور ایسے باکردار نوجوان کو اپنے داماد کے روپ میں سوچ کر ہی دونوں کے دلوں میں سکون سا اتر جاتا تھا لیکن جب کسی انسان کی عزتِ نفس کو چوٹ پہنچتی ہے تو وہ ایسے ری ایکٹ کرتا ہے جیسے فقیر محمد کر رہا تھا۔ اس کے ارمانوں سے بھرے دل کو شہزادی نے کچھ اتنی بے دردی سے توڑا تھا کہ وہ بلبلا ہی اٹھا تھا...... انیسہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر رانی کی جانب دیکھا جو اَب بھی امید بھری

نظروں سے اپنی ماں کی جانب دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ اس کے سوال کے جواب میں اسے لپٹا کر کہیں گی کہ وہ فقیر محمد سے اس کی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں لیکن اس کی توقع کے برخلاف وہ اچانک اٹھیں اور اپنا دوپٹا بیٹی کے پیروں پر ڈال کر خود بھی اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئیں۔

''رانی میری بچی، اب تمہارے ابا کی زندگی' ان کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ انہیں ایسے..... بے موت نہ مرنے دینا۔ شہزادی کے دیے ہوئے زخم پر تم ہی مرہم لگا سکتی ہو رانی...... خدا کے لیے مجھے بچالو، اس گھر کو بچالو۔'' وہ زاروقطار رونے لگیں۔

رانی ششدر سی بیٹھی رہ گئی جبکہ شہزادی نے بہت حیرت سے ماں کو دیکھا لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کا بہت دل چاہا تھا کہ وہ چلّا کر ماں کو ایسا سوچنے سے بھی منع کردے...... جس کنویں میں گرنے سے اس نے اپنے آپ کو بچایا تھا بھلا اس کنویں میں وہ اپنی چہیتی بہن کو کیسے گرنے دیتی لیکن اتنی مار کھانے کے بعد اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ لب بھی ہلا سکے کہ ماں کی نظروں میں اپنے لیے..... بے تحاشا نفرت اور قہر وہ اب بھی محسوس کررہی تھی۔

''رانی تمہارے ابا تو کچھ دیر میں آنے والے ہیں۔ اس سے پہلے مجھے تمہارا جواب سننا ہے تاکہ میں کسی طریقے سے بات کو نبھا سکوں...... اس ذلیل لڑکی نے ہم سب کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ کاش یہ پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔'' انیسہ نے ہاتھ ملتے ہوئے بہت نفرت سے شہزادی کو گھورا لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کا تسلسل نہ ٹوٹا۔

''اماں مجھے فقیر محمد سے شادی نہیں کرنی ہے، خدا کے لیے اس بات کا کوئی اور حل نکال لیں۔'' رانی نے ڈرتے، ڈرتے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بہت ہمت سے کہا تو انیسہ ایک لمحے کو اسے دیکھتی رہ گئیں۔ نہ جانے کیوں انہیں رانی سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ وہ اپنی ماں کے آنسوؤں کی لاج رکھ لے گی، اپنے باپ کی عزت کا بھرم اسے عزیز ہوگا...... انہوں نے بہت بے بسی سے رانی کی جانب دیکھا۔ جانے کیا تھا ان نگاہوں میں کہ رانی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انیسہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اجمل صاحب کے آنے کے بعد اس گھر میں جو قیامت آنی تھی اس کا سوچ کر ہی ان کا دل ڈوبا جارہا تھا۔

''اماں!'' رانی نے بے اختیار انہیں پکارا۔ اس وقت جو بے بسی اسے اپنی ماں کے چہرے پر نظر آئی تھی اس نے جیسے رانی کو اندر تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ انیسہ نے پلٹ کر اسے دیکھا...... شہزادی کی بھی استفہامیہ نظریں بہن کی جانب اٹھی تھیں۔ رانی ایک دم اٹھی اور دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

''اماں آپ جس طرح مناسب سمجھیں ابا سے کہہ دیجیے گا۔ میں اس رشتے پر تیار ہوں۔'' اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں جیسے انیسہ کو خوشیوں کی پھوار میں بھگو دیا۔ انہیں بالکل ایسے ہی محسوس ہوا جیسے گھپ اندھیرے میں اچانک بہت سے چراغ جل اٹھے ہوں۔

''جیتی رہو رانی...... ہمیشہ خوش رہو۔ تم نے اپنی ماں کے دکھ کو سمجھا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے۔'' وہ اسے ایک ایسے سائل کے مانند دعا دے رہی تھیں جسے اچانک اس کی امید سے زیادہ نواز دیا گیا ہو اور ان کی دعاؤں سے بے نیاز رانی بس ان کے چہرے کو تک رہی تھی۔ جس پر بکھری خوشی ایک سکون بن کر اس کے دل میں اتر رہی تھی اور فقیر محمد کا خیال کہیں دور، دور نہ تھا پھر انیسہ ایک ملامت بھری نظر شہزادی پر ڈال کر اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ اب انہیں ایک اور مرحلہ طے کرنا تھا۔ اجمل صاحب کو بتانا تھا انہیں سمجھانا تھا، قائل کرنا تھا کہ لڑکے والے چھوٹی کا

رشتہ چاہ رہے ہیں اور انہیں اس بات کو برا مانے بغیر مان لینا چاہیے کہ اتنا اچھا رشتہ گنوانا حماقت ہوگی...... دوسری طرف اپنی ماں کے لیے جذباتی ہو کر فیصلہ کرنے والی رانی اب ہچکیوں سے رو رہی تھی...... یہ قسمت نے اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا...... شہزادی کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ ایک دم سے ایسے اس کی جگہ پر آگئی، اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ شہزادی کو اپنی بہن پر ترس آنے کے ساتھ، ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔

''رانی مجھے تم سے ایسی حماقت کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔ میں نے تو اپنی زندگی میں آنے والے طوفان کو اپنی ہمت اور حوصلے سے موڑ دیا لیکن تم نے تو خود ہی اس طوفان میں بہہ جانے کی ٹھان لی۔ جانتی ہو ناں خودکشی حرام ہے۔'' اس نے رانی کے آنسو پونچھتے ہوئے اس پر اپنا غصہ بھی نکالا۔

''شہزادی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اماں خوف اور پریشانی سے ختم ہوجائیں گی، ابا جو ہم لوگوں کو اتنا چاہتے ہیں اور آج کل اتنی محنت کے باوجود کتنے خوش اور فریش نظر آرہے ہیں شاید وہ ہم لوگوں کی طرف سے ملنے والے اس دکھ کو سہہ نہ پائیں۔ تم اپنے لیے جی لو شہزادی اور میں اپنے ماں، باپ کی دی ہوئی زندگی جی لوں گی۔'' اس کے جملوں کی تپش نے شہزادی کو سلگا کر رکھ دیا۔

''تم بے شک فلموں کی نیک پروین ہیروئن بن کر اپنے ماں، باپ کی خواہشوں پر قربان ہوجاؤ لیکن میں نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اللہ نے مجھے عقل، سمجھ اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا شعور دیا ہے اور اسلام میں لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہ کرنے کا حکم بھی ہے پھر بھی اگر اماں اور ابا ہمیں ایک ناپسندیدہ زندگی گزارنے پر مجبور کررہے ہیں تو یہ ان کی عاقبت نااندیشی ہے۔ انہیں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہیے۔'' اس کے لہجے میں چھپی بغاوت اور ہٹ دھرمی کچھ ایسی تھی کہ رانی مزید کچھ بولنے کی ہمت ہی نہ کر پائی۔ ویسے بھی وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔

''پتا نہیں کیوں اماں سمجھ رہی ہیں کہ بس فقیر محمد پر ہی دنیا ختم ہے...... کاش وہ اپنے ابا سے اتنی فری ہوتی کہ انہیں سمجھا سکتی ان سے اس رشتے پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرسکتی لیکن باپ اور بیٹیوں کے درمیان حائل جنریشن گیپ کچھ اتنا زیادہ رہا تھا کہ وہ لوگ کبھی اپنے دائرے سے نکل کر ان سے بات نہیں کر پائی تھیں جس میں زیادہ ہاتھ انیسہ کا بھی تھا جنہوں نے ہمیشہ اپنی بچیوں کو باپ سے ڈرا کر رکھا تھا۔ روزمرہ کی سیدھی سادی گفتگو اور معصوم سی شرارتیں جنہیں ابا ہنس کر ٹال جاتے تھے لیکن ان شرارتوں میں بھی ایک ادب ملحوظ رہا کرتا تھا۔ رانی چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے سر سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئی جبکہ شہزادی بھی اپنے جوڑ جوڑ دُکھتے جسم کے ساتھ اپنے پلنگ پر لیٹی آنے والے وقت کا سوچ کر خوفزدہ ہو رہی تھی۔ تبھی ابا کے آنے کی آہٹ اور پھر ان کے پکارنے کی آواز پر وہ دونوں اپنے، اپنے بستروں میں مزید دبک کر رہ گئی تھیں۔

اجمل صاحب بہت پریشانی کے عالم میں انیسہ کو دیکھتے ہوئے ان کے بولنے کے منتظر تھے۔

''بولو انیسہ ایسی کیا بات ہوگئی ہے جس نے پورے گھر میں ایک اندھیرا سا کردیا ہے؟'' انہوں نے متوحش نظروں سے سناٹے اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے اپنے گھر کو دیکھا۔

''اجمل، اصل میں فقیر محمد نے شہزادی سے شادی کرنے سے انکار کردیا ہے۔'' اس بار انیسہ نے ہمت کر کے انہیں یہ خبر سنا ہی دی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو اتنی دیر سے تیار کررہی تھیں۔

''ہیں......؟'' اجمل صاحب نے بے حد شاکڈ ہو کر بیوی کو دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... وہ

لوگ تو اتنی خوشی، خوشی بات پکی کر کے گئے تھے۔ ارے فقیر محمد ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے، ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا اس نے۔'' وہ وحشت کے عالم میں بولتے ہی چلے گئے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا...... انیسہ نے گھبرا کر اُن کا ہاتھ تھام لیا۔

''اپنے آپ کو سنبھالیے اجمل صاحب اور میری پوری بات تو سنیں۔ فقیر محمد اور اس کی ماں کو شہزادی سے بہتر رانی لگ رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ بڑی سے زیادہ سمجھدار... بُردبار اور سگھڑ نظر آتی ہے، ان کے خیال میں رانی ان کے گھر کو سنبھالنے کی زیادہ اہلیت رکھتی ہے۔'' جھوٹ بولتے ہوئے انیسہ کی زبان لڑکھڑائے جا رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے لیکن اجمل صاحب کی صدمے سے ہوتی بری حالت انہیں کچھ زیادہ ہی کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے ان لوگوں کا...... انہوں نے تو رشتے کو مذاق بنا لیا ہے۔ شہزادی سے بات پکی کرنے کے بعد شادی کے اتنے نزدیک اچانک اپنا ارادہ بدل کر رانی کو مانگ لینا...... ارے یہ شریفوں کے لچھن نہیں ہوتے...... میں نے فقیر محمد کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلا...... میں ابھی جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔'' غصے سے وہ برانگیختہ ہو رہے تھے۔ انیسہ نے گھبرا کر انہیں روکنے کی کوشش کی جو باہر جانے کے ارادے سے کھڑے ہوگئے تھے۔

''خدا کے لیے اجمل بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے...... اس میں ان لوگوں سے زیادہ میرا قصور ہے...... اصل میں شہزادی کافی بدتمیز اور منہ پھٹ ہوتی جا رہی ہے...... اور اکثر غصے میں آکر میں ان لوگوں کے سامنے اس کی شکایتیں اور رانی کی تعریف کیا کرتی تھی۔'' انیسہ کانپتے ہوئے دل کے ساتھ سارا الزام اپنے سر لے رہی تھیں...... اجمل صاحب کی اپنے اوپر پڑتی قہر آلود نظریں بھلا وہ کیسے محسوس نہ کرتیں لیکن وہ ماں تھیں بیٹی سے کتنی ہی دل برداشتہ اور خفا کیوں نہ سہی پھر بھی اسے اپنی ممتا کے آنچل میں چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے وہ اپنے شوہر کا سارا عتاب سہنے کو تیار تھیں۔ رانی اندر لیٹی ہوئی ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ دل میں کہیں بہت گہرا سا ملال اتر رہا تھا۔ شہزادی کی غلطی اس کی خودسری کی سزا اماں نے اسے دے کر کتنی ناانصافی کی تھی۔

''کاش شہزادی نے ہی کچھ سمجھداری سے کام لیا ہوتا...... اس طرح فقیر محمد کی بے عزتی کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل ودماغ سے اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتی۔'' رانی نے شکوہ کناں نظروں سے بہن کی طرف دیکھا جو اس کے احساسات سے لاتعلق اماں اور ابا کی باتوں پر اپنی پوری توجہ مرکوز کیے ہوئی تھی۔

''انیسہ میں تمہیں اتنا ناقص العقل نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو بے وقوفی کی تمام حدیں ہی پار کرلیں۔ ارے بھلا کوئی اپنی بیٹی کی ہونے والی سسرال کے سامنے اس کی برائیاں بیان کرتا ہے، سوتیلی ماں بھی ایسی حرکت کرتے ہوئے سو بار سوچے...... انیسہ تمہارے جیسی بیوی پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا لیکن آج مجھے پتا چلا کہ مجھ سا بدنصیب شاید ہی کوئی ہو۔'' اجمل صاحب کا غصہ عروج پر پہنچ گیا شادی کے اتنے عرصے میں پہلی بار وہ اتنی شدت سے انیسہ پر چلّائے تھے۔

انیسہ کے پیر بری طرح کانپنے لگے۔ دل لگتا تھا جیسے ابھی بند ہو جائے گا۔ اپنے دھیمے مزاج کے نرم خو شوہر کا یہ انداز پہلے کبھی دیکھا جو نہیں تھا۔

وہ بے خطا، بے قصور ان کے قہر کا نشانہ بن رہی تھیں۔ کتنی حقیر ہوگئی تھیں وہ پل بھر میں اپنے شریکِ حیات کی نظروں میں...... شہزادی نے تو انہیں جیتے جی مار دیا تھا۔ کاش وہ اپنی بیٹی کو سمجھ جاتیں، ان کے تو

وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شہزادی اتنا سخت قدم اٹھا سکتی ہے ورنہ وہ کبھی اس رشتے پر حامی نہ بھرتیں...... پچھتاوا بہت ظالم چیز ہے بالکل ایک ایسے زہرِ قاتل کی طرح جو انسان کو اندر ہی اندر مار دیتا ہے۔ قطرہ قطرہ اسے پگھلنے پر مجبور کرتا رہتا ہے لیکن انیسہ نے آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر غیظ و غضب سے بھرے شوہر کی طرف دیکھا۔ کاش وہ جان سکتے کہ صرف اور صرف ان کی خوشی ان کی عزت ان کے وقار کی خاطر وہ اس وقت مجرم بن کر ان کے سامنے کھڑی ہیں، اپنی معصوم سی رانی کی خوشیوں، اس کے ارمانوں کو انہوں نے اپنے شوہر کی زندگی اور عزت پر قربان کر دیا ہے۔

''ٹھیک ہے انیسہ میں تمہاری حماقت کی بھینٹ اپنی بیٹیوں کو کبھی نہیں چڑھاؤں گا...... اپنی ایک بیٹی کی سیج اجاڑ کر میں دوسری کے لیے پھولوں کی سیج سجانے کے بجائے اسے ساری زندگی گھر میں تو بٹھا سکتا ہوں لیکن اُس گھر میں دلہن بنا کر ہرگز...... ہرگز رخصت نہیں کرسکتا جہاں سے میری شہزادی ٹھکرائی گئی ہو۔'' انہوں نے قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تو انیسہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں اپنی قربانی رائگاں جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگر اجمل صاحب نے فقیر محمد کو بے نقط سناتے ہوئے اس رشتے سے انکار کیا تو جواباً فقیر محمد ان کی بیٹی کے لیے جو زہر افشانی کرے گا انہیں جس طرح ذلیل کرے گا وہ شاید یہ سب برداشت نہ کر پائیں اور اگر انہیں کچھ ہوگیا تو وہ کیسے جی پائیں گی۔ ان کی بیٹیاں بن باپ کے بالکل بے سہارا ہو جائیں گی۔ انیسہ کو شدت سے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ انہیں بلاوجہ کی جذباتیت سے کام لینے کے بجائے بہت طریقے سے اجمل صاحب کو سارا قصہ سچ، سچ بتا دینا چاہیے تھا۔ انہیں ذہنی طور پر فقیر محمد کے متوقع رویّے کے بارے میں تیار کرلینا چاہیے تھا۔ کیا ہوتا

زیادہ سے زیادہ وہ شہزادی پر ایسے ہی چلّا لیتے جیسے اس وقت وہ ان پر چیخے تھے۔ انیسہ نے بہت بے بسی سے سوچا۔ پچھتاوے کا ناگ ایک بار پھر ان کو ڈسنے کے لیے تیار تھا۔

''نہیں، نہیں اجمل صاحب...... آپ کا فیصلہ بالکل غلط ہے، وہ لوگ بہت اچھے اور شریف لوگ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ شہزادی اس رشتے کے ختم ہونے پر بے حد خوش ہے۔ خدا کی قسم وہ تو اس شادی پر تیار ہی نہیں تھی۔ شاید ان لوگوں نے خود بھی یہ محسوس کرلیا تھا...... آپ جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں...... فقیر محمد کی صورت میں مجھے بیٹا مل رہا ہے۔ خدارا اسے مجھ سے مت چھینیں......'' انیسہ نے روتے ہوئے کچھ اتنے درد سے کہا کہ اجمل صاحب اپنا غصہ بھول کر چپ چاپ بیوی کو دیکھتے رہ گئے۔ انیسہ کی باتوں نے جیسے ان کے دل سے اٹھتے شعلوں پر پانی کے چھینٹوں کا کام دیا تھا۔ ویسے بھی انہیں.... فقیر محمد اپنی عادات واطوار اور کردار کی بدولت بے حد پسند تھا اور شہزادی کے مزاج سے بھی انہیں آگاہی تھی اور انہیں علم بھی تھا کہ شہزادی اس شادی سے کچھ خوش نہیں ہے...... لیکن وہ اسے شہزادی کا بچپنا اور نادانی سمجھ کر نظر انداز کررہے تھے۔ شاید اس اچانک بدلتے حالات میں اللہ کی کوئی بہتری چھپی ہو۔ پل بھر میں انہوں نے بہت کچھ سوچ لیا۔ ویسے بھی اجمل صاحب بہت متحمل مزاج انسان تھے۔ بس انیسہ نے کچھ اتنی اچانک یہ خبر سنائی تھی اور جو وجہ بتائی تھی اس پر وہ بے اختیار بھڑک اٹھے تھے لیکن اب ٹھنڈے دل سے سوچنے پر انہیں بیوی کی باتیں سمجھ آرہی تھیں۔

''ٹھیک ہے اگر شہزادی یہ رشتہ ٹوٹنے پر خوش ہے تو پھر سوچا جاسکتا ہے لیکن انیسہ تم نے رانی سے بھی اس کی مرضی پوچھی ہے یا صرف شہزادی کی ہی خوشی پوچھی ہے تم نے؟'' اجمل صاحب کے اس سوال پر انیسہ کی نگاہوں میں بے اختیار رانی کا آنسوؤں سے تر چہرہ گھوم گیا۔ اپنی بچی کی بے بسی سے انہیں تکتی ہوئی آنکھیں یاد آئیں تو دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر انہوں نے اجمل صاحب کو دیکھا۔

''ہاں...... بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا۔ ہم لوگوں کی رضا میں خوش ہے وہ۔'' اپنا جواب انہیں خود اپنے اوپر ہنستا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو بیٹا کیسی ہو تم؟'' اپنے ابو کی آواز سن کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں ابو بس فاران کی مصروفیات میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا ہے۔'' وہ لہجے کو ہشاش بشاش بناتے ہوئے اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔

''ہاں بیٹا، وہ ماشاء اللہ کامیابیوں کی بلندیوں پر جارہا ہے۔ اب تو میرے آفس میں بھی لوگ خاص طور پر مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں بھئی اس کے سسر ہونے کے ناتے خاصا وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملتا ہے مجھے۔'' پہلی بار اُن کے لہجے میں رچا فخر محسوس کرکے زنیرا کو انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ اپنے ابو پر پیار بھی آیا۔ شکر ہے اب وہ بھی اپنے داماد پر نازاں ہونے لگے تھے ورنہ اس سے پہلے اس نے ہمیشہ اپنے ابو کے چہرے پر الجھن اور فکر کے سائے لرزاں دیکھے تھے۔ کتنے فکر مند رہا کرتے تھے وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے لیکن اب جیسے زنیرا کی طرف سے انہیں اطمینان سا ہوتا جارہا تھا۔ اس کا چہکتا ہوا لہجہ جب بھی وہ فون پر سنتے تو دل میں بہت خوب صورت سا سکون اترنے لگتا تھا۔ اب تو زنیرا بھی اپنی اس ایکٹنگ کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ اپنی اس اذیت میں بھی اسے مزہ آنے لگا تھا۔ زندگی کا یہ نیا موڑ اسے ایک ایسی راہ پر لے آیا تھا جس میں بچھے کانٹوں پر چلنا شاید اس کا مقدر بن چکا تھا۔ اس ایک

ماہ میں وہ اور فاران ایک دوسرے سے اتنے دور ہوچکے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ ایک دوسرے کے اٹوٹ انگ رہ چکے ہیں۔ وہ محبت، وہ دیوانگی، وہ پیار، وہ عشق ایک دوسرے کے بنا سانس نہ لینے کا دعویٰ سب فنا ہوگئے تھے، مٹ گئے تھے، کھو گئے تھے کہیں دوریوں اور نفرتوں کے غبار میں۔ فاران جب شوٹنگ سے واپس آتا تو سیدھا بچوں کے کمرے میں چلا جاتا۔ اگر بچے سو رہے ہوتے تو خاموشی سے اپنے بیڈروم میں جاکر دروازہ بند کرلیتا۔ اس دن کے بعد سے اس نے اپنا بیڈروم بھی تو علیحدہ کرلیا تھا۔ کتنے سرد لہجے میں اس نے زنیرا سے کہا تھا۔

''میں چاہتا تو تمہاری طلاق والی خواہش کو پورا کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگاتا لیکن بہرحال ضروری نہیں کہ وہ تین الفاظ بولے جائیں شاید ہمارے معاشرے کے 80 فی صد جوڑے یہ الفاظ بولے بنا ایک کمپرومائز کی زندگی گزار رہے ہیں۔ زنیرا میں نے یہ قدم بچوں کی خاطر اٹھایا ہے لیکن پھر بھی اگر تم ایسے نہیں رہنا چاہو تو واپس جاسکتی ہو۔ زندگی کسی کے جانے سے رکتی نہیں ہے لیکن یاد رکھو، بچے میرے ہی پاس رہیں گے۔''

زنیرا کو اس کا اجنبی انداز اور دل کو بھسم کرتے وہ سفاک جملے ایک پل کو نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت بھی اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اس دشمنِ جاں کو دیکھا تھا۔

''بچے صرف آپ کے ہی نہیں بلکہ میرے بھی ہیں۔ میں اپنے بچوں کی خاطر زہر بھی پی سکتی ہوں اور زہر آلود زندگی گزارنے میں بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ فاران اب میرے دل میں بھی وہ احساسات نہیں رہے جن کی وجہ سے میں روز جیتی تھی اور روز مرتی تھی۔ بس آپ سے یہ التجا ہے کہ خاندان میں کسی کو بھی پتا نہ چلے کہ ہم دونوں کے درمیان کتنی اونچی دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' فاران نے الجھ کر اس سے پوچھا۔

''آپ فلموں میں اتنی اچھی اداکاری کرتے ہیں کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ پلیز بچوں کے سامنے ہم نارمل طریقے سے رہیں گے اور جب بھی کراچی جائیں گے کسی پر بھی یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ رونا آرہا تھا لیکن آنسو جیسے خشک ہوگئے تھے۔ کچھ لمحوں بعد فاران اندر آگیا۔

''تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فلموں کے علاوہ اب مجھے گھر میں بھی اداکاری کرنا پڑے گی۔'' وہ سخت تپا ہوا لگ رہا تھا۔

''آپ تو ویسے بھی اداکار ہیں، ہاں مجھے البتہ مشکل ضرور ہوگی۔ اپنے گھر کی فلم میں ایک تنہا مظلوم عورت کو خوشیوں کا جھوٹا پہناوا پہناتے ہوئے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔ کبھی کبھی کسی ہنسی میں نوحے رو رہے ہوتے ہیں۔

''دیکھو زنیرا میں کوشش کروں گا کہ میں کراچی کم سے کم جاؤں کیونکہ مجھے دُہری زندگی گزارنا سخت ناپسند ہے۔ میں نے پچھلے دنوں بہت اذیت بھرا وقت گزارا ہے اب میں آزاد فضا میں زندگی کا ایک، ایک پل جینا چاہتا ہوں۔ میں ان گھٹن آمیز لمحوں کو بھول جانا چاہتا ہوں جو تمہاری وجہ سے مجھے گزارنے پڑے۔ تمہاری مظلومیت، تمہاری تنہائی سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ تم جیسی بھی ایکٹنگ کرو میری طرف سے کسی ایوارڈ کی امید مت رکھنا۔'' وہ بے حد تلخ لہجے میں کہتا ہوا الماری میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ اس کی یہ حرکت بہت واضح طور پر زنیرا کو بتا رہی تھی کہ دل کے ساتھ، ساتھ اب ان کے کمرے بھی الگ ہوگئے ہیں۔

☆☆☆

رانی دلہن بنی ہوئی اپنے چھوٹے سے کمرے میں

بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے سپاٹ چہرے پر خوشی کی کوئی رمق نظر نہیں آرہی تھی۔ گہرے سرخ عروسی جوڑے میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ پیشانی پر چمکتا ٹیکا اور ستواں ناک میں پڑی چھوٹی سی نتھ نے اسے دلہناپے کا اتنا حسین روپ دیا تھا کہ اس پر نظر نہیں ٹک رہی تھی۔ محلے کی عورتیں اسے گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔ رضیہ خالہ کا خیال تھا کہ اس نے آج تک اتنی خوب صورت دلہن نہیں دیکھی۔ کچھ زیادہ ہی روپ اتر آیا تھا اس کے چہرے پر یا شاید بہت سیدھے سادے حلیے میں رہنے والی رانی کو پہلی بار سب نے اتنے جگمگاتے روپ میں دیکھا تھا۔ حسین زیورات، جھلملاتے کپڑے اور ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے اس کے حسن کو دوآتشہ بنا دیا تھا۔ شہر کے مہنگے ترین بیوٹی پارلر سے تیار ہوئی تھی وہ۔ انیسہ نے تو منع کیا تھا لیکن فقیر محمد کی اماں کے یہ بتانے پر کہ یہ فقیر محمد کی شدید خواہش ہے اور وہ لوگ اس پارلر سے دونوں دنوں کی بکنگ کروا چکے ہیں۔ فقیر محمد کے گھر سے بری بھی اتنی شاندار آئی تھی کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ فقیر محمد نے اپنی شادی کی خوشی میں یا پھر شہزادی کو جلانے کی خاطر دونوں ہاتھوں سے پیسے لٹائے تھے۔ اپنی ماں کو بتائے بغیر اپنے ابا کا خریدا ہوا ایک پلاٹ بھی بیچ ڈالا تھا اور یہ سن کر تو اجمل صاحب بھی حیران رہ گئے تھے کہ فقیر محمد نے ولیمے کا اہتمام ایک ہوٹل میں کیا ہے گو کہ وہ ہوٹل فائیو اسٹار نہیں تھا لیکن پھر بھی شادی ہال سے زیادہ مہنگا پڑ رہا تھا۔

اس وقت بھی سب ہی عورتیں بہت رشک آمیز نظروں سے رانی کو دیکھ رہی تھیں۔ گلابی کپڑوں میں ملبوس شہزادی کی نگاہیں بھی بار بار رانی کے سراپے میں الجھی جا رہی تھیں۔ بری میں آئے کپڑوں، زیورات اور دیگر قیمتی چیزوں کو بار بار دیکھتے ہوئے بھی اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایک بہت شاندار بیوٹی پارلر میں رانی کے ساتھ گئی تھی۔ جہاں یونیفارم میں ملبوس اسمارٹ سی لڑکیاں کتنی مہارت سے اپنی کلائنٹس کو سروس دے رہی تھیں۔ اس ائرکنڈیشنڈ ہال کا سحر انگیز ماحول اسے کسی اور ہی دنیا میں لے گیا تھا۔

رانی کو تیار ہوتا دیکھ کر اس کا بھی دل چاہنے لگا کہ وہ بھی اپنا ہلکا سا میک کروا لے، بالوں کا کوئی اسٹائل ہی بنوا لے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہاں کے چارجز بہت زیادہ ہیں سو دل مسوس کر رہ گئی۔ رانی سچ مچ کی مہارانی لگ رہی تھی اس وقت۔ تین چار لڑکیاں بیک وقت اس کو تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ اتنی حسین دلہن بن کر تیار ہوئی تھی رانی کہ پارلر میں موجود سب ہی خواتین کی نگاہوں کا مرکز بن گئی تھی۔ ستائشی جملے ختم ہو کر ہی نہیں دے رہے تھے۔ شہزادی خود بھی حیران ہو کر اپنی اس بہن کو دیکھ رہی تھی جس پر روپ ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایک عجیب سے پچھتاوے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر اس وقت وہ رانی کی جگہ ہوتی تو اس کی بھی ایسے ہی پزیرائی ہو رہی ہوتی۔ اس وقت وہ بھی سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوتی۔ وہ دونوں کبھی کبھی تھریڈنگ کروانے یا بالوں کی کٹنگ کروانے اپنے محلے کے ایک چھوٹے سے پارلر میں چلی جاتی تھیں۔ وہ بھی کچھ عرصے سے ابا نے منع کر دیا تھا اور اب رانی کی قسمت کہ وہ اتنے مہنگے بیوٹی پارلر سے اپنا میک اپ کروا رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنے سر کو جھٹک کر اپنے آپ کو تسلی دی۔

”ہونہہ رانی کو ان سب چیزوں کے عوض مل بھی کون رہا ہے وہ فقیر محمد جس پر کوئی ایک نظر بھی ڈالنا پسند نہ کرے۔“ لیکن بارات کے آجانے کے بعد دل میں دوبارہ کچھ کھونے کا احساس جاگنے لگا تھا۔ فقیر محمد کی اماں اور بہنیں بڑی شان سے سب کو اپنے ساتھ لائی ہوئی بری دکھا رہی تھیں۔ دلہن پر صدقے واری ہوتے ہوئے وہ نفرت کی ایک نظر شہزادی پر بھی ڈال لیتی تھیں۔

گھر کے باہر شامیانہ لگا کر وہاں بارات کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ دولہا جب رسموں کے لیے اندر آیا تو شہزادی نے کسی عورت کی آنکھوں میں اس کے لیے تضحیک کی کوئی جھلک نہیں دیکھی بلکہ ہاتھوں ہاتھ اسے لے کر دلہن کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ کوئی بھی تو میچ نہیں تھا اس کا رانی کے ساتھ۔ شہزادی کو بے اختیار حور کے پہلو میں لنگور والا محاورہ یاد آگیا لیکن پھر بھی آج نہ جانے کیوں فقیر محمد عام دنوں سے کچھ بہتر ہی لگ رہا تھا۔ گرے سوٹ میں اس کی شخصیت کچھ نکھر سی گئی تھی۔

”کم بخت شاید یہ بھی کسی بیوٹی سیلون چلا گیا ہوگا۔“ شہزادی نے بہت تلملا کر سوچا۔ عورتوں کی... چہ مگوئیاں بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں جو وہ شہزادی کو دیکھتے ہوئے کر رہی تھیں۔ ظاہری سی بات تھی سب ہی کو معلوم تھا کہ شہزادی کا رشتہ فقیر محمد سے طے ہوا تھا پھر اچانک اس کی جگہ رانی کا دلہن بن جانا سب ہی کو ایک جستجو میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس پر مستزاد رانی کے چہرے پر بکھری اداسی بھی سب کو کوئی کہانی سناتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ شہزادی کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ دونوں بہنوں کے درمیان یہ سرد سا کھنچاؤ بھی کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ انیسہ بار بار آکر رانی کو گلے لگا لیتیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات رک ہی نہیں رہی تھی لیکن رانی بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ فقیر محمد جب رسموں کے لیے اندر آیا تھا تو اتفاق سے سب سے پہلے اس کی نظر شہزادی پر ہی پڑی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور دوسرے ہی لمحے فقیر محمد نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ انیسہ اپنے داماد پر واری صدقے جا رہی تھی۔ عورتوں کا ایک ہجوم دولہا دلہن کے گرد جمع تھا۔ کسی عورت نے شہزادی کو پکارا تھا لیکن وہ چپکے سے دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہاں جا کر اسے اپنی بے عزتی تو نہیں کروانی تھی۔

انیسہ تو اس دن کے بعد سے اس سے بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔ شادی کی تیاریوں میں بھی اسے شامل نہیں کیا تھا اور پھر فقیر محمد اور اس کے گھر والے بھی اس سے شدید متنفر تھے پھر بھلا وہ کس برتے پر وہاں جاتی۔ اب وہ لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے تھکنے سی لگی تھی اور پھر یہ ٹینشن بھرے لمحات گزر ہی گئے اور رانی رخصت ہو کر فقیر محمد کے سنگ چلی گئی۔ رخصتی کے وقت جب رانی اپنے ابا کے سینے سے لگی سسک سسک کر رو رہی تھی تو شہزادی کچھ فاصلے پر آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اسے بہت بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اپنی اس معصوم سی بہن سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لے، اسے اپنے دل میں چھپا کر کہیں دور لے جائے جو اس کی وجہ سے ایک بہت ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ان چاہی زندگی گزارنے جا رہی تھی وہ آگے بڑھی تھی لیکن انیسہ نے بے اختیار سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اشارے سے اسے رانی کے پاس جانے سے روک دیا۔

☆☆☆

”ارے واہ، یہ تو تم نے زبردست نیوز سنائی ہے۔ سچ مجھے تو یقین نہیں آرہا۔“ زنیرا کے خوشی سے بھرپور لہجے پر اجالا ہنس دی۔

”اچھا زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب میرے تین شیطان آکر تمہارے گھر میں اودھم مچائیں گے ناں تب تمہیں صحیح مزہ آئے گا۔“

”بری بات اجالا اتنے پیارے، پیارے سے معصوم فرشتوں کو ہرگز کچھ نہیں کہنا۔ کتنی رونق ہو جائے گی ان کے آجانے سے میرے گھر میں۔ روشانہ اور فرحان ویسے ہی بور ہو رہے ہیں آج کل...... ان کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا تمہارے بچوں کے ساتھ۔“ زنیرا سچ مچ اجالا کے آنے کی خبر

سن کر بہت ایکسائٹڈ ہورہی تھی۔ زندگی پر چھائے ہوئے جمود سے وہ تھکنے سی لگی تھی۔ فاران اس کے لیے ایسے اجنبی ہوگیا تھا جیسے وہ دونوں کبھی کسی خوب صورت بندھن میں بندھے ہی نہ تھے۔ بچوں کے سامنے تو وہ پھر بھی اس سے رسمی سی باتیں کرلیتا تھا لیکن بچوں کی غیر موجودگی میں تو وہ اسے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ دونوں اکثر بچوں کے ساتھ باہر گھومنے بھی جاتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی بھی تھی لیکن کتنا فرق ہوگیا تھا پہلے اور اب کے ساتھ میں۔ وہ فخر و غرور، وہ لوگوں کی رشک آمیز نگاہوں کو اپنی طرف اٹھتا پا کر اُن سے لطف اندوز ہونا، فاران کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتے ہوئے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھنا۔ کتنا کچھ کھوگیا تھا اس سے۔ اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گئے تھے وہ لمحات جو اس کی زندگی کا حاصل تھے۔ اس نے جذبات میں آکر طلاق کا مطالبہ کرکے اپنی محبت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی تھی یا شاید فاران کو موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ اس سے ہر تعلق توڑ کر اپنے لیے باہر کی دنیا میں خوشیاں تلاش کرے۔ شروع میں اس نے بھی تو جذباتی ہوکر فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بس بچوں کی خاطر اس گھر میں رہے گی فاران کے لیے اس کے دل میں کسی بھی قسم کے کوئی جذبات باقی نہیں رہے تھے لیکن پھر رفتہ رفتہ جب غصے اور نفرت کی دھند چھٹنی شروع ہوئی تو اس میں چھپی فاران کی محبت کی چمکتی دھوپ ایک بار پھر اس کے دل کی زمین پر بکھرنے لگی۔ یہ کوئی فلم یا افسانہ نہیں تھا کہ وہ ایک ہیروئن کی طرح اپنے شوہر کے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک بنجر زندگی گزار دیتی جبکہ کتنی بھرپور رفاقت ہوا کرتی تھی ان دونوں کے درمیان۔ اب اس نے آدھی، آدھی رات تک اس کے انتظار میں جاگنا شروع کردیا تھا۔ اس کے آنے کے وقت پر لپک کر وہی دروازہ کھولتی اور وہ اس کو دیکھے بنا تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اکثر جب وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا... ان سے باتیں کررہا ہوتا تو وہ اس کے پسندیدہ کلر کے کپڑوں میں سامنے آکر بیٹھ جاتی۔ اس کے فیورٹ پرفیوم سے اپنے آپ کو بھگو دیتی لیکن اس ستم گر کی لاتعلقی ویسے ہی رہتی۔ وہ اس سے مکمل انجان بنا بچوں کے ساتھ مگن رہتا۔ زنیرا کا بہت دل چاہتا کہ وہ اسے بھی اپنی باتوں میں شامل کرے پہلے کی طرح بچوں کو اپنے ساتھ ملا کر اسے خوب ستائے اور جب وہ روٹھ کر وہاں سے اٹھ جائے تو ویسے ہی پیار سے منائے جو اس کا خاصّہ تھا لیکن اب منانا تو دور کی بات وہ اس سے بات تک کرنے کا روادار نہیں رہا تھا۔ نگاہیں تک ملانے سے کترانے لگا تھا۔ اگر وہ کبھی کچھ پوچھ لیتی تو بِنا اسے دیکھے جواب دے دیتا تھا اور وہ بھی بہت سرد مہری سے۔ زنیرا حیران تھی کہ کیا کوئی ایسے بھی اپنے فیصلے پر اٹل رہ سکتا ہے، یہ وہی فاران تھا جس نے اسے جنون کی حد تک چاہا تھا اور اب نفرت بھی اسی انتہا پر کررہا تھا۔ اس دن فاران اتفاق سے گھر پر ہی تھا شاید کوئی شوٹنگ کینسل ہوگئی تھی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ خانساماں چائے بنا کر جب اس کے بیڈروم میں جانے لگا تو زنیرا نے کچھ سوچ کر اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

''رحیم یہ مگ مجھے دے دو اور تم جا کر آج ذرا اسپیشل سا ناشتا بنادو۔ بہت دنوں بعد صاحب گھر پر ناشتا ذرا ڈھنگ سے کریں گے۔''

رحیم کے جانے کے بعد وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شاید ابھی سو کر اٹھا تھا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے ریموٹ ہاتھ میں تھامے چینل بدل رہا تھا۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر فاران کے چہرے پر ناگواری بکھر گئی۔

''رحیم کہاں ہے، تمہیں چائے لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کا تلخ لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے وہ اس کے نزدیک چلی آئی۔

''میں اپنی ذات کی تنہائیوں میں زندہ ہوں
مگر یہ سچ ہے مجھے تیری ضرورت ہے بہت''

اس نے مگ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بہت اداس لہجے میں یہ شعر پڑھا تو فاران کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''پلیز زنیرا تم ابھی اور اسی وقت میرے کمرے سے چلی جاؤ۔ تم نے مجھ سے طلاق مانگی تھی جو میں بچوں کی وجہ سے تمہیں نہیں دے سکا یا تم یہ سمجھ لو شرعی طور پر ہماری طلاق نہیں ہوئی ہے لیکن اب تم میری زندگی میں دور، دور کہیں بھی نہیں ہو اور تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ تمہارے دل میں میرے لیے وہ محبت، وہ احساس کچھ بھی باقی نہیں رہا تو پلیز اپنی بات پر قائم رہو اور اگر ایک منٹ اور تم یہاں ٹھہریں تو میں یہ کمرا چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' اس کا قہر آلود انداز زنیرا کو سہما سا گیا لیکن دل جیسے ہار ماننے کو تیار نہیں ہورہا تھا۔ اپنے محبوب کو منانے کے لیے اسے دوبارہ پانے کے لیے آج وہ اپنی انا کو کہیں دور چھوڑ آئی تھی۔

''فاران میں نے جذبات میں آکر جو کچھ بھی کہا تھا وہ آپ کی ان باتوں کا ری ایکشن تھا جو آپ نے مجھ سے کہی تھیں لیکن آپ کی محبت، آپ کی طلب تو اب پہلے سے کہیں زیادہ میرے دل میں بڑھ گئی ہے۔ آج مجھے کہنے دیجیے فاران کہ میں آپ سے مزید دوری برداشت نہیں کرسکتی پلیز فاران ہم آج سب کچھ بھلا کر دوبارہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرلیں۔'' وہ بہت ملتجی انداز میں کہتی ہوئی بے اختیار اس کے بہت نزدیک چلی آئی اور والہانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن فاران کا ری ایکشن اس کی توقع کے برخلاف اتنا شدید تھا کہ اس کی تو جیسے سانس ہی رک گئی۔ ذلت کے شدید احساس نے اسے بالکل ہی اندر سے ختم کرکے رکھ دیا۔ کاش اس وقت وہ مر ہی گئی ہوتی۔ اس نے بہت ڈوبتے ہوئے دل سے یہ سوچا تھا۔ فاران نے جس غصے اور حقارت سے اسے ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے دھکیلا تھا وہ تقریباً گرتے گرتے بچی تھی۔

''ڈونٹ ٹچ می اگین۔'' اس نے زنیرا کی طرف انگلی اٹھا کر جیسے غراتے ہوئے اسے تنبیہہ کی تھی۔ وہ سفید ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اپنی ایسی توہین کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر آگئی۔ نفرت کا شدید ریلا ایک بار پھر فاران کی محبت، اس کی طلب، اس کا عشق بہا کر اتنی دور لے گیا تھا کہ اس محبت کی ہلکی سی رمق بھی اب اس کے دل میں باقی نہیں بچی تھی بلکہ اس وقت بچوں کا خیال، ان کی محبت بھی اسے نظر نہیں آرہی تھی بس دل چاہ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ چپ چاپ آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کررہا تھا اور نگاہوں میں بار بار اپنی ذلت کا منظر گھوم کر اسے شدید اذیت سے دوچار کررہا تھا۔ بچوں کا کب اسکول سے آنے کا ٹائم ہوگیا تھا اسے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

''مما بھوک لگ رہی ہے۔'' ننھا فرحان اپنا اسکول بیگ قالین پر پھینکتا ہوا اس سے آکر لپٹ گیا لیکن جواباً ہمیشہ کی طرح زنیرا نے اسے لپٹا کر پیار نہیں کیا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''مما آپ ٹھیک تو ہیں ناں، آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟'' فرحان کے پیچھے آتی ہوئی روشانہ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ زنیرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین چار گھنٹوں سے ایک ہی طرح سے بیٹھے رہنے سے اس کی پیٹھ اکڑ سی گئی تھی لیکن اسے کچھ احساس ہی نہیں ہورہا تھا۔

''مما پلیز کچھ بولیے ناں، آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟ میں ڈاکٹر فون کردوں۔ بولیں مما ورنہ ہم لوگ رونے لگیں گے۔'' روشانہ نے روہانسی آواز میں اسے جیسے دھمکی دی۔ دونوں بچے بہت پریشان ہوکر اس کے دائیں بائیں کھڑے اسے پکارے جارہے تھے۔ اس نے خالی خالی آنکھوں سے اپنے دونوں بچوں کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں معصوم بچے کتنے ہراساں، کتنے خوفزدہ سے لگ رہے تھے، اسے اس طرح بے گانگی سے اپنی طرف دیکھتا پاکر...... اس کا سویا ہوا ذہن جاگنے لگا۔ اس نے بے اختیار دونوں بچوں کو زور سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دل میں ایک سکون سا اترنے لگا۔ اس سے محبت کرنے والے، اس کے لیے پریشان ہونے والے، اس کی کیئر کرنے کے لیے اس کے بچے اس کے ساتھ تھے۔ اس رشتے کو بنانے کے لیے اسے کسی فارم پر سائن نہیں کرنا پڑا تھا اور کوئی بھی تین الفاظ اس کے بچوں کو اس کے لیے اجنبی نہیں بناسکتے تھے۔ روشانہ اور فرحان اب بھی سہمے ہوئے سے اس کی آغوش میں دُبکے ہوئے تھے۔ ان کے وجود کی گرمی جیسے ایک توانائی بن کر زنیرا کی رگوں میں دوڑنے لگی۔

اس کے پاس تو محبتوں کا ایک ذخیرہ موجود تھا پھر وہ کیوں اس شخص کے پاس اس کی محبت، اس کی رفاقت کی بھیک مانگنے چلی گئی تھی۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ کتنی حقارت سے فاران نے اسے اپنے پاس سے ہٹایا تھا بلکہ دھکا دیا تھا۔ اس ایک لمحے میں اس نے اپنی ذلت کی انتہائی گھڑی دیکھ لی تھی اور اسی ایک لمحے نے اس کے اندر ایک اور زنیرا کو بھی جنم دیا تھا۔

☆☆☆

''چلو بچوں دیر ہورہی ہے فٹافٹ کار میں جاکر بیٹھو، میں پرس لے کر بس آرہی ہوں۔'' زنیرا نے روشانہ کے بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے اسے ہدایت کی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف پرس لینے کے لیے بڑھی ہی تھی کہ دوسری طرف سے آتے ہوئے فاران سے وہ تقریباً ٹکرا ہی گئی۔

''اوہ سوری۔'' وہ اس تیزی سے پیچھے ہٹی گویا کسی نامحرم اجنبی سے اس کا ٹکراؤ ہوگیا ہو۔

''تم لوگ اجالا کو لینے ائرپورٹ جارہے ہو؟'' وہ بڑے نارمل انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

''ہاں۔'' اس سے مختصر جواب وہ اور نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بنا تیزی سے اپنا پرس اٹھا کر جب باہر کار کے پاس پہنچی تو ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کے بجائے فاران کو براجمان دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹک سی گئی۔ اس دن کے بعد سے وہ فاران کے ساتھ باہر جانا تو دور کی بات وہ اس کے سامنے آنے سے بھی گریز کرنے لگی تھی۔ جب وہ بچوں کے ساتھ وقت گزارتا تو وہ پہلے کی طرح اس کے سامنے آکر بالکل بھی نہیں بیٹھتی تھی۔ اپنے کمرے میں یا تو کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر اپنے امی ابو یا بہن بھائیوں سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتی۔ ٹی وی کے مختلف پروگرامز بھی اب وہ زیادہ شوق سے دیکھنے لگی تھی۔ بچے جب اسے پکارتے تو وہ بہت خوب صورت بہانے بناکر انہیں ٹال دیتی۔ دوریاں طویل ہوتی جارہی تھیں۔ فاصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ اب ان کے سمٹنے کے آثار معدوم ہوچکے تھے۔ بچے ابھی معصوم تھے اپنے ماں باپ کے اس ٹوٹے ہوئے تعلق سے بے خبر اپنے بابا اور مما کی محبتوں کو سمیٹتے ہوئے وہ بھی اپنی معصوم سی دنیا میں مگن تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ زنیرا کے ابو کا لاہور کا آنا کبھی نہیں ہوا تھا ورنہ ان کی دوراندیش نگاہیں بہت کچھ بھانپ لیتیں البتہ اس کی امی اور بہن بھائی کچھ دنوں کے لیے لاہور ضرور آئے تھے لیکن گھر میں چلتی ہوئی فلم کی حقیقت انہیں پتا ہی نہیں چل سکی۔ ان دنوں فاران نے بہت بزی

ہونے کے باوجود ان لوگوں کو کافی ٹائم دینے کی کوشش کی تھی۔ گھر کے حالات ان لوگوں پر ظاہر نہ ہوں وہ زیادہ تر انہیں باہر ہی گھمانے پھرانے لے جاتا رہا تھا۔ اسٹوڈیو میں شوٹنگ بھی دکھانے لے گیا۔ لالہ رخ اور شہباز وہاں دوسرے بہت سے مشہور اسٹارز سے مل کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ امی بھی اپنے داماد کی شہرت اور عزت دیکھ کر بہت خوش اور متاثر لگ رہی تھیں اور پھر اس پر مستزاد فاران کا اتنا خیال رکھنا بھی انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اسی ہلے گلے میں یہ چند روز گزر گئے اور ان لوگوں نے فاران اور زنیرا کے درمیان جاری سردمہری کو محسوس ہی نہیں کیا یا پھر زنیرا نے بھی ایک کامیاب ایکٹریس ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دعا مانگتی رہی تھی کہ وہ لوگ جلد از جلد واپس چلے جائیں۔ فاران کے ساتھ رسمی بات چیت بھی اسے ایک آگ پر چلنے کے مصداق لگ رہی تھی اور اب اجالا کے آنے پر بھی اسے تھوڑی سی الجھن ضرور ہورہی تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اسے اجالا کا آنا اچھا لگ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اجالا کے روپ میں اس کا کوئی مسیحا یا غم گسار آرہا ہے جس سے وہ اپنے دل کی تمام باتیں کہہ سکے گی۔ اپنے وہ احساسات شیئر کرسکے گی جو وہ کسی سے بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کچھ لوگ اس دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے، انسانیت کے، ہمدردی کے سفیر ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کے آنسو اپنی آنکھوں میں محسوس کرتے ہیں اور ان کی خوشیوں کو اپنے دل میں اتار لیتے ہیں۔ زنیرا کو اجالا ایسے ہی لوگوں میں سے محسوس ہوتی تھی۔

کار ایک دھچکے کے ساتھ رکی۔ ائرپورٹ آچکا تھا۔ بے شمار لوگ اپنے پیاروں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ مسافر باہر آرہے تھے اور ریسیو کرنے والے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں

منافقت کیا ہے؟

عام زبان میں قول وفعل کے تضاد کا شکار افراد منافقت کے حامل کہے جاتے ہیں یعنی دل میں کچھ زبان پر کچھ اور عمل سے کچھ......

منافقت رکھنے والے پر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اظہارِ ناراضی کیا ہے بلکہ سخت غصے کا اظہار بھی کیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔ ''یہ (منافق) لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول ﷺ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت) سے منہ موڑ جاتا ہے، ایسے لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ہیں۔'' (سورۂ نور)

قرآن پاک کی ایک مکمل سورۂ...... سورۂ منافقون، منافقین اور منافقت کی نشان دہی مکمل طور پر کرتی ہے۔

ارشاد ربُّ العزت ہے ''منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔'' (سورۂ نسا)

حقیقت یہ ہے کہ سورۂ منافقون میں باری تعالیٰ نے منافقوں سے متعلق جو علامات بتائی ہیں اگر ہم غوروفکر سے کام لیں تو نہ صرف منافقت جیسے قبیح فعل سے اجتناب کرسکتے ہیں بلکہ منافقت برتنے والوں کی صحبت اور دوستی سے بھی بچ سکتے ہیں۔ تبھی اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم ہمیں حاصل ہوسکے گا مگر آج ہم دوسرے کو منافق اور اپنے آپ کو ہی سچا اور کھرا گردانتے ہیں۔ خود احتسابی ہر مسلمان کا ہر شب کا معمول ہونا چاہیے تاکہ اگلا دن، پچھلے دن کی کوتاہیوں اور نافرمانیوں سے بچا ہوا ہو۔

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ''جو شخص دو رُخا ہوگا یعنی ظاہر و باطن کا دوغلا...... وہ منافقوں کی طرح مختلف لوگوں سے مختلف باتیں کرے گا۔ روزِ حشر اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی......'' (سنن ابی داؤد)

مرسلہ: ایلیا مہدی، کراچی

ویل کم کر رہے تھے۔ فاران اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اجالا کا منتظر تھا۔ زنیرا کو الجھن سی محسوس ہونے لگی۔ انہیں آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اتنے دنوں بعد اس کی کوئی پسندیدہ ہستی اس کی خشک زندگی میں کچھ رنگ بھرنے آرہی تھی لیکن فاران کی موجودگی کی وجہ سے اسے کھل کر خوشی کا اظہار کرنا پتا نہیں کیوں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بچے ہر باہر آنے والے مسافر کو اجالا کے گمان میں دیکھتے اور پھر بور ہو کر دوبارہ انتظار شروع کر دیتے۔

فاران کے آس پاس کافی لوگ منڈلا رہے تھے۔ خواتین بھی بار بار اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئی جارہی تھیں۔ کچھ اسمارٹ سی لڑکیوں اور مرد حضرات کی درخواست پر فاران نے ان لوگوں کے ساتھ تصویریں بھی کھنچوائی تھیں۔ کتنی اہمیت مل رہی تھی اسے.. سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا وہ لیکن زنیرا کے دل میں اس کے لیے جیسے ہر احساس مر چکا تھا۔ وہ بالکل لاتعلق سی سامنے اس راستے پر نظریں جمائے کھڑی تھی جہاں سے اجالا کو باہر آنا تھا اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو ہی گئیں۔ اجالا اپنے تین کیوٹ سے بچوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی ٹرالی دھکیلتی باہر آتی نظر آئی تو زنیرا نے بے ساختہ اسے پکار کر ہاتھ ہلا دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ دونوں بہت گرم جوشی سے مل رہی تھیں۔ تبھی فاران مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

''السلام علیکم! تھوڑی سی لفٹ ہمیں بھی کروا دو اپنا اتنا کام چھوڑ کر تمہیں ریسیو کرنے آیا ہوں۔'' فاران نے بہت خوب صورت سی مسکراہٹ کے ساتھ جیسے اجالا کو اس کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔

''اوہو تم بھی آئے ہو، قسم سے مجھے تو یقین نہیں آرہا۔'' اجالا کی بے ساختہ خوشی کو محسوس کرتے ہوئے زنیرا کچھ بددل سی ہو گئی۔ اسے ان دونوں کو اس طرح ایک دوسرے کو اہمیت دینا ذرا بھی اچھا نہیں لگا حالانکہ دل فاران سے ہر تعلق توڑ چکا تھا، ہر احساس ختم کر چکا تھا لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں اسے فاران کا نہ تو اپنے ساتھ آنا اچھا لگا تھا اور نہ ہی اس کا اتنی محبت سے اجالا کو ریسیو کرنا پسند آرہا تھا۔ کتنے دنوں بعد تو وہ یوں کسی کے آنے پر خوش ہو رہی تھی لیکن اس کی اس خوشی کو بھی فاران نے اپنی موجودگی سے ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سخت بور سی ہو گئی موڈ بھی کچھ آف ہو گیا تھا جسے اپنی ایکسائٹمنٹ میں اجالا نے محسوس ہی نہیں کیا ویسے بھی فاران کو اتنی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا دیکھ کر وہ خاصی امپریس ہو رہی تھی۔ سارے راستے اس موضوع پر دونوں میں نوک جھوک بھی ہوتی رہی جس پر زنیرا رسمی طور پر بھی نہیں مسکرائی تھی۔ فاران بہت دنوں بعد پہلے کی طرح شوخ اور ہنستا کھلکھلاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر ہمہ وقت چھایا ہوا تناؤ بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا جبکہ زنیرا کے دل میں جلتے ہوئے خوشی کے چراغ آہستہ آہستہ بجھتے جارہے تھے۔ صبح سے بکھری ہوئی اس کے چہرے کی رونق بالکل ماند پڑتی جارہی تھی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ بہت خاموش اور گم صم سی تھی جبکہ فاران کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چہک رہا تھا۔

بہت مدت بعد اس کا بے ساختہ قہقہہ گھر کی فضا میں گونجا جب اجالا نے اپنے بچے کی کوئی بہت مزے دار بات سنائی تھی۔ اجالا نے ہنسی میں اس کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے اچانک ہی زنیرا کی جانب دیکھا تھا اور جیسے زنیرا کی آنکھیں اپنی تمام تر حساسیت کے ساتھ اسے اندر تک جھنجوڑ گئیں۔ ایک انجانا سا دکھ اسے اس کی آنکھوں میں تیرتا محسوس ہوا تھا۔ یہ آنکھیں بنا بولے کبھی کبھی کتنے راز افشا کر دیتی ہیں۔

☆☆☆

''میں نے ایک بات نوٹ کی ہے انیسہ کہ تمہارا رویہ شہزادی کے ساتھ کافی نامناسب ہے وہ ویسے ہی بہن کے جانے کے بعد خود کو اکیلا محسوس کر رہی ہے

اس پر مستزاد یہ کہ تم بھی اس سے اتنی اکھڑی اکھڑی ہو گئی ہو۔''

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس رانی کے چلے جانے سے خود میرا دل اتنا اداس ہو رہا ہے کہ کسی سے بھی بات کرنے کا نہیں چاہ رہا ہے۔ آپ دیکھیں تو سہی گھر کیسے بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔'' انیسہ کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ نکلے۔ اجمل صاحب کے چہرے پر بھی اداسی چھا گئی۔ ابھی رانی کی رخصتی کو ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا پھر بھلا ان کے دل اتنی جلدی سنبھل بھی کیسے سکتے تھے۔

اُدھر شہزادی اپنے کمرے میں گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ رانی اس سے کتنی بدگمان اور خفا خفا سی گئی تھی۔ رخصتی کے وقت وہ اسے گلے بھی نہیں لگا سکی تھی۔ رانی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اگر قریب گئی بھی تو رانی اس سے ملنے سے انکار کر دے گی۔ انیسہ اس بات کو سمجھ رہی تھیں تبھی تو انہوں نے اسے رانی کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔ تبھی دروازے پر کسی کی آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا تو باپ کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کھڑی ہو گئی انیسہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔

''شہزادی بیٹا سنو صبح تمہیں ناشتا لے کر فقیر محمد کے گھر جانا ہے۔ بھئی یہ رواج ہمیشہ سے ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے...... کیوں انیسہ!'' اجمل صاحب کو اچانک ہی یہ رسم یاد آئی تھی۔

''نہیں اجمل صاحب مجھے فقیر محمد کی ماں سختی سے منع کر گئی ہیں۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ ہم لوگ کتنے بجے تک ناشتا لے کر آئیں تو وہ ہنستے ہوئے بولیں کہ بہن اب یہ رواج بہت پرانا ہو گیا ہے۔ شادی کے دنوں کے لیے فقیر محمد نے ایک باورچی کو بلوا لیا ہے وہ روز صبح ناشتے میں مزے، مزے کی چیزیں بنا رہا ہے۔ کل تو وہ اور اسپیشل ناشتا بنائے گا۔'' انیسہ نے انہیں تفصیل سے بتایا تو وہ فخریہ ہنس دیے۔

''میری اماں ٹھیک ہی تو کہتی تھیں دیکھ لیا تم نے انیسہ کہ رانی کے نام کا اثر اس کی زندگی پر کیسے پڑا ہے۔ اسم بامسمیٰ بن گئی ہے وہ تو۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ ہمارے داماد کا نام تو فقیر ہے لیکن رہن سہن اور خیالات بالکل بادشاہوں جیسے ہیں۔'' اجمل صاحب کی بات ٹھک کر کے شہزادی کے دل پر لگی تھی۔

☆☆☆

یہ اتنا فاصلہ ہی وہ تعلق ہے جو تو نے
ہمارے اور اپنے درمیاں رکھا ہوا ہے

''زنیرا تمہاری آنکھوں میں چھپا بہت گہرا اور خاموش دکھ مجھے دہلائے دے رہا ہے۔ تمہارے ہونٹوں پر بکھری ہنسی مجھے کیوں اتنی جھوٹی لگ رہی ہے۔ پلیز زنیرا ایسے گھٹ گھٹ کر مت جیو۔ مانا کہ تمہارا خاندان تمہاری خوش قسمتی پر ناز کرتا ہے۔ سب لوگ تمہیں رشک آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں تم اندر سے بالکل ٹوٹتی جارہی ہو۔ بولو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' آج اجالا نے بھی ٹھان لی تھی کہ زنیرا سے وہ سچائی، وہ حقیقت جان کر ہی رہے گی جو اس نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔

''ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے اجالا۔ تم تو زبردستی ہی میری خوشیوں کی جگمگاہٹوں میں اندھیرا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔'' زنیرا کھلکھلا کر ہنس دی۔

''جانتی ہو زنیرا کہ انسان کی زندگی کا سب سے مشکل لمحہ کون سا ہوتا ہے؟'' اجالا نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کون سا؟'' زنیرا نے مسکرا کر اسی سے سوال کر ڈالا۔

''جب کسی کو اپنے آنسو اپنی آنکھوں میں چھپا

کرسب کے سامنے ہنسنا پڑے۔'' اجالا کے جواب نے زنیرا کے چہرے پر اک سایہ سا لہرا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اجالا کے آنے کا سن کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی رفوگر اس کی روح میں چھپے زخموں کو سینے آرہا ہے لیکن اس کے آنے کے بعد جب خود اس نے اجالا کو اپنا ایک مکمل جہاں جیتے ہوئے پایا جہاں وہ اپنے شوہر کی محبتوں کے سائے میں اپنے بچوں کے ہمراہ ایک خوشیوں بھری زندگی جی رہی تھی۔ اس کی باتیں، اس کی کھلکھلاہٹیں اس کی ایک ایک ادا اپنے اندر مسرتوں کا جیسے ایک خزانہ چھپائے ہوئے تھیں۔ دن میں دو مرتبہ تو عدیل کی کال ضرور آتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ نہ جانے کیا کہہ دیتا تھا کہ زنیرا کو دور سے ہی اجالا کے رخساروں پر بکھرا گلال نظر آجاتا تھا۔ تب اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ بے اختیار دل چاہتا کہ اجالا کو اپنی اس بے رنگ زندگی کے سارے پرت کھول کر دکھا دے لیکن اس کے سامنے اپنا جھوٹا بھرم توڑتے ہوئے اسے بہت عجیب سی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا لیکن شاید اجالا نے ان کچھ دنوں میں ان دونوں کے مابین سرد مہری کو محسوس کر ہی لیا تھا۔ آج فاران اپنی شوٹنگ کے سلسلے میں دو دن کے لیے کسی ہل اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ بچے اپنے کھیل کود میں مگن تھے اور زنیرا کے ہاتھ کی بنی ہوئی مزے دار کافی پیتے ہوئے اچانک ہی اجالا نے اس سے وہ سوال کر ڈالا تھا جس کے جواب میں زنیرا کے پاس ایک بہت بڑا آنسوؤں سے لبریز افسانہ موجود تھا۔

☆☆☆

شہزادی کی آنکھ آج کافی دیر سے کھلی تھی۔ کل شادی کے ہنگاموں کے علاوہ ذہنی تناؤ نے بھی اس کے اعصاب پر کافی برا اثر ڈالا تھا۔ بہن کی اتنی پزیرائی، اس کی اتنی شان و شوکت جیسے وہ سچ مچ کی ہی رانی بن گئی ہو شہزادی سے کسی طرح ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی اس بیوٹی پارلر کا منظر گھوم جاتا جہاں رانی شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اسمارٹ سی لڑکیاں اس کو ایسے سجا سنوار رہی تھی جیسے وہ اس کی کنیزیں ہوں۔ کبھی اس کی نگاہوں میں وہ قیمتی عروسی جوڑا اپنی چھب دکھلانے لگتا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھاری زیورات اس کا منہ چڑانے لگتے جنہیں اس نے بس شوکیس میں ہی لگا دیکھا تھا۔ کل رانی کتنی حسین لگ رہی تھی اور وہ اس کے سامنے بس ایک باندی جیسی ہی تو لگ رہی تھی تبھی ماں کی آواز پر وہ جلدی سے بستر سے اٹھ آئی۔

''جلدی سے چائے کا وہ سیٹ نکال لو جو تمہارے ابا نے تمہارے جہیز کے لیے خریدا تھا۔ رانی کے سسرال والوں نے تو کچھ بھی لینے سے منع کر دیا اب تمہاری شادی کب ہوتی ہے کچھ پتا نہیں۔'' ایک ہی سانس میں وہ اسے آرڈر دیتے ہوئے طنز بھی کر گئیں۔

''لیکن ان برتنوں کو نکال کر میں کیا کروں؟''
اس نے بھی تپ کر جواب دیا۔

''ظاہر سی بات ہے انہیں ابھی استعمال ہی کرنا ہے۔ ارے رانی اور فقیر محمد کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں تمہارے ابا کے موبائل پر ابھی فقیر محمد کا فون آیا تھا۔'' انیسہ نے جلدی، جلدی اپنے چھوٹے سے برآمدے میں بچھے ہوئے تخت کی چادر بدلتے ہوئے اس سے کہا تو شہزادی کے کانوں میں .... بے ساختہ رانی کی آواز کی بازگشت گونجی۔

''ہائے کتنا مزہ آئے گا جب لوگ کہا کریں گے کہ وہ دیکھو شہزادی اور فقیر ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔'' شہزادی کو بے اختیار رانی پر ترس آنے لگا۔ وہ رشک آمیز سوچیں خود بخود کہیں تحلیل ہوگئیں۔

''بے چاری رانی میرا مذاق اڑاتے، اڑاتے خود میری جگہ پر آگئی۔ آج رانی اور فقیر کی جوڑی یہاں آتے ہوئے کتنی عجیب سی لگے گی۔'' اس نے تاسف سے سوچا اور پھر جلدی، جلدی برتن نکال کر انہیں سائڈ پر رکھی ہوئی میز پر سیٹ کر کے جلدی سے اپنے کپڑے لے کر نہانے گھس گئی۔ ابا چائے کے لوازمات لینے بازار جاچکے تھے اور اماں اپنے چھوٹے سے گھر کو چمکانے میں بے حال ہوئی جارہی تھیں۔

دن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر ہونے والی دستک نے گھر میں ایک ہلچل ہی مچادی۔ ابا تقریباً ایک گھنٹے سے ان کے انتظار میں پورے گھر میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اب تھکنے سے لگے تھے لیکن دستک کی پہلی ہی آواز پر جیسے پورے جہاں کی پھرتی ان کے وجود میں آبسی، وہ تیر کی طرح دروازے کی طرف دوڑے جبکہ اماں بھی دوپٹے کو سلیقے سے لیتے ہوئے تیزی سے ان کے پیچھے دروازے تک آگئیں جہاں سے رانی اور فقیر محمد اندر داخل ہورہے تھے۔ شہزادی برآمدے میں ہی رک کر ان کو اندر کی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔

رانی کو جس والہانہ انداز میں انیسہ نے گلے لگایا تھا وہ شہزادی کو کچھ اچھا نہ لگا۔ اس سے تو وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہی تھیں اور رانی کے لیے جیسے ان کی ممتا اُبلی پڑ رہی تھی۔ گہرے نیلے کامدانی کے سوٹ میں رانی کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ بڑے بڑے کُندن کے آویزے اس کے چہرے کی رونق کو مزید بڑھا رہے تھے۔ وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ شہزادی ایک لمحے کو تو اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ تو کل سے بھی زیادہ خوب صورت آج لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج اس کے چہرے پر وہ تناؤ، وہ بیزاری، وہ اداسی نظر ہی نہیں آرہی تھی جس نے کل اس کے دلہناپے پر اپنا سایہ ڈالا ہوا تھا۔

اس وقت جیسے اس کے اندر کی خوشی کی چمک نے اس کے حسن کو بہت انوکھا سا نکھار بخشا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر حیا آمیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک

پیشکش

اتنے اچھے موسم میں
روٹھنا نہیں اچھا
ہار جیت کی باتیں
کل پہ ہم اٹھا رکھیں
آؤ
آج دوستی کرلیں

محبت

کس قدر انوکھا ہے رابطہ محبت کا
کب نہ جانے ہوجائے معجزہ محبت کا
اپنی ذات سے بھی وہ اجنبی سا لگتا ہے
جس کے ساتھ ہوجائے حادثہ محبت کا

از: ارم کمال......فیصل آباد

خوب صورت سی شرم چھلکتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ فقیر محمد بھی ہلکے نیلے شلوار سوٹ میں بے پناہ خوش نظر آرہا تھا حالانکہ رانی کے ساتھ چلتا ہوا وہ شہزادی کو کافی میلا میلا سا لگا لیکن پھر بھی جیسے دل نے اس سے سرگوشی کی تھی کہ وہ پھر بھی اتنا برا نہیں لگ رہا تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔

انیسہ نے ان دونوں کو اس طرح سے برآمدے میں بچھے ہوئے تخت پر بٹھایا گویا وہ دونوں سچ مچ کے رانی اور راجا ہوں۔ فقیر محمد کی والہانہ نگاہیں بار بار رانی کے حسین چہرے پر جیسے نثار ہوئی جارہی تھیں۔ خوشی کے مارے دانت بند ہی نہیں ہورہے تھے۔ اماں اور ابا ان دونوں کی خاطروں میں بچھے، بچھے جارہے تھے۔ ذرا ذرا سے کام کے لیے شہزادی کو یوں آواز دی جارہی تھی جیسے وہ ان دونوں کی خادمہ ہو۔ شہزادی کو ایک عجیب سی بے عزتی کا

احساس ستانے لگا۔ فقیر محمد نے اس سارے عرصے میں ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی جس میں کسی بھی جذبے کی ذرا سی بھی کوئی رمق نہیں تھی البتہ رانی نے اتنے دنوں بعد اسے محبت سے دیکھا بھی تھا اور اس سے گلے بھی ملی تھی۔ شہزادی کچھ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔ رانی کا یہ بدلہ انداز اسے ایک نامعلوم سے احساس میں مبتلا کر رہا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد رانی بھی اس کے پاس چلی آئی اور بے اختیار اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے رخسار کو چوم لیا۔ شہزادی نے بہت حیرت سے اس کی اس حرکت کو دیکھا۔

''سوری شہزادی، میں نے شادی والے روز تم سے کچھ زیادہ ہی بدتمیزی کر ڈالی تھی۔ تم سے رخصتی کے وقت ڈھنگ سے ملی بھی نہیں۔'' وہ کچھ شرمسار لہجے میں معذرت کرنے لگی۔

''معافی تو مجھے تم سے مانگنی چاہیے رانی میری وجہ سے تمہاری زندگی برباد ہوگئی۔'' اس کا ذہن اب بھی رانی کی اس خوشی کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

''ارے نہیں شہزادی، کل تک میں بھی یہ سمجھ کر تم سے بہت زیادہ ناراض تھی لیکن آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مجھ جیسا خوش قسمت شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہو۔ فقیر محمد کی ظاہری پرسنالٹی معمولی سہی لیکن اس کا دل بہت خوب صورت ہے۔ وہ ہوس کا مارا ہوا بندہ نہیں ہے، اس نے کل رات مجھے ایک کانچ کی گڑیا کی طرح ٹریٹ کیا۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی مجھ سے اتنا پیار کر سکتا ہے۔ میرا اتنا خیال کر سکتا ہے۔'' بہت جذب سے کہتے ہوئے رانی نے شہزادی کی جانب دیکھا جس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ رانی بے اختیار ہنس دی۔

''تمہیں میری باتیں حیران کر رہی ہیں ناں...... مجھے خود یقین نہیں آرہا کہ کوئی شخص صرف ایک رات میں کسی کی دل کی دنیا ایسے بھی بدل سکتا ہے۔ پتا ہے شہزادی، فقیر محمد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ میرے نام کی لاج رکھتے ہوئے مجھے رانیوں کی طرح رکھے گا۔ میرے ناز نخرے اٹھائے گا اور مجھے مری اور کاغان بھی گھمانے لے جائے گا۔'' معصوم سی رانی کی آنکھیں یہ سب بتاتے ہوئے خوشی سے جگمگا رہی تھیں۔

''چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' شہزادی نے بے دلی سے خوشی کا اظہار کیا۔

''اور ہاں یہ انگوٹھی دیکھو، کل اس نے مجھے منہ دکھائی میں دی ہے۔'' رانی نے فخریہ اپنی مخروطی انگلی میں پہنی ہوئی ایک بہت حسین سی رنگ اسے دکھائی۔ خالص سونے کی بنی ہوئی اس انگوٹھی میں لگے نگ بھی جیسے شہزادی پر طنز کر رہے تھے۔ شہزادی کو بادل ناخواستہ اس انگوٹھی کی بھی تعریف کرنا پڑی جبکہ دل میں بے اختیار پچھتاوے کے بے شمار سانپ سرسرانے لگے تھے۔

''ارے رانی، اندر جا کر کہاں بیٹھ گئیں، فقیر محمد جانے کو کہہ رہے ہیں۔'' انیسہ کی آواز پر وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

''یہ گھر سے مجھے یہ کہہ کر لائے تھے کہ میں ایک منٹ کے لیے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوں گی اور مجھے دیکھو تم سے باتوں میں اپنا وعدہ بھول ہی گئی۔'' کتنی اتراہٹ تھی رانی کے لہجے میں شہزادی بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اور ہاں کل رات فقیر محمد نے میری ایک اور خواہش کو پورا کر کے مجھے حیران کر دیا۔'' وہ جاتے جاتے جیسے کچھ یاد آنے پر پلٹ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔

جذباتی فیصلے کچھ ایسے ہی حالات پیدا کرتے ہیں...... زنیرا کے جذباتی مطالبے کا انجام اب کس موڑ پر اسے لا پٹخے گا اگلے حصے کا انتظار کیجیے



سب حرف زندہ ہیں

تحسین اختر

بس کچے پکے راستوں پر ہچکولے کھاتی اپنی منزل کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ فضا میں حبس اور گرمی ایک ساتھ ٹھہر گئے تھے حبس کی وجہ سے شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ میرا موڈ پہلے ہی آف تھا اور اس ناخوشگوار اور پُراذیت سفر نے اس خراب موڈ کو اور خراب کر دیا تھا۔ مجھے بس میں خوش گپیاں کرتے دیہاتی لوگ اس قدر برے لگ رہے تھے کہ میں انہیں نظر بھر کر دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

میں تو بس سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے ایک، ایک منٹ گن رہا تھا کہ کب اس سفر کا اختتام ہو اور میں مطلوبہ منزل پر پہنچوں۔

''شاہین آباد آ گیا جی!'' کنڈیکٹر کی آواز میری سماعتوں میں کیا اتری تھی میں جلدی سے آنکھیں کھول کر اور تقریباً اچھل کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب اپنا سفری بیگ سنبھالے بس سے نیچے اتر رہا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر پسینے سے تر بتر اپنے کپڑے سکھانے لگا۔ میں نے بس اسٹاپ پر لگے شاہین آباد کے زنگ آلود بورڈ کو دیکھا اور ایک بار پھر میرے اندر نئے سرے سے غم اور غصہ بھرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے دادا ابا پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا جن کے طفیل آج میں اس پسماندہ دیہی علاقے میں موجود تھا۔ محکمۂ تعلیم میں مجھے اچھی بھلی نوکری ملی تو میرے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ آج کل کے دور میں سرکاری نوکری کہاں اتنی آسانی سے ملتی ہے۔ میں ابھی اپنے اس فخر اور خوش قسمتی پر جی بھر کر خوش بھی نہیں ہوا تھا کہ ساتھ ہی شاہین آباد میں تقرری کا پروانہ بھی مل گیا۔ میں نے تو اس جگہ کا نام ہی پہلی بار سنا تھا کجا کہ وہاں جا کر رہنا اور استادی شاگردی کرنا تو بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی اس نوکری کو ہی خیر باد کہے دیتا دادا ابا کو میرے ارادوں کی خبر ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے میری ایک نہ چلنے دی اور مجھے شاہین آباد بھیج کر ہی دم لیا۔

''کدھر جانا ہے جی؟'' میں ہلکی ہوا کا لطف لینے اور پھر اپنے خیالوں میں بری طرح مگن تھا جب ایک چنگ چی والے نے دانت نکال کر مجھ سے پوچھا تھا۔

''شاہین آباد!'' میں نے رومال سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''آؤ جی پھر وہاں کیوں کھڑے ہو۔'' اس نے کہا اور میں پاس پڑا اپنا بیگ اٹھا کر پھولوں، موتیوں اور رنگ برنگے اشتہارات سے سجے اس کے رکشے میں سوار ہو گیا۔

''آپ کو سالم رکشا ہی چاہیے یا پھر اور سواریاں بھی بٹھا لوں۔''

''او بھائی چلو بھی اب، سواریوں شواریوں کو چھوڑو، میں تمہیں پورا کرایہ دے دوں گا۔''

''اچھا جی!'' اس نے رکشا اسٹارٹ کیا تھا اور پھر صحیح معنوں میں میری نازک سماعتوں کے ساتھ میری ہڈیوں اور پسلیوں کا امتحان بھی شروع ہو گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد اس نے رکشے کو بریک لگائے تھے اور مجھے شاہین آباد کے واحد سرکاری ہائی اسکول کے احاطے میں اتار دیا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' میں نے اس سے اترتے ہوئے کہا۔

''کیا جی؟'' وہ مجھ سے کرایہ پکڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''آج مجھے شک نہیں یقین ہے کہ جس طرح تم نے اپنا یہ ہوائی جہاز اڑایا ہے ناں میری آدھی سے زیادہ ہڈیاں تو ضرور ہی ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں گی۔''

''صاحب جی آپ ٹھہرے شہری بابو اپنا یہ ہوائی جہاز تو ایسے ہی اڑتا ہے۔ رہی بات ہڈیاں ٹوٹنے کی تو کوئی فکر نہیں اب آپ بھی شاہین آباد میں رہتے ہوئے اس کے عادی ہو جاؤ گے۔'' اس نے چونکہ راستے میں مجھ سے پوچھ لیا تھا کہ میں کس مقصد کے لیے یہاں آ رہا ہوں اس لیے اب بلا تکلف کہہ رہا تھا۔ وہ دوبارہ سے اپنا ہوائی جہاز اسٹارٹ کر کے پھٹ پھٹ کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر دائیں بائیں اپنے جسم کو حرکت دے کر جسم کے باقی اعضا اپنی حالت پر لانے کی ناکام سی کوشش کی اور پھر تھوڑی دیر بعد اسکول کے اندر داخل ہو گیا۔

☆☆☆

میرا یعنی ذکی آفندی کا شاہین آباد میں آج دوسرا دن تھا اور کل سے پورے شاہین آباد میں ڈھنڈورا مچ گیا تھا کہ ہائی اسکول میں نیا ماسٹر آ گیا ہے اور کل سے ہی لوگ میرا دیدار کرنے اور مجھ سے ملنے آ رہے تھے اور جس طرح کا پروٹوکول مجھے یہاں مل رہا تھا اس سے میں اپنے آپ کو واقعی کوئی اعلیٰ و ارفع شے سمجھنے لگا تھا۔ لوگ عقیدت سے مجھ سے ملنے آ رہے تھے اور شاہین آباد کے گمنام قصبے میں گزارے صرف دوسرے دن بعد ہی مجھے اپنے دادا جان کی باتیں کچھ، کچھ صحیح لگنے لگی تھیں ورنہ اب تک تو میں ان سے ناراض ہی تھا۔ اسکول میں چوکیدار، مالی اور ایک پرائمری کلاس ٹیچر پہلے ہی موجود تھے۔ اس لیے اسکول کی حالت بہت زیادہ خستہ نہیں تھی۔ بچوں کی تعداد بھی معقول ہی تھی اور صفائی ستھرائی کا نظام بھی ٹھیک ہی تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی اور میں نے جلد ہی اپنی ساری توجہ بچوں کو پڑھانے کی طرف لگا دی۔

یہ بات نہیں تھی کہ مجھے پڑھانے سے کوئی رغبت نہ تھی بلکہ میرا یہ پسندیدہ شعبہ تھا اور اس جاب کے لیے میں نے بڑی خوشی، خوشی اپلائی کیا تھا۔ پڑھانا ہمیشہ میرا شوق رہا ہے۔ غصہ تو مجھے بس اتنی دور تقرری پر تھا۔

بچوں کو میرے پڑھانے کا طریقہ پسند آیا تھا، وہ نہ صرف مجھ سے گھل مل گئے تھے بلکہ پڑھائی پر بھی توجہ دینے لگے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے ماسٹر کی ہر طرف واہ، واہ ہونے لگی۔ میں اپنی تعریفیں بھی سمیٹتا جا رہا تھا اور اپنے فرائض بھی محنت اور جان فشانی سے ادا کیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''سلام ماسٹر صاحب!'' ایک دن میں شام کے وقت اسکول سے نکل کر یونہی چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک مترنم اور میٹھی سی آواز میری سماعتوں میں اتری۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے گلی میں موجود دائیں طرف کے گھروں میں سے ایک گھر کے باہر کھڑی لڑکی پر ایک نظر ڈال کر اس کے سلام کا جواب دیا۔

''وہ ماسٹر جی آپ سے ایک کام تھا۔'' میں ابھی دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ وہی آواز پھر سے ابھری۔

''جی فرمائیں۔'' چونکہ یہاں کے لوگ مجھ سے عقیدت رکھتے تھے اس لیے مجھے اپنا وقار اور عزت بہت پیاری تھی۔ میں یہاں قدرے ریزرو ہی رہتا تھا سو اب بھی میں نے لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جی مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر پڑھانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے قیمتی وقت میں سے ٹائم نکال کر کچھ دیر کے لیے مجھے پڑھا دیا کریں تو میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

''دیکھیں محترمہ، میں بس انہی بچوں کو پڑھاتا ہوں جو اسکول میں داخل ہیں۔ باقی میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا......'' میں اسے سختی سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ حقیقت میں مجھے اس لڑکی پر بے تحاشا غصہ بھی آیا تھا جس نے اس طرح میرا راستہ روک کر مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی۔

''ہونہہ، یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں لفٹ لینے کے چکروں میں کیسے، کیسے حربے آزماتی ہیں۔'' اسکول واپس آنے تک میں یہی سوچتا رہا۔

کچھ دنوں بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں اور میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر واپس لاہور چلا آیا۔ شاہین آباد سے نکل کر لاہور آتے ہوئے مجھے نہ تو چنگ چی کے ہچکولوں نے پریشان کیا تھا نہ باقی سفر نے بور کیا تھا۔ اپنوں میں جانے اور اپنے گھر لوٹنے کی خوشی ہی اتنی شدید تھی کہ ہر چیز پر غالب آ گئی تھی۔ گھر میں بھی میرا بھرپور طریقے سے استقبال کیا گیا تھا۔ آج تک ایسی کبھی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ اتنے عرصے تک گھر سے دور رہنا پڑتا مگر یہ نوکری کی مجبوریاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی

بہت کچھ کرنا اور سہنا پڑتا ہے۔

''میاں اور سناؤ پھر شاہین آباد میں کیسی گزری؟'' رات کھانے کے بعد جو محفل جمی تو دادا ابا جو سب سے زیادہ بے چین تھے میرے گزشتہ دنوں کا حال احوال سننے کو جلدی سے پوچھنے لگے۔

''کیا بتاؤں اور کیا سناؤں، کچھ سنانے کو ہو بھی تو۔'' دراصل انہی کی وجہ سے تو میں یہاں سے تنگ ہو کر گیا تھا اب تھوڑا بہت انہیں تنگ کرنا بھی میرا حق بنتا تھا۔

''کیا مطلب کیا بتاؤں؟ میاں وہی جو تمہارے ساتھ بیتی' وہاں کے سفر کے بارے میں بتاؤ، لوگوں کے بارے میں بتاؤ اور اپنے اسکول کا حال احوال سناؤ۔''

''دادا ابا اب جب مجبوری میں وہاں چلا ہی گیا ہوں تو لوگ جیسے بھی ہوں سفر جیسا بھی ہو گزارہ تو کرنا ہی ہے ناں۔''

''ہوں یہ بات ہے، اس کا مطلب ہے تم ابھی تک خوش نہیں ہو۔''

''خوش تو میں آپ سب کے ساتھ رہ کر ہوں گا یا دور رہ کر؟ آپ ہی بتائیں؟''

''میاں دیکھو، اب ساری عمر تم گھر پر تو نہیں بیٹھے رہ سکتے ناں۔ مرد ہو کمانے کے لیے وہاں جانا ہی پڑتا ہے جہاں رزق لکھا ہوتا ہے پھر تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو رہے ہو؟''

''چلیں چھوڑیں دادا ابا، بھائی کو وہ تو بتائیں ناں کہ آپ کا کالم کس اخبار میں چھپا ہے اور اس کی کیسی پزیرائی ہوئی ہے۔'' چھوٹی بہن فریحہ نے بات بدلتے ہوئے دادا ابا سے کہا چونکہ دادا ابا ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور اپنے زمانے میں استاد رہ چکے تھے اور ایک علمی و ادبی شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے اس لیے ان کے لیے یہ سب معمول کی باتیں تھیں مگر پھر بھی وہ مجھے اپنی نئی کامیابی کے بارے میں جوش و خروش سے بتانے لگے۔ میں بھی... فی الوقت سب کچھ بھلا کر ان کی بات غور سے سننے لگا پھر بات کالموں سے ہوتی ہوئی شاعری، شوبز، اسپورٹس اور پھر سیاست تک جا پہنچی تھی۔

اس دوران امی جان جاتے کتنے چکر لگا چکی تھیں یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ محفل برخاست ہوئی کہ نہیں اور ان کا بچہ جو اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے وہ آرام کے لیے اپنے کمرے میں گیا کہ نہیں۔

''امی جان آپ سو جائیں، ہم بھی بس تھوڑی دیر ہی اور بیٹھیں گے۔'' فریحہ ایک بار پھر گرما گرم چائے بنا کر لے کر آئی تھی، اس نے انہیں بے چین پھرتے دیکھ کر کہا۔

''میں تو سونے جا رہی ہوں اب تم لوگ بھی یہ محفل ختم کرو اور سونے کی تیاری کرو۔ باقی باتیں کل کر لینا۔ کل خدانخواستہ کون سا دن نہیں چڑھے گا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☆☆☆

گرمیوں کی چھٹیوں کو میں نے جی بھر کر انجوائے کیا تھا۔ ٹھنڈے آموں کی بہتات ہوتی، نیم تاریک کمروں میں سکون اور ٹھنڈک ایک ساتھ براجمان ہوتے اور اپنوں کا ساتھ...... ایسے میں دن کب چڑھا اور رات کب گزری مجھے کچھ پتا نہ چلتا۔ میں ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتے بھی نہ تھکتا تھا۔

''بھائی جان سارا سال ہی چھٹیاں کیوں نہیں چلتیں؟'' ایک دن چھوٹی ماریہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بھی اسکول جانے سے بہت گھبراتی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی چھوٹی سی بچی تھی نویں کلاس میں تھی اور اچھی خاصی سمجھ دار تھی مگر اسکول جانے سے چھوٹے بچوں کی طرح ہی اس کی جان جاتی تھی۔

''کیوں بھئی، یہ گرمیوں کی اتنی لمبی چھٹیاں کم ہیں کیا؟ سارا سال چھٹیوں کا مطلب ہے گھر میں فارغ ہو کر بیٹھ جاؤ...... پھر بچے' پڑھائی کیسے ہوگی؟'' میں نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

''اسے تو فارغ رہ کر ہی مزہ آتا ہے۔ کوئی کام ہو نہ کاج بس یہ ہو خوب ڈٹ کر کھانا پینا ہو، ٹی وی کے فضول ڈرامے ہوں یا پھر لمبی تان کر سونا۔'' امی جان جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے اس کے سارے شوق ہی بیان کر دیے۔

''یہی تو ہمارے سارے نوجوانوں کا المیہ ہے جنہیں اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے جو ہمارا مستقبل ہیں، جو ہمارا کل ہیں، وہ سو کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں یا پھر فضول کاموں میں مگن رہ کر...... کوئی مثبت اور تعمیری سوچ اور جذبہ تو انہیں چھو کر نہیں گزرا پھر ہم دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی نہیں کر رہا۔'' دادا جان کو ماریہ کی بات پر بولنے کا موقع مل گیا۔ ماریہ تو یونہی ایک بات کر کے پھنس گئی تھی حالانکہ جانتی تھی کہ گھر میں تعلیم کے خلاف.... کوئی بات برداشت نہیں کی جاتی۔ وہ اب یہاں سے کھسکنے کو تیار بیٹھی تھی اور باقی سب اس کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

چھٹیاں ختم ہو گئیں ایک بار پھر میں یعنی ذکی آفندی تھا اور شاہین آباد کا شہر۔ اب میرا یہاں کچھ کچھ دل لگنے لگا تھا۔ کچھ یہ تھا کہ اب یہاں مکمل اجنبی نہیں رہا تھا کافی لوگوں سے اچھی دعا سلام ہو گئی تھی اور پھر میں نے اس مقصد کو خاص طور پر چن لیا تھا جس کے لیے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا وہ تھا تعلیم کا فروغ...... سو میں شاہین آباد کے بچوں اور یہاں کی نئی نسل کو علم سے روشناس کروانے کے لیے جت گیا۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتا تھا مگر اپنے شعبے سے.... بے ایمانی نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میری پرورش دادا ابا جیسی شخصیت کے زیر سایہ ہوئی تھی۔

''بھائی جان میری دوست ہے ناں سحرش، اس کے چچا شاہین آباد میں ہی رہتے ہیں اور ان کی بیٹی فائزہ بھی پرائمری کی ٹیچر ہے مگر وہ کسی دوسری جگہ نوکری کرتی ہے۔ سحرش نے مجھے بطور خاص کہا تھا کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ اس کے چچا سے ضرور ملیں۔ سحرش نے اپنی کزن اور چچا کو بھی آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ کسی دن وہ آپ سے ملنے آئیں گے۔'' ایک دن فریحہ نے فون پر مجھ سے سب کہا تو میں نے اسے اچھا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں اسے اور کہتا بھی کیا۔ جب میں یہاں اسکول میں موجود تھا تو کسی کو بھی اجازت تھی کہ وہ مجھ سے آ کر مل سکتا تھا پھر میں فریحہ کی دوست سحرش کو بذاتِ خود بھی جانتا تھا۔ وہ ایک اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ یقیناً اس کے رشتے دار بھی اچھے ہی ہوں گے۔ اس لیے ان سے ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

ایک دن جب میں شام کے وقت بچوں کی کاپیاں چیک کر رہا تھا ایک صاحب مجھ سے ملنے چلے آئے۔ اپنا نام وہاج اکبر بتایا اور پھر سحرش کے چچا کے طور پر اپنا تعارف کروایا۔ میں بڑی خوش دلی سے ان سے ملا تھا۔ وہ میرے پاس کافی دیر بیٹھے اور گپ شپ کرنے کے بعد جب وہ اٹھے تو مجھ سے خاصے متاثر نظر آ رہے تھے اور پھر انہوں نے جاتے جاتے مجھے اگلے دن' رات اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ میں نے کچھ تذبذب کے بعد ان کی دعوت قبول کر لی۔ کسی کی اتنی خلوص بھری آفر کو ٹھکرانا میرے بس سے باہر تھا۔

☆☆☆

چوہدری وہاج اکبر کا گھر بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ ان کے گھر کے اندر اور باہر اتنا سبزہ اور رنگا رنگ پھولوں کے پودے تھے کہ گھر کو دیکھتے ہی ایک خوش کن تاثر ابھرتا تھا۔ کل وہ مجھ سے متاثر ہو کر گئے تھے اور آج میں ان کے اچھے ذوق کا قائل ہو گیا تھا۔

''ماسٹر جی آئیں ناں، اندر آئیں۔'' وہاں

میرا استقبال بھی خوب ہوا تھا۔

''آپ مجھے ماسٹر صاحب کے بجائے ذکی کہیں تو زیادہ اچھا ہے وہاج صاحب۔'' میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلیں آپ کو ذکی ہی کہہ لیتے ہیں، جیسے آپ کی خوشی بیٹا ورنہ تو آپ پر ماسٹر صاحب بھی خوب جچتا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے پھر انہوں نے اپنی فیملی سے میرا تعارف کروایا۔ اپنی بیگم سے، بڑے بیٹے اور بہو سے اور پھر اپنی بیٹی فائزہ سے جو فریحہ اور سحرش کی ہی ہم عمر تھی۔ انہوں نے مجھ سے کسی کا پردہ نہیں کروایا تھا اور اپنے گھر میں پہلی دفعہ آنے پر ہی میرے ساتھ گھر کے ایک فرد جیسا سلوک کیا تھا۔ فائزہ وہاج نے بی اے، بی ایڈ کر رکھا تھا اور قریبی قصبے میں پرائمری ٹیچر تھی۔ یہ تعارف بھی اسی وقت ہوا تھا۔ سب نے میرے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے دوران بھی گپ شپ ہوتی رہی۔ فائزہ نے سحرش کو فون بھی کیا تھا اور اپنے گھر میں میرے آنے کا بھی بتایا تھا۔ سحرش بھی بہت خوش ہو رہی تھی کہ پردیس میں مجھے اپنے گھر جیسا ماحول مل رہا ہے اس نے فائزہ سے ایک بار پھر میرا خیال رکھنے کی تاکید کی۔

''رباط جا رہی ہو؟'' کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ میں دادا ابا کی باتیں سب کو سنا رہا تھا کہ فائزہ نے کھلے دروازے میں سے کسی کو آواز دے کر پوچھا۔

''جی...... آپ تو مصروف ہیں۔'' دروازے کی اوٹ سے ہی جواب آیا۔

''چلو ٹھیک ہے باقی کام کل کرلیں گے۔'' وہ اسے جواب دے کر پھر سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ یوں ایک یادگار سی شام گزار کر میں چوہدری وہاج کے گھر سے واپس آ گیا۔

☆☆☆

''بھائی جان کیسا لگا آپ کو سحرش کے چچا جان کا گھر؟'' فریحہ بڑے جوش و خروش سے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بڑی عزت اور چاہت والے اور پھر جس طریقے سے انہوں نے میرا استقبال کیا مجھے لگا ہی نہیں کہ میں پہلی بار ان لوگوں سے مل رہا ہوں یا پہلی بار ان کے گھر آیا ہوں۔'' میں نے فریحہ کو بتایا۔

''مجھے سحرش نے بتایا تھا کہ وہ لوگ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے ہیں۔''

''اچھا! مجھ میں ایسا کچھ ہے تو نہیں۔''

''بھائی جان یہ آپ کہہ رہے ہیں ناں...... ورنہ آپ کسی سے کم تو نہیں۔'' فریحہ بہنوں والی خاص محبت سے بولی اور مجھے بھی اتنی دور بیٹھے ہوئے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ یہ رشتے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کبھی نہ ٹوٹنے والے، کبھی نہ ختم ہونے والے، کبھی نہ سمٹنے والے۔ ان رشتوں کی محبت کی ڈور کسی موڑ پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ فریحہ سے بات کرنے کے بعد ایک اور چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ بات بات پر ہنستا ہوا، کھلتا ہوا، متناسب نقوش والا چہرہ...... فائزہ وہاج کا چہرہ۔

''کیا مجھے شاہین آباد جیسے چھوٹے سے شہر میں بسنے والی ایک عام سی لڑکی سے محبت ہونا تھی۔ کیا تقدیر کے کھیل ایسے ہی نرالے ہوتے ہیں۔ کیا محبت یا تقدیر پر انسان ایسے ہی بے بس ہو جاتا ہے لیکن وہ اب عام سی لڑکی کہاں رہی تھی۔ فائزہ وہاج کا چہرہ...... وہ خود میرے لیے بہت خاص بن گئی تھی۔ اتنی خاص کہ اس کے بنا میں خود کو ادھورا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ کہنے کو تو یہ عام لو اسٹوری کی شروعات کے مانند تھی مگر پوری زندگی کے لیے تو یہ ایک نئی کہانی تھی۔''

''بیٹا تم تو ہمیں جا کر بھول ہی گئے۔ ایک بار تمہیں بطور خاص اپنے گھر بلا کر ہم نے تمہارے آنے جانے کا راستہ کھولا تھا۔ چوہدری وہاج کا گھر

تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہارا جب دل چاہے آیا جایا کرو۔ ہمیں کبھی غیر مت سمجھنا۔'' ایک دن چوہدری صاحب کا محبت بھرا فون آیا تو میں سرتاپا نہال ہوگیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، میں تو خود فائزہ کو ایک بار پھر دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس لیے میں نے دو دن بعد ہی ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

''چوہدری صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔ پُتّر تم بیٹھو میں فائزہ کو بلاتی ہوں' وہ تمہارے لیے کوئی چائے پانی کا بندوبست کرے۔'' فائزہ کی امی جان تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''نہیں، نہیں آنٹی چائے پانی کی ضرورت نہیں ہے آپ بیٹھیں بلکہ میرا خیال ہے میں چلتا ہوں جس دن چوہدری صاحب... گھر پر ہوں گے اس دن دوبارہ آجاؤں گا۔'' میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مروت یا لحاظ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

''لو چوہدری صاحب گھر پر نہیں ہیں تو کیا ہوا ہم سب تو گھر میں ہیں اور پُتّر تم چائے یا پانی کے بغیر کیسے جا سکتے ہو۔'' وہ اب میری بات سنے بغیر باہر نکل گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگے، آگے اور پیچھے پیچھے فائزہ چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئیں۔ فائزہ کو ایک نظر دیکھ کر ہی میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ فائزہ نے مجھے چائے دی اور اپنی امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''باجی میں جاؤں اب؟'' فائزہ اور اس کی امی اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں جب ایک نسوانی آواز دروازے کے قریب سے ابھری تھی۔

''رباط بات سنو۔'' فائزہ نے پکارا تھا اور اب کے آواز والا چہرہ دروازے میں نمودار ہوگیا تھا۔ میں اس لڑکی کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس نے ایک دن گلی میں مجھے روک کر پوچھا تھا کہ میں اسے پڑھادوں اور مجھے اس دن کی طرح آج بھی اسے دیکھ کر بہت غصہ آیا تھا۔

''جی۔'' وہ فائزہ کی بات سننے کے لیے کھڑی تھی مگر دیکھ مجھے رہی تھی۔

''کل چھٹی کر لینا، کل ہم نے کہیں جانا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ کتابیں سینے سے لگائے چلی گئی۔

''یہ رباط فاطمہ ہے۔ یہیں قریب ہی رہتی ہے۔ بے چاری کو پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر اس کے گھر والے بہت دقیانوسی سوچ کے مالک ہیں۔ وہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ ویسے تو بہت ذہین ہے مگر جب کوئی پڑھانے والا نہ ہو تو ذہین بندہ بھی کیا کرے۔ میں فارغ وقت میں اسے پڑھاتی ہوں۔'' فائزہ نے بڑے فخر سے مجھے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، ویسے یہ پڑھنے والی بھی ہے یا پھر یونہی گھر کے کاموں سے بچنے کے لیے کتابیں اٹھائے پھرتی ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ایسی تو نہیں ہے، پڑھنے والی ہے۔ آپ یہ پکوڑے تو لیں، میں نے خود بنائے ہیں۔'' فائزہ اب میرے کھانے پینے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی اور میں تو ویسے بھی اسی کی طرف متوجہ تھا۔

''میں چلتا ہوں اب بہت دیر ہوگئی ہے۔'' میں چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''پُتّر بیٹھ کھانا کھا کر جانا۔'' چچی جان نے مجھے کہا۔ انہوں نے خود مجھے منع کیا تھا کہ میں انہیں آنٹی نہ کہوں بلکہ چچی ہی کہوں۔ اس سے زیادہ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

''بہت شکریہ چچی جان! میرا کھانا بس تیار ہی ہوگا۔ آپ مجھے اب اجازت دیں۔''

''ایک منٹ ٹھہریں ذکی صاحب، میرے پاس کچھ نوٹس وغیرہ ہیں جو میں نے خود لکھے ہیں آپ ذرا ان کی اصلاح کردیں۔'' فائزہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر کچھ کاغذات لے کر اسی تیزی سے اندر بھی آ گئی۔

''اچھا کیا ہے، چلیں آپ دے دیں، میں

کردوں گا۔" میں نے وہ کاغذات تھامے اور باہر آ گیا۔

☆☆☆

مانا وادیِ عشق میں پاؤں اندھا رکھنا پڑتا ہے
لیکن گھر کو جانے والا راستہ رکھنا پڑتا ہے
تنہائی وہ زہر بجھی تلوار ہے جس کی دہشت سے
بعض اوقات تو دشمن کو بھی زندہ رکھنا پڑتا ہے
جبر کی جتنی اونچی چاہو تم دیوار اٹھا لینا
لیکن اس دیوار میں ایک دروازہ رکھنا پڑتا ہے
ہجر کا دریا آن پڑا ہے بیچ تو کوئی بات نہیں
عشق میں ساتھی تھوڑا سا تو حوصلہ رکھنا پڑتا ہے
بے خبری کی شامیں ہوں تو پھر انجان مسافر کو
صحرا میں بھی سمتوں کا اندازہ رکھنا پڑتا ہے

وہ نوٹس نہیں تھے...... وہ تو شاعری تھی جو فائزہ وہاج نے خود کی تھی۔ میں اس شاعری کی اصلاح کیا کرتا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔ ایسی ہی تین چار غزلیں تھیں جن میں میرے خیال میں اصلاح کی کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی جو شاہین آباد جیسے چھوٹے شہر میں رہتی ہے وہ اتنی اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہوگی۔ میں اس کی ذہانت اور اس خداداد صلاحیتوں پر گنگ بیٹھا تھا۔ میں کچھ دنوں کے بعد اپنے گھر گیا تو وہ کاغذات ساتھ ہی لے گیا۔ میں وہ دادا جان کو دکھانا چاہتا تھا۔ اس شاعری پر ان جیسی ادبی شخصیت کی رائے چاہتا تھا۔

"واہ...... کیا خیال ہے اور کیا حسنِ بیاں۔ کہیں بھی کوئی جھول نہیں...... لفظ تواتر سے ایسے رواں ہیں جیسے دریا کوئی بہتا ہے۔ بڑی باکمال بچی ہے۔ میری طرف سے اسے کہنا کہ اسے چھپوائے۔ بڑا نام پائے گی۔" دادا ابا نے ساری غزلیں پڑھی تھیں اور پھر تعریفوں کے پُل باندھ دیے تھے۔ فائزہ کی تعریف مجھے اپنی تعریف لگ رہی تھی۔ میں یوں اِترا رہا تھا جیسے یہ سب اس نے نہیں، میں نے خود لکھا ہو۔ فائزہ وہاج مجھے زندگی کی طرح عزیز ہوگئی تھی اور اس کے لکھے ہوئے لفظ مجھے اپنی زندگی ہی لگنے لگے تھے۔ میں شاہین آباد واپس آ گیا تھا۔ اب میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ہمارے درمیان تکلفات کی بہت سی دیواریں گر گئی تھیں۔ چوہدری وہاج کے باقی گھر والوں کا اعتماد اور بھروسا مجھ پر بہت بڑھ گیا تھا۔ اب واقعی مجھے پردیس، پردیس نہیں لگتا تھا۔ مجھے شاہین آباد اپنا شہر اور اپنا گھر لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

تتلیاں، جگنو سبھی ہوں گے مگر دیکھے گا کون
ہم سجالیں اگر دیوار و در دیکھے گا کون
اب تو ہم ہیں جاگنے والے تیری خاطر یہاں
ہم نہ ہوں گے تو ترے شام و سحر دیکھے گا کون
جس کی خاطر ہم سخن سچائی کے رستے چلے
جب وہی اس کو نہ دیکھے تو ہنر دیکھے گا کون
سب نے اپنی، اپنی آنکھوں پر کینڈکر نقابیں ڈال لیں
جو لکھا ہے شہر کی دیوار پر دیکھے گا کون
بے ستارہ زندگی کے گھر میں اب بھی رات کو
اِک کرن تیرے خیالوں کی مگر دیکھے گا کون

فائزہ نے ایک تازہ غزل لکھی تھی اور مجھے اس میں وہ کافی مایوس نظر آئی تھی۔

"ایسی بھی کیا مایوسی، دیکھنے والے کیوں نہیں ہیں۔ تمہارے لفظوں میں اتنا درد کیوں اتر آیا ہے۔ کسی سے کوئی شکایت ہے تو کھل کر کہو۔" میں جو اس کے لفظوں سے محبت کرنے لگا تھا کہاں برداشت کرسکتا تھا کہ اس کے لفظ رونے لگ پڑیں یا قلم دکھی ہوجائے۔ رات گئے میں نے اسے فون کیا تھا۔

"یہ تو شاعری ہے، آپ سچ سمجھ بیٹھے کیا؟" دوسری طرف وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"شاعری بھی تو دل کی آواز ہوتی ہے اور مجھے ایسی دکھی آوازوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"آپ تو بہت معصوم ہیں۔ شاعری کو بس شاعری سمجھ کر پڑھیں۔" اس کے لہجے کی شگفتگی نے میرے خدشے جھٹلا دیے تھے۔ میں نے سینے سے ایک گہری سانس باہر نکالی اور پھر ریلیکس ہوکر اس سے باتیں کرنے لگا۔

"آئندہ ایسی شاعری نہ کرنا۔ مجھے تمہارے لفظ بھی بہت عزیز ہیں۔" فون بند کرنے سے پہلے میں نے اسے کہا تو وہ ہنستے ہوئے خدا حافظ کہہ گئی۔

☆☆☆

"یہ اس طرح کیوں رو رہی تھی؟" میں فائزہ کے گھر آیا تو رباط فاطمہ اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی اور وہ ہولے ہولے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی رباط نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور مجھ پر ایک گہری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فائزہ سے پوچھا۔

"اس کے گھر والے اس کی شادی کررہے ہیں۔"

"تو اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ شادی تو سب کی ہوتی ہے۔"

"لیکن جس لڑکے سے اس کے گھر والے اس کی شادی کررہے ہیں وہ اسے پسند نہیں ہے۔"

"پسند کیوں نہیں ہے، کیا خرابی ہے اس لڑکے میں؟"

"اس کی سب سے بڑی خرابی اس کا جاہل اور ان پڑھ ہونا ہے۔ اس کے تایا کا بیٹا ہے۔ گھر والے سب راضی ہیں اور یہ کہتی ہے کہ مرجاؤں گی مگر اس جاہل، گنوار سے شادی نہیں کروں گی۔ آئیڈیل نہیں ملتا تو نہ ملے مگر کوئی اچھا پڑھا لکھا انسان تو ہو۔"

"اچھا، اس کا کوئی آئیڈیل بھی ہے؟" مجھے اس کیس میں یک دم ہی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"آئیڈیل تو ہر لڑکی کا ہوتا ہے۔ ہر لڑکی آئیڈیل بناتی ہے خواہ وہ اسے ملے یا نہ ملے۔"

"لڑکیاں اتنے خواب کیوں دیکھتی ہیں۔ اتنے سپنے کیوں بُنتی ہیں۔ آئیڈیل بناتی ہی کیوں ہیں جب انہیں پتا ہوتا ہے کہ ان کے خواب کوئی پورے نہیں کرے گا۔ ان کے آئیڈیل کو حقیقت کوئی نہیں بنائے گا۔"

"سب کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا۔ بہت سوں کو آئیڈیل مل بھی جاتا ہے۔ بہت سوں کے خواب بھی پورے ہوجاتے ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"تمہارے خواب پورے ہوئے؟ تمہیں آئیڈیل ملا؟" میں نے ذو معنی انداز میں فائزہ سے پوچھا۔

"آئیڈیل تو مل گیا ہے، امید ہے خواب بھی پورے ہوجائیں گے۔" وہ شرمگیں مسکراہٹ سے بولی اور میں اس کے جواب پر سرشار سا ہوگیا۔

"پھر تم اس کے لیے کیا کروگی؟ تمہیں اس کی مدد تو کرنی چاہیے۔" میں نے اسے واپس حال میں کھینچا۔

"اس کے گھر والے بہت عجیب سوچ کے مالک ہیں۔ جو ٹھان لیتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اس معاملے میں کسی کی نہیں مانیں گے۔"

"لیکن تم اس کی دوست ہو، اس کی استاد ہو۔ اس کی کچھ تو مدد کرو۔" میں نے اسے اکسایا۔

"ہوں...... اس کی اماں جان اور بہن سے بات تو ضرور کروں گی۔"

"بے چاری کس بری طرح رو رہی تھی۔" مجھے ایک بار پھر روتی ہوئی رباط فاطمہ یاد آئی۔

"اس کی زندگی تباہ ہونے جارہی ہے، ظاہر ہے وہ روئے گی۔ چلیں چھوڑیں یہ بتائیں آپ کو پتا ہے سحرش وغیرہ آرہے ہیں ہم سے ملنے۔" فائزہ نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں پتا ہے...... اور فریحہ نے بھی میری جان کھائی ہوئی ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ آنا چاہتی ہے مجھ سے ملنے اور تم سے بھی۔" میں نے اسے بتایا۔

"تو آنے دیں، آپ کیوں روک رہے ہیں؟"

"روکا تو نہیں ہے لیکن ابھی اجازت بھی نہیں دی ہے۔"

''اجازت دے دیں، اس میں سوچنے والی کیا بات ہے؟'' فائزہ نے کہا اور میں نے واقعی فون پر فریحہ کو آنے کی اجازت دے دی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ وہ سحرش کی فیملی کے ساتھ مجھ سے اور بطورِ خاص فائزہ سے ملنے آرہی تھی۔

فائزہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے میں جس گلی سے گزر رہا تھا یقیناً اسی گلی میں رباط فاطمہ کا گھر تھا کیونکہ جس دن اس نے میرا راستہ روکا تھا وہ اس گلی کے اسی سبز دروازے والے گھر سے نکلی تھی۔

''ملنا تو چاہیے ضرور اس کے گھر والوں سے کہ وہ اتنی دقیانوسی سوچ کے مالک کیوں ہیں؟'' میرے دل میں یونہی چلتے، چلتے ایک خیال آیا مگر پھر میں سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا کہ مجھے کیا دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں مگر اس کے گھر پر جب میں نے نظر ڈالی تھی تب مجھے لگا تھا دروازے میں کوئی کھڑا ہے اور اس کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کالا آنچل اڑتے دیکھا تھا۔ مزید غور کیے بغیر میں آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

سحرش کی فیملی شاہین آباد پہنچ گئی تھی اور ساتھ ہی فریحہ بھی تھی۔ ماریہ کو بھی آنا تھا مگر اسے چھٹی نہیں ملی تھی۔ فریحہ کتنی دیر میرے ساتھ لگی کھڑی رہی تھی اتنے دنوں کی دوری نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا پھر ہم سب نے چائے پی اور کھانا بننے تک سب میرا اسکول دیکھنے کو تیار ہوگئے۔ میں خوشی، خوشی سب کو ساتھ لے کر اسکول اور اپنی رہائش گاہ کی طرف آگیا تھا... وہ لوگ دو تین دن وہاں رہے تھے اور جس دن ان کی واپسی تھی اس دن فریحہ صبح سے میرے ساتھ تھی اس وقت بھی ہم دونوں بہن بھائی اسکول سے ملحق میری رہائش گاہ میں بیٹھے تھے۔ خلافِ توقع فریحہ، فائزہ وہاج کے بجائے رباط فاطمہ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔ وہ اتنے تواتر سے اور اتنی محبت سے رباط کا ذکر کر رہی تھی کہ مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ میں اس کے منہ سے فائزہ کا ذکر سننا چاہتا تھا، فائزہ کی تعریفیں سننا چاہتا تھا مگر وہ فائزہ کے بجائے رباط فاطمہ سے زیادہ متاثر ہو کر جا رہی تھی۔

''فریحہ تم نے یونہی رباط فاطمہ کو اپنے حواسوں پر سوار کر لیا ہے، ورنہ فائزہ کے آگے تو وہ کچھ بھی نہیں۔'' مجھ سے آخر رہا نہ گیا اور میں نے فریحہ سے کہہ دیا۔

''نہیں بھائی جان! میں نے کبھی کسی کو یونہی اپنے حواسوں پر سوار نہیں کیا جو کچھ رباط میں ہے فائزہ وہاج تو اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ اس لڑکی کی خوبیاں، اس کا کردار، اس کی گفتگو اور اس کا جذبہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ آج وہ اگر شاہین آباد میں نہ ہوتی کہیں اور ہوتی یا پھر یہیں اس کا ساتھ دینے والا کوئی ہوتا تو وہ صرف رباط فاطمہ نہ ہوتی تو وہ کچھ سے کچھ بن جاتی۔''

''چھوڑو رباط نامہ چلو چلیں سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی ٹائم سے نکلو گے تو شام تک گھر پہنچ سکو گے۔'' میرے سیل پر فائزہ کے میسج آرہے تھے میں نے اٹھتے ہوئے فریحہ سے کہا تھا۔ فریحہ بھی اپنا بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''کافی دنوں سے تمہارا کوئی نیا کلام سننے کو نہیں ملا۔ لفظ تمہارے ہیں اور محبت مجھے ان سے ہوگئی ہے۔ یوں کہو کہ تمہارے لفظ پڑھنے کو نہ ملیں تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔'' میں نے فائزہ سے بڑے جذب سے کہا۔

''ابھی آمد نہیں ہو رہی۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔

''اچھا تو شاعرہ صاحبہ آمد کے انتظار میں ہیں یا پھر موڈ نہیں ہو رہا۔''

''دونوں ہی باتیں ہیں۔'' وہ کھلکھلائی۔ اتنے میں رباط فاطمہ بھی کتابیں اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی اور فائزہ کے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرنے پر وہاں بیٹھ گئی۔

''فائزہ پتر تمہاری بھابی کا فون ہے، تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔'' کچھ دیر بعد چچی جان نے فائزہ کو آواز دے کر بلایا تھا اس وقت اس کی بھابی اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ فائزہ فون سننے باہر چلی گئی۔ میں فائزہ کی ایک کتاب اٹھا کر اسے دیکھنے لگا اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو رباط کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے پایا۔ میرے نظریں اٹھانے پر اس نے گڑبڑا کر فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ مجھے اب وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، میں وہاں سے اٹھا اور چچی جان کو بتا کر واپس آگیا۔

اس بار میرا ارادہ تھا کہ میں گھر جاؤں گا تو فائزہ وہاج کے بارے میں ضرور کوئی حتمی فیصلہ کر کے اس کے متعلق سب کو بتادوں گا تاکہ باضابطہ طریقے سے فائزہ میری زندگی میں شامل ہو جائے۔

☆☆☆

آج میں بہت خوش تھا میرے اسکول کا رزلٹ سو فیصد آیا تھا۔ محکمۂ تعلیم والوں نے اپنے آفس میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں اچھا رزلٹ دکھانے والے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب بڑے پیمانے پر منعقد ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے گھر فون کر کے اپنی اس کامیابی کے بارے میں بتایا تھا سب بہت خوش تھے۔ میری کامیابی ہی ان کی کامیابی تھی۔

''فائزہ اپنی کچھ نظمیں، غزلیں مجھے دو میں انہیں تمہارے نام سے چھپواؤں گا۔'' میں اس تقریب میں فائزہ کا لکھا ہوا کلام بھی لے کر جانا چاہتا تھا تاکہ مجھے وہاں کوئی متعلقہ شخص ملے تو میں فائزہ کا نام اور کلام چھپوالوں۔

''نہیں، نہیں ذکی۔ میں انہیں نہیں چھپوانا چاہتی۔'' فائزہ جانے کیوں ایک دم گھبرا گئی تھی۔

''کیوں آخر، اس میں کیا برائی ہے؟'' میں حیران ہوگیا۔

''بس میں نہیں چاہتی۔'' وہ بضد تھی۔

''اچھا بابا...... جیسی تمہاری مرضی۔ تمہاری مرضی کے بغیر تو یہ کام کوئی نہیں کرسکتا۔ ویسے تو لوگ موقع ڈھونڈتے ہیں کہ انہیں شہرت اور عزت ملے۔''

''بس میری اپنی سوچ ہے۔'' وہ بولی۔

''اوکے، اوکے اب دوبارہ نہیں کہوں گا۔ ویسے تمہاری شاگرد محترمہ کئی دنوں سے نظر نہیں آئی؟'' میں نے رباط کا اچانک پوچھ لیا تھا حالانکہ رباط فاطمہ میرے لیے کوئی اتنی زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ اگر وہ کچھ دنوں تک نظر نہیں آئی تو میں خاص طور پر اس کا پوچھوں۔

''اسے میں نے جواب دے دیا ہے۔'' فائزہ نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ میں مزید اس کو پڑھا سکوں اس لیے میں نے اسے ہٹا دیا ہے۔''

''اگر وہ تمہاری اچھی شاگرد تھی اور پڑھنے کا شوق رکھتی تھی تو تمہیں اس کے لیے تھوڑا بہت وقت تو نکالنا چاہیے تھا۔'' میں وہی تھا جس نے خود رباط فاطمہ کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا اور اسے جھڑک کر رکھ دیا تھا اور اب مجھے ہی فائزہ کا اس کے لیے انکار کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''بس وقت نہیں تھا ناں۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی تھی اور میں اس کے موڈ کو دیکھ کر چپ رہ گیا تھا۔

☆☆☆

میرے ہاتھ میں ٹرانسفر لیٹر تھا اور میں گم صم سا بیٹھا تھا۔ یہ ٹرانسفر شاہین آباد کے ایک ٹیچر جو لاہور میں تعینات تھا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے ایک طرح سے میرے لیے بھی آسانی کی تھی اور اپنے لیے بھی کہ وہ اپنے شہر میں آجاتا اور میں اپنے گھر میں مگر میں اس اچانک افتاد کو دیکھ کر پریشان ہو بیٹھا۔ میرے لیے تو وہ افتاد ہی تھی اب جبکہ میں شاہین آباد میں دل لگا بیٹھا تھا تو یہ جگہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ فائزہ سے دور نہیں جانا چاہتا تھا کہ میرے شاہین آباد سے جانے کا حکم آگیا تھا۔ گھر والوں کو اس ٹرانسفر کا پتا چلا تو ان سب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں جو روزگار کے لیے گھر سے بے گھر ہوا بیٹھا ایک بار پھر اپنے گھر آجاتا اور آرام وسکون کے ساتھ نوکری کرتا لیکن میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے اس ٹیچر سے بات بھی کی کہ وہ یہ آرڈر واپس نہیں کروا سکتا تو وہ میری بات پر ہنس پڑا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے پتا نہیں کیسے یہ آرڈر کروائے ہیں اب یہ واپس کیسے ہو سکتے ہیں۔ آخر کار مجھے شاہین آباد سے رختِ سفر باندھنا ہی پڑا۔ عجیب بات تھی میں یہاں آتے ہوئے بھی خوش نہ تھا اور اب جاتے ہوئے بھی میرا دل رو رہا تھا۔ ایک بار پھر چوہدری وہاج نے میرا الوداعی کھانا کیا تھا اور میں ان کے گھر میں افسردہ سا بیٹھا تھا۔ فائزہ کا بھی چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ پل بھر میں ہی چھلک پڑیں گی۔

''فائزہ پریشان مت ہونا۔ میں تم سے دور ضرور جا رہا ہوں مگر تمہیں دل سے کبھی دور نہیں کروں گا۔ میں بہت جلد اپنے گھر والوں کے ساتھ دوبارہ یہاں آؤں گا۔'' جب ذرا سا موقع ملا تو میں نے فائزہ کو تسلی دی تھی اس نے بس سر ہلا دیا تھا اور کچھ نمکین آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے تھے۔ یہ میری بے بسی کا امتحان تھا یا پھر اس کی بے کسی کا۔ مجھ سے زیادہ دیر وہاں بیٹھا نہیں گیا اور میں واپس آگیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر میرا شہر تھا، میرے اپنے لوگ تھے، میں خود تھا مگر کچھ ایسا بھی تھا جو دل کو بری طرح اداس کر رہا تھا۔ شاہین آباد جب سے چھوڑ آیا تھا تب سے دل کی رونقیں بھی وہیں کہیں رہ گئی تھیں۔ فائزہ سے موبائل پر رابطہ تو تھا مگر وہ پہلے والی بات نہ تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا بس سن سکتا تھا اور یہی بات میرے دل کو چین نہ لینے دیتی تھی پھر میں نے اپنے گھر والوں کو مجبور کیا کہ وہ شاہین آباد جائیں اور فائزہ کو میرے لیے مانگ لیں۔

''بھائی! کیا آپ نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا اور سب سے اہم فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟'' فریحہ میرے پاس آکر پوچھنے لگی۔

''ہاں تو اور کیا۔'' میں نے بڑے مطمئن انداز میں کہا۔

''فائزہ وہاج ہی آپ کی چوائس ہے؟'' وہ جانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی۔ میں اس کی الجھن تو نہ سمجھ سکا البتہ میں نے اسے بتا دیا کہ فائزہ ہی میری پہلی اور آخری چوائس ہے۔

میرے گھر والے چوہدری وہاج کے گھر گئے اور خوشی، خوشی واپس لوٹے۔ میرے بارے میں چوہدری صاحب کو کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہ تھی۔ میں جیسا بھی تھا وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انہوں نے بغیر مہلت لیے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا اور میرے گھر والوں نے رشتہ پکا ہونے کے بعد شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

پھر وہ دن بھی جلدی آن پہنچا جس دن میری اور فائزہ کی شادی تھی۔ میری بارات شاہین آباد جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میرے سہرے کے پھول فائزہ کے انتظار میں مہک رہے تھے۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے یہ ہمارے گھر کی پہلی شادی اور پہلی بڑی خوشی تھی، ہر کوئی مسرور تھا اور میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ میں نے جو چاہا وہ مجھے ملنے والا تھا میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی۔

فائزہ نے بہت جلدی میرے دل سے میرے آنگن تک کا سفر کر لیا تھا۔ محبت اور لگن سچی ہو تو مرادیں یونہی پوری ہو جایا کرتی ہیں۔ اسے پا کر میں تو یوں مدہوش ہوا کہ مجھے اردگرد کی دنیا کا کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ میرے روز وشب اس کی قربت سے مہکتے تھے اور میرے دل کا ہر گوشہ اس کی محبت سے آباد تھا۔

☆☆☆

''ذکی بیٹا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے، جب فرصت ملے میرے کمرے میں آجانا۔'' دادا جان نے سنجیدہ لہجے میں مجھے کہا۔

''مجھے فرصت ہی ہے، چلیں آپ کے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے ان کی بات سن کر فوراً ان کا ہاتھ پکڑا اور ان کے کمرے میں آگیا تھا۔

''بیٹھو۔'' وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کی پائنتی کی طرف ٹک گیا۔

''دادا جان آپ اتنے سنجیدہ ہیں، خیر تو ہے ناں؟''

''ہاں بیٹا خیر ہی ہے۔ مجھے بہو کے بارے میں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''فائزہ کے بارے میں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ میری شادی کو دو تین ماہ ہو چکے تھے۔ دادا جان کو اب اچانک فائزہ میں کیا نظر آیا تھا، میں حیران تھا۔

''ہاں، تمہیں پتا ہے تمہاری بیوی اس گھر سے تمہیں الگ کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اس بچی کو ہم بڑی محبت اور چاہ سے بڑی بہو کی حیثیت سے بیاہ کر لائے ہیں۔ تم ہماری آنکھوں کا تارہ ہو، ہمیں کتنے عزیز ہو یہ شاید لفظوں میں بیان نہ ہو سکے اس لیے تمہارے حوالے سے وہ بھی ہمیں اتنی ہی عزیز ہے۔ بیٹا بڑی بہو گھر کا مضبوط ستون ہوتی ہے۔ وہ ایک گھر کے شیرازے کو بکھرنے نہیں دیتی کیونکہ بعد میں آنے والی دوسری بہوؤں کو بھی اس کی تقلید کرنا ہوتی ہے۔ وہی اگر ہمیں ناپسند کرے گی اور ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہے گی تو لازمی بات ہے دوسری بھی ایسا ہی کریں گی۔ اس طرح ہمارے سارے بیٹے الگ، الگ ہو جائیں گے یہ گھر ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔'' دادا جان معلوم نہیں کون سی کہانی سنا رہے تھے۔

''دادا جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، فائزہ ایسا کیوں چاہے گی؟'' میں ان کی باتیں حیران و پریشان ہو کر سن رہا تھا۔ میں نے تو اپنے گھر والوں کو

چھوڑنے یا ان سے الگ ہونے کا کبھی نہیں سوچا تھا پھر فائزہ ایسا کیوں سوچنے لگی جبکہ اسے یہاں کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔

''بیٹا وہ تمہاری ماں سے کہہ رہی تھی، میں نے اپنے کانوں سے خود سنا ہے۔ اس بھلی عورت نے تو ابھی تک تم سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا کہ ایسی باتیں کرنے سے دل ہی برے ہوں گے۔ میں ہی اپنے طور پر تمہیں بتا بھی رہا ہوں اور سمجھا بھی رہا ہوں۔''

''اچھا، میں پوچھتا ہوں فائزہ سے۔ اس نے امی سے ایسا کیوں کہا؟'' میں نے دادا جان کو تسلی دے کر کہا۔

''ذکی بیٹا، طریقے سے بات کرنا۔'' میں ان سے اجازت لے کر اٹھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''فائزہ تم خوش تو ہو یہاں؟'' رات میں اپنے بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور وہ بڑے اچھے موڈ میں بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی جب میں نے اس سے یہ بات چھیڑی۔

''ہاں خوش تو ہوں مگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔

''مگر کیا؟''

''مگر ذکی یہاں کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔ اپنا دل کمرے سے نکلنے کو نہ بھی چاہے تب بھی باہر نکل کر سب میں بیٹھنا پڑتا ہے، کبھی دادا جان کو میری یاد ستانے لگتی ہے تو کبھی امی جان آوازیں دے دے کر بلاتی ہیں۔ کبھی فریحہ پوچھنے چلی آتی ہے کہ طبیعت تو ٹھیک ہے یعنی بندہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا؟''

''پگلی...... یہ تو سب کی محبت ہے جو پل، پل تمہارا خیال رکھتے ہیں۔ جب تک میں گھر نہیں آجاتا تمہارا دل لگائے رکھتے ہیں۔ تمہیں یہ محبت بری لگتی ہے؟''

''محبت بری نہیں لگتی مگر کوئی پرائیویسی......''

''کس پرائیویسی کی بات کرتی ہو تم۔ جب میں گھر آجاتا ہوں تو کوئی تمہیں آواز دے کر کمرے سے نہیں بلاتا، کوئی کام نہیں کہتا۔ ہم شام کو جہاں دل کرے گھومنے چلے جاتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ تم پر گھر کی کسی ذمے داری کا بوجھ نہیں ہے پھر تم کیسی پرائیویسی چاہتی ہو؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے پہلی بار اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ فائزہ اس قسم کی سوچ کی مالک ہوگی یہ راز تو مجھ پر آج کھل رہا تھا۔

''بس اپنا الگ گھر ہو جہاں میں جس حلیے میں چاہوں آزادانہ گھوموں، پھروں جب تک دل چاہے پڑی سوتی رہوں جب تک دل کرے ٹی وی دیکھا کروں جو دل میں آئے کروں۔ ہر لڑکی کا یہ خواب ہوتا ہے سو میرا بھی ہے۔''

''ایسے خواب ہی شادی شدہ زندگی کے لیے عذاب لے کر آتے ہیں۔ فائزہ تمہاری سوچ اتنی سطحی بھی ہوسکتی ہے میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔'' میں ذرا سا تلخ ہوا۔

''تم اسے جو مرضی سمجھ لو، میرا من تو یہی کرتا ہے۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے بولی اور میں محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ تو پڑ کر مزے سے سو رہی اور میری رات کروٹیں بدلتے بے چینی سے گزری کہ دادا جان میری آنکھیں نہ کھولتے تو میں جانے کب تک سمجھتا رہتا کہ فائزہ میرے گھر میں بہت خوش ہے۔

''جناب کا موڈ کیوں آف ہے؟'' اگلی صبح وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ مجھے اپنا انداز بدلنا پڑا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میری محبت فائزہ کے ان خیالات کو بدل دے گی آخر محبت میں اتنی طاقت تو ہوتی ہے ناں۔

''بس رات والی باتوں سے۔'' اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہہ دیا۔

''جانے بھی دو یار ان باتوں کو... تم نے کہہ

دیں میں نے سن لیں۔ ایسی باتیں دل پر لینے والی تھوڑی ہوتی ہیں۔ اٹھو اپنا موڈ ٹھیک کرو، کچن سے کتنی اچھی خوشبوئیں آرہی ہیں لگتا ہے امی جان آلو کے پراٹھے بنارہی ہیں۔ چلو آج چھٹی انجوائے کرتے ہیں۔''

''تم جاؤ کھاؤ آلو کے پراٹھے، مجھے نہیں کھانے۔'' اس نے اسی انداز میں کہا۔

''تمہارے بغیر میں کہاں کھاسکتا ہوں، چلو اٹھو۔'' میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی کھڑا کردیا اور کمرے سے باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

''اچھا منہ ہاتھ تو دھو لینے دیں۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی اور میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

☆☆☆

وہ جو شہرِ دل تھا اجڑ گیا
وہ جو خواب تھا بکھر گیا
کبھی موسموں کی نظر لگی
کبھی واہموں نے ڈرا دیا
کبھی منزلوں کے سراب نے
ہمیں راستے میں دغا دیا
کبھی زندگی کی کتاب سے
ہمیں جس نے چاہا مٹا دیا
بس اسی لیے
وہ جو چارہ تھا تو دور تک
اسے دیکھتے ہی رہے مگر
نہیں دی صدا بھی مگر
اسے روکتے بھی تو کس لیے

الفاظ بہت مانوس تھے مگر ان میں رچا بسا درد بہت نامانوس مگر دل پر اثر کرنے والا۔ میں تو پڑھ کر مبہوت رہ گیا۔ یہ نظم اس سے پہلے بھی فائزہ کی ڈائری میں پڑھی تھی اور تب بھی ایسے ہی متاثر ہوا تھا۔ میں نے فائزہ سے کہا بھی تھا۔

''تمہارے لفظوں میں تو اتنا درد نہیں ہونا چاہیے۔'' اور فائزہ نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''ضروری نہیں اپنے دل پر چوٹ پڑے تو درد محسوس ہو کسی دوسرے کے درد پر بھی دل تڑپ سکتا ہے۔'' اور میں اس نظم سے زیادہ فائزہ کے حساس دل سے متاثر ہوا تھا مگر اب کہ انہونی یہ تھی کہ نہ صرف نظم اخبار میں چھپی ہوئی تھی بلکہ نیچے جو نام تھا اسے پڑھ کر میں پریشان ہوگیا۔

''فائزہ اِدھر آؤ...... بھئی یہ دیکھو دن دیہاڑے لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔'' میں اخبار اٹھا کر فائزہ کو اونچی آواز میں بلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' فائزہ کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آئی۔

''یہ دیکھو تمہاری شاگرد صاحبہ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تمہاری شاعری کو اپنے نام سے چھپوانا شروع کردیا ہے۔ یہ دیکھو تمہاری لکھی ہوئی نظم پر رباط فاطمہ کا نام......'' میں نے اخبار اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''دکھائیں۔'' فائزہ سے پہلے اخبار فریحہ نے اچک لیا، وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''بھائی جان یہ نظم فائزہ بھابی نے نہیں بلکہ رباط فاطمہ نے ہی لکھی ہے۔'' فریحہ اخبار پڑھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''بلکہ میں نے اسے بہت پہلے کہا تھا تمہارا کلام چھپنے کے لائق ہے۔ تم بہت آگے جاؤ گی۔ اس پر اس نے کہا تھا یہ صرف الفاظ نہیں یہ تو میرے دل کی آواز ہے۔ اس لاحاصل محبت کا نوحہ ہے جو کبھی مجھے نہ ملی۔'' پھر وہ مزید بولی۔ ''آپ کو پتا ہے وہ جس شخص سے محبت کرتی تھی وہ اس کی محبت سے بے خبر رہا اور اس کی محبت دیکھیں ان لفظوں کے سہارے جیے جارہی ہے۔ گھر والوں نے اس کی شادی کرنی چاہی تو اس نے انکار کردیا، نتیجہ مار پیٹ اور گالی

گلوچ کی صورت نکلا۔ وہ بھی گھر سے باغی ہوگئی اوراس کی ضد سے مجبور ہوکر اس کے گھر والوں نے اسے اپنی خالہ کے پاس یہاں شہر بھیج دیا۔ یہ جلاوطنی اسے راس آگئی۔ خالہ کے گھر کا ماحول پڑھا لکھا تھا یہاں آکر اس کے علم حاصل کرنے کے شوق کی تسکین ہونے لگی۔ خالہ نے اسے کالج میں داخل کروادیا ہے۔ وہ اب کالج میں مجھے ملتی رہتی ہے۔ پڑھنے میں وہ آج بھی اچھی ہے اس کا کہنا ہے جس شخص سے اسے محبت ہوئی تھی وہ بھی علم کا رسیا تھا علم بانٹتا تھا، علم پھیلاتا تھا۔ میں بھی یہی کروں گی۔'' فریحہ نے مجھے ایک لمبی چوڑی کہانی سنادی اور میں دم سادھے یہ کہانی سنتا رہا تھا۔ مجھے شاہین آباد میں شک سا تھا کہ رباط فاطمہ مجھ میں دلچسپی لیتی ہے لیکن اب یقین ہوگیا تھا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں، میں ہی تھا میں یعنی ذکی آفندی ہی تھا۔

''لیکن تمہاری بھابی کی شاعری......؟'' میں نے فریحہ سے کہا۔

''بھابی جان، آپ نے بھائی کو نہیں بتایا کہ شاعری تو بس رباط فاطمہ ہی کرتی تھی۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ کو تو وہ دکھایا کرتی تھی استاد کی حیثیت سے اور آپ اسے اپنے نام سے منسوب کرلیتی تھیں۔'' فریحہ نے ایک اور انکشاف کیا تھا اور فائزہ کی حالت دیدنی تھی۔

مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا یعنی جن لفظوں سے میں نے محبت کی تھی اور اس محبت کا سرا فائزہ وہاج تک جا پہنچا تھا وہ لفظ تو دراصل رباط فاطمہ کے تھے۔ درپردہ میں رباط فاطمہ سے ہی محبت کرتا رہا تھا۔ میرا دماغ پھٹنے لگا اور میں فائزہ کے ساکت وجود پر ایک پشیمان سی نظر ڈال کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔

مجھے کچھ دنوں سے فریحہ کے سلوک کی سمجھ آگئی تھی کہ وہ اچانک بھابی، بھابی کرتی ایک دم فائزہ سے دور کیوں ہوگئی تھی۔

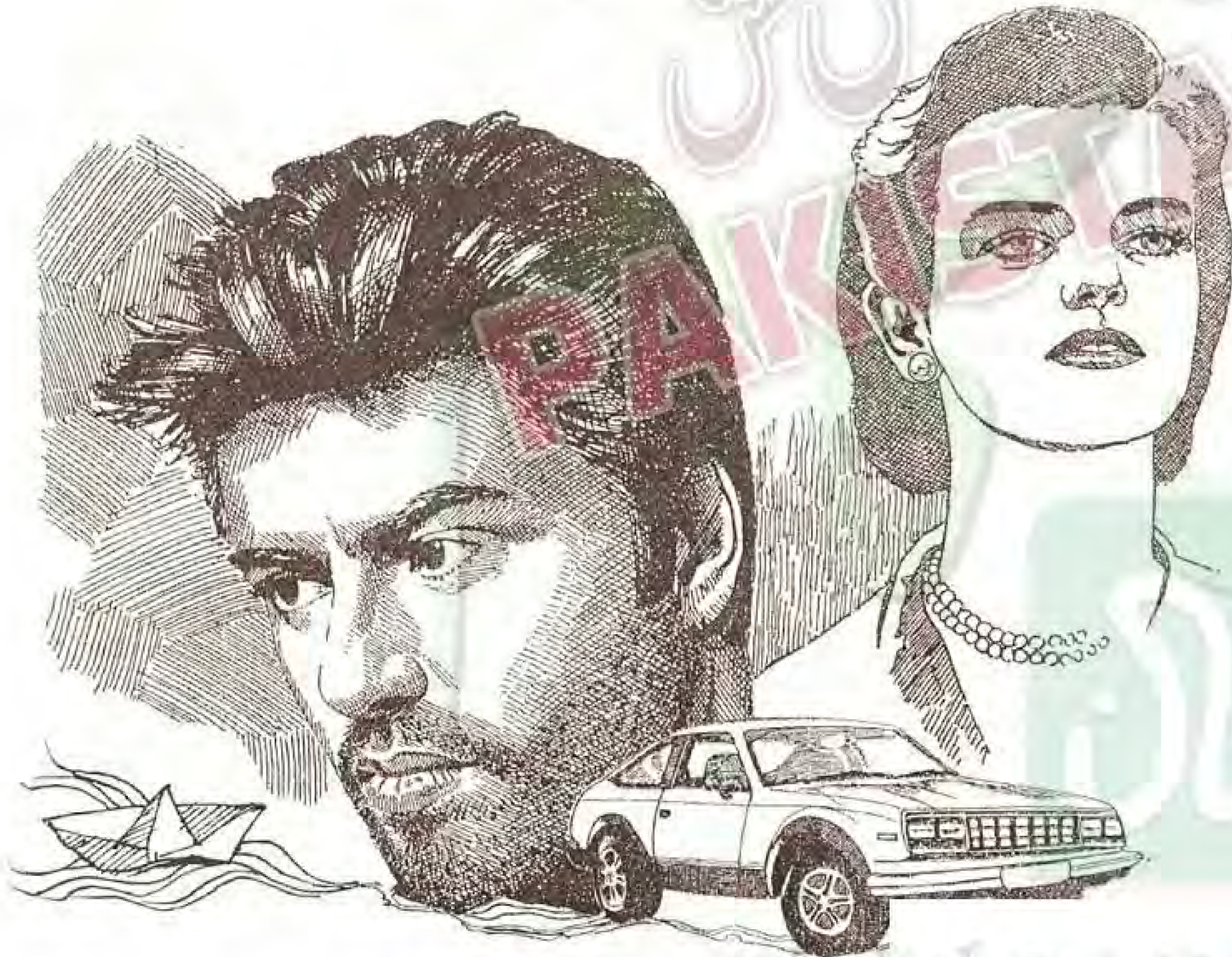
☆☆☆

کہانی کہاں سے چلی تھی اور کہاں آکر رک گئی تھی۔ قسمت میں کیا ہوتا ہے، کبھی کوئی نہیں جان سکتا۔ بہت سا علم رکھنے والا، اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھنے والا، دوسروں کو عقل دینے والا...... کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ میں شاہین آباد میں تھا تو سب کو جاہل اور گنوار اور خود کو عقلِ کل سمجھتا تھا۔ شاہین آباد میں ہی میری عقل میرے فخر وغرور کے نیچے دب گئی اور آج میں کہتا ہوں فائزہ سے شادی کرکے اپنی زندگی کا غلط ترین فیصلہ کیا تھا۔ وہ جو نظر آتی تھی ویسی تھی نہیں۔ وہ چوہدری وہاج کے پورے گھرانے سے بہت مختلف تھی۔ سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتی تھی۔ اس میں ایک فیملی کے ساتھ رہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ وہ ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی۔ اب تو میرے گھر والے بھی اس کے جھگڑوں سے اتنے تنگ آگئے ہیں انہوں نے مجھے مکمل اختیار دے دیا ہے کہ میں اسے لے کر الگ گھر میں چلا جاؤں اور میں سوچتا ہوں الگ گھر میں لے جاکر میں فائزہ کو کیسے رکھوں گا۔ یہاں تو بہت سارے لوگ ہیں، وقت جیسے تیسے کرکے کٹ ہی جاتا ہے۔ دن رات اکیلی فائزہ کی صورت میں کیسے برداشت کروں گا، وہ بھی اس صورت میں کہ جب مجھے رباط فاطمہ سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کا احساس اتنا طاقت ور تھا یا الفاظ اتنے مکمل اور مضبوط تھے کہ وہ میری سوچوں کو آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے ہیں...... میں چاہتے ہوئے بھی ان کے سحر سے نہیں نکل سکتا اور ہر وقت انہی لفظوں کی قید میں جکڑا رہتا ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ فائزہ نے شاہین آباد کے لوگوں کو دکھانے کے لیے مجھ سے شادی کی تھی ورنہ اس کی محبت کی بنیاد ہی جھوٹ پر تھی اور رباط فاطمہ نے جو محبت کی وہ سچی اور کھری تھی اور سچی محبت اپنا آپ منوا ہی لیا کرتی ہے۔

●◆●

ناؤ کاغذ کی

غزالہ فرخ



''آپی...... آپی جی مجھے لگتا ہے کہ ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔''

''اوہ...... اب کیا ہوگا، بارش تو رکنے کا نام نہیں لے رہی اب اس وقت یہ مصیبت...کیا ہوگا؟''

''گھبرائیں نہیں میں دیکھتا ہوں۔'' ڈرائیور نے مجھے تسلی دی۔

''سنو تیز بارش ہے باہر نہیں جاؤ، تھوڑی دیر رک کر انتظار کرلیتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے آپی جی کہ اس وقت ٹائر بدلنا......''

''ہاں، ہاں میں جانتی ہوں۔''

''صاحب کو فون لگائیں جی وہ دوسری گاڑی بھیج دیں، آپ بھلا کیسے یہاں بیٹھ پائیں گی۔'' مجھے غفار کی یہ بات پسند آئی۔ اپنے بیگ سے اپنا آئی فون نکالا اور مبشر کو فون کرنے لگی۔ مبشر کے موبائل کا رابطہ عارضی طور پر بند تھا وہ شاید کسی میٹنگ میں مصروف تھے، میٹنگ میں ہوتے تو وہ اپنا موبائل آف کردیتے۔ اب عجیب سی صورتِ حال پیدا ہوچکی تھی میرا ڈرائیور غفار گھبرا رہا تھا۔

''صاحب سے رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں غفار......اب......؟''

''ایک بات کہوں آپی جی...... یہ قریب ہی ایک ریسٹورنٹ ہے آپ اگر تھوڑی دیر کے لیے انتظار کرلیں......پھر کوئی حل نکال لیں گے۔''

میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا واقعی بالکل قریب ہی ایک ریسٹورنٹ تھا۔ غروبِ آفتاب کا وقت تھا لائٹس روشن ہوچکی تھیں۔ برستی بارش میں وہ جگہ مجھے گوشۂ عافیت سی محسوس ہوئی۔ یوں تیز بارش کے دوران اس پنکچرڈ گاڑی میں بیٹھنا عذاب سا لگ رہا تھا۔ یوں اکیلے اس وقت کسی ایسی جگہ جانا معیوب تو لگا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا...... گو گاڑی اور ریسٹورنٹ کے دروازے کے درمیان راستہ تھوڑا تھا مگر بارش زوروں پر تھی اور سڑک پر پانی جمع...... میں نے ایک نظر اپنی قیمتی ساڑی پر ڈالی اور دوسری نازک سی سینڈل پر...... پھر سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑی ساڑی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اتنا اونچا کرلیا کہ پانی ساڑی کے قیمتی بارڈر کو گیلا نہ کر پائے اور ٹانگیں بھی برہنہ نہ ہوں، ذرا آگے بڑھی، اب میں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کے اوپر بنے شیڈ کے نیچے تھی دروازہ کھلا تھا، ایک نظر اندر کے ماحول پر ڈالی وہاں رش زیادہ نہیں تھا مگر کچھ لوگ بارش سے بچنے کے لیے اس جگہ کو شیلٹر کے طور پر استعمال کررہے تھے۔ اسی وقت اپنے بالکل سامنے والی ٹیبل پر بیٹھے شخص سے نظروں کا تصادم ہوا۔ وہ بھی اِدھر ہی تک رہا تھا۔ شاید میری ہیئت کذائی......

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پہچان لیا۔ وہ سبحان تھا۔ جلدی سے ساڑی نیچے گرائی اور سینڈل پاؤں میں اُڑس لیے، نظر تھوڑی دیر جھکائے رکھی، میرا وجود شدید زلزلے کی زد میں تھا۔ سبحان کو اتنے عرصے کے بعد یوں اپنے سامنے پاکر...... میرا ذہن ابھی تک اس کی موجودگی کو قبول نہیں کر پارہا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر ہم یوں ایک دم ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے اور وہ بھی کس طرح...... ذرا لرزیدہ چال سے قدم آگے بڑھائے اور قریب ترین پڑی کرسی پر ڈھے سی گئی۔ کچھ دیر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر اس صورتِ حال میں بھلا کس طرح نارمل ہوپاتی...... اتھل پتھل سانسوں اور زرد پڑتے چہرے کے ساتھ نظر اٹھائی' لاشعوری طور پر نظر اسی طرف اٹھی وہ بھی اِدھر ہی تک رہا تھا۔ طوفان کے آثار اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھے وہ بھی سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ کچھ ثانیے یونہی گزر گئے۔

''جی میڈم......!'' ویٹر میرے قریب آگیا۔

''ایک گلاس پانی پلیز......'' ویٹر واپس مڑا اور چند ہی منٹوں کے بعد پانی کا گلاس لے آیا جسے میں نے ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اندر ایک لاوا سا پک رہا ہے۔ اس پانی کے گلاس نے ذرا سا پُرسکون کر ڈالا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہورہی تھی۔ بارش اب بھی تیز ہورہی تھی۔ جانے یہاں کتنی دیر رکنا تھا۔ یونہی بیکار بیٹھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ قریب سے گزرتے ویٹر کو کال کیا وہ مؤدب سا ہوکر قریب کھڑا ہوگیا۔

''ایک سینڈوچ اور کافی......''

''اوکے میڈم......!''

وہ واپس چل دیا میں نے بہت کوشش کی کہ سامنے ٹیبل پر بیٹھے اس شخص کی طرف نہ دیکھوں مگر میں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کروں گی کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پائی وہ بھی شاید لگاتار اِدھر ہی تک رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ملیں، وہ بہکے قدموں سے بڑھا اور میرے سامنے والی کرسی پر آن بیٹھا۔

''کیسی ہو مہرالنسا؟''

وہی آواز...... وہی ٹھہرا ہوا انداز مجھے اس کے منہ سے اپنا نام پکارنا بڑا ہی اچھا لگتا تھا، صرف اس کی زبان سے اپنا نام سننے کے لیے میں کبھی اس کی پہلی پکار پر جواب نہیں دیتی تھی۔ میں [illegible]

لخت مجھے اس کے لیے نفرت اور کراہیت کا شدید احساس ہوا۔ میرے دل میں اٹھنے والے جذبات شاید میرے چہرے کے نقوش میں عیاں ہوگئے اس نے تھوڑا سا شرمندہ ہوکر نظریں جھکالیں۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''ناراض......ایسے شخص کے لیے اتنا معمولی سا لفظ؟''

''تم اصل حقیقت نہیں جانتیں...میں مجبور کردیا گیا تھا۔'' اتنے لمبے چوڑے انسان کے لیے جو اتنے بلند و بانگ دعوے کرتا تھا مجبور کردینے کا لفظ بڑا ہی مضحکہ خیز سا لگا۔ میں نے صرف ایسا سوچا تھا بولی کچھ نہیں۔

''ہم قدرت کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں اوپر والا جس طرح چاہتا ہے ہمیں حرکت دیتا ہے، ہم کوئی بھی عمل اپنی مرضی اور رضا سے نہیں کرپاتے...... مہرالنسا تم کچھ کہوگی نہیں......؟ کوئی گلہ...... کوئی شکایت؟'' اس کی گفتگو کا انداز ایسا ہی گمبھیر اور متاثر کن تھا۔ وہ لفظوں کا غازی تھا الفاظ کے ہیر پھیر اور گفتگو کا تاثر اسے مجھ پر حاوی کردیتا تھا، میں اپنی ذات کو، اس کے تقاضوں کو فضا میں تحلیل کردیتی تھی مگر اس وقت اس کی گفتگو میرے تھکے ہوئے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

''تم یوں ایک دم میرے سامنے کیوں آگئے میں نے اس دن کے بعد اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ تم مجھے کبھی نظر نہ آؤ۔'' میری بات نے شاید اسے دکھی کردیا تھا۔ تبھی ایک پل کو رکا ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

''واقعی میرے جیسا معمولی شخص اس اسٹینڈرڈ کے ریسٹورنٹ میں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر یہ بارش...... میری بائیک نے یہاں عین اس جگہ پر دھوکا دے دیا پھر کیا کرتا...... مگر شاید یہاں اس ریسٹورنٹ کے سامنے بائیک کا خراب ہونا...... دیکھا ''

''تم جیسا مادّہ پرست اور خود غرض شخص ایسی باتیں کرتا اچھا نہیں لگتا سبحان......''

ویٹر میرا آرڈر لے آیا تھا۔ سینڈوچ کی پلیٹ میرے سامنے تھی اور دھواں اڑاتی جھاگ سے پُر کافی کا مگ بھی...... میں نے چند لمحے کچھ سوچا پھر کافی کا مگ ہونٹوں سے لگالیا۔

''تم نے مجھے جن القابات سے نوازا ہے مہرالنسا تمہارے خیال میں، میں اسی لائق ہوں کیونکہ تم حقیقت سے واقف نہیں ہو، تم چاہتی تھیں کہ میں آئندہ کسی گھڑی تمہارے سامنے نہ آؤں مگر میں نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ تم مجھے ضرور ملو...... دیکھو اللہ نے یہ سبب بنادیا ناں!'' کافی کا مگ ختم ہوگیا تھا۔ میں بالکل خالی دماغ کے ساتھ تھی مجھے اس کافی کا ذائقہ بھی بالکل محسوس نہیں ہوا۔

''تم نے تو بہت رئیس آدمی سے شادی کرلی، زندگی تمہارے لیے آسان ہوگئی۔'' پتا نہیں اس کے لہجے میں گلہ تھا یا طنز...... میں سمجھ نہیں سکی۔

''تم واپس آئے تھے؟''

''ہاں...... مجھے واپس آنا ہی تھا، ایک حادثہ مجھے کچھ دنوں کے لیے تم سے دور لے گیا تھا مہرالنسا مگر تم لوگ وہاں سے جاچکے تھے...... میں نے بہت ڈھونڈا تمہیں......''

''کیا......اس سانحے کے بعد میرے والدین اس محلے میں رہ پاتے' وہ غیرت مند لوگ تھے سبحان، میں واپس لوٹی تو اماں مجھے لے کر نانی جان کے گھر آگئیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں......مگر میں سب کچھ اس وقت جان پایا جب تم کسی اور کی ہوگئی تھیں۔''

''ابا تو زندہ درگور ہوگئے تھے۔ سبحان ایسے وقت میں اماں نے ہی مرد بن کر سارے معاملے کو سنبھالا۔''

''ہم نے خدا کو حاضر و ناظر مان کر یہ رشتہ جوڑا تھا مہرالنسا۔''

''وہ رشتہ جس کا کوئی ثبوت نہ ہو رشتہ نہیں ہوتا...... وہ تو زمانے کی نظر میں......'' اپنے کیے

ہوئے فعل کے بارے میں کوئی لفظ کہنے کو اپنا ہی دل نہ مانا...... میں برسوں سے اس سے دور تھی اور ہر وقت اپنے دل میں اس کے لیے نفرت اور کراہیت کے جذبات ہی اُمڈتے پاتی مگر آج اچانک جب وہ میرے سامنے آگیا تو جانے کیوں دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''تم نے سبحان میرے اس اتنے بڑے اقدام...... اتنی جرأت کا کیا بھرم رکھا...... میں تو تمہاری محبت میں ہر شے کو حتیٰ کہ اپنے والدین کی عزت کو بھی ٹھوکر مار کر نکل آئی تھی اور تم......تم میرے زیورات نقدی اُڑا کر بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر چل دیے۔'' گزرا ہوا ایک ایک نظارہ ذہن کی اسکرین پر چلنے لگا۔

میں نے ذہنی اور قلبی اذیت کے سات روز اس ایک کمرے کے فلیٹ میں گزارے تھے۔ دروازہ بند کرکے بس اسی کی طرف تکتی رہتی کہ کسی بھی دستک پر وہ لوٹ آئے گا...... میں جو اس کی محبت کے نشے میں چور ہو کر اپنی ماں کے زیور اپنے ہی جہیز کے لیے جمع شدہ رقم لے کر گھر سے چل دی تھی۔ اسی آس پر تھی کہ وہ واپس آئے گا۔ ہم نے اس جگہ تین ہفتے گزارے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند والدین کی بیٹی مہر النسا جانے کیسے بھٹک گئی۔ میں نے اپنے نفس کو اتنی آسانی سے خود کو زیر کرنے دیا تھا یا وہ الفاظ کا غازی تھا اور جھوٹے وعدوں کا کھلاڑی، میں اس کی باتوں میں آتی چلی گئی۔ یہ زیورات میرے لیے تھے اور اس کے مطابق ان پر میرا ہی حق تھا۔

والدین ہمارے ملاپ کے لیے رضامند نہ تھے. ویسے تو ہم بالغ' عاقل بھی تھے ہم خود نکاح کے بندھن میں بندھ کر ان کے سامنے آجاتے اور انہیں اسے قبول کرنا ہی پڑتا۔ یہی وہ پلان تھا جس نے مجھے اپنے گھر سے نکلنے کا حوصلہ دیا۔ نکاح کی رسم کی ادائیگی میں دیر کی بھی اس نے کئی وجوہات بتائیں اور میں ان پر یقین کرتی چلی گئی۔ یوں دن گزرتے چلے گئے اور اس روز جب پھوٹ پھوٹ کر میں رو دی کہ ہماری شادی کا انتظام ہو جائے تو ہم سرخرو ہو کر واپس جائیں تو وعدوں کا ایک پہاڑ قائم کر کے وہ چل دیا......اور میں اس کے انتظار میں اکیلی تڑپتی رہ گئی۔ الماری میں رکھے پیسے اور زیور بھی موجود نہ تھا۔ کمرے میں کھانے پینے کا محدود سا سامان تھا۔ رونے اور کراہنے سے تھک جاتی تو اسے زہر مار کر لیتی مگر جب پورا ہفتہ گزر گیا۔ میں خود کو ایک قبر میں ایک کالی کوٹھری میں محبوس سمجھ بیٹھی تو پھر دروازہ کھول دیا باہر جانے کا راستہ نظر آگیا تھا۔

اس در پر دستک دینے والے وہ لرزتے ہوئے کمزور ہاتھ میرے ہی تھے۔ اماں نے مجھے سامنے پایا تو بازو پھیلا دیے میں آگے بڑھی، شدید ابکائی آئی سارا جہان ایک دم گھوم سا گیا اور میں اماں کے کندے پر سر رکھے بے ہوش ہوگئی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اماں ہراساں سی گھر کا سامان سمیٹ رہی تھیں۔

''بس ضروری چیزیں لے لوں دوبارہ اس محلے میں قدم نہ دھر سکوں گی۔'' مجھے لگا وہ خود سے ہی کلام کر رہی ہیں مگر قریب ہی ادھ موئے سے ابا بھی تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اماں لپک کر میرے پاس آئیں۔

''تجھے جنم دیتے ہی تیرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا مہرو...... تجھ جیسی اولاد سے تو بانجھ ہونا ہی اچھا تھا۔'' اماں کی آواز میں بجلی کی کڑک نہ تھی اشکوں کی نمی تھی۔

''منہ کالا کر آئی ہے ناں، چل وہاں چلیں جہاں کوئی کچھ جان نہ پائے۔'' میں اپنی طبیعت اور اماں کی بے بسی سے سب کچھ جان پائی تھی۔ صبح فجر کی اذان ہوئی، اماں، ابا نے نماز ادا کی اور مجھے لے کر نانی جان کی طرف چل دیں۔ وہاں ایک، ایک منٹ دل اور ذہن پر گھاؤ لگاتا گزرا۔ اماں نے یہی کہا تھا

کہ انہوں نے بیٹی کو بیاہا اس کا خاوند بہت ظالم اور جنونی نکلا تبھی تو اسے علیحدہ کر کے یہاں لے آئی...... بچے کی ولادت کے بعد طلاق دلائی جائے گی۔

آخر وہ وقت آن ہی پہنچا۔ اماں، دائی کو لینے بھاگیں، جان کنی جیسی تکلیف اور درد بھرے مرحلے کے بعد ایک معصوم بچے کی اس ظالم اور فریبی دنیا میں آمد ہوئی......رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''بیٹا ہوا ہے......'' دائی بولی میں ابھی سوچ رہی تھی کہ اس واقعے پر خوشی مناؤں کہ ماتم کروں کہ یک دم جیسے میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ یک لخت بچے کو تولیے میں لپیٹ کر تیزی سے باہر لے جایا گیا۔

''ہائے مر گیا...... بچہ تو مر گیا......''

☆☆☆

مدتوں سے ان آنکھوں کی فصیل میں مقید وہ اشک یک دم راستہ پا کر بہہ نکلے ایک آنسو بہا......اور پھر دوسرا......اور میرا چہرہ اشکوں سے بھیگ گیا۔ سبحان بڑی دکھی اور متورم آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ جب میں تھک گئی تو بے دم ہوتے نیچی آواز میں بولی۔

''سبحان میرا...... ہمارا بچہ مر گیا سبحان......!''

''تمہیں یہ بتایا گیا مہر النسا......'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب......؟'' میں بھونچکی سی بولی۔

''کچھ نہیں......؟'' وہ دوبارہ شانت ہو کر بیٹھ گیا۔

''اور پھر تمہاری شادی کر دی گئی مہر النسا......''

''ہاں...... دو جوان ہوتی بچیوں کے باپ سے۔'' مبشر حسن دو بچیوں کے باپ تھے، بیگم جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ بیگم سے پیار کرنے والے شریف النفس سے انسان تھے۔ دوسری شادی کے حق میں تو نہ تھے مگر اس برے ماحول اور خراب زمانے میں کسی عورت کے بنا بچیاں بھلا اس گھر میں کیسے رہ پاتیں۔ اس لیے مجھے دلہن بنا کر دراصل بچیوں [illegible] بنا کر اس شاندار بنگلے میں لے جایا گیا۔ پتا نہیں مبشر حسن کو میرے بارے میں کیا کہانی گھڑ کر سنائی گئی تھی شریف انسان تھے۔ گھر بار سلیقے سے چلنے لگا اور بچیوں کی تربیت اور حفاظت کے مسئلے سے آزاد ہوئے۔ انہوں نے اس بابت کبھی نہ پوچھا نہ کبھی کچھ کہا۔

وقت کا تو کام ہی گزر جانا ہے۔ وہ تو گزرتا رہا۔ بچیاں عزت اور شرافت سے اپنے، اپنے گھر کی ہو گئی تھیں میں خود ایک ہرجائی شخص کی ڈسی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں بچیوں کو حتی الامکان اس بگڑے زمانے اور منفی روش سے بچانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہی تھی۔ عزت کرنے والا مہذب شوہر دنیا کی ہر آسائش کے ساتھ مجھے میسر تھا مگر جانے کیا کمی...... میرا ماضی نفرت انگیز تھا مگر...... وہ بچہ......جس نے اس دنیا میں سانس لی تھی۔

جو میری کوکھ کا جنا تھا۔ جس کو نو مہینے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ جس کے ہونے کا پہلا احساس میں نے اپنے بدن میں محسوس کیا تھا جو میرے جسم کا حصہ تھا میرا اپنا عضو...... جو آتے ہی اس فریبی زندگی میں سانس لیتے ہی منہ موڑ گیا تھا۔ یہی احساس مجھے یک دم تہی دامن کر دیتا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ماں بننے کا شرف نہیں بخشا۔ شاید میں اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس مکروہ بدن کے ساتھ کوئی نیا مہمان کوئی ننھا سا فرشتہ اس دنیا میں لا سکوں۔ اپنی بانجھ ہوتی سوچوں سے ذرا آزاد ہوئی تو اچانک سبحان سے سوال کر ڈالا۔

''تم نے شادی کی سبحان......؟''

''نہیں...... میرے پاس زندگی گزارنے کے لیے ایک ٹھوس سہارا تھا۔''

''بارش کافی کم ہو گئی ہے میڈم میں اب پنکچر لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میرا ڈرائیور مؤدب میرے سامنے کھڑا اطلاعات کرتے ہی اس کی نگاہ میرے

ساتھ بیٹھے سبحان پر پڑی وہ یک دم شاکڈ ہوا۔

''ابو آپ......؟''

''ابو......'' میں ششدر رہ گئی...... کم پریشان سبحان بھی نہیں تھا۔ یک دم اپنے بیٹے کو سامنے پا کر وہ متحیر تھا مگر اگلے ہی چند لمحوں کے بعد وہ سنبھل گیا۔

''غفار تم......؟''

''جی ابو...... یہ میری آپی جی ہیں۔'' تھوڑی دیر کے لیے سب خاموش ہو گئے، ہم سب ایک ہی جیسی خود اذیتی کا شکار تھے۔ سبحان کے ساتھ غفار کھڑا تھا۔ تقریباً یکساں قد اور بہت ملتے جلتے نقوش کے ساتھ وہ پہلی نظر میں ہی باپ بیٹا کے طور پر جانے جا سکتے تھے۔

''تم چلو غفار، گاڑی سیٹ کرو، میں آ رہی ہوں۔'' وہ واپس پلٹ گیا۔

''یہ تھا میرا مضبوط سہارا مہر النسا جس کے بل بوتے میں نے اپنی زندگی گزار دی۔'' اب اس کی باری تھی وہ سنا رہا تھا۔ وہ حکایت جس سے میں بے خبر تھی...... وہ کہانی جو میرے لیے ان کہی تھی اور ان سنی تھی۔

''میں تمہارے زیورات اور پیسے لے کر گیا تھا مگر میں اس سے شادی کے انتظامات کر کے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا نشیمن تیار کر کے نئی زندگی کی ابتدا کرنا چاہتا تھا مگر ابھی میں گھر کے قریب سنسان سڑک پر تھا کہ مسلح غنڈوں کی زد میں آ گیا۔ پستول کا برسٹ کھانے کے بعد میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوا اور جب کسی رحمدل شخص کے باعث اسپتال میں دو ہفتے گزار کر گھر آیا تو تم جا چکی تھیں۔''

''اس سے پہلے اپنے اسی خیر خواہ کے ذریعے مجھ تک اطلاع تو کروا دیتے سبحان میں تمہارا انتظار کر لیتی تمہاری خبر گیری کر لیتی۔''

''میں کافی دن آئی سی یو میں رہا مہر النسا میں کچھ کہنے سننے سے بیگانہ تھا جب ہوش آیا تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا میں یہ سوچ بنا کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا اپنے محلے میں...... تمہارے گھر بھی گیا مگر...... اُدھر بھی میری تقدیر کی طرح مکمل اندھیرا تھا۔ کوئی تم لوگوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ میں رکا نہیں، میں ٹھہرا نہیں میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا رہا کوئی بھی سرا...... کوئی بھی کلیو ملتا تو دیوانوں کی طرح چل پڑتا پھر ایک روز میں نے تمہارا سراغ پا لیا مگر تم اس وقت کسی اور کی ہو چکی تھیں ایک رئیس گھرانے کی بیگم صاحبہ۔'' اس کے لہجے میں ایک دم زہر بھر گیا تھا۔

''مگر میرا خدا میرے ساتھ تھا۔ میں بے نیل و مرام نہیں رہا، میں نے تمہیں گر کھو دیا تھا پر تمہارا پر تو میرے ساتھ تھا...... اور وہی میری زندگی گزارنے کا سہارا بن گیا مگر میں نہیں جانتا کہ دنیا اس قدر چھوٹی ہے، جس بچے کو میں نے اپنی کُل زندگی بن کر پالا وہ پھر تمہارے پاس ہے تمہارا ملازم بن کر۔'' جذبات اور اس کی تندی نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ یک دم خاموش ہوا اور پہلو بدل کر کسی غیر مرئی نقطے کو تکنے لگا۔ کتنا ہی وقت تھکا دینے والی خاموشی اور تکلیف دہ سکوت کی نذر ہو گیا...... میں بالکل متضاد خیالات کے جھگڑوں سے گزر رہی تھی۔ میری کوکھ کا جنا میرے جسم کا وہ ٹکڑا منوں مٹی تلے نہ تھا۔ وہ اس دنیا میں تھا اور میرے سامنے میرا ہم سفر...... وہ زندگی میں میرا ساتھ نہیں دے پایا تھا مگر گاڑی کے سفر میں وہ میرا ساتھی تھا۔

☆☆☆

پہلے روز ہی جب مبشر حسن نے غفار کو ڈرائیور کے طور پر رکھا تو وہ مجھے دوسرے ملازموں سے الگ سا لگا تھا، مجھے اس میں عجب سی اپنائیت اور کشش محسوس ہوئی شاید کہیں لاشعوری طور پر اس کے نقوش اس کی جسامت اور قد میں مجھے سبحان کی تصویر نظر آئی۔ تبھی تو میں نے اسے بیگم صاحبہ کہنے سے روک دیا۔

''سنو بچیاں مجھے آپی جی کہتی ہیں تم بھی یہی

کہنا مجھے۔''

''جی میڈم...... سوری آپی جی۔''

معصوم چہرے اور جھکی آنکھوں والا غفار میرا منظورِ نظر تھا میں نوکروں کے معاملے میں بہت نرم اور حساس دل رکھتی تھی...... مگر غفار...... اسے دیکھتے ہی اسے پیار کرنے کو اسے کچھ دینے کو جی چاہنے لگتا۔ سارے کے سارے مادرانہ جذبات اُمڈ آتے اور آج سبحان سے یوں سرِ راہ اور اچانک ملاقات کے بعد میں جان پائی کہ وہ...... وہ...... غفار...... میرا اپنا...... گاڑی ایک دم جھٹکے سے رکی تو خیالات کا تلاطم رک گیا۔ میں نہیں جانتی کہ میں نے ریسٹورنٹ سے گاڑی تک کا سفر کس طرح طے کیا اور کس طرح گھر تک آن پہنچی۔ مبشر حسن گھر پر تھے اور میرے لیے پریشان......

''بیگم کہاں چل دی تھیں آپ اتنا خراب موسم...... کم از کم مجھ سے کانٹیکٹ کیا ہوتا۔'' وہ اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے اور میں نے پتا نہیں خود فراموشی کے عالم میں کیا جواب دیے تھے۔ شل دماغ اس وقت جاگا جب سامنے کھڑا غفار نظریں جھکائے بلکہ نگاہیں چرائے میرے سامنے کھڑا تھا اور گاڑی کی چابی میری طرف بڑھا رہا تھا۔

''بیگم صاحبہ...... میں کل سے کام پر نہیں آپاؤں گا......'' میں یک دم کٹ سی گئی تھی۔ وہ چلا گیا اور میں اس کے قدموں کی چاپ کو دل پر لیے تڑپتے ہوئے تنہا رہ گئی۔

''غفار کو تم نے کتنے لاڈ سے رکھا...... مگر وہ پھر بھی چلا گیا۔'' مبشر حسن حیران تھے۔ ''تمہیں کوئی وجہ بتائی؟''

''نہیں تو......'' میں گڑبڑا گئی۔

''مجھے کہہ رہا تھا میں یہاں پاکستان میں نہیں رہوں گا...... میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔'' میں خاموش رہی...... میری کوکھ پھر اجڑ چکی تھی میں اپنے بچے کو سینے سے لگا کر اسے اپنا نہیں کہہ پائی تھی۔

کنواں میرے سامنے رہا اور میں پیاسی......

میری تشنگی ویسی ہی تھی...... میں تو اپنے بیٹے کو ایک دفعہ اپنا نہ کہہ پائی تھی۔ رات بستر میں جیسے کانٹے نکل آتے جس طرف کروٹ بدلتی دل لہولہان سا رہتا...... غفار کے چلے جانے کے بعد اور سبحان سے اس ملاقات کے بعد نہ میں زندوں میں تھی نہ مُردوں میں، عجب سی زندگی تھی میری...... اماں کب کی منوں مٹی تلے جا سوئی تھیں ابا تو پہلے ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ سوال کرتی تو کس سے...... دماغ بھڑکتا انگارہ بن گیا تھا ایسے وقت میں ایک ہی سہارا...... ایک ہی روشنی کی کرن نظر آئی۔

میرے شاید بیسیوں دفعہ کال کرنے کے بعد آخر کار غفار نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو میڈم......''

''تم شرمندہ کر رہے ہو مجھے حالانکہ اب تم ساری حقیقت جان گئے ہو گے غفار۔''

''اس روز ریسٹورنٹ میں آپ دونوں کے چہرے سے ہی ساری کہانی پڑھ پایا تھا، مجھے اب اور کسی صفائی کی ضرورت نہیں۔''

''غفار...... پلیز میری بات سنو......''

''میں اس دنیا میں رہنا ہی نہیں چاہتا بیگم صاحبہ جہاں ایک ماں دولت کی کھنک کے لیے اپنے غریب شوہر اور بیٹے کو تنہا چھوڑ دے۔''

''اوہ......'' سبحان نے جانے اسے کیا بتایا تھا ایک لحاظ سے سبحان بھی صحیح تھا۔ غفار کے آسرے پر اس نے زندگی گزاری تھی اب اسے میرے بارے میں سوچنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا۔

''میں تو دنیا چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر ابو کا میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ ملک، یہ مٹی چھوڑ جاؤں گا جہاں کبھی کہیں بھی آپ سے سامنا نہ ہو سکے۔''

''کیا چاہتے ہو غفار......؟''

''میں امریکا چلا جاؤں گا۔''

''اپنے ...... اپنے ابو کو اکیلا چھوڑ کر؟'' میری آواز رُندھ گئی۔

''نہیں، جاتے ہی سیٹ ہوتے ہی ان کو اپنے پاس بلالوں گا۔''

''مجھے ماں سمجھتے ہو......؟''

''نہیں......'' غفار بری طرح الجھ سا گیا تھا۔

''مگر یہ حقیقت ہے، غفار کہ میں تمہاری ماں ہوں صرف ایک دفعہ مجھے اپنے اس حق کو استعمال کرنے کا موقع دو۔'' وہ خاموش رہا، میں رودی میں تڑپ گئی اور پھر وہ مان گیا۔ میں نے اسے زبردستی ایک چیک دے دیا۔ تین ماہ گزر گئے، جانے ایک پل ایک برس کا تھا یا پھر ایک صدی پر محیط مگر گزر گیا۔ میں اس کی فون کال کے لیے تڑپتی رہی، اپنی مامتا اور مجبوریوں کی دُہائی دے کر اس سے منوالیا تھی کہ وہ امریکا جا کر مجھ سے فون پر بات کرے گا اپنا نمبر بھیجے گا مگر آنکھیں اس کا نیا نمبر دیکھنے کو اور کان اس کی کال بیل کی آواز کو ترس گئے تھے۔ بنگلے میں ملازمین کے علاوہ کوئی نفس نہ تھا جس سے باتیں کرتی ہمبشر حسن مصروف تھے، گھر میں ہوتے تو اپنا وقت لائبریری میں گزارتے، میرے لیے انہوں نے دنیا کی ہر شے مہیا کی تھی' بچیاں اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ گاہے بگاہے آتیں ان کی آمد سے گھر کا انمٹ سکوت تھوڑی دیر کو کم ہو جاتا۔

اب میرے دل میں ایک ہی لگن تھی، میں اپنے جگر کے ٹکڑے کی آواز سننا چاہتی تھی۔ شاید تڑپتی ماں کی آواز اس کے دل میں میری جگہ بنا سکے یا پھر اس کے میرے درمیان چھائی دھند کو ختم کر سکے۔

ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے، میری اپنے بچے کے لیے طلب اور تلاش جنون کی حد تک بڑھی تو خدا نے خود ہی راستہ بنا دیا۔ مالی بابا اور اس کا بیٹا یونہی کسی بات میں غفار کا ذکر کرنے لگے تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''غفار کے گھر کا پتا ہے تمہیں؟''

''نہیں بیگم صاحبہ، اس نے اپنا بھید کبھی نہیں دیا وہ تو بڑا خاموش سا لڑکا تھا۔'' تبھی مالی بابا کا بیٹا قاسم بول اٹھا۔

''میں جانتا ہوں بیگم صاحبہ ایک روز وہ یہاں آ کر بیمار پڑ گیا تھا تو میں اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔'' ایک دم جیسے چاروں طرف گھرے بادلوں کا سایہ ہو گیا ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔

''مجھے اس کے گھر لے چلو قاسم ......'' میں نے کہا۔

☆☆☆

ایک بھدّے جسم اور سفید بالوں والی خاتون میرے سامنے تھیں۔ گندا سا علاقہ تھا اور گندا مکھیوں سے اٹا صحن......

''میں غفار کی نانی ہوں جی وہ میرا ہی نواسا ہے۔'' اس بیان پر ذرا حیرت سی ہوئی مگر پچھلے دنوں سے اتنے انکشافات اور تحیّرات میری زندگی میں پیش آئے تھے کہ میں اس بیان کو بھی ہضم کر گئی۔

''غفار کی ماں میری بیٹی لاڈو واقعی میری لاڈلی بیٹی تھی جانے کیسے اس مکار مرن جوگے سبحان کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس کا دیوانہ ہو گیا۔ میں اور لاڈو کا ابا اسے اپنی بچی کا ہاتھ دینا نہیں چاہتے تھے۔ آوارہ قماش اور کام سے فارغ تھا۔ بتاؤ بی بی کیا تم ایسے شخص سے اپنی بیٹی کا بیاہ رچاؤ گی؟''

یک دم سوال داغا گیا میں اسے کیا بتاتی کہ میں تو خود اپنی زندگی اس کے ساتھ رول آئی۔

''بدمعاش آدمی تھا برے آدمیوں کا یار لاڈو کے ابا نے ٹالنے کو کہا جا کچھ کمائی کر کے لا جانے وہ... بدنیت کہاں سے چار پانچ ماہ میں ہی زیور اور پیسہ لے آیا اور زور لگانے لگا کہ اپنی بیٹی کو روانہ کرو۔ مرتی کیا نہ کرتی لاڈو کا ہاتھ دے دیا، اسے روانہ کیا کرتا تھا نکھٹو کہیں کا خود بھی یہیں پڑا رہا...... میں اور لاڈو کا ابا گھر کا خرچہ چلاتے' اللہ نے اسے اولاد دیں تو دیں مگر ٹھیک نہیں تھیں کچھ عرصے کے بعد ہی چل بستیں۔ بڑی منتوں مرادوں سے ایک بچہ ہوا وہ ماشاء اللہ تندرست اور خوب صورت تھا۔ وہی جوان ہوا تو اسے کام پر لگوایا۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا اماں جی......؟''

''سنو تو......'' اماں کا ٹیمپو ٹوٹ رہا تھا۔ بیٹی گھر سے چل دی تھی۔ باتوں کی شوقین اماں مطمئن تھیں کہ کوئی ان کی کہانی میں دلچسپی لے رہا ہے تبھی تو سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''یہ کسی بھلے گھر میں ڈرائیور لگا خوش تھا وہاں ایک روز مرن جوگا سبحان اس کی کوٹھی میں چل دیا جانے وہاں کیا دیکھ آیا کہ ہر وقت بیٹے کے کانوں میں گھسا منصوبے بناتا رہتا۔ جیسا بھی ہے لاڈو سے اسے سچا پیار ہے۔ لاڈو کو ایک پل آنکھ سے دور نہیں کرتا۔ ہار بنا رہتا ہے ہر وقت اس کا۔'' اماں پٹڑی سے اترنے لگیں یہ بات جانے بغیر کہ ان کی یہ بات میرے دل کو تیز کٹار کی طرح کاٹے دے رہی ہے۔

''پھر؟'' میری آواز میرے لیے اجنبی سی بن گئی۔

''آٹھ دن گھر سے غائب رہا کہنے لگا پرانے شکار کا ریکارڈ پانے جا رہا ہوں۔ پھر ایک روز برستی بارش میں...... چھاجوں مینہ برس رہا تھا گلی میں گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ دونوں چل دیے لاڈو کو کہہ گئے کہ دعا کرنا آج کا ڈراما ٹھیک ہو جائے تو اس کی زندگی کا ڈراما بھی بدل جائے گا۔''

''اوہ......'' ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔ برستی بارش کا وہ دن...... غفار کا عین ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پنکچر کا عذر...... اور وہاں سبحان کی پہلے سے ہی حاضری...... اوہ...... ہر بات میرے سامنے واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے درمیان کی دھند تو چھٹ چکی تھی مگر اصل کتنا بھیانک تھا۔ وہ ان آٹھ دنوں میں ہمارے بچے کے راز سے واقف ہو گیا تھا۔

''جانے کیا ہوا بہت خوش تھے دونوں اور اب تو خیر سے امریکا چل دیا ہے۔''

''اور وہ دونوں......''

''لو بھلا دو مہینے سے بیٹا اتنی تگڑی رقم بھیج رہا ہے تو وہ رہتے اس گند میں کرایے کا فلیٹ لے لیا ہے آہ...... ہا...... جیسا بھی ہے اپنی لاڈو سے بڑا پیار کرتا ہے دیکھنا اب بیٹا بھیجے گا تو عیش کرائے گا...... میری لاڈو کو...... عیش ہو جائیں گے۔''

میں اپنا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے واپس چل دی تھی۔ میں دونوں دفعہ اسی ناگ سے ڈسی گئی تھی جسے میں نے اپنے دل کا مالک بنایا اور اس کی دھڑکنوں کا بھی...... جسے اپنی کل کائنات جانا اور اپنی زندگی بھی سمجھا اور زندگی کا حاصل بھی۔

قاسم گلی کے باہر انتظار کر رہا تھا میں نے ڈوبتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کی نیا ڈرائیور حامد قریب آ گیا۔

''چلیں آپی جی۔''

مبشر حسن نے غفار کی طرح نوجوان معصوم صورت ڈرائیور رکھا تھا۔ جانتے تھے کہ میں اسے غفار کی طرح پیار اور شفقت سے رکھوں گی اس سے آپی جی ہی کہلوایا۔

''آپی جی......'' میری بدلتی حالت دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''کیا ہوا آپی جی...... مجھے بتائیں، مجھے کچھ کہیں تو سہی......''

''خاموش ہو جاؤ میں بیگم صاحبہ ہوں تمہاری' میں کسی کی ماں نہیں، میں کسی کی آپی جی نہیں...... مت بولو یہ لفظ...... میں کسی کی ماں نہیں، میں کسی کی......''

میں نڈھال ہو رہی تھی بے حال ہو رہی تھی اور جانے کیا ہذیان بکے جا رہی تھی۔ حامد حیران ہو کر تک رہا تھا اور میں...... میں غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہی تھی کہ میں نے دونوں دفعہ کاغذ کی ناؤ میں سفر کرنا چاہا تھا۔



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

یہ ایک سرد سہ پہر کا منظر تھا۔ سرما کے آغاز سے بارشوں اور برف باری کا سلسلہ قریب قریب شروع ہو چکا تھا۔ جس کے باعث فضا خوشگوار مگر شہر بہت غلیظ ہو جاتا تھا۔ انتہائی بھیگا اور غلیظ...... اسے گیلی کیچڑ زدہ سڑکوں سے نفرت تھی۔ اسے احمق، بے وقوف اور جاہل لوگوں سے نفرت تھی۔ اسے آنسوؤں سے نفرت تھی گیلی آنکھیں، گیلے چہرے اور گیلی پلکیں...... اس کا دل چاہتا تھا وہ گیلی آنکھوں والے

چہروں کو جھپٹا مار کر نوچ لے۔ گیلے غلیظ شہر اور گیلی غلیظ آنکھیں...... اس کا دماغ گرما دیتی تھیں۔

مگر اب ایسا نہیں تھا، گیلے چہرے اب اسے مقناطیس کی طرح کھینچتے تھے۔ گیلی آنکھوں میں اسے اب کہانیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ گیلے شہروں میں اب اسے امان نظر آتی تھی...... سکون نظر آتا تھا۔

اس نے سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ خلافِ توقع آج شہر گیلا نہیں تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ کیا آج کچھ عجیب ہونے والا تھا؟ بادل اوٹ میں کھسک گئے تھے۔ مرغابیاں بیلے کی طرف بھاگ گئیں۔ سنہری پریاں تالاب سے اُڑ گئیں...... تو کیا سچ میں آج کچھ عجیب ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے شبستاں سے نکل کر لاؤنج کی گلاس وال کے قریب آرکی تھی پھر جیسے اس کے ذہن اور دل میں گھنٹی سی بجی تھی۔ دماغ کو برقی رو کے ذریعے ایک پیغام ملا تھا۔ کوئی کوندا سا لپکا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ چہرے پر گرماہٹ بکھر گئی تھی۔ اس کی نس نس میں انگڑائیاں لیتا انتظار مچل، مچل کر رائل روڈ پر پھسل رہا تھا۔ کوئی اس کے کان میں چپکے، چپکے جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

''کیا وہ ڈوچ لینڈ...... پہنچ گیا؟'' اس کی گیلی آنکھوں میں خواب اتر آئے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے عذاب اتر آئے تھے۔ شاہین لمبی اڑان بھر کر آ رہا تھا۔ شاہین اس کے خوابوں اور عذابوں کا حساب کرنے آ رہا تھا۔ شاہین جیسے اپنا شکار ڈھونڈنے آ رہا تھا۔ شہنشاہ شاہین...... ادھیراج، خاقان، سلطان...... شکاریوں کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں بالآخر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

کئی ساعتیں چپکے سے کھسک گئی تھیں۔ لمحے دبے قدموں نکل رہے تھے۔ معاً بھاری بوٹوں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے گیلی آنکھوں کو رگڑ کر دیکھا۔ دو تین اجنبی چہرے نظر آئے تھے۔ وہ گیلی آنکھوں کو رگڑتی رہی۔ یہ آنسو، یہ پانی... کسی سزا کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑا تھا۔ آنسوؤں کا ایسا چشمہ جو سات آٹھ منٹ بعد خود بخود اُمڈ آتا۔

وہ جیسے اجنبی چہروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا حافظہ ہرگز بھی کمزور نہیں تھا نہ اس کی یادداشت ہلکی تھی۔ اس نے ان چہروں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایک دفعہ دیکھ لیتی تو پھر کبھی نہ بھولتی۔ وہ مہذب، باوقار اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ خوش پوشاک اور ذہین آنکھوں والے...... اسمارٹ، خوش شکل۔ لمحے کے آخری حصے سے گزر کر جیسے وہ ان کی آمد کا مقصد جان چکی تھی۔ شاید اسی لیے اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال اُبھر آیا تھا۔ ان تین لوگوں کی آنکھوں میں تجسس تھا، کچھ کھوجنے، جاننے اور پرکھنے کی آرزو تھی۔ جیسے وہ کسی کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ کس کی تلاش میں آئے تھے؟ یہ جاننا ضروری نہیں تھا کیونکہ گیلی آنکھوں والی لڑکی ان لوگوں کی آمد کا مقصد جانتی تھی۔ وہ ان کی تلاش کا مقصد بھی جانتی تھی۔

''گرس گوڈ......'' ان تینوں میں سے ایک نے سلام جھاڑا تھا۔ انداز میں شائستگی نمایاں تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں تجسس تھا۔

''تاگ...... (ہیلو)'' اب کے دوسرے نے بھی ہونٹ ہلائے تھے۔ وہ لوگ بڑی مشتاق نظروں سے مورگن روک میں لپٹی گیلی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جس کا چغہ پیروں کو چھوتا تھا۔ روک کی فرل جگہ جگہ سے اُدھڑی تھی۔ بالوں کا گھونسلا گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا اور گھر کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کباڑ خانے میں غلطی سے آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ تینوں معنی خیزی سے الٹ پلٹ ہوتی ایک، ایک چیز کو دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے ایک نے گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

''آپ کا تعلق بیدی نوئنگ سے ہے؟'' وہ اپنی ذہین آنکھوں کو اس کے چہرے پر جما کر سوال کر رہا تھا۔ بیدی نوئنگ کا نام سن کر اس کا چہرہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ وہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی دوبارہ بیدی نوئنگ کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔

''نہیں......'' اس نے روکھے اور انتہائی کھردرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اس کی گیلی آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔

''اوہ......!'' ان تینوں کو جیسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

''ہم لوگ شوت لانٹ اسکاٹ لینڈ سے آئے ہیں۔ پولی سیت بیامتے (پولیس افسر) ہیں۔ ان میں سے ایک اسپیشل فورسز کا بندہ ہے۔ ہماری جس اوفی سیل ایجنسی سے پیغام جاری ہوا ہے۔ اس میں سرفہرست مون حسیب کا نام آیا ہے، وہ بیدی نوئنگ (ادارہ) چلاتی تھیں۔ ہم ان کو ایک کیس کے لیے ہائر کرنا چاہتے ہیں...... ایجنسی ان کو شوت لانٹ کا ریٹرن ٹکٹ دے گی اور دیگر مراعات کا شمار کوئی نہیں...... انہیں ہمارے ساتھ معاہدے کے تحت کام کرنا ہوگا......'' ان میں سے ایک آفیسر اپنے آنے کا مدعا بیان کر رہا تھا...... تب اس نے انتہائی درشتگی کے ساتھ اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بات کاٹ کر کہا۔ وہ جانتی تھی یہ لوگ اسی مون حسیب کا پوچھ رہے تھے جو خداداد غیر مادی قوتِ متحرکہ کی مالک تھی۔

''مون حسیب نہیں ہے۔'' اس کے تیور غضبناک ہوگئے تھے۔ تب آفیسر جیسے اور بھی حلیمی کے ساتھ کہنے لگے۔

''محترمہ......! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ برائے مہربانی مون حسیب کو بلادیں...... آپ کو شاید مون حسیب کا پتا نہیں۔ وہ جو mental telegraphy اور clairvoyance کی ماہر ہیں۔ وہ جو انسانی پوشیدہ......'' آفیسر نے لجاجت سے التجا کی تھی جب گیلی آنکھوں والی لڑکی بھڑک کر فرش پر لڑھکا کانچ کا گلاس اٹھاتے ہوئے چیخی۔

''نہیں ہے، مون حسیب، بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ جان نکال لوں گی تمہاری۔'' وہ جنونی انداز میں فرش پر پڑی ایک، ایک چیز اٹھا کر ان پر حملہ کرتی دہاڑ رہی تھی اور وہ جیسے اس حملے پر تیار نہیں تھے۔ ایک دم خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں بھاگنے لگے۔

''ارے...... بھاگ چلو، یہ تو پاگل ہے۔'' وہ چیختے ہوئے باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جب گیلی آنکھوں والی لڑکی اذیت سے مسکرا دی۔

''میں پاگل نہیں...... میں تو منتظر ہوں...... ڈوچ لینڈ پر قدم رکھنے والے شاہین کی منتظر......''

☆☆☆

یہ ایک چمکتی ہوئی دھوپ سے گُندھی دوپہر تھی...... سورج بہت دنوں بعد جوبن پر نظر آ رہا تھا۔ آغاز اگست کی یہ سویر یورپ میں بہت خوشگوار تھی۔

افراہیم کی lexus ایک سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے من ہائیم کو جانے والی آٹو بان پر دوڑ رہی تھی۔ فرینکفرٹ سے جنوب کے رخ جانے والی اس آٹو بان کا اختتام ایک گھاٹی کے اس پار ہرے، پیلے، نیلے، اودے پھولوں اور سبزے کے کٹ تک ہو جاتا تھا۔ دور کہیں سبزے کے ٹیلے اور پُرشکوہ ڈھلان پوری آن بان سے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلانی سطحوں والے ہرے اور بھورے کھیت جن میں کسانوں کی جگہ کہیں کہیں ٹریکٹر اور مشینیں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ سرخ اور سفید انڈے جیسی ٹائل کی ڈھلوان چھتوں والی آبادیاں، دور آسمان کی بلندیوں میں اڑنے والی مرغابیاں اور طویل پہاڑوں کے بلند سلسلوں پر چھائے بیلے کے جھنڈ جو پلک جھپکنے سے پہلے ہی نگاہوں کی اوٹ سے اوجھل ہوتے پھر کچھ اور نئے مناظر کے ساتھ نمودار ہوتے...... گویا فطرت کا حسن آنکھ مچولی کا کھیل مچا رہا تھا۔ بائیں سرے پر ایک سڑک کسی ناگن کی

طرح بل کھاتی ہوئی آٹو بان کی بلندی سے اتری اور اس راستے پر آپڑی جو من ہائیم شہر کی طرف جاتا تھا۔

درختوں ،شاخوں اور بلند اونچی عمارتوں کی چوٹیوں پر وہاں کے معتدل مزاج سورج کی شعاعیں اب ہلکی سنہری پڑ رہی تھیں۔ شہر میں داخلی شاہراہ کے آس پاس، دائیں ،بائیں بھورے اور گلابی پتھر کی اونچی دیو ہیکل عمارتیں کس شان سے کھڑی تھیں۔ عمارتوں کی زیادہ تعداد بینک، انشورنس کمپنیوں' تجارتی فرموں، پوسٹ آفسز، سپر اسٹورز وغیرہ کی تھیں۔ دو رویہ سڑکوں کے درمیان سبزہ، پھول اور قد آور سرو کے درخت ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ اس ایونیو کے اختتام پر افراہیم کی lexus نصف دائرے کے محیط پر آنکلی۔ جس کا مرکز زرد پتھر کی نقاشی کا اعلیٰ ترین، خوب صورت اور بلند و بھاری بھرکم مینار آب تھا۔

پھر اس سے کچھ اور آگے نصف دائرے کے نشیب میں ایک ایسا طلسماتی منظر دکھائی دے رہا تھا گویا اسے پھولوں کے ساتھ گوندھ دیا گیا ہو۔ ایک وسیع و عریض پھلواری جس کے چہار اطراف سرخ، سنہری، نیلے، پیلے پھولوں کے تختے دمکتے تھے اور ان کے درمیان ان گنت فواروں کی آبشاریں چمک رہی تھیں۔ پھولوں کے جانے کتنے دہکتے رنگ تھے......اور پانی کی لہروں میں جانے کیسی قوسِ قزح بہتی تھی۔ ایک ایک منظر نگاہ کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا مگر وہ یہاں اپنی آنکھوں کو فطری حسن سے مبہوت کر دینے کے لیے تو ہرگز نہیں آیا تھا، نہ مغربی جرمنی کے حسن سے متاثر ہونے آیا تھا۔ وہ تو یہاں ایک نصب العین لے کر آیا تھا۔ ایک عظیم ترین مقصد لے کر آیا تھا۔ اسے کسی کا گریبان پکڑنا تھا۔ کچھ پرانے حساب کتاب تھے کچھ پچھلے دفتر تھے، جنہیں کھولنے آیا تھا۔ ماضی کی گرد دھول جھاڑ کر بھولی بسری ایک کہانی میں پھر سے رنگ بھرنے آیا تھا۔ حالانکہ وہ کہانی کوئی بہت پرانی تو نہیں تھی۔ صرف تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ ابھی تین سال ہی تو گزرے تھے مگر یہ تین سال بھلا بھلائے جاسکتے تھے؟ تین سال پہلے اس کے دل اور گھر پر قیامت کا وقت آیا تھا۔ تین سال پہلے شاید اپنی پوری زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے دکھ، غم اور اذیت کے زہر سے آشنائی حاصل کی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ دکھ دراصل ہوتا کیا ہے؟ غم کے گھاؤ کہتے کسے ہیں؟ مرد بھلا روتے کیسے ہیں؟ اور مرد کیا روتے بھی ہیں؟ وہ تو ان تین سالوں میں کئی مرتبہ رویا تھا کبھی گھٹ گھٹ کر، کبھی سب سے چھپ کر اور کبھی سرِ محفل...... وہ جب جب مالا کو دیکھتا تھا اس کے وجود میں دوڑتا خون جوش کھانے لگتا...... اس کی خاموشی خون کے آنسو رلاتی تھی۔ اس کی پتھرائی بے رنگ آنکھوں کا حزن اس کے سب گھر والوں کی نیندیں اڑا چکا تھا۔ مالا کے غم نے ان سب کو بے حال اور نڈھال کر رکھا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ مالا کے غم، خاموشی اور تنہائی کا زہر چپکے، چپکے جانے کیسے اس کی رگوں میں خود بخود اترنے لگا تھا۔ پچھلے تین سال وہ لمحہ بہ لمحہ ایک عہد کو اپنے وجود کے اندر مضبوط کرتا رہا تھا اور یہ وہی عہد تھا جس کی مقناطیسی قوت اور طاقت اسے کھینچ کر من ہائیم لے آئی تھی۔ اس میں کوئی بہت سوجھ بوجھ یا دانائی نہیں تھی مگر یہاں وہ ایک جامع منصوبہ لے کر آیا تھا۔ ایک طویل پلاننگ کے تحت آیا تھا۔ وہ مالا کے مجرم کا گریبان پکڑنے آیا تھا۔ وہ ظلم کرنے والے اس ظالم کے اس حسین شہر کی سرزمین پر انتقام کے گرم اور زہریلے جذبات لے کر آیا تھا۔

وہ جانتا تھا مالا کے مجرم تک پہنچنے کے لیے اسے اپنی بھرپور طاقت، زور، اختیارات کا استعمال کرنا ہوگا۔ اور وہ اپنا سارا زور' طاقت، قوت اور اختیارات کا استعمال کر کے مالا کے مجرم کو اس کے

انجام تک پہنچانے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ وہ یہاں سے ناکام لوٹ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ناکام ہونے اور شکست خوردہ ہو کر لوٹنے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ آرام دہ اس بہترین سپر لگژری lexus میں بیٹھ کر بھی اس کی سوچیں اپنے پیارے گھر کی طرف بہہ رہی تھیں مگر اس کی زہریلی سوچوں کو بریک تب لگے تھے جب افراہیم کی شگفتہ سی آواز سنائی دی تھی۔

''ذی شاہ......! تم کیوں اتنے اپ سیٹ دکھائی دے رہے ہو؟ اتنا حسن بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر پائے تو اس حسن کا بھلا کیا فائدہ......؟''

افراہیم نے اس کا کندھا بھی ہلا دیا تھا۔ تب وہ کچھ چونک کر ذرا خفیف سا ہو گیا۔ گزشتہ سوچوں اور کچھ تکلیف دہ مناظر سے دامن چھڑا کر وہ افراہیم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''ایسی بات نہیں۔'' ذی شاہ نے اس کے خیال کی فوراً تردید کی تھی۔ وہ اس کی سوچ کو جھٹلا رہا تھا۔ در پردہ وضاحت کر رہا تھا کہ اس کا دھیان آس پاس کی خوب صورت طلسماتی دنیا کی طرف نہیں تھا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟'' افراہیم نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ یقیناً وہ اس کی طویل خاموشی سے اکتا گیا تھا۔ ظاہر ہے جہاز سے اترنے کے بعد سے لے کر اب تک وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا ہوا جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ افراہیم کے لیے اس کی خاموشی اچنبھے کا باعث تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں، تمہارا من ہائیم بہت خوب صورت ہے۔'' ذی شاہ کو بروقت اپنی خاموشی کا جواز سوجھ گیا تھا تب افراہیم اس کے لہجے کی گہرائی میں اترے بغیر اس کی تعریف پر کھل اٹھا۔

''صد شکر کہ تمہیں میرا شہر پسند تو آیا......ویسے تمہاری فرم کا صدر مقام بھی من ہائیم ہے، ایکچوئیلی جس فرم کی طرف سے تمہیں دعوتی خط ملا تھا اس کی دو اور برانچیں فرینکفرٹ اور نیورن برگ میں بھی ہیں۔ من ہائیم سے زیادہ شہرت والے یہ دو شہر ہیں مگر چونکہ تم من ہائیم فرم کی طرف سے دعوتی خط کے ذریعے بلائے گئے ہو سو تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہیں یہ مقام پسند آگیا......'' افراہیم نے جذباتی سے انداز میں گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ دراصل وہ اپنے شہر کے لیے ایسے ہی جذباتی تھا۔ پچھلی دو نسلوں سے جرمنی میں افراہیم کا خاندان مقیم تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا تاہم اس کے آباؤ اجداد کا تعلق پاکستان سے تھا۔ وہ خود کو پاکستانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔

افراہیم سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ وہ پاکستان گھومنے پھرنے اور سیاحت کا شوق پورا کرنے آیا تھا۔ جب لارنس کالج آف گھوڑا گلی کی رائل روڈ پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات طویل تر دوستی میں بدل گئی۔ وہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے۔ افراہیم واپس آنے کے بعد بھی ہمیشہ اس سے رابطے میں رہا تھا۔ بہت سالوں سے ان دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ قائم تھا۔

پھر جب ذی شاہ نے جرمنی بزنس کی غرض سے اپنی پلاننگ افراہیم سے شیئر کی تو وہ بے ساختہ خوش ہو گیا تھا۔ اس کا پیارا دوست ایک ڈیڑھ سال کی مختصر مدت کے لیے جرمنی آرہا تھا وہ بھلا کیونکر خوش نہ ہوتا۔ ذی شاہ کے آنے سے پہلے ہی افراہیم نے اپنے گھر میں اس کے رہنے کا بڑا شاہانہ قسم کا بندوبست کر دیا تھا تاہم ذی شاہ نے اس کے گھر مستقل رہنے سے معذرت کر لی تھی۔ جس پر افراہیم اس سے سخت خفا ہو گیا تھا اور یہ افراہیم کی ناراضی کا خوف تھا جس کی بدولت اس نے کچھ دن قیام کرنے کے لیے حامی بھر لی تھی کم از کم تب تک کے لیے جب تک اس کی رہائش کا کوئی مناسب بندوبست نہ ہو جاتا۔

افراہیم نے اسے کچھ یوں ڈرا دیا تھا کہ یہاں ہیرلخ فرم کے قرب و جوار میں جتنے بھی ہوٹلز تھے

اگر چہ رہائش وقیام کے لیے بہت اعلیٰ بہترین تھے، پُرسکون، آرام دہ اور آسائشات سے لبریز، تاہم زیادہ قریب تک تھا جو انتہائی عمدہ، اعلیٰ اور شاندار "ہوٹل گارنی" تھا یعنی ہوٹلوں کی اس قسم میں سے تھا جہاں سونے کا کمرا اور صبح کے ناشتے کا بندوبست ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں لنچ اور ڈنر کے لیے مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔ سوذی شاہ نے خود ہی ہوٹل میں رہائش رکھنے پر لعنت بھیج دی تھی مگر وہ زیادہ دن تک افراہیم کے کندھوں پر بھی سوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے افراہیم کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کردے...... افراہیم نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر حامی بھرلی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا اگر ذی شاہ نے بات ایک دفعہ کہہ دی تو بس کہہ دی۔

من ہائیم کے خوب صورت شہر میں ہنگاموں سے ہٹ کر افراہیم کا ذاتی انتہائی خوب صورت مکان تھا۔ جب اس کی شاندار lexus شیڈ کے نیچے آ کر رکی تب ایک طویل تھکن آمیز سانس خارج کر کے ذی شاہ گاڑی سے باہر آنکلا تھا۔ وہ اپنی گردن کو ہولے ہولے جھٹک کر گویا سابقہ تمام زہریلی یادوں اور سوچوں کو کچھ دیر کے لیے پس پشت ڈال رہا تھا۔ وہ برے موڈ اور روڈ انداز میں افراہیم کے گھر والوں سے پہلی ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی تمام سوچیں اور زہریلی یادیں غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے کی تمام تازگی اور شگفتگی کا رس نچوڑ لیتی تھیں۔ وہ جانتا تھا جب مالا کا چہرہ اس کے تصور میں اپنا عکس چھوڑتا ہے تب اس کے اندر باہر اذیت بھرے سناٹے گونجنے لگتے تھے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مالا کی یادوں سے خود کو لہولہان کرنے لگا تھا جب اس کی نگاہ روڈ کے پار ذرا اونچی پہاڑی پر شان سے کھڑے اس مکان کی طرف اٹھی تھی پھر لحظے بھر کے لیے گویا پلٹنا بھول گئی۔

اردگرد گھاٹیوں کے پار سبزے کے جھنڈ اور پھولوں کے ڈھلان تھے۔ جن پر سنہری تتلیاں رقص کر رہی تھیں۔ دور مرغابیوں کے غول دکھائی دے رہے تھے۔ سورج کا زعفرانی عکس ہر پھول کے رنگ پر چمک رہا تھا۔ فضا میں کائی پھل کی باس رچی تھی۔ اودے رنگ کا پہاڑی پھل درختوں کی شاخوں سے جھلک دکھلا رہا تھا۔ یہ ایک حسین تر اور نگاہ کو مبہوت کردینے والا منظر تھا مگر ذی شاہ کے دل کو دھڑکانے اور نگاہ کو منجمد کردینے والا منظر پھولوں، پتھروں اور آس پاس کی ایک، ایک شے سے قطعاً ہٹ کر بالکل الگ اور منفرد تھا۔ ذی شاہ کی زندگی گویا پہاڑی کے اس کنارے پر ختم ہوگئی تھی۔ حالانکہ زندگی ختم کہاں ہوئی تھی! زندگی کی تو شروعات ہی اب ہوئی تھی یا پھر ہونے والی تھی۔

افراہیم کے ڈبل اسٹوری گھر کے بالکل سامنے ہی وہ مکان تھا انتہائی خوب صورت پتھروں سے آراستہ، جس کے سنہری کنگروں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ سفید مرغابیاں اس کے آس پاس رقص کرتی تھیں۔ احاطے میں چھوٹا سا حوض تھا۔ کبھی کبھار کوئی مرغابی اس حوض کے شفاف پانی میں چونچ مارنے آسمان سے اتر آتی تھی۔

شفاف شیشے کی کھڑکیوں کے سامنے سے لے کر داخلی لکڑی کے اونچے منقش دروازے تک پھولوں سے لدی ٹوکریاں ایک عجیب رنگ دکھا رہی تھیں۔ دراصل یہ ٹوکریاں یقیناً مٹی سے بھرے گملے تھے مگر بظاہر ٹوکری کی شکل میں نظر آتے تھے اور پھولوں سے پور پور بھرے ہوئے تھے۔ ذی شاہ نے ایسی حسین ٹوکریاں آج تک نہیں دیکھی تھیں مگر اسے ان ٹوکریوں نے ٹھٹکایا نہیں تھا۔ حوض کے کنارے ایک پری وش حسینہ بیٹھی تھی۔ اس کی سوتی اسکرٹ میں ڈھیروں پھول تھے جنہیں پتی پتی کر کے وہ پانی میں پھینکے جارہی تھی۔ وہ اس کام میں اتنی محو تھی کہ کسی کی پُرشوق و حیران نگاہوں کا ارتکاز بھی اسے

چونکانے کا باعث نہیں بن رہا تھا۔ ذی شاہ کو اس لڑکی کے حسن نے بھی اتنا مبہوت نہیں کیا تھا جس قدر اسے لڑکی کے چہرے پر پھیلے حزن وملال اور عجیب سے کرب نے ٹھٹکایا تھا۔ دراصل لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کا چہرہ بالکل مالا جیسا لگا تھا۔ ویسا ہی حزن کے سایوں سے اٹا ہوا، ویسے ہی دکھ کی دھول سے غبار آلود...... لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کے چہرے پر مالا کا گمان ہوا تھا۔ حالانکہ وہ مالا تو نہیں تھی مگر اس پل ذی شاہ کو مالا ہی نظر آرہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران وہ تب ہوا جب اس لڑکی کا بھیگا چہرہ نگاہوں کی زد میں آیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے شفاف آنسو حوض کے پانی میں بارش کے قطروں کے مانند بوند، بوند گر رہے تھے۔ جانے وہ کس اذیت اور دکھ میں مبتلا تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں ذی شاہ کو اس لڑکی پر ڈھیروں ترس آنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں اس انجان روتی ہوئی لڑکی کے لیے ڈھیروں ہمدردی محسوس کی تھی۔ جانے ابھی وہ اور کون، کون سے جذبات اجنبی سی اس لڑکی کے لیے محسوس کرتا کہ وہ ایک دم سارے پھول حوض میں اچھال کر پانی کو گھورتی ہوئی زیر لب بڑبڑاتی نظر سے اوجھل ہوگئی۔ وہ جو آنکھیں پھاڑے منجمد کھڑا اب خالی حوض کے کنارے کو گھور رہا تھا افراہیم کی بے ساختہ ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا پھر اس نے نگاہیں موڑ کر شیڈ کے نیچے کھڑے افراہیم کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا سارا سامان کار کی ڈگی میں سے نکال کر جانے کب اندر پہنچا آیا تھا اور اب اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتا ہوا ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اسے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر ذی شاہ قدرے خفت زدہ رہ گیا تھا مگر اس کی ہنسی پھر بھی تھم نہیں رہی تھی۔ جب وہ شرمندگی کی دلدل میں گوڈے، گوڈے ڈوب چکا تھا افراہیم نے پیٹ پکڑ کر سنبھلتے ہوئے سرخ

چہرے پر ہاتھ پھیرتے بہ مشکل کہا۔
''تیرا بھی کوئی قصور نہیں دوست! جرمنی میں ایسا حسن اور ایسا خبطی آئٹم کہیں نہیں ملے گا نہ نظر آئے گا۔ تو جی بھر کے دیکھ لیتا...... اب دوبارہ جانے یہ کب نظر آئے گی۔ ایک دم خبطی اور پاگل ہے۔''
افراہیم کو پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی نظروں کے ارتکاز کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسے پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھ کر ذی شاہ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے فوراً جواب دیا تھا۔
''فی الحال تو، تو مجھے اس آئٹم سے بڑھ کر پاگل دکھائی دے رہا ہے۔'' وہ اسے گھورتا ہوا اب بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسی منقش دروازے کو دیکھنے لگا جہاں سے وہ خبطی لڑکی گزر کر اندر کی طرف غائب ہوئی تھی۔
''ہاہاہا...... ابھی ایک نظر دیکھ کر یہ حال ہے...... یعنی اپنے جگری یار کو پاگل کہہ دیا۔'' افراہیم اور بھی نہ جانے کون کون سے چٹکلے چھوڑتا مگر اس کے چٹکلوں کو افراہیم کی موتر یعنی ماں نے بریک لگا دیے تھے۔ وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں ذی شاہ کو ویلکم کہہ رہی تھیں۔ جانے وہ کب اندرونی حصے سے باہر آئی تھیں۔
''خوش آمدید بیٹے! اندر آؤ...... اس احمق کی باتیں تو پوری رات ختم نہ ہوں گی اور تمہیں یہ یہیں کھڑا رکھے گا۔'' افراہیم کی جرمن مدر جواب آدھی سے بھی زیادہ پاکستانی نظر آتی تھیں اسے بازو سے تھام کر اندر لے گئیں۔
جب وہ داخلی دروازے سے اندر آیا تب اس کے اوپر کوئی نرم نرم خوشبودار چیز کسی پھوار کے مانند گری تھی۔ ذی شاہ نے غور کیا تو پتا چلا کہ ایک مستطیل قسم کی پھولوں سے لدی ٹوکری دروازے کے اوپر اس رخ سے لگائی گئی تھی کہ جب کوئی مہمان پہلی مرتبہ گھر میں داخل ہوتا یہ پھول جھک کر اس کا استقبال کرتے۔ اپنے اتنے بہترین استقبال پر وہ کچھ پل کے لیے تو مبہوت رہ گیا تھا۔ پھر اسے ایک ''این سیل سیمر'' میں بٹھایا گیا تھا۔ یہ نہایت دیدہ زیب فرنیچر سے سجا کمرا تھا۔ بہت آرام دہ دیوان سجے تھے۔ یہاں بھی اسے جگہ جگہ پھول نظر آ رہے تھے۔ کرسٹل کے گلدان سے لے کر دروازے کے پاس رکھی ڈسٹ بن کی ٹوپی تک میں تازہ پھول سجے تھے۔ وہ ابھی اردگرد کا ٹھیک طرح سے جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا جب اسے ٹھنڈے مشروبات پیش کیے گئے۔ انگور، کائی پھل اور ناریل کا مشروب تھا۔ ذی شاہ کو ناریل کا مشروب پسند تھا۔ اس نے دو بلوریں لمبے پتلے گلاس اطمینان سے خالی کر دیے تھے۔ مشروب پیش کرنے والی موتر خود تھیں تاہم کھانے کے لیے اسے ایک دبلی پتلی انتہائی سفید لڑکی بلانے کے لیے آئی تھی۔ اس کے بال اخروٹی رنگ کے تھے۔ شکل میں وہ موتر جیسی لگتی تھی۔ نیلی آنکھیں، سرخ ہونٹ اور گوری رنگت انہوں نے بتایا یہ ان کی بیٹی ایمل تھی...... اور ایمل بہت باتونی تھی، اسے انگریزی نہیں آتی تھی، اردو ٹوٹی پھوٹی بول سکتی تھی۔ تاہم اپنی مادری زبان ڈچ فراٹے سے بول رہی تھی چونکہ ذی شاہ کو ترکش اور اطالوی زبان کی سمجھ بوجھ نہیں تھی سو بس وہ ایمل کے ہلتے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں کو ٹرین کی سی رفتار میں ہلتے دیکھ رہا تھا پھر شاید موتر نے تنگ آ کر ایمل کو ڈپٹا تھا۔
''برائے مہربانی آہستہ بولو۔'' ان کے ڈپٹنے پر وہ چابی والی گڑیا کی طرح بالکل ساکت ہو گئی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک مرتبہ پھر سابقہ انداز میں بولتے ہوئے اٹھ گئی۔
''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ ماں کی خفگی کا تاثر مٹاتی اب خاصی مدبر لگ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ وہ جلدی اٹھ گئی تھی یقیناً مزید ڈانٹ سننا نہیں

چاہتی تھی۔ ذی شاہ کو محسوس ہوا تھا اسے ماں کا ٹوکنا کتنا برا لگا ہے۔ وہ اسے کچھ باتونی اور جذباتی سی لگی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن بندیا کی طرح...... وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح برا منا لیتی تھی۔
ایمل کے جاتے ہی موتر نے اسے بہت محبت سے کہا تھا۔
''پہلے تم فریش ہو جاؤ...... پھر کھانا لگاتی ہوں۔'' انہوں نے اس کی تھکن کے خیال سے کہا تھا۔ افراہیم کی ماں بہت نرم مزاج، شائستہ اطوار اور بیٹے سے بڑھ کر مہمان نواز تھیں۔ افراہیم شکل صورت میں ان سے مختلف تھا۔ یقیناً اپنے والد جیسا تھا۔ گندمی رنگت، کالی آنکھیں اور کالے بال رکھتا تھا جبکہ مزاج اس کا ماں کی طرح تھا۔ وہ گھر والوں کے مزاج پر غور کرتا موتر کی ہمراہی میں ایک انتہائی پُرتعیش ماسٹر بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ بیڈ روم کیا تھا...... گویا کسی ہوٹل کا آرام دہ کمرا تھا۔ اس کے پیروں تلے کھلتے ہوئے عنابی رنگ کا انتہائی نرم قالین بچھا تھا۔ فرنیچر کے ہم رنگ سفید چمکیلی بیڈ روم چیئر بھی تھی۔ دیوار گیر الماری بھی سفید رنگ کی تھی۔ بیڈ شیٹ کا کلر بھی سفید تھا۔ ایسی اجلی بے داغ چادر بچھی تھی کہ ذی شاہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ بھلا اتنے اجلے شفاف، بے سلوٹ بستر پر سو کر اسے خراب کیا جا سکتا تھا...... کمرے میں یہاں بھی سفید مستطیل ٹوکری موجود تھی، جس میں رنگا رنگ گلاب سجے تھے۔ بہت بھینی اور معطر خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایسا رومانوی ماحول تھا اور اس کی سجاوٹ میں کسی آرٹسٹک ذہن کا کمال نظر آتا تھا۔ ذی شاہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اِک طائرانہ نظر میں ہی اس نے پورے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔
اس نے دیکھا تھا، کمرے کی واحد کھڑکی کے شیشے بھی سفید تھے جس کے آگے پردہ تھا، سفید نائیلون کی مہین نازک سی جالی کا...... ذی شاہ نے مڑ کر غیر ارادی طور پر داخلی دروازے کو دیکھا تھا جس پر خوش خط تحریر میں کچھ لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟ یہ ذی شاہ کو ہرگز سمجھ نہیں آیا۔ تاہم وہ تحریر کی طرف دیکھے بنا نہ رہ سکا تھا۔
''ویلکو مین ان من ہائیم......'' بہت زیادہ غور کرنے کا اسے وقت نہیں مل سکا تھا۔ موتر نے اس کی مشکل کو آسان کر دیا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے خود ہی بتانے لگی تھیں۔
''افریشم نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔'' وہ اسے وضاحتی انداز میں بتا کر واش روم کا ہینڈل گھما کر مزید بتا رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں باوے سیمر یعنی غسل خانہ تھا۔ ویسا ہی شفاف، صاف چمکتا ہوا...... لشکارے مارتا ٹب اور اینمل شیشوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ ٹھنڈے اور گرم پانی کی سہولت بھی میسر تھی۔ وہ موتر کے ''افریشم نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔'' جیسے جملے پر غور کرتا سب سے پہلے فریش ہونے کے لیے واش روم چل دیا تھا۔ سفر کی تھکن نہا دھو کر اتارنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے اپنا اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا...... کس طرح کرنا تھا؟ اور کیسے اپنے مجرم کے گریبان تک پہنچنا تھا؟ بہت ساری باریکیوں پر غور کرتا وہ غیر محسوس انداز میں کمرے کی اس واحد کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا جس کے سامنے سفید نائیلون کی مہین جالی کا پردہ پڑا تھا۔ اس نے چٹکی کی مدد سے پردہ پیچھے کھسکا کر سلائڈ ہٹا دیے۔ سامنے دور تک سنہری زعفرانی حسین شام کا حسن بکھرا پڑا تھا...... سفید مرغابیوں کے غول بیلے کی طرف رواں دواں تھے۔ اس کی کھڑکی کے بالکل سامنے وہی دو منزلہ انڈے جیسا سفید اور خوب صورت مکان تھا۔ جس کے بیرونی دروازے پر (ویس ہاؤس) کی تختی آویزاں تھی۔ حوض کے کنارے خالی تھے۔ وہ روتی ہوئی غمزدہ

اجنبی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ مستطیل ٹوکریوں میں سفید گلاب نمایاں تھے۔ منظر پہلے کی طرح بھرپور اور مبہوت کردینے والا تھا تاہم کہیں دور خالی پن ضرور محسوس ہوتا تھا...... یہ خالی پن کیوں تھا......؟ یہ ادھورا پن کیوں تھا؟ شاید وہ سفید روئی جیسی حسین لڑکی اب کہیں نہیں تھی۔

وہ ویلس ہاؤس سے نگاہ ہٹا کر ڈھلوانوں پر بکھرے سبزے اور ہریالی کو دیکھنے لگا تھا۔ تب نہ جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی اُمڈنے لگا تھا۔ نادیدہ ریت اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی تھی۔

وہ آسمان پر اڑتی سفید مرغابیوں کو دیکھ کر...

زیرِلب بڑبڑایا۔

''تو بالآخر میں یہاں پہنچ گیا...... علی عیسیٰ میں تمہارے من ہائیم بالآخر پہنچ ہی گیا...... اب مجھے بس تمہارے گریبان تک پہنچنا ہے......'' ویلس ہاؤس کی ساری خوب صورتی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ موترے، آشیں اور شاہ بلوط کے درخت بکھرے پڑے تھے۔ رومان جو اس شہر کی فضا میں بسا تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ محبت جو اس کی رگوں میں لہو بن کر بھی دوڑ رہی تھی۔ اب صنوبر کے گھنے جنگلات کے تاریک سائے میں سسک رہی تھی۔ (دریا کے کنارے پر پھیلا جنگل) تین سال پہلے عیسیٰ اور مالا کی محبت کے فنا ہونے پر کس طرح سے رُلایا تھا۔ یہ بات ذی شاہ کو پتا نہیں تھی، وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا اور وہ تو بے شمار سچائیوں سے اب بھی بے خبر تھا۔

☆☆☆

تین چار ماہ پہلے جب اچانک ذی شاہ نے جرمنی جانے کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا تو اس کے گھر میں محاورتاً نہیں حقیقتاً بھونچال آگیا تھا۔ ممی نے سنا تو دل تھام لیا تھا۔

''ذی! تو جرمنی ہرگز نہیں جائے گا۔ ارے، اُدھر جا کر کوئی واپس آیا ہے؟ یہ خیال تیرے دل میں آیا ہی کیسے؟'' ممی کے لیے ذی شاہ کا یہ فیصلہ دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں مگر ذی شاہ چونکہ فیصلہ کرچکا تھا سو اپنے اس فیصلے سے محض آگاہ کررہا تھا وہ ان سے مشورہ ہرگز نہیں مانگ رہا تھا۔ دراصل اسے جرمنی جانے سے تقریباً گھر کے ہر، ہر فرد نے روکا تھا۔ ممی سے لے کر بندیا تک...... اس کا بڑا بھائی ذیشان تو ناراض بھی ہوگیا تھا اور عینی بھابی نے بھی خوب واویلا کیا...... اصل میں ذی شاہ کے جرمنی چلے جانے سے عینی بھابی کی بہن کا مستقبل تھوڑا خدشات میں لپٹ رہا تھا سو عینی کو بھی اس کا فیصلہ قطعاً بھایا نہیں تھا۔ ذی شاہ کو سوائے ممی کے کسی اور کے واویلا کرنے کی پروا ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ فیصلہ کرلیا تھا اب اس فیصلے پر عمل کرنے کا... بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ ممی کے ہزار دفعہ سمجھانے اور رونے چلّانے پر اس نے محض ایک دلیل سے انہیں خاموش کروادیا تھا۔ وہ اس کا ارادہ اور دلیل سن کر بالکل خاموش ہوگئی تھیں...... شاید پہلے انہوں نے سوچا تک نہیں تھا کہ ذی شاہ اس کام کے لیے بھی جرمنی جاسکتا ہے۔ جب اس نے ممی کو قائل کرلیا تو پھر بھائی کی اسے پروا نہیں تھی البتہ بندیا کے آنسوؤں نے اسے پسیجا ضرور تھا۔ اسے ڈھیروں دلاسے اور یقین دہانی کروانے کے بعد جب اس نے اپنا ارادہ نہ بدلنے کی وضاحت کی تھی تب بندیا کو بھی خاموش ہوجانا پڑا۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ خاموش کردار مالا کا تھا۔ وہ گھر میں ہونے والی چہل پہل، کچھ کچھ بدمزگی اور جھگڑے کی فضا محسوس کرکے بھی اپنے خول میں بند تھی۔ گویا اسے کسی جھگڑے، لڑائی، فساد اور بدمزگی نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ تین سال پہلے جو روگ اس کے دل کو لگا تھا اس کی چاٹ نے مالا کی قوتِ گویائی کو سلب کردیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتی تھی، محسوس کرتی تھی، سمجھتی اور سوچتی بھی تھی مگر بولنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس کی زبان کو گویا زنگ لگ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر قفل تھا اور یہ قفل کبھی نہ کھلنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر اپنے لبوں پر لگالیا تھا۔ وہ طویل ترین اور مہنگے ترین علاج سے اگرچہ صحت مند ضرور ہوگئی تھی تاہم اس نے کسی سے بھی بولنا ترک کردیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے قید خانے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے خود کو خاموشیوں کے جال میں مقید کرلیا تھا۔ گویا ایک چپ نے اسے ہر سوال کرتی نگاہوں سے بچالیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے اس قید خانے میں مطمئن اور پُرسکون ہوچکی تھی۔ شاید اس نے قسمت کے لکھے پر صبر کرلیا تھا اور اپنی بدبختی پر شاکر ہوچکی تھی مگر ذی شاہ بھلا کیسے صابر اور شاکر ہوجاتا...... وہ کس طرح مالا کو ایک چپ کا عذاب بھگتتے دیکھ کر پُرسکون رہتا؟ پچھلے تین سالوں سے مالا کو ایک قید خانے میں مقید تو دیکھ رہا تھا۔ بھلا اور کتنے سال اسے گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھتا رہتا.........

ذی شاہ اس کی زندگی سے اس حبس کو ختم کردینا چاہتا تھا پھر جب اس نے اپنے فیصلے سے گھر والوں کو آگاہ کیا تو سب سے پہلے ذیشان اور عینی نے ہنگامہ مچادیا۔

''ذی! تم پاگل ہوگئے ہو...... وہ قصہ تین سال پہلے ختم ہوچکا...... اب گڑھے مُردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں...... تمہارا جانا بیکار ہوگا......'' ذیشان کھولتا ہوا چیخ رہا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے ایسی بے عقلی کی امید نہیں تھی۔ یقیناً وہ اپنی بیوی کی زبان بول کر ذی شاہ کو اس کے خطرناک ارادوں سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اُدھر عینی جلے پیر کی بلی بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے باہر جانے سے روک دینا چاہتی تھی مگر کوئی ٹھوس حل مل کر نہیں دے رہا تھا۔ شوہر کو سمجھا بجھا کر اس نے ذی شاہ کے پاس بھیجا تھا اور اب خود بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس وقت سٹنگ روم میں ممی، بندیا اور ذی شاہ کے برابر ذیشان بیٹھا تھا جو برابر اسے لتاڑ رہا تھا۔

''تم احمق مت بنو...... مالا اپنے حالات سے سمجھوتا کرچکی ہے۔ تمہیں جرمنی جا کر آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ ممی آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں۔'' ذی شاہ کو لعن طعن کرتا وہ خاموش بیٹھی ممی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لایا تھا۔ ممی جو چپ چاپ ان دونوں کی تکرار سن رہی تھیں محض ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ذی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا آسان نہیں۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا اب اس سے ہٹ نہیں سکتا تھا پھر اس نے کون سا محض تفریح پر جانے کا یا ہنی مون منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہیں یقین تھا ذی شاہ کچھ غلط فیصلہ ہرگز نہیں کرے گا نہ وہ کچھ الٹا سیدھا کرنے کی اس سے امید رکھتی تھیں۔ وہ بہت معاملہ فہم اور سمجھدار تھا...... یقیناً بہت سوچنے کے بعد اس نے کوئی پلان بنایا تھا تاہم حقیقت تو یہ تھی ممی خود بھی دل سے اسے جرمنی بھیجنے پر تیار نہ تھیں۔ اندر کہیں بہت سارے خدشات سانس لے رہے تھے۔ بھلا منحوس سا مغربی جرمنی ان کے خاندان کو کبھی راس آیا تھا؟

''ممی مجھے کیا سمجھائیں گی؟ میں خود بہت سارے معاملات کا ازسرِنو جائزہ لے کر فیصلہ کرچکا ہوں۔ سو اب اپنے ارادے توڑ نہیں سکتا...... رک نہیں سکتا...... تم اپنی انرجی ضائع مت کرو۔'' ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر تیز لہجے میں کہا تھا۔ ذیشان کا رنگ اس کے ان الفاظ پر تیزی سے بدل گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا غصہ چھلکنے لگا...... بہ مشکل اپنے بگڑے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے اس نے مزاج ترش کرنے سے روکا۔

''تم بھلا کون سے معاملات کا جائزہ لے چکے ہو؟'' ذیشان نے عینی کا اشارہ پا کر خود کو بھڑکنے سے روکا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ کے الفاظ اسے آگ بگولا

کررہے تھے مگر عینی نہیں چاہتی تھی کہ دونوں بھائی لڑائی کو بڑھادیں۔ اگر دونوں میں تکرار بڑھ جاتی تو ذی شاہ نے بول چال بند کردینی تھی پھر عینی کے ہاتھ سے اگلے معاملات بھی چپکے سے پھسل پڑتے...... سو وہ شوہر کو کول ڈاؤن رہنے کا مسلسل اشارہ کررہی تھی۔ اسے پتا تھا اوّل تو ذی شاہ کو غصہ نہیں آتا مگر جب غصہ آجائے تو پھر اتنی آسانی سے اترتا نہیں...... تین چار سالوں میں وہ اپنے بانکے سجیلے دیور کا مزاج خوب سمجھ گئی تھی۔ پھر وہ جانتی بھی تھی ذی کو جو بات پیار و محبت سے سمجھائی جائے اسی کا وہ اثر بھی لیتا ہے۔ غصے کے بدلے غصہ الٹنے میں اسے قطعاً دشواری نہیں ہوتی...... اب بھی ذیشان کا سوال سن کر ... ذی شاہ کے ماتھے پر بل پڑگئے تھے۔ وہ اپنی خوابناک خوب صورت آنکھوں میں ڈھیروں خشونت بھر کے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے سوال کی چبھن نے ذی شاہ کو تکلیف دی تھی۔

''بات تو تم ایسے کررہے ہو، گویا تمہیں کچھ پتا ہی نہیں...... لُٹی پٹی بہن کے نصیب پر شاکر ہو کے بیٹھ جانے والے، کیا تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی اپنی بہن کے مجرم سے فون پر ہی کچھ حساب کرلیتے...... کم از کم اتنا تو اس بے غیرت سے پوچھتے، کس جرم کی پاداش میں اس معصوم کو ایسی سزا سنائی ہے؟ آخر کون سی خطا مالا سے سرزد ہوئی تھی؟ آخر اتنا پوچھنے کا حق تو تم رکھتے تھے ناں......؟'' ذی شاہ ... کے غضبناک لہجے میں عجیب دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کے الفاظ نے جہاں ذیشان کو مشتعل کیا تھا وہیں عینی کی گوری رنگت دہک اٹھی تھی...... وہ جو کب سے بھیگی بلی بنی بیٹھی تھی ایک دم بھڑک اٹھی۔

''تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ بھی مالا کے ساتھ ہوا، وہ ہم نے کروایا؟'' عینی کی بکواس نے ممی سمیت ذی شاہ کو بھی بھڑکا دیا تھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ممی پُرنم اور دھیمی آواز میں بول پڑی تھیں۔

''بہو! تم بات کو غلط رنگ مت دو، اچھی طرح سمجھ رہی ہو جو کچھ ذی شاہ کہہ رہا ہے...... اور ذی غلط نہیں کہہ رہا۔'' ممی کے الفاظ نے جہاں عینی کا منہ بند کروایا تھا وہیں ذیشان پھر سے بھڑک اٹھا۔

''ممی......! آپ ذی کی حمایت کررہی ہیں، یہ کیا ٹھیک کہہ رہا ہے؟ تین سال پہلے آخر حالات کیسے تھے جو میں حساب کتاب لینے اس بے غیرت کے پاس جرمنی بھاگتا، جس کی شکل تک ہم نے دیکھی نہیں...... پھر جب مالا لٹی پٹی واپس آئی تھی تب اس کے حالات جان کر ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا...... بعد میں مالا کی بیماری کے ساتھ ڈیڈی کی موت کا اچانک ملنے والا دھچکا سہتے ہوئے کسے جرمنی جانے کا ہوش رہا تھا پھر ذی بھی تو کراچی سے واپس آچکا تھا یہ کیوں نہ مالا کے مجرم سے دو دو ہاتھ کرنے گیا......؟ اب جب وقت بدل گیا ہے، ساعتیں گزر گئی ہیں، غم کی بھاری گھڑیاں کھسک گئی ہیں، ہمیں بھی صبر آگیا ہے پھر گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ......؟ اس کا جانا سراسر بیکار ہے، یہ کس طرح جرمنی جائے گا؟ پھر اس ذلیل کو ڈھونڈے گا کیسے......؟ ہمارے پاس تو اس ذلیل کی ایک تصویر بھی نہیں...... ہم میں سے کسی نے اس بے غیرت کو دیکھا تک نہیں تو اس کے گریبان تک کیسے پہنچ پاتے...... اور جس نے اسے دیکھ رکھا ہے، وہ کچھ بولنے سے ہی معذور ہوچکی ہے۔ جانے اس معصوم پر کیا بیتی تھی۔ سوچتا ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے۔'' ذیشان کی آواز حقیقت میں بھرّا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گرد اُڑنے لگی تھی...... اجڑی بہن کی حالت پر صبر شکر کرنا آسان نہیں تھا مگر وہ بھی کیا کرتا......؟ کئی طرح کی بیڑیوں میں جکڑا تھا... اور ایک بیڑی تو عینی کی صورت میں تھی۔ وہ اسے تنہا بھلا کہیں جانے دے سکتی تھی؟ خصوصاً جرمنی تو وہ کسی

صورت نہ ذیشان کو بھیجتی، بھلا جرمنی جا کر کوئی واپس آیا تھا؟ اس کی ساس خود بتاتی تھیں ان کا دیور سالوں پہلے جرمنی گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پیچھے ماں مری باپ مرا...... بڑی بہن مرگئی مگر جانے والا کبھی نہ لوٹا...... حالانکہ سمندر پار بیٹھ کر اپنوں کی یاد میں رونے والے کی روح تو نہیں کہیں کُرلا رہی تھی پھر بیچ میں کئی سال گزر گئے تھے کہ اچانک ان کا دیور واپس لوٹ آیا مگر چہرے پر پہلے سی جوانی نہیں تھی، بہار نہیں تھی، وقت نے آزما آزما کر جوانی کا رس نچوڑ لیا تھا...... بالوں میں چاندنی اتر آئی تھی۔ مضبوط چوڑے کندھے جھک گئے تھے۔ بڑھاپے کا موسم بڑا اداس کردینے والا تھا۔

پھر بھلا کیا ہوا تھا؟ کس طرح سے ہوا تھا؟ تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ اس نے کئی راویوں کی زبان سے سنا تھا...... مگر ہر دفعہ سنتے ہوئے الگ ہی جذبات ہوتے۔ کبھی افسردگی، کبھی لطف، کبھی رشک، کبھی کرب... وہ تین سال پہلے کے واقعات... ازسرنو ذہن میں تازہ کررہی تھی جب اچانک ذی شاہ کی آواز اسے اپنی طرف متوجہ کرگئی۔

''تین سال سے اسے کھوج رہا ہوں، تین سال سے اس کے گریبان تک پہنچنے کی پلاننگ کررہا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر سوائے سوچنے کے ہم کچھ نہیں کرسکتے، سو میں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' ذی شاہ غیر جذباتی، ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولا تھا تب ذیشان حد سے زیادہ بے چین ہوگیا اور پہلو تو عینی نے بھی بدلا تھا۔

''آخر فائدہ کیا ہوگا......؟ جو اس ظالم ناپاک، غلیظ گدھ نے کرنا تھا کردیا، تمہارے اس سفر سے حاصل کیا ہوگا؟'' ذیشان کا سوال بہت کڑوا اور حقیقت سے قریب تر تھا۔ سو ممی سمیت بندیا کی خاموش نظریں بھی ذی شاہ کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

''کم از کم اندر لگی آگ تو بجھ جائے گی۔ انتقام کے شعلوں پر چھینٹے پڑ جائیں گے اور سب سے بڑی بات میں کچھ حقائق ضرور جان لوں گا۔ آخر ہنستے بستے گھرانے میں اچانک آگ کیسے لگ گئی تھی؟ کیا تم لوگوں کے ذہنوں میں سوال نہیں اٹھتے؟ ہماری بہن شادی کے چھ مہینے اپنے شوہر کے ساتھ خوش باش رہتی ہے اور پھر اچانک ایک رات سب کچھ بدل جاتا ہے؟ آخر اس رات ہوتا کیا ہے؟ مجھے اس رات تک پہنچنا ہے؟ مجھے حقائق ڈھونڈنے ہیں؟ مالا کے مجرم کو انجام تک پہنچانا ہے۔'' اس کے لہجے سے شعلے لپک رہے تھے۔ آنکھ سے سرخی بہہ رہی تھی۔ اس کے ارادے چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ ان ارادوں کو بھلا ذیشان توڑ سکتا تھا مگر وہ اسے روک تو سکتا تھا۔ سمجھا تو سکتا تھا۔

''ہم نے پہلے مالا کو جرمنی بھیج کر کتنا نقصان اٹھایا ہے۔ اب تمہیں بھیجنے کا حوصلہ نہیں...... خود سوچو، اگر تم مالا کے مجرم سے انتقام لے بھی لیتے ہو تو اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ نہ مالا کی خوشیاں لوٹیں گی، نہ اس کے ماتھے پر لگا بدنما داغ دھل جائے گا۔ پھر بھلا کیا فائدہ اتنے عذاب سہنے کا۔'' ذیشان نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح ذی کو وہاں جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ کچھ عینی کی طرف سے مجبور تھا اور کچھ چھوٹے بھائی کی فطرت سے بھی آگاہ تھا۔ وہ جس کام کے پیچھے پڑ جاتا اسے کبھی ادھورا نہیں چھوڑتا تھا پھر تو یہ مالا کے لیے، اس کی خوشی اور زندگی کے قاتل سے حساب لینے کا معاملہ تھا۔ وہ بھلا رک سکتا تھا؟

''میں فائدہ اور نقصان سوچ کر تو ہرگز نہیں جارہا...... میں نے خسارے اٹھائے ہیں...... اور نقصان، ذلت اور کرب ہی اس کی جھولی میں ڈالوں گا۔ اگر ہماری جان پچھلے تین سال سے سولی پر لٹکی ہے تو علی عیسیٰ بھی سکھ نہیں پائے گا۔ یہ میرا خود سے

وعدہ ہے۔ اس کی زندگی بھی جہنم بنا کر آؤں گا۔'' اس نے گویا بات ختم کردی تھی۔ وہ مزید، اس موضوع پر نہیں بولنا چاہتا تھا۔ سو اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ ذی شاہ کے جاتے ہی عینی کو زبان لگ گئی تھی۔ وہ ذیشان پر غصہ کررہی تھی اور ساس کو کھری کھری سنا رہی تھی۔ اسے بھی تو اپنا غصہ الٹنا تھا۔

''اس کے دماغ میں آپ نے خناس بھرا ہے۔ آپ کے آنسو، سسکیاں، آہیں اور مالا کے لیے ہر وقت کے رونے نے آج ذی سے یہ فیصلہ کروایا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔ نہ آپ اپنے روز روز کے رونے کو اس کے کانوں میں انڈیلتیں نہ وہ مجبور ہو کر علی عیسیٰ سے انتقام لینے کا سوچتا، آخر مالا کی نحوست کون کون سا دن دکھائے گی۔ اگر ذی شاہ باہر چلا گیا تو جانے کب لوٹے گا۔ میری بہن کے معاملے کو آپ نے لٹکا رکھا ہے، میں آپ سے کہے دیتی ہوں، ذی کے باہر جانے سے پہلے آپ کو کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' عینی کی اصل کھولن کا سبب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اسے اپنی بہن آنیہ کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اتنے عرصے سے ماں بہن کو ذی کے حوالے سے امید دلا رکھی تھی۔ اب اس کے اچانک جرمنی جانے کے فیصلے نے گویا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذی شاہ کو جرمنی جانے سے روکنا تو آسان نہیں تھا تاہم وہ ذیشان کو مجبور کر کے کچھ اور تو سوچ سکتی تھی مگر اس کی سوچ کی خوشگواریت کو بندیا کی تلخ آواز نے ختم کردیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''بہت خود غرض ہیں بھابی آپ! میری دکھی اور بیمار بہن کو تو آپ نے کبھی بخشا ہی نہیں اب ممی کو براہِ راست مجرم قرار دے دیا...... بہت گندی سوچ ہے آپ کی...... اور ذیشان بھائی......! آپ سے تو ہمیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے...... بجائے بیوی کا منہ توڑنے کے نہ جانے کس سوچ میں گم بیٹھے ہیں۔''

بندیا کے تلخ الفاظ نے عینی کو تو آگ لگائی ہی تھی ذیشان کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ وہ جو ذی شاہ کے بارے میں سوچ رہا تھا ایک جھٹکے کے ساتھ بندیا کی طرف متوجہ ہوا...... پھر ماحول کی کثافت محسوس کر کے اس نے عینی کو سخت نگاہوں سے گھورا تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ! اٹھ کر جاؤ یہاں سے، ذرا ادب لحاظ چھو کر نہیں گزرا......'' ساس، نند کی موجودگی میں اپنی اس عزت افزائی پر جلتی کلستی، ذیشان کو تیور دکھاتی وہ اٹھ کر پیر پٹختے ہوئے چلی گئی تھی پھر ذیشان بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بندیا کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''تم بھی ذرا اپنی زبان کنٹرول میں رکھا کرو، بڑے چھوٹے کی تمیز ہی نہیں۔'' ذیشان کے گھُرکنے پر بندیا پھٹ پڑی تھی۔

''وہ ممی کو اتنی باتیں سنا گئی ہیں...... ممی اس کی چھوٹی بہن ہیں ناں......'' اس نے تڑختے ہوئے جتلایا تھا پھر تن فن کرتی ممی کے ڈپٹنے پر وہاں سے پیر پٹختی چلی گئی۔ اس کے پیچھے ممی، ذیشان کو منمناتے ہوئے صفائی پیش کررہی تھیں۔

''چھوٹی ہے بیٹا......! درگزر کردیا کرو......''

ممی کی صفائی نے ذیشان کو کچھ اور بھی شیر کردیا تھا۔

''سمجھایا کریں اسے، عینی سے منہ ماری نہ کیا کرے۔'' وہ الٹا ممی کو مشورہ دیتا دھپ دھپ کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں موجود وہ خاموش سی لڑکی بس ٹکر ٹکر ماں کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو دیکھ رہی تھی پھر جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا...... اب وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ رونا اس کے نصیب میں جو لکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں امن قائم نہیں رہ سکا تھا۔ امن قائم رہتا بھی کیسے......؟ ایک تو ذی شاہ باہر جارہا تھا

اور دوسرے ان دنوں اس کا مزاج آسمانوں کو چھو رہا تھا۔ پہلے پہل جو عینی نے ذی شاہ کے ساتھ دوستی گانٹھ رکھی تھی اس کا خاتمہ بھی بالآخر اس دن ہوگیا تھا جب بندیا اور عینی کی تکرار ذی شاہ نے اپنے کانوں سے سن لی تھی۔ تب کا بدگمان ہوا ذی دوبارہ عینی کے ساتھ دوستانہ رویہ قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ سو عینی کے مزاج میں اور بھی تلخی آگئی تھی۔ ساس نند کو تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سنا دیتی تھی تاہم ذی شاہ کے سامنے ہمیشہ مظلوم اور مسکین بن جاتی۔ دراصل وہ دیور کو بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی...... مگر اس کے سوچنے سے پہلے کون سا کچھ بہتر ہورہا تھا۔ جو اَب اس کی پلاننگ حسبِ منشا رزلٹ لے آتی...... وہ اپنی بہن کے لیے جتنی راہیں ہموار کررہی تھی، معاملات اتنے ہی الجھتے جارہے تھے۔ گھر کا ماحول بندیا کے فساد کی وجہ سے خراب ہوچکا تھا۔ اس نے آنیہ کے متعلق جب سے سنا تھا تب سے شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ ممی کو بھی اس نے باور کروا دیا تھا کہ وہ عینی کی بہن کو اس گھر میں لانے کے لیے ہرگز مت سوچیں۔ وہ لوگ تو پہلے ہی عینی کی صورت میں ایک عذاب بھگت رہے تھے...... اب دوسرا عذاب اپنے سر پر مسلط کرنے کا ہرگز بھی رسک نہیں لے سکتے تھے۔ یہ تو بس بندیا کی دلیری تھی جو وہ عینی کے سامنے تن گئی تھی ورنہ عینی، ممی اور مالا کو تو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے بالا ہی بالا ممی اور ذیشان کو رضامند کرلیا تھا۔ اس کی خواہش تھی ممی ذی شاہ کے کانوں میں بھی بات ڈال دیں کہ وہ عینی کی بہن کو اپنی دوسری بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ عینی کو پورا یقین تھا ممی کی بات کو ذی شاہ... قیامت تک ٹال نہیں سکتا تھا نہ نظر انداز کرسکتا تھا سو وہ اس لحاظ سے کچھ مطمئن تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی تیز طرار نند نے آنیہ کا نام سن کر کیسا فساد مچا دینا ہے۔ دراصل مالا کی طرف سے تو اسے کوئی خدشہ لاحق ہی نہیں تھا۔ مالا تین میں تھی نہ تیرہ میں تھی

جبکہ بندیا کو وہ اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی جس کے اعتراض کی طرف گھر والے دھیان دیتے لیکن آندھی اسی جہت سے اٹھی تھی جس طرف عینی کا گمان ہی نہیں تھا۔ فی الحال ذی شاہ کے جرمنی جانے کو بھلا کر بندیا اس نئے غم میں مبتلا ہوگئی تھی۔

''مالا اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، کچھ سنا تم نے، عینی بھابی ذی شاہ بھائی کے لیے اپنی بہن آنیہ کو لانے والی ہیں دیکھنا کل کو زرشام بھائی کے لیے اپنی کسی بھانجی کو اٹھا لائیں گی۔'' بندیا نے غضبناک ہو کر ہاسٹل میں مقیم اپنے تیسرے بھائی کا ذکر بھی کیا جو تعلیم کے حصول کی خاطر ہاسٹل میں رہ رہا تھا مگر یہ ذکر مالا کو کون سا بولنے پر اکسا سکتا تھا۔ وہ اب بھی بے دھیانی سے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔ حالانکہ سمجھ تو اسے آرہی تھی مگر وہ جواب دینا یا بولنا نہیں چاہتی تھی...... اسے خاموشی کی چادر اوڑھنا تھی مگر یہ بندیا بھلا ماحول کو خاموش اور پُرسکون رہنے دے سکتی تھی۔

''میں عینی بھابی کی ایک بھی آرزو کو پورا نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ذی شاہ بھیا کو اس آنیہ کے ہتھے چڑھنے دوں گی نہ اپنے زرشام بھائی کو ان چڑیلوں کے حوالے کروں گی، ان کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دیکھو، میں کرتی کیا ہوں۔'' وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی سخت بے چین تھی۔ اس کی بے چینی مالا خوب سمجھتی تھی مگر وہ اتنی بے بس تھی کہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر گھل ضرور سکتی تھی، آنسو بہا سکتی تھی مگر بندیا کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بندیا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کیا کرے گی؟ اور وہ کچھ ایسا کبھی نہ کرے جو اُن کی ماں کو تکلیف دے یا ان کے تینوں بھائیوں میں پھوٹ پڑ جائے۔

''عینی بھابی کی چالاکی اور مکاری کی کوئی حد بھی ہے، اپنی بہن لے آئیں گی تو ہمیں اسٹور روم

میں گھسنا پڑے گا...... اور میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔'' بندیا تھک ہار کر بیڈ پر ڈھے گئی تھی پھر اس نے سیل فون اٹھا کر ذی شاہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یقیناً وہ اکیلے بول بول کر تھک چکی تھی...... اور اپنی بھڑاس کے جواب میں کسی کی آواز سننا چاہتی تھی۔ ذی شاہ کا نمبر بند تھا، بندیا کا مزاج پھر برہم ہو گیا...... تھوڑی دیر بعد اس نے پھر سے ٹرائی کیا تھا...... اب کہ نمبر آن ہو چکا تھا مگر کال پک نہیں کی گئی تھی۔

''ذی بھائی! اللہ تمہیں پوچھے بندہ کبھی تو فون وقت پر سن لیتا ہے۔'' بندیا زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی جب اس کا موبائل ایک دم بجنے لگا تھا۔ ذی شاہ کے بجائے ہاسٹل سے زرشام کی کال آ رہی تھی۔ اس نے جھٹ فون کان سے لگا لیا۔

''بندریا ڈیئر...... کیسی ہو؟'' وہ اسے بندیا کے بجائے بندریا کہہ کر چھیڑتا تھا کچھ وہ تھی بھی بھوری سی، صاف رنگت، بھوری آنکھیں، بھورے بال، شامی اسے بندریا ہی کہا کرتا تھا...... اور وہ اس طرزِ تخاطب پر آگ بگولا ہو جاتی تھی۔ زرشام بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ اب بھی چھیڑ رہا تھا۔

''بکواس بند کرو...... میرا دماغ پہلے سے تپا ہوا ہے۔'' بندیا دہاڑی تھی اور دہاڑنے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اسے کھانستے سن کر زرشام چہک کر کہہ رہا تھا۔

''ہاؤ فنی...... تمہارے دماغ کب تپا ہوا نہیں ہوتا......'' شامی کھلکھلا کر بولا تھا۔ دراصل ان دونوں بہن بھائی کی خوب چلتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ سال کے کئی مہینے شامی کو گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ سو یہ اپنی چونچیں فون پر لڑا لیتے تھے۔

''کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو مجھے ذی شاہ... بھائی سے کچھ ارجنٹ کہنا ہے۔'' اس نے بہت بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ذی شاہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی بات سن کر دوسری طرف شامی فوراً ٹھٹک گیا تھا۔

''خیریت تو ہے ناں......؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا...... ساری چونچالی وہ لمحوں میں بھول گیا تھا کیونکہ بندیا کی آواز خاصی سنجیدہ اور متفکر تھی۔ سو وہ پریشان کیوں نہ ہوتا۔

''خیریت کہاں ہے، عینی بھابی بھلا خیریت رہنے دے سکتی ہیں۔'' اس نے جلے کٹے انداز میں عینی کی سازش سے شامی کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اُدھر شامی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''یہ منگنی کا شوشا کس نے چھوڑا ہے؟ ذی تو جرمنی جا رہا ہے ناں میرا نہیں خیال وہ فی الحال اس جھنجٹ میں پڑے گا۔'' شامی نے متفکر سے انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا تب بندیا نے بھرائی آواز میں کہا۔

''عینی بھابی ذی بھیا کی منگنی کروا کر ہی دم لیں گی۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میں اس منگنی کو نہیں ہونے دوں گی۔ ممی اور مالا تو کچھ بھی نہیں کریں گی جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ تم ہی گھر آ جاؤ تو ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔'' بندیا کی سوں سوں نے شامی کو بے قرار کر دیا تھا۔ وہ عینی کی سازشوں سے خوب واقف تھا۔ جس طرح ذیشان کو ورغلا کر زبردستی ان کی زندگیوں میں گھسی تھیں یہ سب کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں تھا۔ ممی تو عینی کی تیزی طراری کے باعث انہیں بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ تو ذیشان کی ضد کے باعث بیل منڈھے چڑھی تھی۔ ذیشان نے بہ بانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ عینی کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تب ڈیڈی کی اچانک وفات کا غم بھی تازہ تھا اور مالا کے دکھ بھی ہرے تھے، زخم بھرے نہیں تھے۔ ابھی تو بہن کو اُجڑے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے جب عینی کے گھر والوں نے شادی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بقول عینی کی ماما ''مالا نے تو اب اسی روگ کے ساتھ عمر گزارنی ہے سو وہ اپنی بیٹی کو مالا کے زخم سلنے تک گھر

نہیں بٹھا سکتیں۔'' ایسی تکلیف دہ باتیں سن سن کر اندر سے مرے ہوئے یہ لوگ عینی کو دلہن بنا کر گھر لے آئے تھے پھر عینی کوئی غیر بھی نہیں تھی ان کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی۔ ممی نے دل پر پتھر رکھ کے ذیشان کی شادی کر دی حالانکہ لوگوں نے خوب باتیں بھی بنائی تھیں۔ ابھی تو ڈیڈی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور نہ مالا کی طرف سے ملنے والا گھاؤ ہلکا ہوا تھا جو شادیانے بھی بجانے شروع کر دیے تھے۔ تب ذی شاہ نے تو نہیں البتہ شامی نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔

''چند مہینے شادی اور بھی تو ڈیلے ہو سکتی تھی۔ ابھی تو مالا اسپتال سے ڈسچارج بھی نہیں ہوئی۔'' شامی کی خفگی بجا تھی۔ مالا کی نازک کنڈیشن کے پیشِ نظر اسے اسپتال ایڈمٹ کروا دیا گیا تھا۔ اس کو شدید ہیجانی دورے پڑنے لگے تھے پھر اس کا دوسری مرتبہ بھی نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ مالا اسپتال میں ہی تھی جب نئی دلہن گھر بھی آ گئی۔ تب ذی شاہ پورا دن اسپتال میں مالا کے پاس رہا کرتا تھا ان دنوں عینی بھی گھر والوں کے دلوں میں جگہ پانے کے لیے بھاگ بھاگ کر اسپتال جایا کرتی تھی مگر یہ اخلاقی کارروائیاں محض دنوں پر ہی محیط تھیں...... پھر اس نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے تھے یہ اور بات تھی کہ وہ ذیشان اور ذی شاہ کے سامنے کوئی اور ہی روپ لے کر آتی تھی۔ ان دونوں کے سامنے وہ خود کو بہت مظلوم و معصوم ثابت کیا کرتی تھی البتہ بندیا اور شامی اس کی ہر، ہر چالاکی سے واقف تھے۔ شامی ماں اور بہنوں سے ذی شاہ اور ذیشان کی نسبت زیادہ قریب تھا۔ ہاسٹل میں رہنے کے باوجود وہ بہن سے رابطے میں رہتا تھا جبکہ ذی شاہ بھی پہلے بورڈنگ میں رہنے اور پھر حصولِ تعلیم کی غرض سے زیادہ عرصہ گھر والوں سے دوری کے باعث اتنا قریب نہیں تھا۔ وہ زیادہ اپنے کام سے ہی تعلق رکھتا تھا اور محض سونے کے لیے آتا۔ ڈیڈی کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی بزنس کو وقت دینے لگ گیا تھا۔ جب سے مالا صحت یاب ہو کر دوبارہ گھر آئی تھی اس کے بعد سے ذی شاہ نے دوبارہ آفس کی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مالا سے غافل ہو گیا ہے یا بندیا کی ضروریات سے نگاہ چرا گیا ہے۔ وہ پہلے سے بڑھ کر ممی اور بہنوں کا خیال رکھتا تھا بلکہ ذیشان سے بھی زیادہ ان پر توجہ دیتا تھا مگر... اسے گھریلو معاملات میں انوالو ہونا پسند نہیں تھا۔ اگر بندیا اور عینی کی لڑائی ہو رہی ہوتی تو وہ ان کی لڑائی پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ ہر گھر میں نند بھاوج کی معمولی تکرار ہوتی ہے سو وہ ان کی لڑائیوں پر کیا غور و فکر کرتا، وہ جانتا تھا بندیا مزاج کی تیز ہے پر یہ نہیں جانتا تھا عینی بھی مزاج کی تیز ہے۔ اس کے سامنے تو وہ کوئی اور ہی کیئرنگ قسم کا روپ لے کر آتی تھی پھر صبح سے لے کر شام تک گھر سے باہر رہنے والے مردوں کو گھریلو سیاست کا بھلا کیا پتا ہو سکتا تھا۔

انہی حالات کے دوران ایک دن اچانک مالا کو لان کے الگ تھلگ اور تاریک گوشے میں بیٹھا دیکھ کر کچھ الگ قسم کی سوچیں ذی شاہ کے دل و دماغ کو جکڑ گئی تھیں۔ اس کی بہن اس وقت اکیس سال کی تھی۔ تین سال پہلے ڈیڈی نے اچانک اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کر دی تھی۔ ان کے بھائی عرصہ دراز سے جرمنی میں مقیم تھے۔ ایک دن اچانک پاکستان لوٹ آئے۔ تب ذی شاہ کراچی میں تھا۔ ایک صبح ڈیڈی کی فون کال آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ جرمنی جا رہے تھے اور ان کے ساتھ مالا نے بھی جرمنی جانا تھا۔ ذی شاہ، مالا کے جانے کا سن کر کچھ حیران تھا بھلا مالا کو ڈیڈی ساتھ کیوں لے جا رہے تھے...... تب مالا اٹھارہ، انیس سال کی معصوم بھولی بھالی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ہوشیار، چالاک تو جرمنی میں چھ ماہ کے قیام کے بعد بھی نہیں ہوئی تھی۔ خیر مالا کے جرمنی

جانے کا سن کر ذی شاہ کو بہت حیرت ہوئی تھی مگر وہ ڈیڈی سے سوال جواب نہیں کرسکا تھا۔ ڈیڈی نے اسے خود ہی بتادیا تھا۔ وہ مالا کی شادی کرنے جرمنی جارہے تھے اور حسیب چاچو اپنی بہو لینے پاکستان آئے تھے۔ ڈیڈی کو بھلا وہ تینوں بھائی کیسے روکتے! ڈیڈی خود گھر کے سربراہ تھے، مالا کے باپ تھے اور اس کے لیے بہترین ہی سوچ سکتے تھے حالانکہ یہ عجیب سی شادی ذی شاہ کے اندر کہیں وسوسے ضرور جگا گئی تھی۔ اس کی معصوم سی، کچھ کچھ دبو، تھوڑی تھوڑی ڈرپوک بہن کو نکاح کے بعد ڈیڈی جرمنی چھوڑ کر خود پاکستان خوش باش لوٹ آئے تھے۔ تب ڈیڈی کی آنکھوں میں مسرت کے دیے روشن تھے۔ گویا وہ مالا کو محفوظ ہاتھوں میں تھما کر خود سرشار تھے اور ان کے چہرے پر ایسی چمک تھی جو ایک بیٹی کے باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ دیکھ کر مسرور کیے رکھتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی سسرال سے بھی خوب مطمئن تھے۔ چاچو کی جرمن بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ایک بیٹا تھا، ایک بیٹی تھی البتہ ڈیڈی کے منہ سے چاچو کی بیٹی کا ذکر کم کم ہی سنا گیا تھا تاہم علی عیسیٰ کے تو ڈیڈی دیوانے بن کر آئے تھے۔ اس کی تعریفوں کے لیے انہیں الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ ایسے چلتا ہے، وہ اتنا میٹھا بولتا ہے۔ وہ اتنا بااخلاق ہے۔ اس کا مزاج ایسا ہے۔ ڈیڈی کے لیے اپنے بھتیجے کی تعریفوں کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ یقیناً حسیب چاچو پاکستان آئے ہی اس مقصد کے لیے تھے کچھ انہوں نے خود اپنے بیٹے کی تعریفیں کرکے ڈیڈی کو قائل کر رکھا تھا اور کچھ وہ خود اپنے داماد اور بھتیجے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ ڈیڈی کو یہاں آکر رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ حسیب چاچو نے کیسے ہیرے سے بیٹے کو ان لوگوں سے دور کر رکھا تھا۔ ڈیڈی سے اتنی تعریفیں سن کر ذیشان نے مذاقاً کہا تھا۔

''ڈیڈی وہ صرف میٹھا بولتا، اخلاق جھاڑتا اور باتیں ہی مٹھارتا ہے اس کی شکل صورت کیسی ہے؟ کم از کم ایک آدھ تصویر ہی لے آتے۔'' ذیشان نے کافی عقلمندانہ سوال اٹھایا تھا۔ دراصل اپنے بہنوئی کی تصویر تو وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا مگر ڈیڈی اتنی شاندار شادی کی تصویروں والے البمز اور مووی اُدھر ہی بھول آئے تھے۔ ڈیڈی نے بتایا تھا چاچو نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بہت دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ پورے من ہائیم کی ہائی جنٹری کو بلوایا تھا۔ بہت شاندار ولیمہ کیا تھا مگر ان خوب صورت لمحات کی فوٹو والا بیگ وہ اُدھر ہی بھول آئے تھے پھر اس کے بعد بھی جب بندیا کی مالا سے فون پر بات ہوتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کی تصویروں کے لیے اصرار کرتی۔ اُدھر مالا حامی بھی بھر لیتی تھی مگر اسے پھر یہ چھوٹا سا کام یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش اور بہت مگن تھی۔ ممی کے توسط سے مالا کی خوشحال زندگی کا اور اس کے سکھی شاد ہونے کا پتا چلتا رہتا تھا۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے مالا کی بھرپور زندگی کا سن کر اس کا دل خوشی کے احساس سے معمور تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کبھی کبھار ذی شاہ سے بھی مالا کی بات ہوجاتی تھی۔ اس نے ہمیشہ مالا کو خوش اور مسرور ہی محسوس کیا تھا۔ وہ کھلکھلاتے لہجے میں بات کرتی تھی۔ بولتی بعد میں تھی پہلے ہنستی تھی پھر اس ہنستی مسکراتی مالا کو اچانک جانے کیا ہوگیا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد ذی شاہ نے اسے اجڑی حالت میں حال سے بے حال دیکھا تھا۔ یوں کہ وہ کسی سے کلام نہیں کر رہی تھی۔ تاہم اس نے ایک بھیانک رات کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس بھیانک رات کیا ہوا تھا؟ یہ سب مالا نے نہیں بتایا تھا۔ وہ بہت کچھ بتائے بغیر خاموشی کی بکل مارے سر نیہوڑائے رہتی۔ پچھلے تین سال سے وہ لوگ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر رہے تھے مگر اب ذی شاہ کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئی تھیں۔ اسے اپنی بہن کی خوشیاں دوبارہ واپس لانی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لانی تھی۔ اسے پھر سے شاد و آباد دیکھنا تھا مگر اس سے بھی پہلے ذی شاہ کو اس بھیانک رات کی کھوج کے لیے نکلنا تھا۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟ علی عیسیٰ اور مالا کے درمیان آخر کیا ہوا تھا جو اُن کا ہنستا بستا گھر ٹوٹ گیا تھا۔ مالا کس طرح لُٹی پِٹی واپس آئی تھی؟ اس کی بہن کے ساتھ آخر علی عیسیٰ نے کیا، کیا تھا وہ ہنسنا بھول گئی تھی۔ وہ بولنا بھول گئی تھی۔ اس کی پیاری سی بہن زندگی جینے کا قرینہ بھول گئی تھی۔

ذی شاہ کو ایک پُل صراط سے گزرنا تھا۔ اسے اپنے اور اپنی بہن کے مجرم تک پہنچنا تھا۔ اسے مالا کی خوشیاں دوبارہ لے کر آنی تھیں اور اس کے لیے وہ ہر آزمائش اور ہر حد سے گزر سکتا تھا۔

پہلی مرتبہ ذی شاہ کو احساس ہوا تھا کہ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر کے وہ لوگ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کر رہے۔ وہ محفلوں سے دور تو رہتی تھی اپنے بہن بھائیوں سے بھی دور رہنے لگی تھی۔ ایک الگ تھلگ کونے میں، ایک تنہا گوشے میں نم آنکھیں لیے جانے کس کس تکلیف دہ منظر کو سوچتی رہتی تھی۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ کے دل کو گہری ٹھیس پہنچی تھی پھر یہ ٹیس وقتاً فوقتاً اٹھتی رہتی۔ مالا کو دیکھ کر اس کا دل کرب کی اتھاہ میں گرنے لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا وہ لوگ مالا کے دکھ کی تہہ کو کھوج ہی نہیں سکتے۔ اس کے غم کا بار اٹھا ہی نہیں سکتے۔ اس کے کرب کے ذائقے کو چکھ ہی نہیں سکتے۔ جو مالا اذیت محسوس کرتی تھی اس اذیت کو سمجھنا آسان کہاں تھا۔

☆☆☆

عینی کی سالگرہ والے دن جب اس کے میکے سے سب افراد آئے تھے۔ ذیشان کے کچھ دوست اور ان کی فیملیز بھی تھیں۔ خاندان کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے۔ اس دن بڑا رومینٹک ماحول تھا۔ لان میں باربی کیو کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ دھیما دھیما میوزک ماحول کو سحر انگیز کر رہا تھا پھر تالیوں کی گونج میں عینی نے کیک کاٹا۔ شیفون کی سرخ ساڑی میں اس کا بجلیاں گراتا حُسن ذیشان کو کتنا گھائل کر رہا تھا۔ یہ تو ساری محفل کے لوگ جانتے تھے۔ اتنے پُرفسوں ماحول میں آنیہ کی دلنشین مسکراہٹوں کو نظر انداز کرتا وہ جانے کیوں اتنا بے کل ہو رہا تھا۔ تب اچانک ہی اس کا جی اچاٹ ہوگیا۔ طبیعت پر بیزاری چھا گئی تھی۔ دل میں اتنی اداسی ایک دم پھیلی تھی کہ ذی شاہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس ہنگامے سے کہیں دور بھاگ کر چلا جائے۔ آنیہ کی مسکراہٹوں سے لے کر محفل کی دلکشی تک وہ سرتاپا ...بیزاریت میں لپٹ گیا تھا۔ تبھی کزنز کے جھرمٹ سے نکل کر وہ اندرونی حصے کی طرف آیا تو اس کے پیچھے ہی عینی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔

''تم کیوں چلے آئے ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ متفکر سی برابر اُسے دیکھے جارہی تھی۔ اسے ذی شاہ کا اتنی بھرپور محفل کو چھوڑ... کر آنا پسند نہیں آیا تھا۔ عینی متفکر تھی کہ جانے ذی شاہ کو کون سی بات بری لگی ہے۔ وہ اس کے اُدھر آنے کی وجہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ دراصل اسے ماما اور آنیہ نے بھیجا تھا۔ وہ دونوں بھی ذی شاہ کے اچانک اٹھ آنے پر متفکر تھیں۔ خصوصاً آنیہ کو تو اپنی تمام تر تیاری بیکار محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے لیے وہ بن سنور کر آئی تھی وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں گھس گیا تھا۔ عینی کو تسلی دیتا وہ سر درد کا بہانہ کر کے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب عینی کی متفکر آواز ایک مرتبہ پھر اس کے پیچھے آئی۔

''تم آرام کرو ذی، میں تمہارے لیے کڑک سی چائے بھجواتی ہوں۔'' عینی اپنا اخلاق اس پر نچھاور کرتی چلی گئی۔ تب ذی شاہ سر جھٹکتا کاریڈور میں سے گزر رہا تھا جب آخری سرے پر موجود جالی والے دروازے کے اس پار اسے زرشام اور بندیا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں نیچے محفل میں بھی نہیں تھے۔ دراصل یہی ایک بے کلی تھی جسے محفل میں محسوس کرتا وہ

اچانک اٹھ آیا تھا۔ اس کے بہن بھائی وہاں موجود نہیں تھے سوائے محفل میں جان اور رنگ نظر نہیں آرہا تھا۔ بس ممی وہاں مارے باندھے بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ کچھ سوچتا ہوا جالی کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر نکل آیا تھا۔ تب اسے دیکھ کر بندیا اور شامی کچھ متحیر رہ گئے تھے۔

''تم یہاں......؟'' یقیناً وہ دونوں بھی حیران تھے کہ ذی شاہ اتنی بھرپور محفل کیسے اور کس طرح چھوڑ آیا تھا۔ ان کی حیرت بجا تھی۔ ذی شاہ کو تو جانِ محفل سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کی پارٹیز کے پلان ذی شاہ کے لیے تو بنائے جاتے تھے۔ وہ کوئی بھی پارٹی، فنکشن چھوڑتا ہی کہاں تھا پھر اس وقت اپنے ہی گھریلو فنکشن کو چھوڑ کر اس کا اوپر آنا دونوں کو حیران کر گیا تھا۔

''ہاں میں یہاں...... کیا میں تم لوگوں کے پاس نہیں آسکتا؟ یہاں بیٹھ نہیں سکتا؟'' اس کی نظریں گم صم بیٹھی مالا کے ویران چہرے پر جمی تھیں جو دنیا بھلائے ریلنگ کی درزوں میں سے کھلکھلاتی عینی کو دیکھ رہی تھی جو ذیشان کے کندھے پر جھکی جانے اس کے کان میں کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنے اندر ٹیس سی اٹھتی محسوس کی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر حسرت جھلکتی دیکھی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر عجیب سا کرب دیکھا تھا گویا لان کا منظر اسے ماضی کا کوئی حسین لمحہ یاد دلا گیا تھا۔ مالا کو دیکھ کر ان دنوں اس پر یاسیت کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ذی شاہ کو دنیا کی ہر خوب صورتی اپنی بہن کے کرب میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ اسے لگتا تھا، مالا کا غم اسے پگھلا کر رکھ دے گا۔ شاید یہی بے کلی، اذیت اور بے چینی تھی جو اسے اٹھا کر اپنے بہن بھائیوں کے درمیان لے آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی اور دونوں بہنوں کو مس کر رہا تھا اور مالا کی یہی نظریں لان میں بھی اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

اس کی نظروں کا ارتکاز بھی مالا کو اس کی طرف متوجہ نہیں کر پایا تھا۔ تب ذی شاہ کے اندر نہ جانے کیسا سکوت اتر آیا تھا۔ اسی سکوت اور اضطراب کو جھٹکتے ہوئے اس نے شامی کو مخاطب کیا تھا۔

''تم نیچے کیوں نہیں آئے؟'' وہ مالا کے برابر بیٹھ گیا تھا اور اس کی نظریں بھی مالا کے چہرے پر تھیں جو ابھی تک لان کے اسی جگمگاتے گوشے پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی جسے تابناکی عینی کے حسن نے بخش رکھی تھی۔ ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن جانے کس کس اذیت سے صبح شام گزرتی تھی۔ وہ جو مالا کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا شامی کے کٹیلے سے لہجے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں خود غرض لوگوں کی محفلوں کو پسند نہیں کرتا۔'' شامی بہت زہریلے لہجے میں بول رہا تھا۔ یقیناً بندیا نے اسے عینی اور اپنی تمام تر جھڑپوں کے بارے بتا دیا تھا۔ وہ بندیا کے ساتھ بیٹھ کر گھریلو سیاست پر روشنی ڈال لینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس وقت تھا۔ وہ ممی اور بندیا کو بہت ٹائم دیتا تھا مگر چند ماہ تک اس کے فائنل ایگزامز ہونے والے تھے۔ بعد میں اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا پھر وہ بھی ذیشان اور... ذی شاہ کی طرح مصروف ہو جانے والا تھا اور اس کی مصروفیت کے ساتھ ہی وقت کی قلت کا مسئلہ شروع ہو جانا تھا پھر وہ اپنی بہنوں کے لیے وقت نکال نہیں پائے گا۔ یہ بات شامی نہیں جانتا تھا مگر ذی شاہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ بندیا کو پھر شامی سے بھی بہت شکوے ہو سکتے تھے مگر بندیا کے لیے کڑھنے جلنے کے علاوہ اور بھی مصروفیات تھیں۔ ایک آدھ سال تک اس کی شادی ہو جاتی۔ اس کے بعد مالا کتنی تنہا ہو سکتی تھی، ابھی تو بندیا اسے گھسیٹ کر باہر لے آتی تھی مگر پھر بھلا مالا کا کون خیال رکھتا۔ کون اسے باہر گھسیٹ کر لاتا، کون اسے توجہ دیتا؟

ان تمام سوچوں نے ذی شاہ کو کتنا بے کل کر دیا تھا۔

اس نے اپنی تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال دی تھیں۔ دراصل ڈیڈی کے بعد اس پر دہری ذمے داریاں آپڑی تھیں۔ اسے گھر اور آفس دونوں کو توجہ دینا ان کے ڈیڈی ذوالفقار احمد کا ذاتی بزنس تھا۔ ان کا شمار اچھے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا اور انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی فرم کی ایک اچھی ساکھ بنائی تھی۔

ڈیڈی اور چاچو بس دو ہی بھائی تھے۔ حسیب احمد تعلیم کی غرض سے جرمنی گئے تھے پھر عمر بھر کے لیے وہیں رہ گئے۔ انہوں نے شادی بھی وہیں کی پھر بائیس تیئیس سال تک واپس پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا۔ حسیب احمد کے صرف دو ہی بچے تھے جنہیں محض نام کی حد تک یہ لوگ جانتے تھے۔ علی عیسیٰ اور اس سے چھوٹی سون۔ اکثر ڈیڈی ہی ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انہیں علی عیسیٰ سے خصوصی محبت ہو گئی تھی۔

ذوالفقار احمد پر اولاد اور دولت کے حوالے سے قدرت بہت مہربان رہی تھی۔ اللہ نے انہیں پانچ بچوں سے نوازا تھا۔ ذیشان، ذی شاہ اور زرشام کے بعد مالا اور بندیا تھیں۔ ان کے بچے بہت لائق، ذہین اور خوب صورت تھے۔ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ آگے آگے رہے۔ اپنی اولاد میں انہیں سب سے زیادہ ذی شاہ اور مالا سے محبت تھی۔ ذی شاہ تو زیادہ تر بورڈنگ میں رہا تھا تاہم مالا ان کے بہت قریب تھی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ماں نے اسے گھریلو امور میں بھی طاق کر رکھا تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی، نرم مزاج، موم میں ڈھلی لڑکی تھی۔ تبھی جب باپ نے اپنے بھتیجے سے رشتہ طے کر دیا تو چپکے چپکے باپ کے بن دیکھے بھتیجے سے عشق کرنے لگی۔ اس نے علی عیسیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی نہ باپ کے فیصلے پر اعتراض کرنے کی۔ باپ نے جیسا کہا جو کہا اس پر سر جھکا دیا۔ انٹر سے پہلے اس کی شادی کر دی گئی تھی اور وہ اپنی زندگی کے اس حسین موڑ پر

غزل

قصہ ابھی حجاب سے آگے نہیں بڑھا
میں آپ، وہ جناب سے آگے نہیں بڑھا
مدت ہوئی کتابِ محبت شروع کیے
لیکن میں پہلے باب سے آگے نہیں بڑھا
لمبی مسافتیں ہیں مگر اس سوار کا
پاؤں ابھی رکاب سے آگے نہیں بڑھا
لوگوں نے سنگ و خشت کے قلعے بنا لیے
اپنا محل تو خواب سے آگے نہیں بڑھا
طولِ کلام کے لیے میں نے کیے سوال بہت
وہ مختصر جواب سے آگے نہیں بڑھا

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں ضلع قصور

پوری طرح خوش بھی نہیں ہوئی تھی جب زندگی نے اس کے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کر دیا۔

دراصل مالا کے اجڑنے کی خبر نے سب سے زیادہ ذی شاہ کو شاکڈ کیا تھا۔ ابھی وہ مالا کے دکھ پر ہی متحیر تھا جب اچانک ڈیڈی بھی چل بسے تھے مگر ڈیڈی کے مرنے اور مالا کے اجڑنے سے پہلے جرمنی میں مقیم ان کے اکلوتے چاچو بھی تو فوت ہو گئے تھے۔ اگر ذی شاہ زیادہ غور کرتا تو اسے لگتا کہ چاچو کی وفات کے فوراً بعد مالا کی زندگی طوفان اور آندھیوں کی زد میں چلی گئی تھی۔ جب تک چاچو زندہ رہے تھے تب تک سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر جو کچھ بھی ہوا تھا چاچو کی وفات کے بعد ہوا تھا اور علی عیسیٰ ان لوگوں کے اصرار پر بھی چاچو کی ڈیڈ باڈی پاکستان نہیں لے کر آیا تھا۔ بقول اس کے پاپا کی وصیت تھی ان کو مما کے ساتھ دفنایا جائے۔ یہ بات اس نے ڈیڈی کو فون پر بتائی تھی۔ علی عیسیٰ سے ان لوگوں کی تو کبھی فون پر بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اکثر ڈیڈی کو کال کیا کرتا

تھا۔ چاچو کی فوتگی اور تدفین کا بتانے کے بعد پھر علی عیسیٰ کی کوئی اور کال نہیں آئی تھی۔ مالا بتاتی تھی وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ چاچو کی موت کے صدمے کو بُھلا نہیں پا رہا۔ مالا سے باقاعدگی کے ساتھ ممی اور بندیا کی بات ہوا کرتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے لیے بہت پریشان تھی۔

پھر کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ مالا اجڑ کر واپس وطن لوٹ آئی۔ یہ صدمہ بہت اذیت ناک تھا۔ مالا کے اجڑنے کا دکھ ایک طرف...... ڈیڈی اس غم کے بوجھ تلے دب کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ گئے تھے۔ مالا بیمار تھی، ممی بجھ کر رہ گئی تھیں۔ بندیا پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی تھی۔ ذرشام کم کم گھر آنے لگا تھا گھر کا سوگوار ماحول ذی شاہ کے اندر بھی حبس بھر دیتا تھا۔ سو اس نے بھی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی اور وہ بے چاری بے بس سی سر جھکا کر آنسو بہانے لگتی۔ وہ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتی تھی جبکہ ذی شاہ کو اب مالا کے آنسو ہی تو خشک کرنے تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو ختم کرنا تھا۔ مالا کے چہرے پر مسکراہٹ سجانا تھی اور اس... کام کے سلسلے میں وہ کچھ عملی قسم کے اقدام کرنے والا تھا۔

اس نے اپنے دن بھر کے شیڈول میں کچھ خاص اوقات مقرر کر لیے تھے۔ اسے ان اوقات میں مالا کو بھرپور وقت دینا تھا۔ اسے گھمانے لے جانا، ہوٹلنگ، شاپنگ اور کچھ ہلا گلا...... وہ اس کی زندگی پر چھائے جمود کو توڑنے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ مگر فی الحال اسے شامی اور بندیا کی بدگمانی دور کرنا تھی جو یقیناً اسے بھی ذیشان کی طرح کچھ کچھ... خود غرض سمجھتے تھے۔ فی الوقت کچھ تلخ سوچوں کو جھٹک کر وہ شامی اور بندیا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''تم ذیشان سے اتنے بدگمان کیوں ہو......؟'' اس نے براہِ راست شامی کو مخاطب کیا تھا جو نیچے سے منگوائے گئے سیخ کباب مالا کو پکڑاتا گھوم کر ذی شاہ کی طرف دیکھنے لگا تھا پھر اس کی بات سمجھ کر استہزائیہ انداز میں بولا۔

''اس لیے کہ ذیشان انتہائی سیلفش ہے، ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے، اسے ماں اور بہنوں کی کوئی فکر نہیں۔'' شامی کی آواز میں ذرا غصہ اور عجیب سا دکھ بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ بندیا بھی سر جھکائے یقیناً شامی کے بولے گئے الفاظ کی تائید کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ان دونوں کو بغور دیکھتا رہا تھا پھر سر جھٹک کر شامی کی بات کا جواب دینے لگا۔

''ذیشان سیلفش کیسے ہے......؟ اگر وہ.. خود غرض ہے تو مجھے کیوں نہیں لگتا۔'' اس کے جواب میں بھی ایک سوال تھا اور ذی شاہ کا سوال خاصا تیکھا تھا۔ تبھی شامی بھی قدرے چبھتے لہجے میں ذرا بھڑک کر کہنے لگا۔

''تم ذیشان کے ہاتھ نہیں لگے ابھی...... دراصل اس میں ذیشان کا بھی قصور نہیں...... ماموں کی ساری فیملی کا اس پر اثر ہے اور چونکہ ماموں کی فیملی پر خود غرضی ختم ہے سو ذیشان پر بھی ان کا اثر پڑ چکا ہے اور ویسے بھی اپنی خوب صورت بیوی کے ناز اٹھانے کے ساتھ ساتھ اسے عینی بھابی کی زبان میں گفتگو کرنا پسند ہے اور عنقریب تمہیں بھی ذیشان کے ہاتھ لگنے والے ہیں۔ تبھی کہہ رہا ہوں، ذرا بچ کر رہنا۔'' شامی کا انداز آخر میں معنی خیز ہو گیا تھا۔ تب ہی ذی شاہ کچھ الجھ گیا۔ اس کی پوری بات سمجھ لینے کے باوجود شامی کے آخری الفاظ اسے کچھ ٹھٹکا گئے تھے۔

''میں بچ کر رہوں؟ مگر کیوں......؟ ذیشان کے کیا ارادے ہیں کہ جن سے میں بے خبر ہوں؟'' ذی شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ سیخ کباب کی پلیٹ واپس رکھ کے کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اسے شامی کے معنی خیز انداز چونکا رہے تھے۔ اسی طرح بندیا بھی کچھ کچھ بے چین بیٹھی تھی گویا ذی شاہ

سے اسی موضوع پر بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

''وہ تمہاری منگنی اپنی سالی سے کروانا چاہتا ہے اور تم ایسے انجان ہو گویا کچھ اتا پتا نہیں۔'' شامی نے کلس کر ٹکڑا لگایا تھا۔ وہ اپنے اندر کی کھولن نکال رہا تھا۔ یقیناً ذیشان کے اس خیال اور سوچ نے بندیا اور شامی دونوں کو تپا رکھا تھا...... اور وہ دونوں ہی... ذی شاہ سے اپنی کھولن بیان کرنا چاہتے تھے۔

''ارے...... کیا سچ......؟'' ان کی توقع کے عین مطابق ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ گویا ذیشان کے نیک ارادوں کی بھنک ابھی تک اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔

''لو جی...... یہاں تو کمال کی بے خبری ہے۔'' شامی کلس کر پہلو بدل گیا۔ اب کہ بندیا بھی لب کشائی کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''عینی بھابی کی بھرپور کوشش ہے وہ آنیہ کو ہمارے سروں پر ضرور مسلط کر کے رہیں گی۔'' اس کو اپنے دکھ یاد آ رہے تھے۔ وہ جانتی تھی عینی بھابی کی کوششیں اگر رنگ لے آئیں تو اس گھر میں سانس لینا بھی محال ہو جائے گا۔ وہ دونوں ذی شاہ کو نہ صرف خبردار کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے آنیہ سے منگنی رکوانے پر مجبور بھی کرنا چاہتے تھے۔

''یہ بھلا ممکن ہے، آنیہ کے بارے میں ایسا ہرگز میں نے کبھی نہیں سوچا......'' ذی شاہ کے الفاظ جہاں شامی اور بندیا کو مطمئن کر چکے تھے وہیں اندر کی کچھ کچھ بے چینی انہیں مزید بولنے پر بھی اکسا رہی تھی۔

''تم نہ بھی سوچو تو عینی بھابی زبردستی تمہیں آنیہ کو سوچنے اور آنیہ کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیں گی۔'' شامی نے جل بھن کر کہا تھا۔ وہ جو کچھ اسے سمجھانا یا بتانا چاہتے تھے، بتا چکے تھے۔ ذی شاہ کو الرٹ تو کر دیا گیا تھا اب وہ خود ہی اپنی جنگ لڑ سکتا تھا اور ان دونوں کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ ذی شاہ کے دل میں آنیہ کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔

''عینی کی ایسی مجال، میری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' ذی شاہ نے غصے سے کہا تھا فی الحال تو وہ اپنے بارے میں ایسا کچھ سوچنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا...... اسے سب سے پہلے مالا کے لیے سوچنا تھا پھر بندیا کی شادی کے بعد ہی وہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے اپنی زندگی کے لیے وہ قطعاً کسی خوشگواریت کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔

''اب اپنی باتوں اور لفظوں کی لاج رکھ لینا۔ یہ نہ ہو ذیشان تمہیں مجبور کرے اور تم سہرا سجانے پر تیار ہو جاؤ۔'' شامی نے ذرا متفکر لب و لہجے میں یقین دہانی چاہی تھی۔ وہ اپنے خدشات ڈھکے چھپے لفظوں میں ذی شاہ پر ظاہر کر چکا تھا۔ تب ذی شاہ نے خاصی ناگواری بھرے ٹھوس لہجے میں وضاحت کی تھی۔

''میں تو نادان سا بچہ ہوں ناں...... ذیشان میرے ہاتھ میں لولی پاپ پکڑا کر اپنی مرضی سے مجھے استعمال کر لے گا جیسے......'' وہ چڑ کر خفگی سے بولا تھا تب بندیا اور شامی کے دلوں میں ڈھیروں چین اتر آیا...... وہ ذی شاہ سے ایسی ہی دلیری کی امید رکھتے تھے...... اب چونکہ ان دونوں کی تسلی ہو چکی تھی سو وہ دونوں چین کی بانسری بجا سکتے تھے۔

''مجھے تم سے ایسی ہی بہادری کی امید تھی......'' شامی اس کا کندھا تھپک کر دلار سے بولا۔

''میں سرحد پر لڑنے جا رہا ہوں کیا......؟'' اس کی بات سمجھ کر ذی شاہ ذرا مسکرا کر ماحول کا تناؤ کم کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ اسے ذیشان کی سوچ پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ وہ بالا ہی بالا اس کی مرضی، پسند اور خواہش جانے بغیر کیسے اس کی زندگی کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا...... اگرچہ آنیہ خوب صورت تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا ذی شاہ اس سے بغیر اپنی ممی کی مرضی جانے منگنی یا شادی کر لیتا...... اسے شادی تو کرنا تھی مگر آنیہ سے ہرگز نہیں...... وہ لاکھ گھر کے معاملات سے بے نیاز رہتا

تھا مگر وہ اتنا ضرور جانتا تھا عینی اچھی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ نہ اچھی بہو ہے نہ بھابی ہے۔ اس کی بہنوں کے ساتھ تو عینی کا رویّہ بہت ہتک آمیز ہوتا تھا۔ ممی یا بندیا اسے کچھ نہیں بتاتی تھیں اس کے باوجود وہ عینی کے مزاج کو سمجھ گیا تھا پھر عینی کی بہن کو بھلا اس گھر میں کیسے لے آتا؟ ویسے بھی وہ مالا اور بندیا کے بارے میں بہت حساس ہو رہا تھا اور ان دونوں سے پہلے اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ذیشان اور عینی بھابی سے ٹکر لینا آسان نہیں...... سمجھو تو اس گھر میں نیا محاذ کھلنے والا ہے۔" شامی نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔ تب ذی شاہ نے چھوٹے بھائی کو بھرپور تسلی دینے والے انداز میں مسکرا کر بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

"اور مجھے محاذوں پر لڑنا اور فتح پانا آتا ہے، تم بالکل فکر نہ کرو، میں عینی بھابی جیسی ایک خوب صورت بلا کو اپنی پیاری بہنوں کے سروں پر مسلط ہرگز نہیں کروں گا۔" اس نے شرارتی انداز میں بندیا کو چھیڑا تھا۔ وہ دونوں ہی کچھ جھینپ کر ہنس پڑے تھے، ذی شاہ .... قدرے پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور بہن کے دل سے بدگمانی کو دور کر چکا تھا۔ وہ انہیں یقین دلا چکا تھا کہ وہ ذیشان کی طرح خود غرض نہیں...... نہ وہ کبھی انہیں چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔ اس خوب صورت تاروں سے ڈھکی رات میں ان تینوں کے درمیان اعتماد، اعتبار اور خلوص کی اک نئی فضا قائم ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے اب بالکل کھل کر ہر بات ڈسکس کرنے لگے تھے۔ مالا کی تکلیف اور دکھوں سے لے کر عینی کی سازشوں تک ایک، ایک بات تینوں کے درمیان شیئر ہونے لگی تھی۔ مالا چونکہ ان باتوں میں حصہ نہیں لیتی تھی تاہم ذی شاہ زبردستی اسے کھینچ گھسیٹ کر باہر لے آتا تھا۔ بندیا کو بھرپور تسلی مل چکی تھی۔ اب آنیہ نام کا عفریت ان کو چمٹنے والا نہیں تھا...... مگر وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے۔ ذی شاہ کا انکار کس طرح ان کے گھر کی دیواروں کو ہلا گیا تھا۔ رشتوں میں کتنی بڑی بڑی بدنما دراڑیں پڑ گئی تھیں تاہم ذی شاہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا تھا۔ وہ ثابت قدم مضبوط اور مستحکم رہا تھا۔ وہ ذیشان کی بے جا ضد کے سامنے جھکا ہرگز نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے رشتوں کی قربانیاں ضرور دینی پڑی تھیں۔

☆☆☆

ان دنوں وہ آفس سے جلدی اٹھ آتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ مالا کو بہت ٹائم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ مالا کے لیے رنگ رنگ کے رسائل لے آتا۔ خوب صورت میگزین اور اخباروں کے ڈھیر لگا دیتا۔ اسے باقاعدگی سے واک پر لے جاتا۔ کبھی لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنا لیتا...... کبھی شاپنگ کا اور کبھی بلاوجہ ہی سڑکوں پر نکل جاتا۔ اکثر بندیا بھی ان کے ہمراہ جاتی تھی۔ وہ بھی ان دنوں بھائی کی توجہ پا کر بہت خوش تھی اور ممی ان کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھیں۔

ذی شاہ کی یہ نئی روٹین عینی کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو ذی شاہ مصروفیت کا بہانہ بنا دیتا۔ اسے مالا کے ناز اٹھانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ عینی کو یہ صورتِ حال دیکھ کر خفقان ہونے لگا تھا مگر وہ ... ذی شاہ کو روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا عینی اسے کس بل بوتے پر روکتی یا منع کرتی؟ پھر وہ اس کے کہنے میں آنے والا بھی نہیں تھا۔ ان دنوں عینی سے خاصا اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ یہ حالات عینی کے لیے خاصے تشویش ناک تھے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ذی شاہ کے گرد پرانا حصار قائم کرنا چاہتی تھی اور خوش قسمتی سے اسے موقع بھی مل گیا۔ اس دن بھی صبح، صبح وہ میز پر ذی شاہ کے لیے ناشتا سجا کر بڑی لگاوٹ سے بولی تھی۔

"ذی! مجھے ماما کی طرف تو لے جاؤ، بہت دن سے چکر نہیں لگا۔" وہ ملک شیک کا جگ اس کے سامنے رکھ کر بڑی مصروف نظر آ رہی تھی۔ گویا اس گھر کے ڈھیروں کاموں میں الجھ کر اسے میکے جانے کا وقت نہیں مل پاتا تھا۔ اور آج اس نے بڑی مشکلوں سے وقت نکالا تھا۔ بظاہر وہ کچھ ایسا ہی جتانے پر تلی ہوئی تھی مگر چونکہ غیر محسوس انداز میں عینی کی اصلیت اس پر کھل چکی تھی سو اب وہ اس کی شیریں بیانی کے جال میں نہیں پھنس سکتا تھا۔

"آئی ایم سوری...... عینی بھابی......! آپ ذیشان کے ساتھ ہی چلی جاتیں...... میرے پاس اتنا وقت نہیں...... میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔ مائنڈ مت کیجیے گا، شام کو وقت ہوا تو سوچوں گا۔ ویسے میرے لارے پر مت رہیے گا۔ گاڑی اور ڈرائیور آفس پہنچ کر بھیج دوں گا۔ ٹھیک ہے ناں...... آرام سے جائیں، آرام سے آئیں۔" وہ بھی جواباً شیریں بیانی دکھاتا اخبار ایک طرف رکھ کر ملک شیک پینے کے بعد کوٹ اور چابیاں اٹھاتا عجلت میں باہر نکل گیا تھا اور عینی گویا پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ آج سے پہلے کب ذی شاہ نے اسے میکے لے جانے اور واپس لانے کی ڈیوٹی سے انکار کیا تھا پھر اب اسے کیا ہوا تھا؟ وہ کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً ہاتھوں سے نکلنے والا تھا۔ عینی کے آس پاس خطرے کے الارم بج رہے تھے۔ اسے سو فیصد یقین تھا ذی شاہ کے کان ممی اور بندیا نے بھرے ہیں۔ اسے اپنی دانست میں مکار پھوپی جو اس کی ساس بھی تھیں پر سخت تاؤ چڑھ رہا تھا اور پھر بندیا جیسی کٹنی نند کی گردن مروڑنے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ آنیہ کو اس گھر میں لانے کا خواب ادھورا ہی رہے گا...... کبھی تعبیر نہیں پائے گا۔

ذی شاہ کے کورے جواب نے اسے دھچکا [illegible] کی ماری...... اجڑی، ویران بہن کے لیے اس کے پاس وقت ہی وقت تھا اور عینی کے لیے پندرہ بیس منٹ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ عینی کو اتنا غیظ چڑھا کہ اس نے غصے میں دو تین گلاس توڑ ڈالے تھے۔ کانچ کے گلاس ٹوٹنے کی آواز سن کر ممی اور بندیا دوڑی آئی تھیں۔ ان کے پیچھے ہراساں سی مالا بھی کھڑی تھی جو عینی کے غضبناک تیور دیکھ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا چڑیا جتنا دل لڑائی جھگڑے سے بہت سہم جاتا تھا مگر یہاں مالا کے خوف کی بھلا کسے پروا تھی۔ عینی کی تیوری چڑھی دیکھ کر ممی نے ہی لب کشائی کی کوشش کی تھی۔ دوسرے معنوں میں بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کے استفسار کرنے پر عینی چیخ پڑی۔

"یہ سب کیا دھرا آپ کا ہے، میری زندگی سے آپ سب نے سکون ختم کر دیا ہے۔ تم تینوں میری جان کو چمٹی ہوئی ہو...... اس گھر میں میری سانس بند ہونے لگی ہے۔" وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے آنسو بھی... برسا رہی تھی۔ جانے اسے اچانک ہوا کیا تھا۔ ممی سمیت بندیا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ تاہم عینی کے الفاظ نے اسے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

"اس گھر میں آپ کی سانس بند ہوتی ہے تو چلی جائیں یہاں سے۔ شوہر سے کہیں آپ کو الگ گھر دے دے...... وہ تو ویسے بھی آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کیے عمل کیے جاتا ہے۔" بندیا نے بے دھڑک جواب دے کر عینی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ممی اسے برابر چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو چپ کر جاتی۔

"میں کیوں نکلوں یہاں سے، تم ماں بیٹیاں تو چاہتی یہی ہو، ذیشان مجھے چھوڑ دے۔ گھر سے نکال دے۔" بندیا کی بات کو الٹ انداز میں لیتی عینی نے بھاں بھاں کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔ جانے یہ کیسی کھولن تھی جسے وہ بندیا پر نکال رہی تھی۔

"ہم کیوں ایسا چاہیں گے، اپنے جیسا....

خودغرض مت سمجھو ہمیں...... اپنے بھائی کا گھر ہم کیوں برباد کرنے کا سوچیں گے۔'' بندیا کے کھرے جواب نے ایک مرتبہ پھر عینی کو لاجواب کردیا تھا۔ وہ بندیا کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی مگر بے بس اتنی تھی کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہی تھی۔

''بہت مکار ہو تم ماں بیٹیاں...... شامی اور ذی کے کان بھر رکھے ہیں میرے خلاف، ذیشان آتے ہیں تو انہیں بتاتی ہوں۔'' جب کچھ اور نہ سوجھا تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھی۔ بندیا اس کی بکواس پر اور بھی سیخ پا ہوگئی تھی۔

''جھوٹی تو آپ خود ہیں عینی بھابی......! جو مرضی کہہ دیں ذیشان بھائی سے...... میں نہیں ڈرتی ورتی......'' اس نے حلق پھاڑ کر ایک مرتبہ پھر عینی کو لاجواب کردیا تھا۔ یعنی بندیا کے اطوار نے اسے متوحش کردیا تھا۔ آج تو وہ اس کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ پہلے کی طرح ڈرنے، دبکنے کے بجائے مقابلے پر اتر آئی تھی۔ عینی کا منہ کچھ اور کھل گیا تھا۔ یقیناً ذی شاہ اور شامی کی سپورٹ پا کر وہ اتنی بہادر اور منہ پھٹ بنی ہوئی تھی کہ عینی کو ایک مرتبہ پھر ذی شاہ پر بھی تاؤ آگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ذی کی سپورٹ نے بندیا کو اتنا دلیر کر رکھا ہے۔

''میں تم تینوں کو گھر سے نکلوا دوں گی۔'' عینی کی آخری حد بس یہیں تک تھی۔ وہ فوراً اپنی اوقات پر اتر آتیں۔ ہمیشہ لڑائی میں اختتام تک آتے، آتے وہ آخری ہتھکنڈا ضرور استعمال کرتی تھیں۔ اپنے تئیں عینی نے بندیا کا منہ بند کروا دیا تھا مگر بندیا کا منہ بھلا بند ہوسکتا تھا۔ اس کے جواب نے عینی کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔

''عینی بھابی! سنبھال کر رکھیں اپنی گندی زبان کو... اور اتنی اونچی اڑان بھی مت بھریں کہ واپس آنے میں دشواری ہو...... ہمیں آپ کس برتے پر نکالیں گی۔ اس گھر میں ذی شاہ بھائی اور شامی کا بھی حصہ ہے۔ ہم آپ کے گھر میں نہیں رہتے...... ڈیڈی کے بعد اپنے بھائیوں کے گھر میں رہتے ہیں۔ ڈیڈی کے بزنس میں بھی شاہ بھائی اور شامی برابر کے حصے دار ہیں۔ ہم آپ کے شوہر کی خیرات نہیں کھاتے۔ آئندہ سوچ سمجھ کر بولیے گا۔ میں ذی شاہ بھائی کو آپ کی بکواس کا سلیس ترجمہ سنا دوں گی۔'' بندیا کے مفصل جواب نے اسے حواس باختہ کردیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بندیا جیسی ڈرپوک اور دبو لڑکی کے سامنے لاجواب ہونا پڑے گا۔ مارے اہانت اور غضب کے وہ لال انگارہ ہوگئی تھی۔ بندیا کی بک بک نے اس کا فشارِ خون بلند کردیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ الٹے ہاتھ کے دو چار اس کے منہ پر لگا دے مگر یہ سب وہ محض سوچ سکتی تھی اس پر عمل نہیں کرسکتی تھی۔ وہ جو اپنی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی مزید منہ کی کھا کر غضبناک ہوگئی تھی۔ اسے بندیا کو کرارا سا جواب دینا تھا۔ جسے سن کر اسے آگ لگ جاتی۔ کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد دروازے سے چپکی تھر تھر کانپتی مالا کو دیکھ کر اس نے انتہائی زہر میں بجھے الفاظ منہ سے باہر نکالے تھے۔

''بہت لمبی زبان ہے تمہاری...... سسرال جاؤ گی تو کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ پھر یاد رکھنا، تمہارا انجام بھی مالا سے الگ نہ ہوگا۔ اس کی طرح اجڑ کر ہمارے سروں پر سوار ہو جاؤ گی۔'' عینی اپنی کہی زہریلی باتوں سے ٹھیک طرح لطف بھی نہ لے پائی تھی جب ذی شاہ کی دہاڑ نے اس کے حواس گم کردیے تھے۔ ذی شاہ اچانک گھر آگیا تھا۔ وہ بالکل دبے قدموں گھر میں داخل ہوا تھا۔ یقیناً اس کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی اور وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تو عینی کو اس کے میکے تک چھوڑنے کے لیے دوبارہ گھر آیا تھا۔ دراصل اسے جواب دے کر اس کا ضمیر خاصا بوجھل ہوگیا تھا۔ فطرتاً وہ صاف نیت کا بندہ تھا پھر بڑی بھابی کا یہ معمولی سا کام اتنا بڑا بھی نہیں تھا جو وہ دوٹوک انکار کر آیا تھا۔ کچھ ذیشان

کے حوالے سے عینی قابلِ احترام تھی۔ بس انہی نزاکتوں کو سوچتا وہ واپس گھر آیا تھا جب اچانک عینی کی بکواس کو سن کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ یقیناً بندیا اور عینی کے درمیان تکرار ہو رہی تھی مگر تکرار کی نوعیت اتنی فضول اور بے ہودہ ہوگی یہ ذی شاہ نے ہرگز نہیں سوچا تھا۔ عینی کے الفاظ نے اسے مشتعل کردیا تھا۔ وہ اس کی بہنوں کے بارے میں اتنا غلط اور غلیظ سوچتی تھی یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''بہت خوب، بہت اعلیٰ۔'' ذی شاہ نپے تلے قدم اٹھاتا عینی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دوٹوک کٹیلے الفاظ نے عینی کو حواس باختہ کردیا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گئی تھی...... اور گھبرا تو ممی کے ساتھ بندیا بھی گئی تھی۔

''آپ میری بہنوں کے لیے اتنا بہترین سوچتی ہیں عینی بھابی...! آج سے پہلے میں جان ہی نہیں سکا۔'' ذی شاہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے بھینچے لہجے میں بلا کا غیض ابل رہا تھا۔ عینی کی تو روح فنا ہوگئی تھی۔

''میری باتیں تم نے سن لی ہیں۔ بندیا کی بکواس نہیں سنی۔'' وہ خاموش رہ کر خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنا تھی، ذی شاہ کی بدگمانی دور کرنا تھی۔ وہ اسے ہاتھوں سے نہیں نکالنا چاہتی تھی۔ عینی کی جلد بازی نے بنا بنایا معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ زبان سے نکلے الفاظ اگرچہ واپس نہیں آسکتے تھے تاہم وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ذی شاہ کی بدگمانی کم ضرور کرسکتی تھی۔

''مجھے جو سننا تھا سن لیا...... آپ کی سوچ اور ذہن کی گندگی جان کر بڑا افسوس ہوا ہے، تاہم آپ کی اصلیت واضح ہوگئی۔ سو یہ اچھا ہی ہوا۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر عینی کو مزید بولنے سے روک دیا تھا۔ اسے مزید کوئی وضاحت یا صفائی نہیں چاہیے تھی۔ تبھی عینی پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے رونے دھونے والا حربہ استعمال کرنا شروع کردیا...... وہ ہر صورت ذی شاہ کے دل پر اچانک جمنے والی میل کو کھرچنا چاہتی تھی۔

''ذی......! بندیا بہت بدزبان ہے، یقین کرو، مجھے اتنا کچھ......'' وہ تیز لہجے میں بولتی ہوئی اچانک رک گئی تھی۔ ممی کی مداخلت نے اسے مزید بولنے نہیں دیا تھا۔

''یہ تو روز کا قصہ ہے بیٹا! تم کب تک عدالت لگاؤ گے۔ جانے دو، اب تو عادت ہوچکی ہے۔'' وہ مالا اور بندیا کو لے کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ممی اس لمحے کتنی اداس، ویران اور تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ گویا مردوں کی غیر موجودگی میں گھر کا ماحول ایسے ہی تکلیف دہ، پُراذیت ہوا کرتا تھا۔ عینی کو بھلا کیا پروا ہوسکتی تھی۔ وہ آگ لگا کر میکے چلی جاتی تھی یا سیر سپاٹوں پر نکل جاتی۔ اس کا تو یہ معمول تھا۔ عینی نے اسی طرح بدزبانی کے جوہر دکھا کر سب پر تسلط قائم کر رکھا تھا۔ پہلے پہل بندیا بھی ممی کی طرح چپ کی بکل اوڑھ لیتی تھی۔ عینی کی ہر زیادتی پر خاموش رہتی مگر پھر آہستہ، آہستہ عینی کا بڑھتا دباؤ محسوس کر کے اس نے بھی کھرے کھرے جواب دینے شروع کردیے تھے۔ ورنہ عینی تو ان کی ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ بلاوجہ اسے کچن میں گھسا دیتی۔ نوکروں کی موجودگی میں بھی اس سے فضول کام کرواتی، کپڑے دھلواتی، استری کرواتی، یہاں تک تو ٹھیک تھا، اس نے ذرا کام خراب ہونے پر اس کی بے عزتی بھی کرنا شروع کردی تھی پھر وہ بے ضرر سی مالا کو بھی بے نقط سناتی تھی۔ جب اس نے مالا پر طنز کرنے اور اسے ایذا دینی شروع کی تھی تب سے بندیا بھی عینی کو دوبدو جواب دینے لگی تھی۔ مالا نے پلٹ کر کچھ کہا جو نہیں تھا۔ تبھی عینی سر چڑھتی جا رہی تھی۔ اب چونکہ بندیا کو دونوں بھائی خود سپورٹ کر رہے تھے تب سے وہ خاصی دلیر ہوگئی تھی۔

اُدھر ذی شاہ کے لیے عینی کی بدزبانی ہضم کرنا سہل نہیں تھا۔ عینی کو مزید کچھ کہے بغیر وہ واپس آفس آ گیا تھا مگر اس نے ذیشان سے اپنی ٹینشن ضرور شیئر کی تھی۔ وہ اسے گھر کے ماحول سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر ذیشان کے الٹے جواب نے کچھ پل کے لیے اسے متحیر کر دیا تھا۔

"وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہے یار! تبھی بندیا کو کچھ کہہ دیا ہوگا۔ بڑی بھابی ہے، بندیا کو ذرا کچھ کہہ دیا تو کیا ہو گیا؟ بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔" ذیشان نے بڑے سکون سے بیوی کے ڈپریشن پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ ذی شاہ قدرے ہونق سا اپنے بدھو بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی سُدھ بُدھ عینی سے بیاہ کے بعد کھو چکی تھی۔ اس کی ساری بکواس ذیشان کے سر پر سے گزر چکی تھی اور وہ آرام سے عینی نامہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم نے بھی تو معاملہ لٹکا رکھا ہے، کچھ اپنے بارے میں بھی سوچ لو...... تبھی عینی کی ٹینشن بھی ختم ہو گی۔" ذیشان گھما پھرا کر مطلب کی بات تک آ گیا تھا۔ وہ تو کب سے موقع کی تلاش میں تھا۔ کب یہ ذکر چھڑے اور کب وہ عینی کی تمنا ذی شاہ کے کانوں میں انڈیلے۔ بیوی کا ڈپریشن اسے نظر آتا تھا۔ معصوم بہن کی اجڑی صورت اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ تھے خون کے رشتے، خود غرضی میں لپٹے ہوئے...... وہ ذیشان کو ہزار مرتبہ بتا چکا تھا۔ جب تک مالا کی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا تب تک وہ ہرگز بھی شادی، منگنی کے جھنجٹ میں پڑنے والا نہیں تھا...... مگر ذیشان کی بک بک کے تار پھر عینی کے ڈپریشن سے جُڑتے ہوئے اس کی منگنی پر آ پہنچے تھے۔ وہ ذیشان کو کس طرح سمجھاتا......؟ کس طرح مطمئن کرتا؟ وہ بغیر کسی بدمزگی کے دوٹوک انکار کرنا چاہتا تھا مگر سمجھ نہیں آتی تھی بات کا آغاز کیسے کرے...... اِدھر ذیشان نے اپنی تان لگا رکھی تھی۔

"دیکھو یار......! شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر ٹال مٹول سے کام کیوں لے رہے ہو...... آنیہ میں کمی کیا ہے؟ پھر اپنے رشتے دار بھی ہیں۔ عینی کی خواہش ہے......" ذیشان ابھی بہت میٹھے لہجے میں گفتگو کا آغاز کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا جب ایک دم ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا...... وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ویسے بھی وہ ذیشان کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ اس سے امیدیں وابستہ کر رہے تھے جبکہ وہ آنیہ تو کیا کسی میں بھی انٹرسٹڈ نہیں تھا اور نہ ہی شادی کی فی الحال خواہش رکھتا تھا۔

"مجھے فی الحال نہ منگنی کرنی ہے نہ شادی......" ذی شاہ نے دوٹوک لہجے میں انکار کر دیا تھا۔ "اور آنیہ کے ساتھ تو بالکل نہیں...... میرا اور آنیہ کا مزاج ہی نہیں ملتا......" اس نے بھی آج صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ذیشان کی رنگت پل پل بدل رہی تھی، وہ ہکا بکا اپنے چھوٹے بھائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے ذی شاہ سے ایسے کھرے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ذی شاہ آنیہ کے لیے انکار کر دے گا۔ وہ تو اپنے تئیں تمام معاملے نمٹا چکا تھا۔ سب کچھ طے کیے ہوئے تھا۔ اسے تو صرف آگاہ کرنا تھا مگر ذی شاہ نے تو بازی ہی الٹ دی تھی۔ ذیشان کو بھلا غصہ کیوں نہ آتا۔

"مزاج تو شادی کے بعد مل ہی جاتے ہیں۔ تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟" بہت سنبھل کر ذیشان نے تیز لہجے میں پوچھا تھا۔ ذی شاہ کو امید نہیں تھی وہ اس کے انکار پر بھی جرح کرنے لگے گا۔

"بس میں آنیہ کے لیے اس انداز میں نہیں سوچ سکتا۔" ذی شاہ نے نہایت ناگواری سے بہ مشکل جواب دیا تھا۔ وہ اسے کس چیز کا احساس دلانا چاہتا تھا اور ذیشان بات کو کسی اور طرف گھما پھرا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھریلو ماحول کی کشیدگی کو وہ ذی شاہ

کی شادی کے سلسلے سے منسوب کر رہا تھا۔ اسے بہنوں سے بھی زیادہ سالی کی فکر کھا رہی تھی...... نہ بیمار بہن کی پروا تھی۔ نہ چھوٹی بہن کی شادی کے لیے متفکر تھا۔ فکر تھی تو بس لاڈلی بیگم کی نازک اندام بہن کی...... ذی شاہ کا دل کچھ اور بھائی کے رویّے سے کھٹا پڑ گیا تھا۔

"تو اب سوچ لو......" ذیشان اسے اکسا رہا تھا۔ کچھ لہجے کو نرم کر کے اس کا دل موم کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ذی شاہ کا دل موم کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کی رہ گزر سے کسی کو گزرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

"مجھے فی الحال اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچنا...... پہلے مالا اور بندیا کے لیے سوچوں گا۔" اس نے دوٹوک انداز میں ذیشان پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا مگر چونکہ ذیشان نے آنکھیں اور کان بند کر رکھے تھے سو وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب بھی اس کے انکار کی اصل وجہ پر توجہ دیے بغیر وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ یقیناً وہ اس انکار کو انا کا مسئلہ بنا رہا تھا...... اور عینی نے بھی اسے ذی شاہ کے انکار کو سن کر بعد والی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے ہی تیار کر دیا تھا۔

"یعنی تم انکار کر رہے ہو؟" ذیشان نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور اکھڑ نظر آنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے قدرے تحمل سے کہا۔

"یقیناً میں انکار ہی کر رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں بھی خاصی ناگواری تھی۔ اسے ذیشان کے اکھڑ تیور بہت برے لگ رہے تھے۔ وہ کیونکر اپنے فیصلے اس پر ٹھونس سکتا تھا۔ پھر جب اس نے واضح لفظوں میں انکار کر دیا تھا تب اس کا اصرار فضول تھا۔

"تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے......" ذیشان نے بھینچی آواز میں تلخی سے کہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے لگا تھا۔ یقیناً وہ بہت غصے میں تھا۔ اب اسے اگلے لائحہ عمل کی فکر تھی۔ چونکہ ایک بات تو طے تھی کہ وہ ذی شاہ کو دھمکا کر بھی آنیہ سے منگنی پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ ذی شاہ اس کی پلاننگ پر چاروں شانے چت گر جائے گا۔

"میں اپنے ساتھ اچھا کروں یا برا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ذی شاہ نے فائل پر نگاہ جما کر ذیشان کو رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف رکا تھا بلکہ پلٹ بھی آیا تھا۔

"یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا۔" ذیشان نے چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا تب وہ تلخی سے سر جھٹک کر زہرخند ہوا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" ذی شاہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اسے بھائی سے ایسی بکواس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ غضبناک تیور لیے اسے گھور رہا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" ذیشان سرخ آنکھیں لیے اسے گھورتا ہوا دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتا باہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ بے بس سا بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا پھر اس نے سر جھٹک کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی تھی۔ اسے ذیشان کی بکواس پر کڑھنا نہیں تھا مگر وہ اس کی سوچوں کو منتشر ضرور کر چکا تھا۔ اب اس کا خاک کام میں دل لگنا تھا۔ اپنے گھریلو حالات کو سوچتا وہ مالا کے لیے بہت رنجیدہ ہو رہا تھا اور ابھی مالا کے لیے اس نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا...... جو...... اب ذیشان اور عینی نے نیا محاذ کھول لیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا ذیشان کو عینی نے اپنی باتوں میں لگا رکھا تھا۔ اور وہ بھی بیوی کی بتائی ایک، ایک لائن کو پوری جانفشانی کے ساتھ دُہراتا تھا مگر چونکہ ذی شاہ ان دونوں کی نیت کا کھوٹ سمجھ چکا تھا سو وہ قیامت تک بھی ذیشان کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔

(باقی آئندہ)



اندھیرے اجالے

شاہدہ ملک

اگر چہ ہم چاروں کی دوستی مقابلے کی بنیاد پر تھی مگر میرا اور مسز ریحان کا کانٹے کا مقابلہ تھا۔ ہم چاروں اپنی، اپنی پریشانیاں کبھی ایک دوسرے سے شیئر نہیں کرتی تھیں مگر خوشیوں اور مالی آسودگی کی تفصیل بڑھا چڑھا کر بیان کرتیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے اندر سچائی اور خلوص کی کمی تھی جبکہ حسد اور جلن کا مادہ زیادہ تھا جو اس مادیت پرست دور کی بہت بڑی دین ہے۔

اگر مسز فراز کبھی اپنے ملتان کے مربعوں کی آمدن کی تفصیل بیان کرتیں تو ہم لوگ دل مسوس کر رہ جاتے۔ ہمارے میاؤں کی تو صرف لگی بندھی تنخواہیں تھیں اور جو کبھی مسز قاضی اپنی نئی جیولری کی قیمت بتاتیں تو ہم قصداً اس میں نقص نکالتے۔ کلب ہو یا جم، ہماری گفتگو انہی چیزوں کے گرد گھومتی رہتی۔

میں اپنے بھتیجے اور ہونے والے داماد کی خوب صورتی، لیاقت اور جاب کا ذکر کرتی تو باقی سب کا جو حال ہوتا وہ ایک طرف مگر مسز ریحان کا اتنا سا منہ نکل آتا اور جو مسز ریحان ہر سال گاڑی کا ماڈل تبدیل کرتیں تو میں دنوں اداس رہتی۔ اس مقابلے کی فضا نے میرے گھر کے ماحول کو آج کل شدید مکدّر کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

آج پھر کرنل صاحب ناشتا کیے بغیر چلے گئے تھے اور میں نوکروں پر گرج برس کر اپنا غصہ نکال رہی تھی۔

”توبہ ہے، آج کل کے مرد مجال ہے بیوی کی بات کو سمجھ جائیں۔ اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں جبکہ عقل ان کی گھٹنوں میں ہوتی ہے اور یہ فوجی (معذرت کے ساتھ) ان کی عقل تو بس......“ اتنی سی تو بات کی تھی کہ شادی کی تقریب پیلس میں رکھیں گے۔

”دماغ خراب ہے تمہارا جانتی ہو پیلس کے میرج ہال کا کرایہ کتنا ہوگا؟“ وہ تو یہ بات سن کر ہی بھڑک اٹھے تھے۔

”تو کیا ہوا؟ سب ہی کرتے ہیں۔ ہمیں بھی سوسائٹی میں عزت رکھنے کو کرنا ہوگا۔“

”سب کون؟ ہمیں اپنی جیب دیکھنی ہے نہ کہ سب کی حیثیت......“

”ہماری جیب کو کیا ہو گیا ہے، دیکھ لیں ابھی دو ماہ پہلے آپ کے کزن ریحان کی بیٹی کی شادی ہوئی تو انہوں نے......“

”جانتا ہوں، جانتا ہوں مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“ قائل ہونے پر خود مجھے خاموش کرا دیا۔

”اگر جانتے ہیں تو خواہ مخواہ چخ چخ کیوں کر رہے ہیں سیدھی طرح سے پیلس کی بکنگ کروائیں۔“

”میں بکنگ کی بات نہیں کر رہا...... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جس دن اس کی گردن پھنس گئی پھر چھڑانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔“ انہوں نے کزن کے خوفناک مستقبل کا نقشہ کھینچا۔

”میں یہ فضول قسم کی تقریر نہیں سننا چاہتی، بس ہم بکنگ پیلس میں ہی کروائیں گے۔“ میں جانتی تھی کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے سو ٹوک کر حتمی فیصلہ دے دیا تھا۔

☆☆☆

میرے بھتیجے اور ہونے والے داماد روشان نے لندن سے ایم بی اے کی ڈگری لی تھی اور چھ ماہ سے پاکستان میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا تھا۔ اس کے آتے ہی میں نے تیاریاں شروع کر دی تھیں اور زور شور سے ان کی تفصیل بھی اپنی دوستوں میں وقتاً فوقتاً بتاتی رہی تھی۔ ابھی شادی چند ماہ بعد ہونا تھی۔ جب مسز ریحان نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی فضا ریحان کی شادی کا کارڈ لے کر آئی تھیں۔ شادی سے چند دن پہلے انہوں نے ہمیں اس فرنشڈ کوٹھی کا وزٹ کرنے کی دعوت دی جو فضا کو جہیز میں دی جا رہی تھی اور ہم سب دنگ ہی رہ گئے۔ اس قدر قیمتی فرنیچر، بہترین

اور امپورٹڈ کراکری، اعلیٰ قسم کے ڈیکوریشن پیسز سے مزین وہ پُرشکوہ کوٹھی دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کررہی تھیں۔

شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے بعد میں بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ بارات کے لیے پیلس کا میرج ہال بک کیا گیا تھا۔

دولھا کو سلامی میں ہنڈا سوک، اس کی بہنوں اور ماں کو سونے کے بھاری سیٹ دیے گئے تھے۔ فضا کا شادی کا جوڑا پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اسے شہر کے بہترین ڈیزائنر نے تیار کیا ہے۔ اس پر قیمتی ڈائمنڈ بیڈز کا جو کام کیا تھا وہ بھی بہت یونیک تھا۔ مزید کسر بھاری اور جدید زیورات کے ڈیزائن نے پوری کردی تھی۔

میں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جو کچھ تیار کررکھا تھا، مجھے اس کا ازسرِنو جائزہ لینا پڑا تھا اور نتیجتاً روزانہ کی چپقلش میرے گھر کا معمول بن چکی تھی۔

☆☆☆

آج میں کچھ مطمئن تھی۔ اصل میں پہلے کے حساب سے جو زیورات میں نے بنوائے تھے، مجھے اب وہ بھی ناکافی لگنے لگے تھے۔ سو میں نے دو نئے سیٹ آرڈر کردیے تھے۔ کرنل صاحب لنچ پر آئے تو اسی وقت جیولر کا فون آگیا۔

''زیورات تیار ہیں، پے منٹ کر کے لے جائیں۔'' پہلے تو شوہرِ نامدار بہت برانگیختہ ہوئے پھر میں نے انہیں سو دلیلیں دے کر قائل کر ہی لیا کہ ہمیں اپنی بیٹی کو اسی شان و شوکت سے رخصت کرنا ہے۔ جس سے مسز ریحان نے اپنی بیٹی کو بیاہا ہے۔

اب ساری زندگی اچھا کھایا، اچھا پہنا......کبھی زیادہ بچت کی میں نے بھی کوشش نہیں کی تھی سو وہ مجھے سمجھانے لگے کہ اس قدر کی گنجائش کہاں سے نکال سکتے ہیں ہم ......فوری طور پر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تو میں نے انہیں کنونس کرنے کی کوشش کی کہ ہمیں بینک سے لون لے لینا چاہیے۔ ناچار وہ مان گئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میری بیٹی راحیلہ نے اپنی دوست انسا کو فون کر کے بلوایا تھا تاکہ اس کے ساتھ شاپنگ پر جاسکے مگر وہ اپنے ساتھ بیٹے کو بھی لے آئی تھی۔

''بیٹا یہ منا آپ کو کیا شاپنگ کرنے دے گا؟'' میں نے تشویش سے کہا۔

''آنٹی وہ آپ کی ماسی شمیم کہاں ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے اس کے پاس چھوڑ جاؤں گی۔''

''مگر وہ تو چھٹی پر ہے آج .... اگر یہ روتا نہیں ہے تو پھر میرے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔'' ناچار مجھے کہنا پڑا تھا۔

''ارے نہیں، یہ بالکل تنگ نہیں کرتا......بس ٹی وی لگا کر کچھ کھانے کو دے دیں یہ جگالی کرتا رہے گا۔'' اس نے ہنس کر کہا تھا۔

''اچھا یہ بات ہے تو اِدھر بٹھا دو اور فریج سے چاکلیٹس وغیرہ نکال کر پلیٹ میں رکھ دو۔'' میں لاؤنج میں کشن سے ٹیک لگائے چینل سرچنگ کررہی تھی۔ آج کل ٹی وی دیکھتے ہوئے میرا یہ دیکھنا مشغلہ تھا کہ کسی اینکر یا آرٹسٹ نے کیا سوٹ پہن رکھا ہے۔ قانونی ماہرین سے مشوروں کا پروگرام چل رہا تھا مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ہوسٹ کا چمکتا دمکتا سوٹ مجھے ہاتھ روکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

''میرے پیرنٹس نے مجھے بھاری جہیز، گاڑی اور زیورات جو کیش سمیت دیے تھے ان پر سسرال والوں نے قبضہ کرلیا ہے اور مجھے بھی گھر سے نکال دیا ہے۔ کیونکہ ان کے مطالبات شادی کے بعد مسلسل بڑھ رہے تھے اور میرے والدین ان کی ڈیمانڈز مزید پوری نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں اپنے سامان کی واپسی کے لیے عدالت سے کیسے رجوع کرسکتی ہوں جبکہ میرے پاس کوئی پروف بھی نہیں ہے۔'' یہ آواز تو میں ہزاروں میں بخوبی پہچان سکتی تھی پھر لائیو کال کے ساتھ اسکرین پر جگمگاتا فضا ریحان کا نام تھا۔ اتنا تو مجھے پتا تھا کہ فضا ان دنوں میکے میں ہے مگر اس کی وجہ کوئی ناچاقی ہوگی یا حالات اس نہج پر ہوں گے اس کا میں نے سوچا نہ تھا ایسا کسی کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند ماہ پہلے مسز ریحان نے اپنی بیٹی کو جس طرح رخصت کیا تھا اس پر ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے تھے مگر میں ایک مرتبہ پھر سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

مسز ریحان آج کل کلب اور جم سے بھی مسلسل غیر حاضر تھیں۔

☆☆☆

میری سوچ کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ کیا میں جو کررہی ہوں وہ میری بیٹی کی خوشیوں کا ضامن ہوگا۔ چند دن سے میرا ذہن ہاں یا نہیں کے درمیان گھن چکر بن گیا تھا۔ میں یہ سب کیوں کررہی ہوں...خوشیاں مال و دولت سے مشروط نہیں ہوتیں......اتنا تو مجھے علم ہو چکا تھا۔

''بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے۔'' ملازمہ کارڈلیس ہاتھ میں لیے آرہی تھی۔

''مسز ممتاز کچھ سنا آپ نے؟'' دوسری طرف مسز قاضی تھیں۔

''کیا......؟''

''ریحان صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، وہ اسپتال میں ہیں۔''

''کیا......؟'' میں ان کی بات سن کر چکرا گئی۔

''آج ہی مسز فراز نے فون کر کے مجھے بتایا ہے۔''

''مسز قاضی کوئی پرابلم چل رہی تھی کیا......؟''

''ارے ہاں، ان کا تو سب کو پتا ہے کہ کرپشن کے ماہر تھے۔ چند ماہ پہلے کوئی لمبا ہاتھ مارا اوپر سے انکوائری شروع ہوگئی.... لگتا ہے اس معاملے کو انہوں نے دل پر لے لیا ہے۔'' مسز فراز کے انداز میں نئی خبر کا دبا دبا سا جوش تھا مگر کسی ہمدردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جانے کیوں مجھے اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

اس عارضی شان بان اور جھوٹی نمود و نمائش کی خاطر ہم کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔

''یہ کیا کیا مسز ریحان نے......!'' میں نے... بڑبڑانے والے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔ ''انہوں نے یقیناً اپنے شریکِ سفر کی زندگی، عزت، اپنی اولاد کے مستقبل اور اپنے سکون کو داؤ پر لگا دیا تھا... اور اب میں کیا کرنے چلی ہوں۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے فیصلہ کیا اور کرنل صاحب کے دفتر کا نمبر ملانے لگی انہیں یہ بتانے کے لیے کہ ہمیں کسی بینک سے لون لینے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں ورنہ تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔

غزل

لمحوں کے کرب میں ہے عکسِ جمال تیرا
خود اپنے حال سے ہی ظاہر ہے حال تیرا
نظارے کا یقیں تو ہرگز نہیں ہے مجھ کو
آنکھوں کے سامنے ہے پر خد و خال تیرا
چہرے ستم گروں کے کب ہوں گے سب پہ ظاہر
دہلیزِ وقت پر ہے ٹھہرا سوال تیرا
نامہرباں زمانہ، اپنوں کی بے وفائی
آئینہ کہہ رہا ہے، رخ پُر ملال تیرا

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، آسٹریلیا

مکمل ناول



پیامِ محبت

رتیزا اشی

"تم نہیں جانتی ثمر کتنا جینئس ہے۔ اب یہ ہماری بُک ہے ناں...... وہ اسے اٹھا کر دیکھے گا اور ایک طرف پھینک دے گا۔ کہے گا یہ بھی کوئی پڑھنے والی چیز ہے، کیا ہے اس میں جو بندہ پڑھے؟"

ثمرین حسبِ معمول اپنے بھائی کی شان میں قصیدہ گو تھی اور وہ بھی حسبِ معمول اس کی لن ترانیوں کے جواب میں ہوں ہاں میں لگی ہوئی تھی۔

اسے ابھی کالج جوائن کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا

تھا۔ وہ اور اس کی سہیلی صبا اسکول سے ہی ایک دوسرے کی فرینڈز تھیں اور اب تک کلاس فیلوز تھیں شاید اس وجہ سے اس کا دل جلد ہی اس نئے کالج میں بھی لگ گیا تھا۔ یہاں ان دونوں کی جوڑی کو ٹرائی اینگل میں تبدیل کرنے والی ثمرین تھی۔ ثمرین خاصی ڈینگیں مارنے والی اور لمبی لمبی چھوڑنے والی لڑکی تھی۔ اسے ایسی شوخ اور اوچھی لڑکیاں پسند نہیں تھیں مگر کمپیوٹر کا مضمون لڑکیوں میں صرف ان تینوں نے ہی لیا ہوا تھا اور اکٹھے بیٹھنے کی وجہ سے اسے ثمرین کی بکواسیات سننا پڑتی تھیں۔ پہلا ہفتہ تو ثمرین اس سے اس کے بارے میں سوالات کر کر کے تعارف کے مراحل طے کرتی رہی۔ اس کے بعد ثمرین تھی اور ثمر نامہ...... جتنا وقت بھی اسے ثمرین کے پاس بیٹھنا پڑتا ثمر (ثمرین کا بھائی) کی تعریفیں ہی سننا پڑتیں۔

ثمرین کو نہیں پروا تھی کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہے ٹیچر کچھ پڑھا رہے ہیں، وہ تو بس ہر وقت ثمر یہ اور ثمر وہ...... میں لگی رہتی تھی۔ اوپر سے اس کی عجیب عجیب فرمائشیں۔

''میرے گھر چلو۔''

''ثمر سے ملو۔''

''ثمر کالج آئے گا اس سے ملنا۔''

''میرے گھر چلو ثمر سے ملواؤں۔''

وہ ثمرین کی ان فضول فرمائشوں سے بہت چڑتی مگر خاموش رہتی کیونکہ وہ امن پسند لڑکی تھی کسی سے بدزبانی کرنے سے گریز کرتی تھی اور ثمرین کو وہ طرح طرح کے بہانے بنا کر ٹالتی آ رہی تھی۔

اس وقت بھی سر پڑھا رہے تھے اور ثمرین اپنے بھائی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔

''اتنا شرارتی ہے میرا بھائی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں...... تم ملو اس سے تو تمہیں پتا چلے...... ایسا کرو آج چھٹی کے بعد میرے گھر چلو...... وہ آج کل گھر آیا ہوا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملواتی ہوں۔''

''میں گھر سے پوچھے بغیر کہیں نہیں جاتی، گھر سے پوچھ لوں پھر چلوں گی۔'' اس نے ایک بار پھر ٹالا۔

''اس میں بھلا گھر والوں سے پوچھنے کی کیا بات ہے؟'' ثمرین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

اسی وقت پیریڈ اوور ہونے کی بیل بج اٹھی اور اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

اگلی کلاس لینے کے لیے وہ ابھی جا ہی رہی تھی کہ جب اسے سیڑھیوں سے ایک لڑکا اترتا دکھائی دیا۔

''صبا! یہ بھی ہماری کلاس کا لڑکا ہے ناں......'' ذرا آگے چل کر اس نے صبا سے پوچھا۔

''ہاں۔'' صبا نے جواب دیا۔

''دیکھو...... بالکل گوری کا بچہ دکھتا ہے۔ برٹش لکس ہیں اس کے۔'' اس نے مزید رائے دی۔ ''کیوٹ سا۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

''آہم......'' صبا معنی خیزی سے کھنکاری۔

''دفع ہو......'' اس نے صبا کی کھنکار کی معنی خیزی ... سمجھ کر ڈانٹا اور پھر بولی...... ''میں نے تو صرف ایک کمنٹ دیا ہے۔''

☆☆☆

صبا اس کی کاپی سے کچھ سوالات نوٹ کر رہی تھی کہ پروفیسر صاحب نے اچانک نام لیا۔

''سمیر سجاول۔'' وہ نام سن کر بری طرح چونکی۔

''سمیر سجاول......'' اس نے نام زیرِ لب دُہرایا۔

''اُف صبا! کیا سویٹ نام ہے، کیا خوب صورت کمبی نیشن ہے، یہ نام تو لیتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے منہ میں گلاب جامن ہنی، اسٹرابیری اور نہ جانے کیا کیا سوئٹ سوئٹ چیزیں گھل گئی ہیں۔''

''دیکھ لو بھئی...... کون ہے اس سوئٹ نام والا...... اگر پسند آتا ہے تو چن لو اسے جیون ساتھی کے طور پر......'' صبا نے نوٹ کرتے ہوئے پیپر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''دفع ہو...... مجھے نہیں دیکھنا کہ کون ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے دیکھنے کی...... خوب صورت ہے یا... بدصورت...... میری بلا سے...... میں کلاس فیلوز سے شادی کے سخت خلاف ہوں یہ بات تمہیں پتا ہے۔ نفرت ہے مجھے ایسی حرکتوں کرنے والوں سے لوگ کالج پڑھنے آتے ہیں یا اپنے لیے ساتھی ڈھونڈنے۔'' اس نے دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ اس خوب صورت نام والا کون ہے۔

☆☆☆

کالج میں آئے اسے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا مگر اب بھی اس کا یہ حال تھا کہ اپنی کلاس تو کیا اپنے گروپ تک کے لڑکوں میں سے اگر کسی کا چہرہ پہچانتی تھی تو اس کا نام معلوم نہیں تھا اور اگر کسی کا نام معلوم تھا تو شکل نہیں پہچانتی تھی۔ بہت سے لڑکے تو ایسے تھے جن کا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی کلاس یا گروپ کے ہیں بھی یا نہیں۔ وجہ اس کے اصول اور ان کاموں میں عدم دلچسپی تھی۔ لڑکوں کے بارے میں معلومات رکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کا اصول تھا کہ بندہ جو بھی کام کرے جہاں بھی جائے بس اسی کام سے خود کو وابستہ رکھے۔ اس سے دائیں بائیں دلچسپیاں پیدا کرنے کو وہ لغویات میں شمار کرتی تھی۔

☆☆☆

کمپیوٹر کا پیریڈ تھا اور سر نے ٹیسٹ دے رکھا تھا۔ پیریڈ اسٹارٹ ہوئے پانچ منٹ گزر چکے تھے مگر سر ابھی تک کلاس میں نہیں آئے تھے۔ اور ثمرین...... بھی...... مسلسل اس کا دماغ چاٹ رہی تھی۔

''یار مجھے بتاؤ، تم کب چل رہی ہو ہمارے گھر......؟'' ثمرین نے آج پھر فرمائش داغی۔

''چلو آج چلتی ہوں۔'' اس نے سوچا کہ گھر فون کر کے بتا دے اور صبا کو ساتھ لے کر ثمرین کے گھر چلی جائے گی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' ثمرین نے فوراً کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''مگر ثمر تو لاہور گیا ہوا ہے۔''

اس کے تو جیسے آگ لگ گئی مگر خاموش رہی اُدھر ثمرین پھر سے اپنے بھائی کی ذہانت اور قابلیت بیان کرتے ہوئے زمین آسمان ایک کر رہی تھی تب ہی سر آگئے اور آتے ہی اسے صبا اور ثمرین کے درمیان سے اٹھا کر دو ٹیبل چھوڑ کر پیچھے لے آئے۔

تیسری ٹیبل پر بیٹھے تین لڑکوں میں سے دو کو اٹھا دیا اور اسے درمیان والی کرسی چھوڑ کر سائڈ والی پر بٹھا دیا۔ اسی طرح درمیان کی سیٹیں خالی کروا کے باقی لڑکوں کی بھی سیٹیں تبدیل کروا دیں۔

''اُف...... صبا اور ثمرین اچھی رہیں جو کناروں بیٹھی تھیں، مجھے کدھر سر نے لا کر لڑکے کے ساتھ بٹھا دیا ہے۔ اس نے کوفت سے سوچا اور سر جو ٹیسٹ دے رہے تھے وہ سوالات نوٹ کرنے لگی۔ اس نے نہیں دیکھا کہ وہ کس کے ساتھ ٹیبل شیئر کر رہی ہے۔

وہ پوری توجہ سے لکھ رہی تھی۔

سر کلاس سے باہر نکل گئے تھے۔

''اوئے شیزی! نیٹ ورک اسٹینڈرڈز کیا ہیں؟'' اس کے ساتھ جو لڑکا بیٹھا تھا اس نے اگلی ٹیبل پر بیٹھے لڑکے سے پوچھا۔

اس نے محسوس کیا کہ اسے بولنے میں تھوڑا مسئلہ ہے...... الفاظ کی ادائیگی وہ مہارت اور درست طریقے سے نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اس کے بولنے کا انداز بہت پیارا لگا اسی لیے وہ گردن گھما کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور چونک گئی یہ تو وہی لڑکا تھا جسے دیکھ کر پہلی نظر میں ہی اس کے لیے کیوٹ کا لفظ ذہن میں آیا تھا۔ صبا نے بھی اس کے بارے میں کہا تھا کہ

خاصا نائس ہے اور وہ اس دن سے صبا کو چھیڑ رہی تھی۔ اس کا اکثر ہی اس لڑکے سے سامنا ہو جاتا تھا۔ کبھی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے، کبھی کلاس روم سے نکلتے یا داخل ہوتے تو کبھی کینٹین میں...... یہ اور بات کہ دونوں ہی کترا کر ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہوئے نکل جاتے تھے بغیر کوئی بات کیے اور وہ پھر صبا سے یہ بات کہنا اور اسے چھیڑنا نہ بھولتی تھی۔

اب بھی اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں یہی شرارتی خیال آیا تھا کہ صبا کے ساتھ سر نے زیادتی کر دی ہے۔

''مجھے خود نہیں پتا...... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ کیا ہیں۔''

اس کیوٹ کے سوال کے جواب میں شہزاد المعروف شیزی نے کہا۔

''ڈی فیکٹو اینڈ ڈی جیور......'' اس نے فوراً بتایا۔ جواباً اس کیوٹ نے اس کا شکریہ ادا کرنا تو دور اس کے اس طرح بتانے پر اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ یوں جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ اسے خاصی توہین محسوس ہوئی۔ وہ غصہ ضبط کر کے اپنا پیپر کرنے لگی۔

''اوئے...... کیا لکھا ہے تم نے نیٹ ورک اسٹینڈرڈز کے بارے میں؟'' شہزاد نے تھوڑی دیر کے بعد اس کیوٹ سے پوچھا۔

''میں نے ڈی فیکٹو اینڈ دی جیورز لکھ دیے ہیں۔'' اس لڑکے نے جواب دیا۔

وہ حیران رہ گئی کہ اس لڑکے نے اس کی بات صرف سنی ہی نہیں تھی بلکہ لکھی بھی تھی۔ اس نے اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی پھر سر آ گئے اور سب کو واپس ان کی اپنی اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ بھی صبا کے لیے دل میں کئی شرارتی فقرے لیے واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔

سر اسٹوڈنٹس سے ٹیسٹ پیپرز لے کر بدلنے لگے۔ ایک کا ٹیسٹ دوسرے کو اور دوسرے کا ٹیسٹ تیسرے کو دے رہے تھے اور اس بار بھی سر نے ثمرین کا ٹیسٹ صبا کو اور صبا کا ٹیسٹ ثمرین کو دیا اور اس کا ٹیسٹ لے کر نہ جانے کسے تھما دیا اور اسے جو ٹیسٹ پیپر لا کر دیا اس پر لکھا نام دیکھ کر وہ چونک گئی۔

☆☆☆

''لو اب سوئٹ، سوئٹ نام والے کی سوئٹ سوئٹ رائٹنگ والا ٹیسٹ چیک کرو۔'' صبا نے اسے دھیرے سے کہا۔

''دفع ہو۔'' اس نے کہا۔

کمپیوٹر کے سر تو اکثر کہتے تھے کہ سمیر سجاول کی ہینڈ رائٹنگ بہت خوب صورت ہے اور آج اس نے دیکھ بھی لیا تھا۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ واقعی بہت خوب صورت تھی۔

''مجھے تو چلو سوئٹ، سوئٹ نام والا ٹیسٹ دے دیا ہے سر نے لیکن تمہارے ساتھ سر نے بڑی زیادتی کی وہ اپنا کیوٹ ہے ناں، اس کے ساتھ سر نے مجھے لے جا بٹھایا تھا۔'' اس نے صبا سے کہا اور صبا نے اسے دھپ رسید کی۔

سر نے سب اسٹوڈنٹس سے کہہ دیا کہ انہیں جس، جس کا ٹیسٹ تھمایا گیا ہے ایمانداری سے کل چیک کر کے لائیں۔

☆☆☆

اگلے روز کمپیوٹر کے سر ایک، ایک اسٹوڈنٹ سے ٹیسٹ لے کر اس اسٹوڈنٹ کے حوالے کر رہے تھے جس کا ٹیسٹ تھا۔ اور اس میں کارکردگی کے حوالے سے پوچھ گچھ بھی کر رہے تھے۔

''سمیر سجاول......'' سر نے اس سے ٹیسٹ پیپرز لے کر سمیر سجاول کو بلایا۔ اس نے اس کی ایک دو غلطیاں نکالی تھیں۔ سر نے جب سمیر سجاول کو بلایا تو اس نے ضروری سمجھا کہ سمیر سجاول کے ان ایک دو غلطیوں پہ ہونے والی پوچھ گچھ پہ تاثرات دیکھے کہ کہیں وہ اس قسم کا لڑکا نہ ہو کہ اس کے یوں غلطیاں

نکالنے پر وہ اس سے ضد باندھ لے اور بدلہ لینے کے لیے کوئی شیطانی حرکت سوچے۔

سمیر سجاول کے نام پر سامنے آنے والا لڑکا اسے اور صبا، دونوں کو چونکا گیا۔ جس کو کیوٹ کہہ کہہ کر وہ صبا کو چھیڑتی تھی اور صبا جس کا نام لے لے کر اس کو چھیڑتی تھی ایک ہی لڑکا نکلا تھا۔

سمیر سجاول! اس کیوٹ کا نام سمیر سجاول ہے؟'' شہرینہ نے بے یقینی سے صبا سے کہا اور پھر دونوں کچھ بولنے کے قابل نہ رہیں۔

☆☆☆

ان کا تھرڈ ائیر یونہی ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ اس دن کے بعد صبا نے اور اس نے ایک دوسرے کو سمیر سجاول کے حوالے سے چھیڑنا چھوڑ دیا تھا۔ سمیر سجاول اور کیوٹ ایک ہی لڑکا نکلنے کے بعد تو وہ ایک دوسرے کو کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں رہی تھیں بلکہ اب وہ بڑی بے فکری سے اسے ایک دوسرے سے ڈسکس کیا کرتی تھیں کیونکہ اب اگر ایک دوسرے کو چھیڑتی تو دوسری بھی جواباً چھیڑنے کا پورا حق رکھتی تھی۔

اکثر چھٹی کے بعد وہ فرسٹ فلور کے ایک خالی کلاس روم میں رک جاتی تھیں کیونکہ بہت سی لڑکیاں دور سے آتی تھیں اور وہ اس کلاس میں اپنی اپنی گاڑی کے آنے کا انتظار کرتی تھیں۔ یہ روم سڑک کے بالکل سامنے تھا سمیر سجاول بھی گاڑی سے آتا جاتا تھا اور وہ دیگر لڑکوں کے ساتھ کالج سے باہر گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی گاڑی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں جب بھی کالج میں چھٹی کے بعد رکتیں تو اکثر ہی اس شیشے کی بڑی سی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر نیچے کھڑے سمیر کو دیکھا کرتی تھیں۔ وہ اتنا کیوٹ تھا کہ اسے دیکھنا صبا اور شہرینہ دونوں کو ہی اچھا لگتا تھا۔ یوں تو کسی بھی طرح سے اسے دیکھنا مناسب نہیں تھا مگر اس طرح چھٹی کے بعد ویٹنگ روم کی کھڑکی سے نیچے دیکھنا خاصا دلفریب اور ہر طرح سے محفوظ تھا۔ اس طرح کسی کو بھی شک نہیں ہوتا تھا کیونکہ اپنی اپنی گاڑیوں کے انتظار میں اکثر و بیشتر لڑکیاں اس کھڑکی سے باہر نیچے سڑک کو دیکھتی تھیں۔ گاڑی کا انتظار نہ بھی ہو تو بھی آتی جاتی مختلف رنگوں، اور مختلف قسم کی گاڑیوں وغیرہ کو دیکھنا تقریباً ہر لڑکی کے لیے دلچسپی رکھتا ہے۔ انہیں جو بھی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ بھی سڑک کی رونق دیکھنے کو کھڑی ہیں اور نیچے کھڑا وہ کیوٹ سمیر سجاول بھی بالکل بے خبر ہوتا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کبھی وہ اکیلا ہوتا تو چپ چاپ سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتا اور کبھی ساتھ دوست ہوتے تو ان کے ساتھ گپیں لگاتا یا کچھ کھاتا پیتا۔

''کتنا کیوٹ بے بی ہے ناں...... چھوٹا سا...... کم عمر سا۔''

وہ دونوں جب اسے دیکھتیں تو اکثر ہی ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے کہتی اور دوسری اس کی مکمل تائید کرتی۔

حالانکہ سمیر سجاول کا قد چھ فٹ کو چھوتا تھا اور جسم بھی ماشاء اللہ صحت مند تھا لیکن چہرے پر اتنی سادگی، اتنا بچپنا اور معصومیت تھی کہ وہ سترہ، اٹھارہ سال سے اوپر کا نہیں لگتا تھا۔

''میرا بھتیجا!'' اسے دیکھتے ہوئے شہرینہ اکثر کبھی دل میں تو کبھی کبھی صبا سے بہت پیار سے کہتی۔ اس نے اپنے طور پر ہی اس کیوٹ کو اپنا بھتیجا مان لیا تھا اور صبا شروع شروع میں اس کی اس بات پر بہت ہنسی تھی۔

پورا سال لڑکوں میں دلچسپی نہ لینے کے باوجود بھی وہ اور صبا اتنا ضرور کہتی تھیں کہ سمیر سجاول اور شہزاد ان کی کلاس کے شریف ترین لڑکے تھے۔ ان دونوں لڑکوں نے کبھی پڑھائی سے ہٹ کر کسی اور سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ نہ کبھی کسی ٹیچر کا مذاق اڑایا تھا نہ کبھی کسی پر ہوٹنگ کی اور نہ ہی لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھا۔ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتے اور کلاس

میں پورا وقت خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ فضول قسم کی گفتگو میں ان کی آواز انہیں کبھی نہیں سنائی دی۔ نہ ہی انہیں اپنے ارد گرد ہوتی فضول سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی تھی۔

شہرینہ خود سمیرا اور شہزاد کی شرافت کی معترف تھی اور اسی وجہ سے وہ ان دونوں کو بہت احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

☆☆☆

یہ فورتھ ائیر کے بالکل شروع کی بات تھی جب شہرینہ نے نئی موبائل سم لی۔ ثمرین اور صبا نے اس کا نمبر اپنی اپنی کاپی پہ نوٹ کرلیا۔ اس کے بعد صبا نے تو ایک دو بار اسے فون بھی کیا مگر ثمرین کی طرف سے اسے کوئی فون کال کبھی نہیں آئی۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ثمرین نے اس سے اس کے گھر کا ایڈریس، لینڈ لائن فون نمبر اور پچھلا موبائل نمبر غرض سب کچھ لے رکھا تھا مگر اس نے نہ تو کبھی شہرینہ کو کوئی کال کی تھی نہ ہی اس کے گھر آئی تھی بس کالج تک ہی بات چیت تھی۔

اس دن وہ گھر میں فرصت سے بیٹھی تھی کیونکہ ہفتہ اور اتوار چھٹی کے دن تھے اور وہ بہت بے فکری سے اپنی پہلی چھٹی انجوائے کررہی تھی۔ جب ہی اس کا موبائل فون بجا۔

ویسے وہ نامعلوم فون کالز ریسیو کرنے سے گریز ہی کرتی تھی مگر صبا کبھی کبھار اسے نامعلوم نمبر سے بھی کال کرلیا کرتی تھی۔ اب اس نے صبا کا سوچ کر کال ریسیو کرلی تھی۔

”ہیلو......!“

”ہیلو......!“ دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے کچھ کنفیوز ہو کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“

”جی فرمائیں......!“ وہ بدستور کنفیوز تھی۔

”آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے سوال آیا۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ سے۔“

”ایکسکیوز می پلیز“ اسے آگ لگ گئی۔

”جی!“

”کوئی پرابلم ہے؟“ اس نے بگڑ کر پوچھا۔

”بات کریں ناں......“ دوسری طرف سے فرمائش آئی۔

”شٹ اپ......“ اس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔ اس کے بعد اسی نمبر سے دوبارہ کال آئی۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی اس کے بعد کال پہ کال آتی گئی وہ سمجھ گئی کہ کسی نے تُکّے میں نمبر ملایا تھا اور اب لڑکی کا نمبر جان کر تنگ کررہا ہے۔ اس کا علاج اس کے نزدیک یہی تھا... مکمل خاموشی۔

اس طرح کے رونگ کالرز بڑے منصوبے باز ہوتے ہیں۔ وہ کالز کرتے ہی جاتے ہیں اور لڑکی گالیاں دیتی جاتی ہے مگر وہ گالیوں سے بدمزہ ہونے والے نہیں ہوتے۔ وہ مستقل مزاجی سے کالز کرتے ہی رہتے ہیں، اس آس پر کہ لڑکی کب تک لڑے گی، کب تک غصہ کرے گی۔ کب تک گالیاں دے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے ہار مان کر دوستی کرنا ہی ہوگی اور اب یہ رونگ کالر اس کے ساتھ بھی یہی کرنا چاہتا تھا اس کے نزدیک یہی علاج تھا کہ بندہ سرے سے فون کال ریسیو ہی نہ کرے۔ آخر کار خود ہی وہ مایوس ہوجائے گا۔ جب لڑکی فون کال ریسیو ہی نہیں کرے گی کوئی رسپانس ہی نہیں دے گی تو کالر بے چارہ کیا کرے گا اور کیا کرسکتا ہے؟ اس نے فون سائلنٹ پر لگا دیا کیونکہ محترم خاصے ڈھیٹ تھے مسلسل کالز کرتے ہی جارہے تھے۔

سارا دن گزر گیا۔ رات آئی، صبح ہوئی اور پھر اگلی شام بھی آگئی مگر اس کا فون تھا کہ مسلسل بجتا چلا جارہا تھا۔

شام کے وقت وہ اپنے کمرے میں تھی جب صبا چلی آئی۔ اس نے صبا کو وہیں بستر پر بٹھالیا۔ فون تکیے پر رکھا تھا صبا اس سے باتیں کررہی تھی جب تکیے پر پڑا فون دیکھ کر بولی۔

”تم نے فون سائلنٹ پر کیوں لگا رکھا ہے؟ کال آرہی ہے اس پر۔“

اس نے گردن موڑ کر فون کی اسکرین پر ڈسپلے ہوتا نمبر دیکھا.. صبا کو دیکھا اور آرام سے ساری بات بتادی۔

”ایسی بات ہے تو بات تو کرو اس سے کہو کہ تمہیں اس طرح کالز نہ کرے۔“ صبا نے کہا۔

”دفع کرو...... کہنے سے باز آنے والے ہوتے ہیں یہ لوگ؟ ضرورت ہی کیا ہے بات کرنے کی۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”مجھے فون دو، میں بات کرتی ہوں۔“ صبا بولی۔

”چھوڑو ناں یار...... بات کرو تو اور بھی لیس ہوجاتے ہیں۔“ اس نے بدمزہ ہوکر کہا۔

”نہیں، میں جانتی ہوں ان لوگوں سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ لڑنے جھگڑنے کا تو فائدہ ہے نہ تنگ۔ بندہ شرافت سے کہہ دیتا ہے، تم مجھے فون دو۔“ صبا نے ہاتھ آگے پھیلایا۔

اس نے چارونا چار فون اٹھا کر صبا کے ہاتھ میں تھمادیا۔

”بی کیئرفل...... غلط زبان استعمال نہیں کرنا، ورنہ جواب میں تمہیں سننے کو وہ گند ملے گا جو تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ اس نے فون صبا کو تھما کر کہا۔

”بے فکر رہو۔“ صبا نے کہا اور کال ریسیو کرنے ہی لگی تھی کہ اس کا جوش سارا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”لو...... کال ہی مس ہوگئی ہے۔“ صبا نے مایوس ہوکر کہا۔

”کوئی مایوسی کی بات نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”لو......رکھ لو۔“ صبا نے فون واپس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تب ہی فون پر دوبارہ کال آنے لگی۔

صبا نے کال ریسیو کرکے فون کان سے لگایا اور بات کرنے لگی۔ صبا بہت شرافت سے اس سے فون کرنے کی وجہ پوچھ رہی تھی پھر اس نے اس کالر کا حدود اربعہ پوچھا کہ کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ نام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ......اور پھر بولی۔

”آپ سے ایک ریکویسٹ ہے، میں اس قسم کی لڑکی نہیں، میں لڑکے، لڑکی کی دوستی پہ یقین نہیں رکھتی اور نہ ہی اسلام اس فعل کی اجازت دیتا ہے۔ لڑکا، لڑکی کی دوستی کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ دوستی صرف اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہی پائیدار ہوتی ہے۔ آپ کو بھی چاہیے کہ ان ہی سے دوستی کریں۔“ صبا نے کہا۔

پھر دوسری طرف سے جواب سن کر بولی۔

”اگر آپ کے بہن، بھائی نہیں تو میں کیا کرسکتی ہوں۔“

”فارغ ہو تو کہیں جا کر خودکشی کرلو۔“ اُدھر سے پھر کچھ کہا گیا۔

”کیا؟“ دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ صبا حیران ہوئی اور بولی۔

”تم پاگل خانے فون کرو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا تمہارے لیے۔“ اس کے بعد جو جواب اسے ملا اس پر صبا نے فون کان سے ہٹا کر خاصا دور کیا اور شہرینہ کی طرف جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”یہ تو تمہارے گھر کا نمبر بھی جانتا ہے۔“ صبا کے چہرے کی رنگت اُڑی ہوئی تھی۔

”یس، یس شیور...... جہاں جی چاہتا ہے فون کرو مگر مجھے اب دوبارہ تمہاری کال نہیں آنی چاہیے۔“ پھر اس کی کسی بات کے جواب میں بولی۔

”اچھا...... کرو گے تو کب تک کرو گے؟“

”میں تم سے دوستی کبھی نہیں کروں گی۔“

”بہت پیسہ ہے تمہارے پاس جو تم اس طرح کارڈز پہ ضائع کرتے رہو گے۔“

”اس سے کہو اگر اتنا ہی پیسہ ہے تو ہزار، ہزار کے کارڈز کے نمبر ہمیں لکھوا دیا کرے کالز نہ کیا کرے۔“ شہرینہ ہنستے ہوئے بولی۔

صبا بھی ہنسنے لگی... پھر فون پر بولی۔

”آپ نے اب کال نہیں کرنی بس، ٹھیک ہے ناں!“ صبا نے فون بند کر کے رکھا اور بہت تشویش اور پریشانی سے بولی۔

”شہرینہ! یہ تو تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ میں نے کہا خودکشی کر لو تو تمہارے محلے کا نام لے کر کہتا ہے کہ وہاں چلا جاؤں خودکشی کرنے۔“

وہ چونکہ صبا کی باتوں سے یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ لڑکا اس کے بارے میں جانتا ہے اس لیے صبا کے اب اس طرح بتانے پہ اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جس اطمینان سے بیٹھی تھی اسی طرح اطمینان سے بولی۔

”تو اسے میرے گھر کا نمبر بھی معلوم ہے۔“

”ویسے کون ہے یہ؟ کہتا ہے میرا نام عمران ہے اوپن یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔“ صبا نے پریشانی سے کہا۔

”یقین کرنے والی بات نہیں۔ اتنا احمق کوئی نہیں ہوتا کہ سچائی بتائے۔“

”پھر؟“ صبا نے مزید پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”سوچنا پڑے گا۔ میرا یہ نیا نمبر میرے تمام گھر والوں تک کو نہیں معلوم جس، جس کو میں نے یہ نمبر دیا ہے سب کا مجھے علم ہے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس قسم کی حرکت کرے یا کروائے پھر بھی ہے تو ان ہی میں سے کوئی...... میں غور کرتی ہوں کہ جس، جس کو نمبر دیا ہے ان میں سے کون ہے یہ۔ پتا چل ہی جائے گا۔ تم بھی جانتی ہو کس، کس کو میرا نمبر معلوم ہے۔ تم بھی سوچو۔“ شہرینہ ...... نے صبا سے کہا۔ تب ہی اس کے فون پر میسج آیا۔

”مجھے معلوم ہے جس کا یہ نمبر ہے اس کا نام S سے شروع ہوتا ہے مجھے آپ سے نہیں S سے بات کرنی ہے۔“

اس نے بہ آواز بلند میسج پڑھا۔

”لاؤ میں لکھ دیتی ہوں میں بھی ایس ہوں۔“ صبا نے شرارت سے کہا۔

وہ ہنس دی اور پھر میسج ڈیلیٹ کر کے بولی۔

”کال ریسیو کرنی ہے، نہ میسج کا جواب دینا ہے۔ کچھ بھی نہیں مکمل خاموشی...... ابھی تو میں سوچ رہی تھی کہ سم چینج کر لوں لیکن اب نہیں...... اگر نمبر آف ہو گیا تو یہ بندہ میرا راستہ روکنا شروع ہو جائے گا۔ اسے بات کرنے کی آس پہ فون کال کے ذریعے ہی بہلا وا دو۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

وہ صبا سے پھر سے باتیں کرنے لگی۔ تب ایک اور میسج آیا جس میں اس کالر نے اس کے کالج اور کلاس اور گروپ تک کا لکھا ہوا تھا۔

”یہ کالج میں سے ہی ہو گا کوئی۔“ صبا نے کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے کلاس فیلوز کے پاس میرا یہ نمبر کیسے جا سکتا ہے اوپر سے گھر کا نمبر بھی اور یہ بھی معلوم کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ میرے محلے سے کوئی بھی لڑکا یا لڑکی میرے کالج نہیں جاتا جو میں سمجھوں کہ اس نے بتایا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے کلاس فیلوز ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے کبھی کلاس میں کوئی اوچھی حرکت نہیں کی اور نہ ایسا بناؤ سنگھار کیا کہ لڑکے میری طرف متوجہ ہوں اور مجھے غلط قسم کی لڑکی سمجھیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ میری کلاس کا کوئی لڑکا نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر......؟“ صبا نے تشویش سے کہا۔

”سوچتے ہیں یار...... ٹینشن نہ لو۔ پتا چل ہی جائے گا۔“ اس نے کہا اور بات بدل دی پھر جتنی دیر صبا بیٹھی رہی اس کے فون پر مسلسل کالز آتی دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔

”اُف کتنا ڈھیٹ ہے اور یہ بندہ فارغ کتنا ہے اسے کوئی اور کام نہیں جو کالز پہ کالز کیے جا رہا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ کر حیران ہوں، کل سے مسلسل فون بج رہا ہے، میں خود سوچ رہی ہوں کہ اسے کھانا پینا، سونا، وغیرہ، کوئی بھی کام نہیں جو مسلسل ایک ہی کام کیے جا رہا ہے اور کچھ نہیں کم از کم بندہ واش روم تو جاتا ہی ہے۔“ صبا کی بات کے جواب میں اس نے کہا اور آخری بات پر وہ دونوں ہنس دیں۔

”شہرینہ! تمہارا عاشق پیدا ہو گیا ہے۔“ صبا نے ہنس کر کہا۔

”بڑا ہی سچا عاشق ہے۔“ اس نے طنز سے کہا۔ ساتھ ہی دل میں کچھ حسرت بھی ہوئی۔ سچے عاشقوں کی وہ بڑی قدر دان تھی۔ ان کے جذبات کا بہت احترام تھا اس کے دل میں۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ آج کل کے دور میں کسی نے کسی سے سچا پیار کیا کرنا ہے۔ آج کل تو جس سے شادی ہو جائے اس تک سے لوگ مخلص نہیں ہوتے۔

☆☆☆

وہ حیران تھی کہ یہ شخص آخر کرتا کیا ہے۔ صبح چھ بجے سے وہ کالز کرنا شروع ہوتا اور جب تک وہ کالج کے لیے نکلتی نہیں تھی تب تک کالز آتی رہتیں۔ کالج جاتے ہوئے وہ فون آف کر دیتی تھی اور جب کالج سے واپسی پہ وہ فون آن کرتی تو کالز آنا شروع ہو جاتی تھیں اور رات ایک ڈیڑھ بجے تک مسلسل کالز آتی رہتیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ فون آٹو ڈائل پر لگا رکھا ہے کیونکہ اکثر اوقات جب بھی وہ فارغ ہوتی اور فون اس کے پاس ہوتا تو وہ کال ایکسپٹ کر کے فون ایک طرف رکھ دیتی تھی۔ شروع شروع میں ایسا کرنے پہ کال کچھ دیر لگی رہتی تھی مگر اس کے بعد جب اس نے جانا کہ کال ریسیو کرنے کے باوجود یہ بات نہیں کرتی تو اس نے کال ایکسپٹ ہونے پہ کال کاٹ کے پھر سے ملانا شروع کر دیتا۔ وہ کال ایکسپٹ کرتی جاتی اور وہ کاٹ کاٹ کر ملاتا جاتا۔ ایسا کر کر کے اس کا کتنا ہی پیسہ اس نے ضائع کیا تھا مگر وہ تھا کہ اسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

”پلیز دوستی کر لو۔ پلیز شہرینہ! تم مجھے غلط نہیں سمجھو، میں ٹائم پاس نہیں کر رہا، میں مخلص ہو کر تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“

شروع شروع میں وہ اس قسم کے میسج بھیجتا رہا اور پھر اس کی مکمل خاموشی پہ وہ اپنے میسجز میں تبدیلی لا چکا تھا۔ اس کے میسج اب اس قسم کے ہوتے۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں، آئی لو یو، میں ٹائم پاس نہیں کر رہا، میری محبت کو قبول کر لو، میں سیریس ہوں، پلیز مجھے جواب دو۔“

”پلیز پلیز پلیز شہرینہ! ایک دفعہ بات کر لو، صرف ایک دفعہ بات کر لو، میں تمہیں بتاؤں میں کون ہوں، میں تمہارے ہی کالج کا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں، بات کر لو ناں۔“

”میں سیریس ہوں، تم مجھے جس طرح چاہو آزما لو، آئی لو یو ریئلی۔“

اور اس قسم کے کئی میسجز جو وہ روزانہ کرتا تھا۔

☆☆☆

یہ کون تھا اس کی کنفیوژن دور ہو چکی تھی۔ یہ ثمر تھا، ثمرین کا بھائی۔ اس کے بارے میں اس لڑکے کو اتنی ہی باتیں معلوم تھیں جتنی کہ ثمرین اسے بتا سکتی تھی۔ ثمرین ہی ہر وقت بھائی کے قصیدے پڑھ پڑھ کر اسے

اپنے بھائی سے متاثر کرنے کی کوششوں میں رہتی تھی اور جب دیکھا کہ ان کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوتا تو بھائی کو ہی آگے کر دیا تھا کہ تم خود ہی اسے پٹالو۔

''ہونہہ...... کبھی مجھے دیکھا تک نہیں اور عشق کی انتہا دیکھو۔'' وہ اس کے میسجز پہ تمسخر سے سوچتی۔

وہ کبھی سوچتی کہ یہ لڑکا بہت ضدی ہے۔ وہ اس سے بات نہیں کر رہی تو اس نے بھی ضد باندھ لی ہے کہ اسے بات کرنے کے لیے مجبور کر کے ہی چھوڑنا ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر اس کا ردِعمل یہ تھا، وہ یہ سوچتی تھی۔ ''اگر تم نے ضد باندھ لی ہے کہ مجھ سے بات کر کے چھوڑنا ہے تو میری بھی ضد ہے بیٹا کہ میں بھی کبھی کسی بھی صورت میں تم سے بات نہیں کروں گی۔''

دوسرا خیال اس کے دل میں یہ تھا کہ شروع میں ضرور اس لڑکے نے فلرٹ کرنا چاہا ہے مگر جب اس نے دیکھا کہ یہ اس قسم کی لڑکی نہیں تو میرے کردار کی مضبوطی سے اتنا متاثر ہو گیا ہے کہ میرے معاملے میں سیریس ہو گیا ہے۔ اس صورت میں بھی وہ یہی سوچتی تھی کہ جب میں نے کسی سے شادی وادی کرنی ہی نہیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ سیریس ہے یا نہیں۔ مخلص ہے یا فراڈ...... جب کسی سے شادی کرنی ہی نہیں تو اس کے اخلاص کو پرکھنے کا کیا مقصد...... وہ ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کے فیوچر پلانز میں فی الحال شادی تھی ہی نہیں۔ وہ ابھی بہت کچھ کرنا چاہتی تھی اور اگلے کم از کم چار سال تک اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ چار سال بعد اگر کبھی کہیں ہوئی تو دیکھا جائے گا اپنے ان ارادوں کے باعث اگر وہ لڑکا مخلص تھا تو بھی وہ اس سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھی۔

کچھ عرصے بعد اس نے سوچا کہ ثمرین کے بھائی نے تو اسے دیکھا تک نہیں پھر وہ اس کا راستہ کیسے روکے گا۔ اسے کیا پتا کون ہے شہرینہ...... جب اس نے یہ سوچا تو بے فکر ہو گئی اور اس نے اطمینان سے نئی فون سم لے کر پہلی نکال کر رکھ دی۔

☆☆☆

اگلے روز کمپیوٹر کی کلاس میں جب وہ، صبا اور ثمرین اکٹھی بیٹھی تھیں تب اس نے ثمرین کو سنانے کے لیے ہی صبا سے کہا۔

''پتا ہے صبا! کل میں اس رانگ کالر سے اتنی تنگ آئی کہ میں نے اپنی سم نکال کر پھینک دی، اب میں نے بھائی سے سم لے کر وہ ڈال لی ہے۔''

''ہیں...... شہرینہ! تم نے اپنی وہ سم پھینک دی ہے؟'' ثمرین نے خاصا پریشان اور بے یقین ہو کر اس سے پوچھا۔

''ہاں ناں...... اور کیا کرتی اس کا۔'' اس نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

پیریڈ اوور ہوا تو ثمرین روم سے باہر آ کر بینچ پر بیٹھ گئی اور شہرینہ کا بھی بازو پکڑ کر روک لیا۔

''یار! پلیز رکو...... میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے۔''

''کیا ہوا تمہیں؟'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے، میں گھر جا رہی ہوں۔ تمہارے فون میں کریڈٹ ہوگا؟ گھر فون کر کے کہتی ہوں کہ مجھے آ کر لے جائیں۔''

''سوری یار! میرے تو فون میں کریڈٹ نہیں۔'' اس نے انکار کیا۔

''تھوڑا سا بھی نہیں۔'' ثمرین نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ثمرین نے ایسا منہ بنایا جیسے کڑوا کریلا چبا لیا ہو اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ریسیپشن سے فون کر لیتی ہوں۔'' ثمرین کہہ کر چلی گئی اور صبا اس کے پاس آئی۔

''اسے کیا ہوا؟'' صبا نے پوچھا۔

''ڈراما...... کتنی چالاک ہے، دیکھو دو سال ہو گئے اسے کالج جوائن کیے اور یہ کتنی ہی دفعہ چھٹی

لے کر گھر جا چکی ہے اور ویسے بھی گھر فون کرتی ہی رہتی ہے۔ ہمیشہ ریسیپشن سے ہی کال کرتی ہے اور آج میں نے بتایا کہ میں نے سم چینج کر لی ہے اور پہلے والی پھینک دی ہے تو مجھے کہتی ہے مجھے اپنا فون دے دو میں گھر کال کر لوں۔ میں نے کہہ دیا کہ اس میں کریڈٹ نہیں... اس کا کیا ہے۔ صرف ایک مس کال دے دیتی اور مجھے کہتی کہ کال نہیں ملی اور اگلے کے پاس میرا نمبر پہنچا دیتی۔''

''اُف اللہ...... اتنی چالاک......'' صبا انگشت بدنداں رہ گئی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد ثمرین نے نئے نئے طریقے آزمانا شروع کر دیے۔ کبھی اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ ''ثمر لاہور سے آیا ہوا ہے ہمارے گھر چلو۔'' تو کبھی چھٹی کے وقت بہانے سے کہتی۔ ''جاؤ یار! باہر میری گاڑی کھڑی ہے جا کر ڈرائیور سے یہ بات کہہ آؤ۔'' کبھی کہتی ''جاؤ دیکھو میری گاڑی آئی کہ نہیں؟'' وہ سمجھ جاتی کہ ضرور ثمر گاڑی لے کر آتا ہوگا اور یہ بہانے سے اسے باہر بھیجتی ہے تاکہ ثمر اسے دیکھ لے اور اسے پتا چل جائے کہ جس لڑکی کو اس نے چیلنج بنا رکھا ہے اس کی شکل کیسی ہے۔ وہ کبھی بہانہ بنا کر معذرت کر لیتی تو کبھی اس کام کے لیے کسی اور کو بھیج دیتی۔ غرض وہ ہر طرح سے محتاط تھی۔

ایک دن اس نے کالج سے چھٹی کی۔ اگلے روز کالج گئی تو صبا نے اسے بتایا۔ ''اسے اچھا ہوا تم کل نہیں آئی تھیں۔ کل ثمرین کلاس میں آئی اور آتے ہی شور مچا دیا کہ ثمر آیا ہوا ہے، ثمر آیا ہوا ہے۔ شہرینہ کدھر ہے؟ میں نے بتایا کہ وہ آج نہیں آئی تو وہ اتنا برا منہ بنا کر رہ گئی۔''

''بہت خبیث لڑکی ہے یہ۔'' اس نے کھولتے دماغ کے ساتھ کہا۔

''یار، وہ دو سال سے کوششوں میں لگی ہوئی ہے کچھ ترس ہی کھا لو اس بے چاری پر اور اس بے چارے پر۔ اچھا خاصا مالدار گھرانا ہے۔ اعتراض کیا ہے تمہیں؟'' صبا نے کہا۔

''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے لڑکوں پر، اتنا گھٹیا اور فلرٹ انسان...... اگر میرے معاملے میں سینسئر ہو تو بھی میں ابھی چار سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ پھر جس راستے پر چلنا ہی نہیں تو اس کے کوس کیا ناپنے...... میری بلا سے وہ مخلص ہے یا نہیں......'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ تب ہی ثمرین چلی آئی۔

''یار شہرینہ! تم کل کدھر تھیں۔ چھٹی کیوں کی تھی تم نے؟'' ثمرین جیسے پولیس والوں کی طرح تفتیش کر رہی تھی۔

''مجھے ڈومیسٹک کام تھا۔'' اس نے کہا۔

''کل ثمر آیا تھا کالج...... آج تو وہ بے چارہ واپس لاہور چلا بھی گیا۔'' ثمرین نے جیسے تاسف سے کہا۔

''شکر الحمدللہ......'' اس نے دل میں کہا۔

☆☆☆

تین ماہ گزر گئے، ثمرین اسی طرح اسے ثمر سے ملانے کی کوششوں میں رہی اور وہ بہانے بنا کر اور خود کو بچا بچا کر بہت ہلکان ہو رہی تھی۔ تین ماہ بعد اس نے سوچا کہ ثمرین کو اس نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ سم پھینک چکی ہے۔ اب بھلا کیا ثمر کال کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی وہ سم نکالی اور فون میں ڈالی اور جیسے ہی سم ایکٹو ہوئی۔ اسے ایک میسج ملا اور پھر کالز کا تانتا بندھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی سم فون سے باہر تھی۔

''بات کر لو، بات کر لو، بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''مائی فٹ۔'' اس کے میسج پہ اس نے کھولتے دماغ کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

وہ سم پھینکنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کوڈ کی سمیں بہت مہنگی اور نایاب ہوچکی تھیں اور پھر یہ نمبر بھی بہت خوب صورت اور اس کا فیورٹ تھا۔ اس لیے اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ سم پھینکے۔

مزید چھ ماہ گزر گئے اور اب فورتھ ایئر کے پیپرز ہونے والے تھے اور وہ خوش اور سرشار تھی کہ ایک بہت بڑے ٹرائل سے گزرنے کے بعد وہ آخر کار کامیاب تھی۔ چھ ماہ بعد پھر ایک روز اس کا جی للچایا کہ اپنی وہ سم ڈالے، اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ لڑکا اسے کالز کرے۔ چھ ماہ تک جو سم بند رہے، چھ ماہ بعد تو کسی کو نمبر تک یاد نہیں رہتا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ سم ڈالی کہ کوئی مسئلہ یا پریشانی نہیں۔ جیسے ہی سم ایکٹو ہوئی اس کے ساتھ ہی میسج آیا۔

''کیا حال ہے؟'' اس کا خون کھولنے لگا لیکن یہ تھا کہ اس میسج کے بعد کوئی کال نہ آئی۔ اس نے فون سائڈ پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور میسج آیا۔

''پلیز شہرینہ! ایک آخری دفعہ بات کرلو۔''

اس نے کچھ دیر سوچا پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے سوچا یہ لڑکا اس ضد میں ہے کہ اس سے بات کرکے ہی چھوڑنی ہے اور بہانہ بنا رہا ہے کہ ضروری بات ہے اور میری ضد ہے کہ میں نے بھی ہرگز اس سے بات نہیں کرنی۔ کیوں نہ میں کزن بن کر اس سے بات پوچھوں۔ اس طرح اس کے پاس میسج کرنے کا بہانہ ختم ہوجائے گا۔ وہ بھی خاموش ہوجائے گا اور اسے یہ بھی تسلی نہیں ہوگی کہ وہ مجھ سے بات کرنے میں کامیاب رہا ہے اور اس کی ضد پوری ہوگئی ہے۔ اس نے یہ سوچا اور میسج کردیا۔

''آپ کون ہیں؟ اور آپ کو شہرینہ سے کیا بات کرنی ہے؟''

''یہ میں شہرینہ کو ہی بتاؤں گا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے؟'' جوابی میسج آیا۔

''آئی ایم سوری...... ایسا ممکن نہیں۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں ہے اور میں دوسرے شہر میں رہتی ہوں، اگر کوئی ضروری بات ہے تو بتادیں، میں اس تک آپ کی بات پہنچادوں گی۔''

''مجھے کیا پتا تم کون ہو اور اس تک میری بات پہنچاؤ گی یا نہیں۔'' وہ یہ میسج پڑھ کر مسکرائی اور جواباً میسج ٹائپ کرنے لگی۔

''میں اس کی کزن ہوں اور میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ آپ کا میسج اس تک پہنچادوں گی۔ باقی یقین دلانے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اگر آپ نے میرا یقین کرنا ہے تو کریں نہیں تو مجھے میسجز کرکرکے تنگ نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں بتادوں تو تم اسے کب تک بتاؤ گی؟''

میسج پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر جاندار لطف اندوز مسکراہٹ آئی۔

''بول بیٹا بول...... بے فکر ہوکر بول...... تیری بات شہرینہ تک پہنچ جائے گی۔'' اس نے سوچا اور میسج ٹائپ کیا۔

''میں آج ہی اسے فون کرکے بتادوں گی۔''

''تم اسے بتاؤ کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔'' وہ میسج پڑھ کے ہنسی۔

''میں اسے کیا بتاؤں کہ کون اسے پیار کرتا ہے؟''

''میں اس کا کلاس فیلو ہوں، اسے اتنا بتادو کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتی ہے؟'' وہ میسج پڑھ کر تمسخر سے مسکرائی۔

(پہلے اوپن یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اب کلاس فیلو بن گیا) اس نے سوچا اور پھر جواباً میسج لکھنے لگی۔

''کلاس فیلو کہنے سے اسے کیا پتا چلے گا کہ کون اس سے پیار کرتا ہے۔ اس کلاس میں صرف ایک ہی لڑکا ہے یا وہ ہر لڑکے سے پیار کرتی ہے جو آپ سمجھتے ہیں کہ صرف کلاس فیلو بتانے پر وہ کہے گی کہ مجھے بھی

اس سے پیار ہے، آپ کو نام تو بتانا ہی ہوگا۔''

''میں نام نہیں بتاؤں گا اگر وہ اگلے روز کالج آکر مجھے الٹا لٹکا دے تو؟''

''اور اگر نام ہی نہیں بتائیں گے تو آپ خود بتائیں اسے کیسے پتا چلے گا اور وہ کیا جواب دے گی؟''

''ٹھیک ہے...... اس سے کہو سمیر اس سے بہت پیار کرتا ہے۔'' وہ ایک ٹک موبائل کی اسکرین پر ابھرے اس نام کو دیکھے گئی۔

''سمیر......'' پہلے جس طرح وہ انجوائے کررہی تھی اب نام پڑھ کر اس کی کیفیت یکسر بدل گئی تھی۔

''سمیر......'' یہ نام اس نے کیوں لیا......؟ وہ بہت بری طرح الجھن کا شکار ہوئی۔ یہ سمیر کا نام کیوں استعمال کررہا ہے؟ کلاس میں کتنے ہی فلرٹی اور عاشق مزاج لڑکے تھے ان میں سے کسی کا ہی نام لے لیتا، جس کا یقین بھی کیا جاسکتا تھا مگر سمیر...... اتنا کیوٹ، شریف بچہ اس کا نام یہ شخص آخر کیوں لے رہا ہے؟

''اسے کب تک فون کرکے بتاؤ گی؟ مجھے جواب ضرور دینا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ تم مجھ سے ذرا تمیز سے بات کرو، میں بہت نہیں تو بھی دس گیارہ سال تو تم سے بڑی ہی ہوں گی اور شہرینہ کو میں شام کو گھر جاکر فون کروں گی۔ اس وقت میں کام پر ہوں۔'' وہ چاہ رہی تھی کہ یہ لڑکا یہی سوچے کہ شہرینہ کی یہ کزن خاصی عمر رسیدہ مگر اوچھی سی عورت ہے۔

☆☆☆

باقی سارا دن وہ الجھتی رہی، اس شخص نے سمیر نام لیا تو آخر کیوں لیا۔ ثمرین سے ضرور اس نے پوچھا ہوگا ورنہ یہ کہاں جانتا ہے میری کلاس کے لڑکوں کے نام...... اس تمام میسجنگ میں ثمرین کا مشورہ تو ضرور ہی شامل رہا ہوگا اور ثمرین نے سمیر کا نام لیا کیوں؟ اسے پکا یقین تھا کہ یہ ثمر ہی ہے مگر اس نے سمیر ہی کا نام کیوں لیا۔

خوشیوں کے بہانے

ٹوٹے ہوئے دل کی قسم تجھے دل سے روانہ کرکے
رو پڑی میری آنکھ تنکے کا بہانہ کر کے
شام کے سائے جو سورج کو چھپانے نکلے
ہم دیے لے کر آندھیوں کو جلانے نکلے
اور تو کوئی نہیں تھا جو جرم بغاوت کرتا
ایک ہم تھے جو یہ رسم نبھانے نکلے
سحر میں، دشت میں صحرا میں بھی تجھ کو پایا
اے غمِ یار تیرے کتنے ٹھکانے نکلے
چاند نکلا تو میں لوگوں سے لپٹ کر رویا محسن
غم کے آنسو تھے جو خوشیوں کے بہانے نکلے

مرسلہ: بختاور خورشید، لیہ

شام کو الجھے ذہن کے ساتھ خود اس نے پہلے میسج کیا۔

''میں نے فون کیا ہے اس کے گھر مگر اس سے بات نہیں ہوسکی کیونکہ وہ کہیں گئی ہوئی ہے گھر پر نہیں تھی۔''

''تو......؟'' دوسری طرف سے سوال آیا۔

''ڈونٹ وری...... میں کل آفس ٹائم میں ہی اس کے گھر کال کرکے اس سے بات کرلوں گی۔''

''اوکے، میں کل آپ سے پوچھوں گا۔''

''ہوں......'' اس نے میسج پڑھ کے پُرسوچ انداز میں ہوں کیا اور اگلے دن کی پلاننگ شروع کردی۔

وہ فوراً ہی اس سے یہ کہہ کر شہرینہ سے بات ہوگئی ہے، بات ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب اسے اس راز کا پتا لگانا تھا کہ سمیر کا نام استعمال کرنے کی کیا وجہ ہے اگر ثمرین نے سمیر کا نام یونہی استعمال کیا ہے تو کیوں......؟ اور اگر دشمنی کے سبب استعمال کیا ہے تو بھی کس حد تک اس نے سمیر کے بارے میں معلومات

اکٹھا کر رکھی ہیں۔ ظاہر ہے سمیر سے دشمنی میں ثمر نے اگر سمیر بن کر اس سے فلرٹ کرنا ہے تو اسے سمیر کے بارے میں خاطر خواہ معلومات تو حاصل ہوں گی جو شہرینہ کو یقین دلا سکیں کہ یہ سمیر ہی ہے اور اس کے لیے اسے اسی سے پوچھ گچھ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا تھا۔ سمیر کا نام نہ جانے کیوں استعمال کیا گیا تھا مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ثمرین کی سمیر سے کوئی دشمنی ہے، اسے دشمنی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی آثار اسے ان دو سالوں میں کبھی نظر آئے تھے۔ ثمرین تو سمیر سے اتنی ہی لاتعلق تھی جتنی یہ دونوں تھیں۔

اس نے یہی منصوبہ بنایا کہ اگلے دن وہ اس شخص سے باتوں باتوں میں سمیر کے بارے میں پوچھے گی اور جب وہ کچھ بتانے سے قاصر ہوگا تو اس کا جھوٹ کھل جائے گا اور وہ اسے جھوٹ کہہ کر یہ ڈراما ختم کروائے گی اور ثمرین کے ارادوں پر پانی پھیر دے گی۔

☆☆☆

''سلام...... کیا حال ہے...... بات کی شہرینہ سے؟'' اگلے روز اسے میسج ملا۔

''صبر...... پہلے منہ تو دھولو...... اتنی صبح پوچھ رہے ہو، اب کیا دس بجے ہی اس کے گھر فون کردوں؟ جو بھی اٹھائے گا کہے گا کیا ایمرجنسی آن پڑی ہے کل بھی فون کیا تھا۔ آج بھی کر رہی ہو، حالانکہ میں نے مہینوں مہینوں کبھی ان کے گھر فون نہیں کیا ماسوائے کسی خاص وجہ کے۔''

''تو کب کریں گی؟''

''تھوڑا ٹائم گزرنے دو، جب مجھے لگے گا کہ اس وقت فون وہ ہی اٹھائے گی تب ہی کروں گی۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟''

اس نے سوچ کر یہ سوال کیا کہ ایک دفعہ کمپیوٹر کے پیریڈ میں سر نے سمیر کے تلفظ کی ادائیگی پر سمیر سے پوچھا تھا کہ تم کیا انگلینڈ میں رہے ہو؟ تب سمیر کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے کہا تھا۔

''یس سر! یہ ہے ہی برٹش...... یہ پیدا ہی وہیں ہوا تھا۔''

تب اس نے ایسے ہی سمیر کی طرف دیکھا تھا اور اس کی مسکراہٹ پہ دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری تھی۔

''ہائے میرا کیوٹ بھتیجا...... کتنی معصومیت اور پاکیزگی ہے اس کی مسکراہٹ میں۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔

اب سمیر کے برٹش ہونے کی یہ بات اسے تو اس وقت پتا چلی تھی مگر ضروری نہیں تھا کہ ثمرین بھی سنتی اور یاد رکھتی اور یہ بات ثمر کو بھی بتاتی...... ناممکن

......اور وہی ہوا، دوسری طرف سے میسج آیا۔

''میرے ابو پراپرٹی کا کام کرتے ہیں۔''

''ہوں......'' اس نے سوچا اور اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔

سمیر کیوٹ لگتا تھا یہ تو بات اپنی جگہ سچ تھی مگر کیوٹ دِکھنے کا مطلب یہ تھوڑا ہی تھا کہ ضرور کسرِ نفسی سے کام لینے والا ہوتا۔

کوئی انگلینڈ کی شکل کیا دیکھ لے...... جس سے بھی ملے اس بات کا ذکر کرنا نہیں بھولتا پھر اگر یہ ثمر کے بجائے سمیر ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ والد محترم کے پیشے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت نہ جتاتا؟

باپ کے کام کا پوچھنے کا مقصد کیا ہے، یہ تو اسے ضرور... ہی سمجھ جانا چاہیے تھا اور آ ہی چکا ہوگا، اس کے لیے اگر سمیر ہوتا تو فٹافٹ ساتھ کہتا۔

''ابو فلاں کام کرتے ہیں، میں خود بھی برٹش ہوں۔'' لڑکیاں پٹانے کے لیے تو گلیوں اور نکڑوں پر کھڑے ہونے والے تک جھوٹ بولتے ہیں کہ میں برٹش ہوں پھر اگر یہ سمیر ہوتا تو کیوں نہ کہتا۔

اور یہ شخص ایسا کہہ بھی کیسے سکتا تھا... کیونکہ سمیر فلرٹ نہیں تھا اور یہ شخص سمیر بھی تو نہیں تھا۔

''غریب غربا ہو، پھر یہ عشق وشق کے کھڑاگ کدھر پال رہے ہو؟ غریبوں کو تو روٹی کی فکر سے ہی فرصت نہیں ملتی، کہاں اس طرح کی لگژری۔'' اس نے اب یہ میسج اس لیے لکھ کر بھیجا کہ جواباً عشقیہ ڈائیلاگ جھاڑے گا۔ یہ کہے گا کہ نہیں ایسی بھی غربت نہیں، خیر سے وقت پر سیر ہو کر کھاتے ہیں، ابو اتنا کماتے ہیں، پیسے کی پریشانی نہیں اور پھر محبت امیروں کی میراث تو نہیں، عشق تو امیر، غریب کی تفریق نہیں کرتا۔ یہ مرض تو جس کو چاہتا ہے لگ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ......

مگر جواباً ملنے والا میسج اس کے برعکس تھا۔ اس نے میسج میں اپنے ابا کا خاصا لمبا چوڑا بزنس بیان کر کے پھر اپنے بارے میں لکھا تھا۔

''میں بھی برٹش ہوں، میرے ابو نے انگریز عورت سے شادی کی تھی اور میں گوری کا بیٹا ہوں۔''

یہ پڑھ کر تو اسے سکتہ ہو گیا۔

''اس ثمر نے تو سمیر کی پوری بائیوگرافی پڑھ رکھی ہے۔ یہ تو وہ باتیں بھی بتا رہا ہے جو مجھے نہیں معلوم...... اور مجھے کیا پتا واقعی سمیر کے بارے میں جو کچھ یہ کہہ رہا ہے صحیح ہے یا غلط...... اب میں کیسے تصدیق کروں؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

بہت دیر سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شخص کا جھوٹ کیسے پکڑے البتہ اتنا تو اسے باور ہو گیا کہ جس طرح سے وہ اسے جھٹلانا چاہتی تھی اس کا وہ طریقہ تو ناکام ہو گیا ہے لیکن ثمرین کی سمیر سے کوئی دشمنی ہے؟ یہ بات عقل اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھی جو وہ سمجھتی کہ دشمنی میں سمیر کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ اس نے سوچا کہ سوالات کا انداز بدلا جائے شاید اس طرح کوئی سرا ہاتھ آئے اور وہ اسے جھٹلا سکے۔

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ شہرینہ تک اپنا میسج پہنچا کر آگے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں صرف اسے اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں، ایک دفعہ اسے معلوم ہو جائے اور بس......''

''بتا تو چلو میں دوں گی مگر آگے کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

''اس کا جواب جاننا چاہتا ہوں۔''

''کیسا جواب چاہتے ہو تم؟''

''اگر مان جائے تو بہت اچھا...... نہیں تو بیڈ لک۔''

''اگر نہ مانی تو تم اس کا پیچھا چھوڑ دو گے کیا؟'' اس نے بہت کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہ مانے...... اللہ کرے مانے...... انشاء اللہ مانے گی، نہ مانی تو میں یہی سمجھوں گا کہ میں بہت بدقسمت ہوں۔'' اس نے میسج پڑھ کر بھویں اچکائیں۔

''اگر مان گئی تو کیا کرو گے؟''

''خوشی ہو گی۔''

''نہیں خوشی کے علاوہ......؟ اگر وہ مان گئی تو اس کے بعد تم کیا کرو گے؟''

''وہ مان جائے، اسے منالوں بس اس کے بعد کیا کرنا ہے؟''

''نہیں، کچھ ارادہ تو ہوتا ہے بندے کا، کیا کرو گے؟''

''کچھ برا نہیں کروں گا۔''

''پھر بھی بتاؤ تو......؟ اچھا کرو گے تو کیا کرو گے؟ اب یہ فلم تو ہے نہیں کہ ادھر تم کہو گے آئی لو یو اُدھر وہ کہے گی آئی لو یو ٹو اور تم دونوں اس کے فوراً بعد شہر کی سڑکوں پہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گانے گاؤ گے۔'' یہ میسج لکھتے اور پھر سینڈ کرتے وقت اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

''انشاء اللہ شادی کروں گا۔'' جب دوسری طرف سے جواباً یہ میسج آیا تو اسے بے اختیار بے تحاشا

شرم آئی۔

''اچھا میں کچھ کام کرلوں پھر میں اسے کال کروں گی۔'' اس نے یہ سوچ کر یہ میسج بھیجا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ صبح سے میرے ساتھ میسجنگ پر لگی ہوئی ہے تو جاب کیا خاک کررہی ہوگی۔ اسے کوئی آکر روکتا ٹوکتا نہیں ہے کیا؟ اس کا جھوٹ نہ پکڑا جائے اور اس کی طرف سے وہ مشکوک نہ ہو اس لیے اس نے احتیاطاً ایسا کہا اور فون ایک طرف رکھ کر اپنے لیے کھانا لینے چلی گئی۔

ابھی اس نے لنچ اسٹارٹ ہی کیا تھا کہ میسج آیا۔

''بات ہوئی اس سے؟''

''تم مجھے فارغ ہونے ہی کہاں دے رہے ہو کہ اس سے بات کروں؟ تم میسج کرنا بند کرو تو میں اس سے بات کروں ناں۔''

''اوکے...... سوری...... اب میسج نہیں کروں گا۔ آپ بات کرلیں اس سے۔''

اسے پھر سے خیال آیا کہ وہ پھر اس کی نظروں میں اونچی ہورہی ہے کسی گھٹیا حرکت کی اس وقت اسے اشد ضرورت محسوس ہوئی۔

''کیا کروں......؟'' اس نے سوچا اور اچانک ایک آئیڈیا آیا۔

''اچھا یہ بتاؤ، میں تمہاری اتنی مدد کررہی ہوں، کل سے تمہیں میسج کررہی ہوں، اس کو بھی کال کی تھی اور اب پھر کروں گی میں تمہارے لیے اتنا کچھ کروں، بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟''

''جو مانگیں گی انشاء اللہ ملے گا۔''

''فی الحال تو مجھے ڈھائی سو کا کریڈٹ بھیجو کیونکہ میرا اکاؤنٹ خالی ہوگیا ہے۔ یہ میرا لاسٹ میسج ہے اور میں نے شہرینہ کو ابھی کال بھی کرنی ہے۔'' اس نے میسج سینڈ کرتے ہوئے سوچا کہ اب یہ خود سے نمبر لکھ کر بھیج دے گا اور کہے گا۔'' یہ لو ڈھائی سو کا کارڈ نمبر، ری چارج کرلو۔'' اگر ری چارج ہوجائے تو گڈ لک نہیں تو کہے گا۔'' میں کیا کرسکتا ہوں میرے تو ڈھائی سو خرچ ہوئے ہیں ناں۔''

''میں ابھی گھر میں بیٹھا ہوں کسی کو فون کرکے کریڈٹ مانگتا ہے۔'' ادھر سے میسج آیا۔ وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرائی اور کھانے میں مصروف ہوگئی۔ ابھی پانچ منٹ گزرے تھے کہ اس کے موبائل نے میسج ریسیو ہونے کی بیپ دی۔

''لو بھیج دیا خود سے نمبر لکھ کر۔'' اس نے دل میں کہا اور جب میسج دیکھا تو وہ کمپنی کی طرف سے تھا کہ جس میں انفارم کیا گیا تھا کہ فلاں نمبر سے شیئرنگ کے ذریعے آپ کے اکاؤنٹ میں ڈھائی سو روپے منتقل کردیے گئے ہیں۔ وہ حیرت سے بے ہوش ہونے کو تھی۔

''مل گئے پیسے......؟'' میسج آیا۔ وہ چپ چاپ کبھی اپنا بیلنس چیک کرتی اور کبھی اس کا میسج پڑھتی۔ اس کی بے یقینی ختم ہی نہیں ہورہی تھی۔

''اب جواب تو دیں ناں؟'' کچھ دیر بعد ایک اور میسج آیا۔

''ہاں مل گئے۔'' اس نے میسج سینڈ کیا اور پھر ایک اور خیال آیا۔

''تم نے مجھے پیسے بھیجے ہیں، مجھے اب تک یقین نہیں آرہا۔ مجھے تو کبھی میرے بوائے فرینڈ نے دس روپے تک نہیں دیے اور تم نے مجھے ڈھائی سو کا کریڈٹ بھیجا ہے۔ تم ایسا کرو شہرینہ کو چھوڑو میرے ساتھ لگ جاؤ، تم کم از کم کنجوس تو نہیں ہوناں!''

آخری بات لکھتے ہوئے وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی اور میسج سینڈ کرنے کے بعد بھی قہقہے لگاتی رہی۔

''میں نے کہا ناں میں سنجیدگی سے شہرینہ سے پیار کرتا ہوں، میں کوئی ٹائم پاس نہیں کررہا۔'' اُدھر سے میسج آیا۔

''ہاں بچو! رانجھے، مجنوں، فرہاد سب تمہارے ہی تو شاگرد ہیں تم سے ہی وفا سیکھی ہے انہوں

نے۔'' اس نے دل میں تمسخر سے کہا اور پھر میسج کیا۔

''اوہ، میں تو مذاق کررہی تھی، اچھا یہ بتاؤ مجھے اور کریڈٹ سینڈ کروگے ناں؟'' اس نے مزید گھٹیا پن دکھایا۔

''آپ اس سے بات کرکے مجھے بتائیں وہ کیا کہتی ہے۔''

''پہلے مجھے بتاؤ، مجھے اور کریڈٹ سینڈ کروگے ناں؟''

''ابھی کیا بتاؤں، پہلے کام تو میرا ہونا چاہیے۔ میرا کام ہونا چاہیے پھر جو مانگیں گی وہ دوں گا۔''

''ایہہ وکھو پکا ٹھیکے دار...... ایسے کہہ رہا ہے جیسے میں کنٹریکٹ پہ لوگوں کے کام کرتی ہوں۔'' اس کے میسج پہ اس نے سوچا۔

''چلیں اب اسے کال کرکے مجھے بتائیں، وہ کیا کہتی ہے۔'' ایک اور میسج آیا۔

''اوکے...... میں کرتی ہوں کال...... تم ویٹ کرو۔'' فون رکھ کر وہ سوچنے لگی کہ کیا کروں۔

پہلے اس نے کھانے کے برتن لے جاکر کچن میں رکھے، سنک میں تھوڑے ہی برتن تھے اس نے وہ دھونا شروع کردیے۔ برتن دھوتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان اس لڑکے کی طرف تھا۔ اس لڑکے نے اسے حقیقتاً بہت بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ برتن دھونے کے بعد وہ اپنے کمرے آبیٹھی اور اسے میسج کیا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''سمیر سجاول، اب کیا ہوا؟''

''ہوں...... وہ بھی یہی کہہ رہی تھی، اب کیا ہوا کا کیا مطلب ہوا۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ اسے کال کرو۔'' اس نے اب کیا ہوا؟ پر کچھ بگڑ کر کہا۔

''بات ہوگئی اس سے؟''

''ہاں۔''

''کیا کہتی ہے۔''

''وہ کہتی ہے میری کلاس میں سمیر نام کا صرف ایک ہی لڑکا ہے اور اس کا پورا نام سمیر سجاول تھا۔''

''ہاں تو پھر......؟'' اور کیا کہا اس نے؟''

''وہ میں بعد میں بتاتی ہوں پہلے تم یہ بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے؟''

''بیس سال۔''

''اس کا مطلب ہے وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔''

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''تمہیں پتا ہے وہ تم سے تین سال بڑی ہے، اس کی پڑھائی میں گیپ آگیا تھا۔ وہ تئیس سال کی ہے اور تم ابھی بیس سال کے ہو۔''

''وہ کیا کہتی ہے، آپ نے بتایا اسے کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں؟''

''وہ تو میں تمہیں بتادوں گی مگر ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ ابھی تم کیا سوچتے ہو؟ اس کی عمر جاننے کے بعد تمہاری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی؟''

''ایج میں کیا رکھا ہے، بڑی ہے تو کیا ہوا...... اس میں میرا کیا قصور ہے، وہ اس بات کو کیوں اتنی اہمیت دیتی ہے؟''

''تم نہیں دیتے اہمیت؟''

''نہیں۔'' اُدھر سے جواب آیا۔

''اچھا...... میں نے اسے تمہارا بتایا ہے، وہ ماننے کو تیار نہیں، وہ کہتی ہے کہ تم سمیر سجاول نہیں۔''

''اسے بتائیں ناں کہ میں سمیر سجاول ہی ہوں۔''

''میں نے بتایا ہے ناں کہ تم سمیر سجاول ہو مگر وہ مانتی ہی نہیں۔ وہ کہتی سمیر سجاول ایک شریف لڑکا ہے، وہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا...... تم سمیر سجاول ہو ہی نہیں سکتے۔''

اس نے میسج میں یہ بات واضح کرنے کی پوری کوشش کی سمیر سجاول کا نام استعمال کرکے اسے پھنسانے کی جو کوششیں وہ کررہا ہے یہ کبھی کامیاب

نہیں ہوسکتیں۔ سمیر سجاول کو وہ ایک شریف لڑکا سمجھتی ہے اور سمجھتی رہے گی اور اس کے بارے میں ایسی الٹی سیدھی باتوں پر کبھی یقین نہیں کرے گی لہٰذا اس شخص کو چاہیے کہ سمیر کا نام استعمال کرنا چھوڑ دے۔

وہ اب توقع کررہی تھی کہ وہ معذرت کرے گا...... سوری میں نے ڈر سے غلط نام بتایا تھا ورنہ میں سمیر نہیں بلکہ فلاں لڑکا ہوں۔

"جہاں میرے لیے اتنا کیا ہے وہاں تھوڑی سی مدد اور کریں گی، پلیز......؟ پلیز آپ ایک دفعہ پھر اس سے بات کریں اور اسے یقین دلائیں کہ میں سمیر سجاول ہی ہوں اور اس سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں کوئی ٹائم پاس نہیں کررہا۔ میں سیریس ہوں۔" اُدھر سے جو میسج آیا اس پہ اس نے سوچا۔ بچو! تم خود کہو گے کہ میں سمیر سجاول نہیں اور پھر میسج لکھا۔

"میں کہہ دوں گی مگر ابھی نہیں...... میں ابھی دوبارہ کال نہیں کرسکتی اور نہ ہی اس کے سامنے واضح طور پر تمہاری وکالت کرسکتی ہوں۔ ابھی میں نے فون کیا تھا تو شکر ہے اسی نے اٹھایا تھا اب اگر کسی اور نے اٹھایا تو میں کیسے ری کو بلاؤں گی اور کس طرح بات کروں گی، میں بہانے سے ہی فون کروں گی اور پھر باتوں باتوں میں تمہارا ذکر لاکر تمہاری بات کروں گی کیوں کہ وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ تم کوئی فراڈ ہو، مجھے بھی تم سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے بھی اس کی تسلی کروادی تھی کہ میں تمہارے کسی میسج کا جواب نہیں دوں گی۔ وہ تو مجھے یہ سم تک استعمال کرنے سے منع کررہی تھی۔ اگر میں صاف تمہاری وکالت کروں گی تو وہ مجھے بھی غلط سمجھے گی۔ اس لیے صبر کرو، میں اس سے پھر کسی وقت موقع ملا تو بات کروں گی۔"

"اوکے......" اُدھر سے جواباً میسج آیا۔

"اور سنو...... شام کے بعد مجھے کوئی میسج نہ کرنا کیونکہ میرے میاں اظہر گھر پر ہی ہوتے ہیں اور کل چھٹی ہے، کل بھی نہ کرنا کیونکہ اظہر میرا کوئی میسج آئے تو پڑھ لیا کرتے ہیں۔ اس لیے مہربانی فرما کر مجھے نہ مروانا۔"

"ٹھیک ہے، نہیں کروں گا۔"

"ابھی تو میں نے پانچ سو اور ہزار کے کارڈز اور نکلوانے ہیں، تم نے اتنا عرصہ مجھے تنگ کیا اور اس کی سزا کے طور پر بھی اور اس لیے بھی کہ جب میں تمہیں شہرینہ سے ہٹاؤں تو تم شہرینہ کی کزن کے پیچھے ہی نہ پڑ جاؤ" اس نے سوچا اور فون رکھ دیا۔

☆☆☆

اسے تو میسج کرنے سے اس نے منع کردیا تھا مگر خود اس کی الجھن دور نہیں ہوئی تھی۔ عجیب پریشانی تھی۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا کہ آخر اصل بات کیا ہے۔ باقی کا دن اور اگلا دن اسی الجھن اور بے چینی میں گزرا اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اگلے دن اسے میسج کرنے سے کیوں منع کیا تھا۔ آج کا دن بھی اس سے کچھ باتیں کرلیتی تو شاید کچھ سراغ ملتا لیکن آج منع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ لڑکا اس کے منع کرنے پر باز آتا ہے یا نہیں تاکہ وہ آئندہ کا اندازہ لگا سکے کہ جب وہ شہرینہ کا جواب دینے کے بعد اسے اپنی طرف سے بھی خدا حافظ کہے گی تو اس کے بعد بھی یہ میسج کرے گا یا خاموش ہو رہے گا۔

جس طرح کا یہ لڑکا تھا اس سے امید تو نہیں تھی کہ وہ بات مانے گا امید واثق یہی تھی کہ وہ میسج کرکے معذرت کرے گا کہ سوری آپ کی بات نہیں مانی کیونکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں سخت پریشان اور بے چین ہوں مگر مقام حیرت کہ اس لڑکے نے اسے کوئی میسج نہیں کیا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جب میسج کرتے تھے تو میسج کی لینتھ تین، تین، پانچ پانچ میسجز تک چلی جاتی

تھی۔ اس سیاپے میں پڑنے کے بجائے وہ سیدھے سیدھے کال کرکے جو بات کرنا ہو کیوں نہیں کرتا، وہ خوفزدہ بھی تھی کہ کہیں وہ صاف سیدھی بات جاننے کے لیے کہیں کال ہی نہ کرلے...... کال کی صورت میں اسے بات کرنا پڑتی اور وہ آواز پہچان لیتا آخر پہلی دفعہ جو کال آئی تھی اس پر اس نے جو بات کی تھی مگر اس وقت اس نے برٹش لہجے پر غور نہیں کیا تھا۔

اتوار کا دن اس کا اسی الجھن اور بے چینی میں گزرا۔ اگلے روز وہ صبا کے گھر جانے کی تیاری کررہی تھی جب اسے میسج ملا۔

"سلام...... کیا حال ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں، تمہارا کیا حال ہے؟"

وہ ایسا ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے اس لڑکے سے بات کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ خود کو ایسا ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اس لڑکے کو وہ اتنی بری لگے کہ وہ اس سے جان چھڑالے اور ظاہر ایسا کرنا چاہتی تھی جیسے وہ اس سے بات کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہو۔

"میں ٹھیک ہوں، بات ہوئی شہرینہ سے؟"

"نہیں ابھی نہیں لیکن تم پریشان نہ ہو آج ضرور بات کروں گی اس سے۔" اس نے جواباً میسج کیا۔

"میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہی سمیر سجاول ہوں؟"

"مجھے کیا پتا...... تم خود بہتر جانتے ہو کہ کیسے یقین دلانا چاہیے، مجھے تو یہ تم سے پوچھنا چاہیے کہ میں تمہارا اسے کیسے یقین دلاؤں۔" اس نے جواباً میسج کیا اور صبا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کچھ مشورہ تو دے سکتی ہیں، میں کیسے اسے یقین دلاؤں؟"

"میں کیسے کچھ کہہ سکتی ہوں، مجھے تو خود نہیں معلوم کہ سمیر سجاول کون ہے، کیسا ہے؟ اگر میں تمہیں جانتی ہوتی تو کچھ کہتی۔"

صبا کے گھر پہنچ کر اس نے سارا قصہ صبا کو سنایا اور پھر اپنی الجھن بھی بیان کی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سمیر کا نام کیوں استعمال کررہا ہے۔

"ہاں واقعی...... سمیر سجاول تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔" صبا نے کہا۔

"اور یہ بھی کنفرم ہے کہ یہ ثمر یا اور جو کوئی بھی ہے لیکن ہے ضرور ثمرین کا کچھ لگتا...... ثمرین کے کہنے پر ہی یہ سب کچھ کررہا ہے۔" اس نے کہا۔ ساتھ ساتھ اس لڑکے سے میسجنگ بھی جاری تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" صبا بولی۔

"میں نے آپ کو اپنا بتایا تو ہے سب کچھ۔" اس لڑکے نے میسج کیا۔

"لیکن اس میں کچھ بھی ایسا نہیں جو میں دلیل کے طور پر ری کو بتاؤں اور یقین دلاؤں کہ تم سمیر سجاول ہو۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" اس نے ہنس کر صبا سے کہا۔

"دیکھو اس کی معصومیت...... مجھ سے مشورے لے رہا ہے۔" صبا ہنس دی۔

"مجھے اس وقت کچھ کام کرنے دو، صبح سے تم نے میسجنگ پہ لگایا ہوا ہے، میرا سارا کام پڑا ہوا ہے، باس نے دیکھا تو خفا ہوں گے...... میں تھوڑا کام ختم کرلوں پھر تم سے بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، کام ختم کرکے پلیز ری کو فون کردیں، اسے پلیز یقین دلائیں کہ میں سمیر سجاول ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے میسج سینڈ کیا اور صبا سے مخاطب ہوئی۔

"میں سوچ رہی ہوں اس سے ایک اور کارڈ لے لوں اور پھر اسے بتاؤں کہ میری شہرینہ سے بات ہوگئی ہے تاکہ بعد میں یہ مجھ سے کوئی رابطہ رکھنے

کی کوشش نہ کرے۔"

"ہاں...... اب اس سے پانچ سو کا کارڈ مانگنا۔"

"یس۔" اس نے صبا کی طرف ہاتھ بڑھایا اور صبا نے جواباً اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پھر وہ اور صبا اٹھ کر کچن میں چلی گئیں اور اپنے لیے چائے اور چپس تیار کرنے لگیں ساتھ ساتھ باتیں اور ہنسی مذاق بھی جاری تھا اور زیادہ ڈسکشن اسی لڑکے پہ ہو رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ صبا بھی الجھن میں تھی کہ ثمرین، سمیر سجاول کو کیوں پھنسا رہی ہے۔

"بات ہوئی "ری" سے؟" کوئی آدھا گھنٹا یا اس سے ذرا زیادہ ہی گزرا تھا جب پھر میسج آیا۔

"دیکھو کتنا بے چین ہے بے چارہ۔" صبا نے کہا۔ وہ صبا کی بات پر ہنسی اور پھر مسکراتے ہوئے میسج لکھنے لگی۔

"ہاں...... تم مجھے بہت تنگ کر رہے ہو لڑکے...... میں صبح سے بالکل بھی کام نہیں کر رہی۔ صرف تمہارے ہی کام میں الجھی ہوئی ہوں۔"

"تھینک یو ویری مچ...... بتائیں ناں بات ہوگئی؟"

"لو یار......! میں تو احسان جتا کر پیسے مانگنے لگی تھی اور اس نے شکریہ ادا کر دیا ہے۔" اس نے صبا سے کہا اور پھر میسج لکھنے لگی۔

"ہاں، میں نے پہلی فرصت میں ہی اسے کال کی تھی۔ میں نے سوچا پہلے اس سے بات کرلوں پھر کام کروں گی مگر اُدھر سے فارغ ہوتے ہی تمہارا میسج آگیا۔"

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"میں نے اسے بتایا کہ یقین کرلو تم s.s ہی ہو مگر وہ کہتی ہے کہ اگر آپ مجھ سے s.s کا پوچھتی ہیں کہ وہ مجھے کیسا لگتا ہے تو میں آپ کو بتادوں کہ s.s ہماری کلاس کا سب سے نیک اور شریف لڑکا ہے۔ ان واہیات سرگرمیوں میں ملوث ہونے والا لڑکا ہے ہی نہیں...... وہ ہر لڑکی کو عزت دینے والا ایک عزت دار لڑکا ہے۔ میں نے جب پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا تو پہلی نظر پڑتے ہی میرے دل میں اس کے لیے کیوٹ کا ٹائٹل آیا تھا...... سمیر سجاول بہت کیوٹ اور کم عمر سا بچہ ہے اور میں اسے ہمیشہ اپنا بھتیجا سمجھتی رہی ہوں، مجھے s.s اتنا پیارا لگتا ہے کہ اکثر اسے جب بھی دیکھتی تھی تو دل میں خواہش کرتی تھی کہ اللہ اگر دنیا کے خوب صورت ترین لڑکے ایک لائن میں کھڑے کر کے مجھ سے کہتا کہ ان میں سے کوئی بھی منتخب کرلو تو میں s.s کو اپنے بیٹے کے طور پر چنتی...... اور یہ کہ یہ فون کرنے والا سمیر سجاول ہرگز نہیں۔"

"تم اسے کیا لکھ رہی ہو... پیسے مانگے؟" صبا نے اسے میسج لکھتے دیکھ کر کہا۔ "اب پانچ سو بھیجے تو یہ آدھا حرام کا مال مجھ سے بھی شیئر کرتا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں یار! یہ بات کرلوں پھر مانگتی ہوں اس سے پیسے۔"

"کیا لکھا ہے؟" صبا نے پوچھا۔

"دیکھ لو sent message میں۔" اس نے فون صبا کو دیا۔

"اے...... یہ سمیر کے بارے میں جو جو تم فیل کرتی تھیں سب اس کو کیوں بتایا......؟ اور اتنی تعریفیں کہ سمیر اتنا نیک ہے؟" صبا نے میسج پڑھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں...... یہ میرے ذریعے سمیر کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اس لیے سمیر کا نام استعمال کر رہا ہے اور میں اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں کہ جس سے تم نقصان کی امید رکھتے ہوں سمیر کی سب سے بڑی ڈھال تمہیں یہ ہی ملے گی۔"

"اُف یہ آخر میں تم نے کیا لکھ دیا ہے۔" صبا کا ہنس ہنس کر برا حال ہونے لگا۔

"ٹھیک ہی تو لکھا ہے، سمیر مجھے لگتا ہی اپنے بے بی جیسا تھا۔" اس نے کہا اور اسی وقت فون کی بیپ بجی۔

"دو میسج آئے ہیں۔" اس نے فون صبا سے لے لیا۔

"ٹھیک ہے، مجھے میرا جواب مل گیا ہے، میں بہت بدقسمت ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے میری اتنی مدد کی۔ میری کوئی بات بری لگی ہو آئی ایم سوری۔ اب میں آپ کو میسج نہیں کروں گا۔ اللہ حافظ۔"

یہ غیر متوقع میسج پڑھ کر تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"ارے نہیں، یہ ابھی سے خدا حافظ کیسے کہہ سکتا ہے۔"

"کیا ہوا...... کیا کہا اس نے؟" صبا نے اس سے پوچھا۔

جواباً اس نے میسج پڑھ کر سنا دیا۔

"چلو شکر ہے جان چھوٹی۔" صبا نے کہا۔

"نہیں شکر نہیں...... ایسے ہی خدا حافظ؟ ابھی میں اس سے ساری بات اگلواؤں گی۔ اب کوئی سوال کر کے اندازے لگانے اور نتیجے نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اب دیکھو یہ کیسے اپنے منہ سے کہے گا کہ معاف کرو، جان چھوڑو میری۔ میں تو بس کسی کے کہنے پر یہ سب کر رہا تھا ورنہ نہ تو میں سمیر سجاول ہوں اور نہ ہی میں کسی شہرینہ کو جانتا ہوں جو مجھے اس سے محبت ہوگی۔" اس نے کہا اور میسج لکھنا شروع کر دیا۔

"ارے...... تم ابھی سے ہمت ہار گئے......؟ پیار کرنے والے تو بڑے حوصلہ مند ہوتے ہیں...... ہار وہی مانتے ہیں جو اپنے ارادوں کے کچے اور جھوٹے ہوتے ہیں مگر تم تو مجھے ایک مخلص اور سچے انسان لگے تھے۔ تم کیوں میدان چھوڑ رہے ہو؟"

"میں میدان نہیں چھوڑ رہا۔ میں بس اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔" جواباً میسج آیا۔

"چچ چچ...... بے چارہ...... رو رہا ہے اپنی قسمت کو......" وہ بڑبڑائی اور صبا سے بولی۔ "دیکھو صبا! کتنا خبیث ہے، پیچھے بھی ہٹ رہا ہے اور مان بھی نہیں رہا کہ وہ فراڈ کر رہا تھا۔" پھر اس نے میسج سینڈ کیا۔

"دیکھو...... جو سچا پیار کرتے ہیں وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتے...... ایک مرد جو کسی سے پیار کرتا ہے تو اسے کبھی نہیں چھوڑتا... کیونکہ چھوڑنے کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی اور کے لیے چھوڑ رہا ہے اور جسے محبت ہوتی ہے وہ کسی اور کے لیے کبھی نہیں چھوڑتا۔ تم اسے چھوڑ رہے ہو اس کا مطلب ہے کہ تم سچے نہیں۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں جب وہ ہی مجھے پسند نہیں کرتی تو؟ مجھے اس سے سچا پیار ہے۔ میں اسے محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی اس کی محبت میں گزار دوں گا لیکن وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تو میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"میں تمہاری مدد کروں گی اگر تم سچے ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اسے مناؤں گی۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ اسے سمیر سجاول سے نفرت ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ s.s اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ تم s.s نہیں۔ اگر تم اسے یقین دلا دو کہ تم s.s ہو اور اس سے شادی کرو گے تو وہ ضرور مانے گی...... میں تمہاری مدد کروں گی ناں!"

"اب دیکھنا کہے گا اللہ کا واسطہ ہے، معاف کرو نہیں چاہیے تمہاری مدد...... میں نہیں ہوں سمیر سجاول۔" اس نے صبا سے کہا۔

"میں ابھی شادی کی بات نہیں کرسکتا۔ ہمارے گھر کے کچھ حالات ٹھیک نہیں۔ ابو ان دنوں ایک مسئلے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ پریشان ہیں۔ ابھی میں گھر میں ایسی بات نہیں کرسکتا۔"

"دیکھا...... آرہا ہے ناں لائن پر، بچا رہا ہے ناں دامن، اب ایک دو جھوٹے بہانے بنا سکا تو بنائے گا.... میں نے بھی اس سے اگلوا کر چھوڑنا

ہے۔'' اس نے صبا سے کہا اور اسے میسج ٹائپ کیا۔

''میں تو تمہیں سچا عاشق سمجھ رہی تھی مگر جس طرح تم اب دامن بچا رہے ہو اور ایکسکیوز دے رہے ہو اب تو مجھے بھی لگ رہا ہے کہ ری ٹھیک کہتی ہے۔ تم s.s نہیں ہو، نہ ہی تمہیں اس سے سچی محبت ہے۔''

''بول دے بیٹا! بول دے یہی حقیقت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بول دے کہ تم ثمرین کے کہنے پر یہ سب کر رہے تھے پھر میں تم سے پوچھوں کہ ثمرین ایسا کیوں کروا رہی ہے؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''نہیں ...... میں سمیر سجاول ہی ہوں اور میں ری سے سچی محبت کرتا ہوں۔ میں اسے ساری زندگی پیار کرتا رہوں گا۔'' یہ میسج پڑھ کر وہ صبا کی طرف دیکھنے لگی اور مایوسی سے سر ہلایا۔

''بیکار ہے، یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس سے صاف صاف بات کرنی ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''اگر تمہیں اس سے محبت ہے تو تم اسے چھوڑ کیوں رہے ہو؟''

''میں نہیں چھوڑ رہا...... میں نے کہاں ناں اس سے محبت کرتا رہوں گا۔''

''تم برداشت کرلو گے کہ اس کی شادی کسی اور سے ہو جائے، اس کا مطلب یہی ہے کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔''

''میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟''

''میں نے کہا ناں میں تمہاری مدد کروں گی، میں اس سے دوبارہ بات کر کے اسے یقین دلا سکتی ہوں اور میں اسے دوبارہ فون کر کے منا بھی لوں مگر تم ہی ایسا نہیں چاہتے۔''

''میں کیوں نہیں ایسا چاہتا...... میں یہی تو چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں اسے دوبارہ فون کرتی ہوں۔'' اس نے میسج سینڈ کیا۔

''وہ جب چھوڑ رہا ہے پھر تم کیوں اسے اس طرح امیدیں دلا رہی ہو۔'' صبا نے اس سے کہا۔

''میں صاف جاننا چاہتی ہوں کہ ثمرین کا یہ سب کرنے کا مقصد کیا تھا اور اس کے لیے اب مجھے خود ہی اس سے بات کرنی ہوگی۔'' پھر وہ بولی۔

''کاش سمیر سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہوتا، میں سمیر کو ساری بات بتا کر اسی سے کہہ دیتی کہ وہ پتا لگائے ثمرین اس کا نام کیوں استعمال کر رہی ہے۔'' وہ بہت رنجیدہ تھی۔

''وہ دوسرے لوفروں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا نہیں تھا اس لیے۔'' صبا نے جل کر کہا۔

''وہ کچھ کہنے کے بجائے خاموشی اور گہری سنجیدگی سے اگلا لائحہ عمل ترتیب دینے لگی۔

''آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔'' صبا نے کہا وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

کمرے میں آنے کے بعد صبا ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ وہ کوئی پانچ منٹ بے توجہی سے ٹی وی دیکھتی رہی اور پھر اس نے میسج کیا۔

''سنو میں نے ری سے دوبارہ بات کی ہے، وہ تم سے خود بات کرنا چاہتی ہے اگر تم اس سے بات کرو تو میں تمہیں اس کی دوست کا نمبر بتاؤں تم اس پر اس سے بات کرلو۔''

''جی...... آپ مجھے نمبر بتائیں۔''

''صبا...... یہ سم تم اپنے فون میں ڈالو۔'' اس نے اپنی دوسری سم پرس سے نکال کر صبا کو دی۔

''کیوں......؟'' صبا نے پوچھا۔

''تم ڈالو...... میں نے اس نمبر سے اس سے بات کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

صبا نے سم لے کر اپنے فون میں ڈال لی۔

''یہ ہے اس کی سہیلی کا نمبر...... اسے ابھی کال کرلو، وہ تمہاری کال کا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے نمبر لکھ کر بھیجا۔

تھوڑی دیر میں صبا کے فون پر کال آنے لگی،

''لو کرو بات۔'' صبا نے فون اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے فون لے لیا اور گہری سنجیدگی سے اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھنے لگی۔

''کال ریسیو کرو ناں۔'' صبا نے کہا۔

''ابھی نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

فون بج بج کر آخر کار خاموش ہو گیا۔

''کال کیوں نہیں ریسیو کی؟'' صبا نے پوچھا۔

''وہ یہ نہ سمجھے کہ میں فون ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نمبر ناٹ آنسرنگ۔'' اُدھر سے اس کے فون پر میسج آیا۔

''اچھا......؟ اس نے تو کہا تھا کہ وہ ویٹ کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے میں نے نمبر لکھنے میں غلطی کر دی ہو، میں پھر لکھ رہی ہوں اگر نمبر ٹھیک ہے تو مجھے نہیں معلوم کیوں نہیں ریسیو کر رہی اور اگر نہیں تو اس پہ کال کرو، پہلے میں نے غلط نمبر دے دیا ہوگا۔'' اس نے جواباً میسج لکھا اور صبا سے بولی۔

''اصل میں، میں نہیں چاہتی کہ اسے ذرا سا بھی شک ہو کہ میں اور میری کزن ایک ہی ہیں۔''

صبا والے فون پہ دوبارہ سے کال آنے لگی۔ اس بار اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔

''ہیلو!''

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' اس نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

''کیا حال ہے؟'' اُدھر سے پوچھا گیا۔ اس کا دماغ کھولنے لگا۔

''ٹھیک ہوں۔'' بہ مشکل اس نے کہا وہ حقیقتاً اس شخص سے جلی ہوئی تھی جو اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ اس کا تو حال پوچھنا اسے کلسا گیا۔

''جی بات کریں...... کیا بات کرنی ہے آپ کو؟'' اس لڑکے نے کہا۔

''بات مجھے کرنی ہے بھلا؟ میسج تم مجھے کرتے تھے، کالز تم مجھے کرتے تھے اور بات مجھے کرنی ہے تم سے؟'' اس نے کھل کر کہا۔

''آپ کو میں نے تو کال نہیں کی۔ آپ کی کزن نے مجھے کہا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں اس لیے مجھے نمبر دیا اور کہا کہ کال کروں۔'' اس لڑکے نے کہا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو تم مجھے؟ کیوں کالز اور وہ بے ہودہ میسجز بھیجتے تھے اور اب کیوں میری کزن کے ذریعے مجھے پیغامات بھیج رہے ہو؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''میں نے تو کبھی کوئی بے ہودہ میسج نہیں بھیجا۔ میں تو بس جو بات آپ سے کہنا چاہتا تھا وہی کہی ہے۔''

''کیا بات؟'' وہ مزید بگڑی۔

''پیار کرتا ہوں تم سے اور کیا؟''

''اور یہ بات مجھ سے کہنے کے لیے تمہیں کس نے کہا ہے؟''

''کسی نے بھی نہیں۔''

''ثمرین سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کس سے......؟'' اس نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ثمرین شاہ سے؟''

''ثمرین شاہ؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا اور دوسرے ہی لمحے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''نہیں...... کوئی تعلق نہیں۔''

''سچ بتاؤ تمہیں ثمرین شاہ نے یہ سب کرنے کے لیے نہیں کہا؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

''تو تم کس کے کہنے پہ ایسا کر رہے ہو؟''

''میں کسی کے بھی کہنے پر نہیں کر رہا۔''

''تم کون ہو؟''

"میں سمیر سجاول ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو، مجھے سچ سننا ہے، تم کون ہو؟"

"میں سمیر سجاول ہی ہوں۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"کیسے یقین دلاؤں میں آپ کو؟"

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سمیر سجاول کا نام استعمال کیوں کررہے ہو؟ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے یا سمیر سے؟"

"میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں، مجھے کیوں تم سے دشمنی ہوگی، میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"محبت کرتے ہو تم مجھ سے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"کیا تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

اس کی زبان سے نکلنے لگا تھا کہ اب کیا دونوں مل کر گانا گائیں؟ مگر یہ بات وہ پہلے بحیثیت کزن کہہ چکی تھی۔

"تو کیا ڈیٹس مارنا شروع کردیں۔ کل کہیں ریسٹورنٹ میں ملیں پھر...... بولو؟" وہ بہت اکھڑ مزاجی سے کہہ رہی تھی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا، میں نے نہیں ڈیمانڈ کی کہ تم میرے ساتھ ڈیٹ مارو۔"

دوسری طرح وہ بھی غصے میں آگیا۔

"تو کیا چاہتے ہو تم......اگر محبت کرتے ہو اور ڈیٹس بھی نہیں مارنی تو کیا کرنا چاہتے ہو تم میرے ساتھ؟"

"شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے اور کیا؟"

"اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تم مجھے اس طرح تنگ نہ کرتے، تم سیدھی طرح اپنے والدین کو بتاتے اور ان سے کہتے کہ شرافت سے میرے گھر رشتہ مانگنے آئیں۔"

"ٹھیک ہے، میں ان سے بات کرلوں گا، پہلے تم سے اس لیے بات کرنا چاہتا تھا کہ تم انکار نہ کرو، اب میں گھر والوں کو بتادوں اور اُدھر تم انکار کردو تو؟"

"تمہارے گھر والے اعتراض نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔"

"اچھا اور وہ جو اپنی بھتیجیاں اور بھانجیاں تمہاری امی نے تمہارے لیے پسند کررکھی ہیں اور جو اپنی بھتیجیاں اور بھانجیاں تمہارے ابا جان نے پسند کررکھی ہیں وہ؟"

اس کی اس بات پہ وہ ہنسا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، ہمارے خاندان میں لڑکے زیادہ ہیں۔۔اور لڑکیاں کم...... ہماری شادیاں خاندان سے باہر..... ہی ہوتی ہیں۔"

"تم ہو کون؟"

"میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں، میں سمیر سجاول ہی ہوں۔"

"اگر تم میرے کلاس فیلو ہوتے تو تمہیں مجھ سے نہیں ثمرین سے پیار ہوتا، جاؤ تم اس سے اظہارِ محبت کرو، وہی تھی پورے کالج کے لڑکوں کی ہارٹ بیٹ۔" اس نے اس خیال سے کہا کہ یہ جو ثمرین کے کہنے پہ یہ سب کررہا ہے۔ اسے بھی بتائے کہ ثمرین خود کتنی ذلیل لڑکی ہے۔

"کیوں...... اسے کیوں کہوں؟ ضروری تو نہیں کہ سب اس کے پیچھے جاتے تھے تو میں بھی جاؤں۔ مجھے تم سے پیار ہے۔"

"مجھ سے کیوں ہونے لگا تمہیں؟" اس نے کلس کر پوچھا۔

"تم سادگی سے رہتی ہو اس لیے، مجھے ثمرین کے جیسی خود کو شو آف کرنے والی ماڈرن لڑکیاں نہیں پسند، مجھے تم پسند ہو کیونکہ تم سادہ ہو۔"

"رشیدہ مجھ سے زیادہ سادہ ہے۔" اس نے بے ساختہ اپنی کلاس کی ایک معمولی شکل صورت والی لڑکی کا نام لیا جسے پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے تک کا ڈھنگ نہیں تھا۔

"کون؟"

"رشیدہ جلال......" اس نے پورا نام لیا۔ دوسری طرف وہ لڑکا جو ہنسنا شروع ہوا تو ہنس ہنس کر بے حال ہی ہونے لگا۔ اِدھر اس کی بھی ہنسی چھوٹنے لگی۔ اس نے بہ مشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی دبائی کہ وہ تو اس سے سخت لہجے میں بات کررہی تھی۔ اب اس کی ہنسی کا ساتھ دیتی تو وہ کیا سمجھتا۔

"نہیں، مجھے رشیدہ جلال سے نہیں تم سے محبت ہے۔" کافی دیر ہنستے رہنے کے بعد اس نے اس سے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"مجھے ایک دفعہ سر نے سمیر کا ٹیسٹ دیا تھا۔ چیک کرنے کے لیے۔" اس نے کہا۔ اصل میں وہ ابھی تک بے یقین تھی کہ وہ سمیر ہے۔

"ہاں اور تمہارا ٹیسٹ مجھے دیا تھا۔"

"تمہیں......؟ تمہیں کیسے؟"

"میرا ٹیسٹ سر نے تمہیں دیا تھا اور تمہارا مجھے۔" اس نے بتایا۔

"مجھے تمہارا نہیں سمیر سجاول کا ٹیسٹ دیا تھا اور تم سمیر سجاول نہیں ہو، تم ہزار قسمیں بھی کھاؤ تو بھی میں نہیں مانوں گی کہ تم سمیر سجاول ہو، سمیر سجاول ایسی حرکتیں کرنے والا لڑکا ہی نہیں ہے جیسی حرکتیں تم کررہے ہو، سمیر وہ مجھے گھاس تک نہیں ڈالتا تھا۔"

"تم کیسے یقین کروگی کہ میں ہی سمیر ہوں۔"

"اے......یہ کیا بکواس کررہی ہو، یہ نہ ہو کہ یہ سمیر ہی ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ تمہیں گھاس تک نہیں ڈالتا تھا۔" صبا نے ہنسی روکتے ہوئے دبی دبی آواز



غزل

بچپن کی تصویر کو پا کر روئی ہوں
آنکھوں سے میں نیر بہا کر روئی ہوں

میرے عشق کا صدمہ کتنا گہرا تھا
ہر اک کو میں حال سنا کر روئی ہوں

مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے حاکم نے
عدل کی زنجیر ہلا کر روئی ہوں

صحراؤں میں سسی بن کر آئی تھی
پنوں کے کچھ خواب سجا کر روئی ہوں

کاغذ پر کچھ نقش اتارے ہاتھوں سے
پھر اس کی تصویر بنا کر روئی ہوں

کل شب اس نے لوٹ کے واپس آنا تھا
کمرے میں کچھ پھول بچھا کر روئی ہوں

اس نے فری لوٹ کے ہی کب آنا تھا
گھر کا ہر اک دیپ بجھا کر روئی ہوں

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

میں کہا۔

''میں سمیر سجاول ہی ہوں۔ جس روز ہمارے ٹیسٹ تبدیل کیے تھے اس دن تمہیں میری والی ٹیبل پہ بھی بٹھادیا تھا ٹیسٹ دینے کے لیے اور یہ کہ میرے آگے شیزی بیٹھا تھا، پیچھے فرخ، تم نے مجھے نیٹ ورک اسٹینڈرڈ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اب آگیا یقین یا اور بھی واقعے بتاؤں۔''

وہ کچھ سوچنے پہ مجبور ہوگئی۔ نیٹ ورک اسٹینڈرڈز والی بات تو ثمرین کیا صبا کو بھی نہیں معلوم تھی یہ بات تو صرف اس کے اور سمیر کے درمیان ہوئی تھی۔

''تم کہتی ہو ناں کہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارا بتاؤں، ٹھیک ہے میں بتادیتا ہوں پھر تو تمہاری تسلی ہوجائے گی ناں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔''

وہ خاموش رہی...... دوسری طرف وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا...... اور وہ خود کو کچھ کہنے کے قابل نہیں پارہی تھی۔

''ہیلو...... !'' بہت دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی تو دوسری طرف سے اس نے ہیلو کیا۔

''ہاں......'' وہ بہت مدھم انداز میں دھیرے سے بولی۔

''اب تو تم یقین کرتی ہو ناں کہ میں جھوٹا نہیں۔''

''ڈونٹ نو۔'' اس کی آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی۔

''کیا؟'' اسے سمجھ نہیں آئی۔

''معلوم نہیں، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں۔ اگر تم سمیر سجاول ہو ناں...... تو آئی ایم شاکڈ...... آئی ایم ریئلی شاکڈ......'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''میں گھر والوں سے بات کرتا ہوں، وہ مان جائیں گے اور جب وہ مان جاتے ہیں تو تم کیا کہتی ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''میں......؟'' ''یہ جب وہ مان جائیں گے تب تم مجھ سے پوچھنا۔'' اسے اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہورہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرا یہ نمبر میرا اپنا نہیں ہے، میرے پاس فون نہیں ہے، میری وہ سم جس پر تم کالز کرتے تھے وہ میری کزن کے پاس ہے اور یہ میری دوست کا نمبر ہے جو میں نے تمہیں دیا ہے۔''

''تھینک یو۔''

''نہیں تھینکس کی بات نہیں کیونکہ یہ نمبر آف رہتا ہے اس لیے میں نے بے فکر ہوکر تمہیں دیا تھا۔ اگر کوئی بات ہوئی تو تم مجھ سے کیسے رابطہ کروگے؟'' اس نے سوئے ہوئے دماغ کے ساتھ کہا۔

''میرے پاس تمہارے گھر کا نمبر ہے۔''

''نہ...... مہربانی فرمانا...... میرے گھر کے نمبر پر پلیز کوئی کال نہ کرنا۔''

''پھر...... چلو میں تمہاری کزن سے کہہ دوں گا۔''

''اس کو بھی فضول میں میسجز یا کالز کر کے اس کے گھر رولا نہ ڈلوانا...... ویسے بھی اس کا شوہر بہت تنگ نظر اور سخت مزاج شخص ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

''میں فون بند کررہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ!'' اس نے کہا اور فون بند کر کے بستر پر آلیٹی۔ اس کی طبیعت عجیب سی ہورہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ان پر اپنا بازو رکھ لیا۔ صبا اس کے پاس خاموشی سے بیٹھی رہی۔

یہ سمیر سجاول ہے؟ سمیر سجاول کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے...... وہ بھی مجھ سے؟ مجھ سے کوئی محبت کرتا ہے اور وہ بھی سمیر سجاول۔ اسے یقین... ٹوٹا تھا

کہ اس سے کبھی کوئی محبت نہیں کرسکتا کیونکہ اس نے کبھی خود کو کسی لڑکے کے سامنے ایسا بنا کر پیش نہیں کیا تھا کہ کسی کو کچھ لگے اور اگر وہ کسی کو پسند آبھی جاتی ہے تو بھی کوئی اس سے یہ کہنے کی جرأت کرنا تو دور خواب میں بھی ایسا کرنے کا ارادہ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کا رویہ ہی ایسا تھا کہ کسی کا حوصلہ اتنا بلند نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کا ایک یہ یقین ٹوٹا تھا اور دوسرا اسے یقین سمیر پہ تھا۔

سمیر ایسا لڑکا ہرگز نہیں تھا کہ کسی لڑکی میں انوالو ہوتا، ایسی حرکتیں تو لوفر، لفنگے لڑکے کرتے ہیں، سمیر کسی لڑکی میں دلچسپی لینے والا نہیں تھا۔ وہ کیسے کسی لڑکی میں دلچسپی لے سکتا تھا، وہ بھی کلاس کی نمایاں لڑکیاں چھوڑ کر اس لڑکی کو جو ہر لحاظ سے خود کو چھپا کر رکھنے کی کوششوں میں رہتی تھی۔ جو سب سے زیادہ باصلاحیت اور معاملہ فہم ہونے کے باوجود کالج کے معاملات میں دوسرے اسٹوڈنٹس کی احمقانہ باتیں اور منصوبے سن لیتی تھی مگر اپنی رائے نہیں دیتی تھی کہ اس طرح وہ دوسروں کی نظروں میں آجائے گی۔ کالج میں لڑکیاں کہتی تھیں۔

''شہرینہ! تم اتنی خوب صورت ہو اور جھلّی سی بن کر آجاتی ہو اگر تم خود کو صحیح طرح سے سنوار کر دوپٹا اوڑھنے کا اسٹائل بدل لو تو دیکھو کسی اور لڑکی میں خود کو خوب صورت کہنے کی جرأت نہیں ہو۔ ثمرین کو دیکھو، نہ صورت نہ شکل لیکن پورے کالج میں آدھے سے زائد لڑکے اس کے گھر تک کا طواف کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ خود کو بنا سنوار کر رکھتی ہے۔'' وہ جواب میں فقط مسکرا دیتی تھی۔ وہ چاہتی تو خاصی لمبی بحث کرسکتی تھی کہ اسے اپنے پیچھے لڑکے لگانے کا کوئی شوق نہیں جو وہ یہ اوچھی حرکتیں کرے۔ وہ یہاں صرف اور صرف پڑھنے کے لیے آتی ہے اس سے بڑھ کر اور اس کے علاوہ اسے کسی چیز کی خواہش نہیں مگر وہ لاحاصل قسم کی بحثوں سے کتراتی تھی۔

انمول موتی

☆ آگ لکڑی میں نہیں اس ہاتھ میں ہوتی ہے جو اسے آگ لگاتا ہے۔

☆ حقیقی سخاوت یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کو تکلیف سے بچانے کے لیے خود تکلیف اٹھالو۔

☆ جو تمہارے چہرے سے تمہاری خواہش پڑھ لے سمجھ لو کہ وہی تمہارا سچا دوست ہے۔

☆ بے اعتدالی کی اس سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے کہ انسان کو خوراک کے بجائے دوا کھانی پڑے۔

☆ کتابیں جوانی میں رہنما، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق ثابت ہوتی ہیں۔

☆ ضمیر کی عدالت میں ضرور جائیں کیونکہ وہاں غلط فیصلے نہیں ہوتے اور نہ وکیلوں کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔

☆ کردار ایک ایسا جوہر ہے جو پتھر کاٹ دیتا ہے۔

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

جب وہ ہر طرح سے خود بچا کر اور چھپا کر رکھتی تھی پھر کیسے سمجھتی کہ کوئی اس میں دلچسپی لے گا اور وہ بھی سمیر سجاول...... جو اپنی سیٹ پر بیٹھا جھکا ہوا سر تک نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ کسی لڑکی کو کیسے پسند کرسکتا تھا۔ اس میں کیسے دلچسپی لے سکتا تھا۔ اس کا اپنا یقین بھی ٹوٹا تھا اور سمیر پہ جو یقین تھا وہ بھی...... یہ بہت بڑا حادثہ تھا اس کے لیے جسے اس کا ذہن قبول نہیں کر پارہا تھا اور نتیجتاً وہ شاکڈ تھی۔

''صبا! میری طبیعت خراب ہورہی ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ پنکھا بند کردو پلیز۔''

''تمہیں گرمیوں کی اس کڑکتی دوپہر میں سردی لگ رہی ہے؟'' صبا کو شدید حیرت ہوئی۔

وہ خاموش رہی...... اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا فون سامنے کیا اور آنکھوں سے بازو ہٹا کر اپنے اکاؤنٹ کا بیلنس چیک کیا۔ اس کے بعد اس نے ڈھائی سو روپے سمیر کے نمبر پر شیئر کیے۔

''یہ کیا...... واپس کیوں کیے پیسے؟ میں نے تو نہیں مانگے تھے۔'' پیسے شیئر کرنے پر اسے میسج آیا۔

''رکھ لو...... میں نے تمہیں تنگ کرنے کے لیے پیسے مانگے تھے کیونکہ اس وقت میں تمہیں کوئی فلرٹ سمجھ رہی تھی۔ ورنہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جنہوں نے لڑکوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوتے ہیں۔'' اس نے جواباً میسج کیا۔

''تھینک یو۔'' اسے جواب آیا۔

''صبا! میری سم نکال دو۔'' اس نے صبا کے فون سے اپنی سم نکلوائی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم جا رہی ہو؟'' صبا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میری طبیعت خراب ہو رہی ہے صبا! میں گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور گھر کو چل دی۔

وہ اتنی شاکڈ ہوئی تھی کہ اسے بخار ہو گیا اور گرمیوں کی اس دوپہر میں جبکہ اور لوگوں کا پنکھے کے سامنے بیٹھ کر بھی برا حال ہو رہا تھا۔ اسے سردی لگ رہی تھی اور بدن کپکپا رہا تھا مگر اس نے اپنی طبیعت کا ذکر کسی سے نہ کیا کیونکہ وہ تنہائی اور خاموشی چاہتی تھی۔ اس کی ایسی حالت نہ تھی کہ کسی سے اس سے متعلق سوال جواب کرتی۔ ایک طرف سمیر سجاول کے متعلق سوچتی تو دوسری طرف ثمرین اور ثمر کے متعلق...... بلاوجہ ہی وہ ثمرین کی طرف سے بدگمانی کا شکار رہی۔ اگلے دن بھی اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ اس کزن والے جھوٹ کو کب تک پالے گی اور اس کی اب ضرورت بھی کیا تھی۔ لہٰذا اس نے سمیر کو میسج کیا۔

''تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟''

''آپ شہرینہ کی کزن ہیں۔'' سمیر کی طرف سے جوابی میسج آیا۔ وہ جواباً میسج میں لکھنا شروع ہو گئی۔

''میں شہرینہ کی کزن نہیں ہوں، میں تمہیں ثمرین کا بھائی یا کوئی اور سمجھ رہی تھی جو ثمرین کے کہنے پر میرے ساتھ فلرٹ کرنا چاہتا تھا۔ میں تم سے مکمل طور پر جان چھڑانا چاہتی تھی۔'' وہ ابھی میسج ٹائپ کر رہی کہ اسے ایک اور میسج ریسیو ہونے کی اطلاع ملی۔

''پلیز...... مجھے صحیح بتائیں آپ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

اس نے میسج دوبارہ سے لکھنا شروع کرنے کے بجائے سیدھا اسے کال ملائی۔

''ہیلو۔'' کچھ ہی دیر میں کال ریسیو ہوئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اُدھر سے جواب آیا۔

''اب پتا چلا، میں کون ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''نہیں پتا چلا؟'' شہرینہ نے کچھ حیرت ملی شوخی سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''نہیں۔'' وہ خاموش ہو گئی اور ایک لمحہ سوچ کر بولی۔

''کل آدھا گھنٹا کس سے......''

''سمجھ گیا، سمجھ گیا۔ اب آواز ہوئی ہے کلیئر......'' اُدھر سے وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے اور جوش سے بولا۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''شکر ہے...... یہ سم میرے پاس ہی تھی شروع سے، نہ میں نے پھینکی تھی اور نہ ہی کسی کزن کے پاس تھی۔ میں نے ہی اپنی کزن بن کر تم سے بات کی تھی۔''

''اچھا......؟'' سمیر نے کچھ پُرسوچ انداز میں

کہا۔

''تمہیں برا لگا...... تم نے مائنڈ کیا؟'' اسے کچھ خدشہ ہوا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں۔'' سمیر کا لہجہ اب بھی کچھ مدھم اور ڈھیلا سا لگ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری سمیر! اصل میں، میں تمہیں ثمرین کا کوئی واقف سمجھ رہی تھی۔'' اس نے ساری وجہ بیان کی کہ کیوں اس نے یہ سب کیا۔

''اچھا...اب تو نہیں سمجھتی ناں؟''

''نہیں...... نہیں اسی لیے بات کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر پوچھنے لگی۔

''تم اتنے عرصے سے مجھے کالز اور میسجز کر رہے تھے، میں نے اتنا عرصہ سم بند رکھی۔ تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ کبھی تمہاری حوصلہ شکنی نہیں ہوئی؟''

''ہوئی تو تھی مگر کالج میں جب تم کو دیکھتا، تو پھر رہ نہیں پاتا تھا اور عزم تھا کہ تم کو بتا کر ہی رہنا ہے۔ جواب چاہے کچھ بھی ہو مگر تم کو بتا کر رہوں گا۔''

''تم نے کالج میں کبھی مجھ سے ایسا کیوں نہیں کہا؟''

''مجھ میں کبھی سے فیس ٹو فیس ایسی بات کہنے کی ہمت نہیں۔ جب پرسوں تم کو کال کر رہا تھا، تم سے بات کرنے کے لیے تب بھی اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا کہ تم جب پوچھو گی تو میں کیسے کہوں گا کہ کیا کہنا چاہتا ہوں مگر میں نے خود سے کہا کہ اب ہمت تو کرنا ہی ہوگی اس لیے...... ویسے بھی کالج میں اگر کہتا تو کسی نہ کسی کو ضرور پتا چل جاتا اور پھر پورے کالج میں بات پھیل جاتی اور ہماری بدنامی ہوتی۔'' وہ سرشاری ہو کر زیرلب مسکرائی۔

''کب سے انٹرسٹ لے رہے ہو مجھ میں؟'' اس نے پوچھا۔

''فرسٹ ایئر سے۔''

اسے حیرت ہوئی۔

پیار امر ہے

میرا پیار امر ہے پیارے
تیری چاہ کی کچی ڈوری
تیرے حسن کا سونا جھوٹا
میرے عشق کی مٹی سچی

مرسلہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

''تو فرسٹ ایئر میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''میرے پاس آپ کا موبائل نمبر نہیں تھا۔ گھر کا نمبر ملا تھا صبا کی کاپی سے۔ آپ کے گھر کالز کرتا تھا مگر صرف آواز سن کر بند کر دیتا تھا، کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ بات کرتا۔''

''صبا کی کاپی سے؟'' اسے کرنٹ لگا۔ پھر پوچھا۔ ''اور میرا موبائل نمبر؟''

''وہ بھی ایک دفعہ صبا کی کمپیوٹر کی بک ٹیبل پر پڑی ملی تھی اس پہ لکھا تھا۔''

''اُف اللہ...... یہ احمق صبا...... میرا نمبر لکھ تو لیتی تھی مگر اپنی کاپیاں سنبھال کر نہیں رکھیں اس نے۔''

''فرسٹ ایئر میں جب سر نے ٹیسٹ کے لیے مجھے تمہاری ٹیبل پر بٹھا دیا تھا اس وقت بھی تھا تمہیں مجھ سے؟'' پیار محبت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے وہ خود بھی ہچکچا رہی تھی۔

''نہیں، وہ بہت شروع کی بات ہے تب کچھ نہیں تھا۔''

''مگر میں نے اتنا عرصے یہ سم بند رکھی، کالج تو روز آتی تھی جب ہمارا کالج آف ہوا تب تم نے سوچا نہیں کہ موبائل سے بھی رابطہ ممکن نہیں اور اب یہ کالج بھی نہیں آئے گی۔ آگے میں کہاں جاتی، کیا ہوتا تمہیں کہاں کچھ پتا ہوتا۔ تب تمہیں خیال نہیں آیا کہ خود ہی جا کر کہہ دوں۔''

"نہیں...... مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ سم ضرور آن ہوگی۔ اگر کسی اور کے پاس ہوتی تو اسی سے کہہ دوں گا کہ تم سے بات کروائے اگر یوں بھی ممکن نہیں ہوتا تو گھر کا نمبر تو تھا میرے پاس اس لیے کالج آف ہونے کی مجھے فکر نہیں تھی۔"

"تمہیں پتا ہے؟ میں تم سے تین سال بڑی ہوں، بیس کے ہو ناں؟"

"ہاں۔"

"میں تئیس کی ہوں، تم اس سے بددل نہیں ہوئے۔"

"دو تین سال بڑے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"جانتے ہو ہماری کاسٹ بھی مختلف ہے۔"

"کاسٹ الگ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، مسلمان ہونا کافی نہیں ہے؟"

"مجھے فرق پڑتا ہے سمیر ...میں اس پر بہت یقین رکھتی ہوں۔"

"کیوں......جن کی کاسٹ الگ ہو ان کا مذہب ایک نہیں ہوتا کیا؟" اس نے خاموشی سے ہونٹ چبائے، اسے اس.... تضاد پہ اعتراض تو تھا مگر وہ یہ اعتراض اس کے سامنے بار بار کر کے یا اس پہ ڈٹ کر اس پہ بحث کر کے وہ اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے خاموش ہو رہی لیکن پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"تمہاری فیملی میں تو کرتے ہوں گے اس کا فرق۔"

"نہیں کوئی نہیں کرتا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا...... مجھے یہ تو بتاؤ، تم شروع شروع میں دوستی کے لیے کیوں کہتے تھے؟"

"اور کیا کہتا......؟ اگر شادی وادی کی بات کرتا تو تم بہت غلط سمجھتیں اور کہتیں کہ یہ دیکھو شادی کی آفر لے کر آ گیا ہے۔ پہلے تو سب دوستی کا ہی کہتے ہیں ناں۔" وہ اس کی سادگی پہ زیرِلب مسکرائی۔

"اور ابھی کچھ دن پہلے جب میں کزن بن کر تمہیں میسج کر رہی تھی، تم نے اتنے لمبے لمبے میسج کرنے کے بجائے سیدھے کال کر کے بات کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"میں شکر کر رہا تھا کہ کم از کم کوئی میسج تو کر رہا ہے، کال کرتا تو کہیں تم برا ہی مان جاتیں اور میسج سے بھی جاتا۔"

"اوہ اچھا......" وہ اب سمجھی۔

"ایک بات کہوں سمیر؟ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم سمیر سجاول ہی ہو۔ میرے کلاس فیلو۔"

"کیسے یقین دلاؤں تم کو؟" وہ کچھ پریشان ہوا۔

"نہیں، ضرورت نہیں۔ ویسے جانتے ہو میں کلاس فیلوز کی شادی کے سخت خلاف رہی ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ بہت غلط لگتا ہے، بہت گندے لگتے ہیں وہ لڑکے اور لڑکیاں جو کالج جا کر پڑھنے کے بجائے اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔"

"اب اگر کوئی کلاس میں ہی اچھا لگنا شروع ہو جائے تو اس میں جرم کیا ہے اور قصور کیا ہے؟ کوئی جان بوجھ کر تھوڑی کسی کو پسند کرنے لگتا ہے۔"

"کوئی جرم نہیں ہوتا مگر یہ ایک غلط رویہ ہے اور میں اس کی مخالفت کرتی ہوں سمیر۔ انسان جہاں بھی جائے جس مقصد سے بھی جائے صرف اس مقصد سے منسلک رہنا چاہیے۔ اگر مجھے کلاسز کے دوران تمہارا پتا چل جاتا ناں سمیر! تو میں تمہارا بہت برا حشر کرتی...... اور تم مجھے منا لیتے...... یہ ناممکن تھا۔ تم چاہے کتنے بھی اچھے، کتنے ہی مخلص ہوتے...... لیکن صرف تمہارے کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے میں ہرگز تمہیں قبول نہیں کرتی۔" اس نے بے لچک انداز میں کہا۔

دوسری طرف سے گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی کیا کیفیت ہو رہی ہے اس لیے بولی۔

"لیکن اب تو ہم کلاس فیلو نہیں ہیں ناں۔ اب تو کالج اوور ہو چکا ہے، ہے ناں؟"

"تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟"

"نہیں، کیا کروں بات؟"

"ہاں......"

"لیکن ابھی تو میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"جانتی ہوں...... لیکن والدین کو پتا ہونا چاہیے...... تمہارے بھی، میرے بھی...... دیکھو...... جن لڑکے لڑکیوں کے رشتے والدین طے کر دیتے ہیں اور ان کی شادیاں کئی کئی سال بعد ہوتی ہیں۔ وہ آپس میں ملتے ہیں، ہوٹلنگ کرتے ہیں، کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔ حالانکہ اکثر ایسے رشتے شادی سے پہلے ٹوٹ بھی جاتے ہیں لیکن کوئی انہیں الزام نہیں دیتا کیونکہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ ہمارے والدین نے ہمارے رشتے جوڑے تھے لیکن اگر ہم والدین کو بے خبر رکھ کر صرف فون پہ ہی پانچ منٹ بات کر لیتے ہیں اور کل کو ہماری شادی ہو بھی جاتی ہے تو بھی یہ سب ایک گناہ ہوگا۔ لوگوں کو اگر نہ بھی پتا چلے تو بھی بندہ اپنے طور پر تو گلٹ فیل کرتا ہی ہے۔ میں خود بھی ابھی تین چار سال تک شادی نہیں کرنا چاہتی اور میں چاہتی ہوں تمہیں اتنا عرصہ مل جائے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنے لیے درست فیصلہ کرنے کے لیے...... تاکہ تمہیں بعد میں یہ احساس یا پچھتاوا نہیں ہو کہ تم نے جلد بازی سے کام لیا اور وقتی کشش کو پیار سمجھ بیٹھے، اتنے عرصے میں ہو سکتا ہے تمہیں کوئی اور مل جائے اور میں چاہتی ہوں کہ ایسا ہو۔"

"تاکہ جان چھوٹے۔" وہ بولا۔

"نہیں......" اس نے فوری کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں اگر مجھے تم سے جان چھڑانا ہوتی تو تم سے اس طرح بات نہیں کر رہی ہوتی۔ صاف، صاف منع کر دیتی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ تم سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو۔ میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی مجھ سے بہتر مل جائے۔ جو عمر کے لحاظ سے بھی تمہارے لیے مناسب ہو۔"

"انشاء اللہ ایسی کبھی نہیں ملے گی۔ تم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔"

سمیر نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"اچھا! میرا یہ نمبر آن ہی ہے، وہ جو دوسرا نمبر میں نے دیا تھا... ناں، اپنی سہیلی کا کہہ کر...... وہ بھی میرا ہی نمبر ہے۔ وہ ابھی بند ہے۔ جب وہ آن کرنا ہو تب یہ سم نکال لیتی ہوں۔"

"او کے......"

"اچھا! میں فون بند کرتی ہوں، اللہ حافظ۔"

افسانچہ

پچھلے کچھ عرصے سے اس کی سرگرمیاں کافی مشکوک...... تھیں، ہر کوئی اس کی شکایت کر رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اس پر نظر رکھوں۔ دن میں وہ دکھائی نہ دیتا، رات دیر گئے دبے پاؤں آتا۔ بالآخر اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر میں نے کچھ سوچا۔ رات کے پچھلے پہر جب ہو کا عالم تھا میں نے کچن میں جا کر زہر کا نوالہ بنایا، پلیٹ میں رکھا اور آٹے کے کنستر کے نیچے چھپا دیا۔ جب رات ہوئی میں نے دیکھا وہ آیا اس نے اٹھا کر کھا لیا۔ ارے یہ کیا ہوا دوستو...... آج کل زہر بھی خالص نہیں ہے، میرے کچن کا چوہا زہر کا نوالہ کھا کر مزے سے ڈکار لے کر نکلا اور میں ہاتھ ملتی رہ گئی۔

صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

"اللہ حافظ!" سمیر نے کہا۔

☆☆☆

"کی اپنے والدین سے بات؟" اس روز اس نے فون پر سمیر سے بات کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اپنی بھابی سے بات کی ہے، ان سے کہا تھا کہ وہ امی سے بات کریں اور اس وقت وہ اُن کے کمرے میں ہی بات کرنے گئی ہیں۔ ویسے میں نے امی کو تمہاری تصویر دکھائی تھی کہہ رہی تھیں کہ اچھی ہے۔"

"میری تصویر......؟" اسے از حد حیرت ہوئی۔

"ہاں۔" سمیر نے کہا۔

"تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

"پارٹی کی مووی تھی ناں میرے پاس، اس میں سے نکالی تھیں میرے پاس تمہاری سو سے زائد تصویریں ہیں، کچھ پارٹی کی مووِیز کی اور کچھ میں نے کلاس میں موبائل فون سے لی تھیں۔"

"کیا......؟" وہ دم بخود رہ گئی۔

"تم کلاس میں بھی میری تصویریں کھینچتے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، اکثر...... میتھ کے پیریڈ میں کون سر پر توجہ دیتا تھا، سب اپنا، اپنا کام تو کرتے تھے۔ میں بھی زیادہ تر اسی پیریڈ میں تصویریں لیا کرتا تھا۔

"اُف اللہ...... سمیر!" اسے بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"تمہیں تو میں بہت ہی سادہ سمجھتی تھی۔ اب کلاس کے سب سے سادہ اور شریف لڑکے کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا حال ہوگا۔"

"اندازہ لگالو۔" وہ ہنسا پھر اس سے پوچھنے لگا۔ "تم نے مائنڈ کیا؟"

"نہیں......" اس نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تمہاری محبت پر میں مائنڈ کیوں کروں۔ ہاں حیرت ضرور ہوئی۔"

"مجھے لگتا ہے بھابی امی کے کمرے سے باہر آچکی ہیں۔ میں جا کر پوچھتا ہوں پھر تمہیں فون کر کے بتاؤں گا۔"

"او کے......" اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔

وہ سوچنے لگی کہ اب جانے اس کی امی کیا کہتی ہیں، وہ یونہی بستر پر بیٹھی آس و نراش کی کیفیت میں سمیر کی کال کا انتظار کرتی رہی۔

کچھ دیر بعد سمیر کی کال آگئی۔

"ہیلو......"

"ہاں جی! کیا ہو رہا ہے؟" سمیر کا لہجہ بشاش بشاش تھا۔

"تم بتاؤ، کیا کہتی ہیں امی؟"

"وہی جو میں توقع کرتا تھا۔ وہ راضی ہیں۔"

"اور ابو؟"

"ان سے آج رات کو امی بات کریں گی۔"

"اور وہ راضی نہیں ہوئے تو؟"

"امی بات کریں گی ناں، ہو جائیں گے راضی۔"

"اور اگر نہ ہوئے تو......؟"

اس کے سوال پر سمیر فوراً کچھ نہ بولا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے اس کے بولنے سے پہلے کہا۔

"دیکھو سمیر! میں چاہتی ہوں اس کے لیے تمہارے گھر کا ایک، ایک فرد راضی ہو کیونکہ میں ان میں سے نہیں جو صرف اپنے شوہر سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری پوری فیملی کے ساتھ رشتہ نبھانا چاہتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھ سے ناخوش ہو۔ میری طرف سے تمہاری فیملی کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اس کی گارنٹی میں دیتی ہوں اور تمہاری فیملی سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی اس کی گارنٹی تمہیں مجھے دینا ہوگی۔"

"رائٹ...... لیکن تمہاری فیملی کیا راضی ہو جائے گی؟"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں...... ایسا کوئی ریزن ہے ہی نہیں کہ وہ اعتراض کریں۔ میں تم سے بڑی ہوں، اس کا اعتراض تمہاری طرف سے ہونا چاہیے۔ ہماری طرف سے نہیں۔ رہ گئی ذاتیں مختلف ہونے کی بات تو میں تمہیں بتاؤں ہمارے پورے خاندان میں کوئی بھی اب ذات پات کا فرق نہیں کرتا سوائے میرے...... یہ میں ہی ہوں جو رشتے، لین دین کے معاملے میں ذاتوں کے فرق پہ اعتراض کرتی ہوں حالانکہ میں خود اتنی میچورڈ نہیں ہوں جو ایسے فیصلے کرسکوں مگر کسی حد تک میں بااصول ہوں، ضدی نہیں جس طرح تم نے مجھ سے پیار کیا ہے، تمہاری شرافت اور تمہارے جذبات کی سچائی کے آگے میرے اصولوں کی حدود ختم ہو جاتی ہیں سمیر...... مجھے میرے اصول تمہارے سچے اور معصوم جذبوں سے زیادہ اہم نہیں اور جب میں ہی اعتراض نہیں کر رہی تو دوسرا کوئی ہے ہی نہیں ہمارے خاندان میں جو ذات کا فرق نکالے...... مسئلہ صرف تمہارے خاندان کا ہے سمیر...... اور میں تمہاری فیملی کے ایک چھوٹے بچے کی بھی رضامندی کے بغیر تم سے شادی نہیں کروں گی۔ اس لیے تم سے پوچھ رہی ہوں اگر تمہارے ابو نہ مانے تو تم پھر آگے کیا کرو گے؟"

"اگر ایسی بات ہے تو میں خود کو لٹکا لوں گا۔"

"شٹ اپ......" وہ بے ساختہ چلائی۔

"تو اور کیا کہوں؟"

"منہ بند رکھو تم اپنا......" وہ پھر دہاڑی۔

"ابو مان جائیں گے ناں...... کہا ناں کہ امی ان سے بات کریں گی اور وہ نہ مانے تو بھی امی منالیں گی۔"

"سوری سمیر! میں نے تم پر غصہ کیا۔" اسے اپنی زیادتی کا یکایک احساس ہوا۔

"نو سوری...... تم غصہ کرو، جو چاہے کہو، نو سوری،

غزل

کتنی آہیں تھیں تعاقب میں میرے
جانے کس کس کا مُدعا ہوں میں
ٹھہر ٹھہر کے برستے ہیں اشک
جیسے ساون کی اِک گھٹا ہوں میں
آنسو آنکھوں میں ہنسی ہونٹوں پر
ہجر کی ایک بددعا ہوں میں
ہوں تو اس دور کی مگر پھر بھی
ہر ایک شخص سے جُدا ہوں میں
دید کے واسطے تڑپ کیسی
جہاں دیکھو وہاں، وہاں ہوں میں
آنکھ کی تحریر سمجھتی ہوں کرنؔ
کیونکہ الفت کی انتہا ہوں میں

شاعرہ: شہناز کرن، پشاور

محبت میں

محبتوں کے قال میں
وحشتوں کے جال میں
کون جانے آج کل
کون ہے کس حال میں
محبتیں تو کھیل ہوئیں
عداوتوں کی چال میں
رہزنوں نے لوٹا ہے
رہبروں کی ڈھال میں
کوثرؔ ایمان کو بچانا ہے
اس عہدِ دجال میں

کوثر اعجاز چوہدری، للیانی
مصطفیٰ آباد ضلع قصور

نو ایکسکیوز، مجھے تمہاری کوئی بھی بات بری نہیں لگ سکتی شہرینہ......''

''سمیر!'' اس نے پُرسوچ انداز میں پکارا اور قدرے توقف کے بعد پوچھنے لگی۔ ''تم میری کون سی غلطی معاف کرسکتے ہو اور کون سی غلطی کبھی نہیں معاف کرسکتے؟''

اس نے پوچھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اگر کچھ غلط بھی بول جائے تو بھی سمیر اسے ٹوکتا نہیں تھا جبکہ خود کوئی معمولی سی بات کرنے سے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے اور اس پر اس نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ اس طرح نہیں ہوتا۔ جو بات کرنی ہو کھل کر کیا کرو...... اگر کوئی بات بری لگے گی تو تمہیں آرام سے کہہ دوں گی کہ دوبارہ ایسی بات نہیں کرنا۔

اصل میں وہ اس بات کو تو اتنا محسوس نہیں کررہی تھی مگر سمیر جس طرح اس سے ہر بات کرنے سے پہلے سوچتا تھا اس نے اسے غور کرنے پر مجبور کردیا تھا اور اس نے جانا تھا کہ جس طرح وہ پہلے ثمر سمجھ کر اسے نظر انداز کرتی آئی تھی اس سے سمیر کو یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے اس کی بات بری لگ جائے اور وہ اس سے بات کرنا چھوڑ دے اور پہلے کی طرح اس سے رابطے کے تمام راستے بند کردے۔ اس لیے اس نے سمیر کا یہ خدشہ دور کیا کہ وہ ایسا نہ سوچے۔ کسی سے وہ اتنی آسانی سے رشتہ جوڑتی نہ تھی اور اب جو جوڑ لیا تھا تو ہمیشہ نبھانے کے لیے آخری حد تک کوشش کرے گی۔

''کوئی بھی ایسی بات نہیں، میں تمہاری ہر غلطی معاف کرسکتا ہوں۔'' سمیر نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''پھر بھی سمیر...... کچھ ایسا ہوتا ہے ناں کہ ایک مرد کہتا ہے چاہے جو بھی ہو مگر یہ نہ ہو۔ کوئی تو ایسی غلطی بتاؤ ناں تاکہ میں نہ کروں۔'' اس نے اصرار کیا۔

''کوئی ایسی بات نہیں۔ ہاں اتنا کہوں گا مجھے کبھی نہ چھوڑنا...... میں یہ برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

''اور اگر تم نے ہی مجھے چھوڑ دیا تو؟''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا...... اگر ہوا تو تم مجھے گولی مار دینا۔'' سمیر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں نے کبھی چھوڑا تو تم کیا کروگے؟''

''میں کیا کروں گا، تب بھی تم ہی مجھے مار دینا۔''

''سمیر!'' بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ کچھ دیر وہ آنکھیں اور ہونٹ بھینچے خود پر کنٹرول کرتی رہی اور دوسری طرف سمیر بے چین اور پریشان ہوگیا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کی اس بات نے شہرینہ کے اندر کی دنیا بدل دی تھی۔ وہ بے چین ہورہا تھا کہ شاید شہرینہ کو اس کی بات بری لگ گئی ہے اور وہ ناراض ہورہی ہے مگر وہ اتنا پوچھنے کی ہمت بھی نہیں پارہا تھا اور ائیر پیس سے شہرینہ کی آواز ابھری۔

''پتا ہے سمیر! اب تک میں نے صرف تمہارے جذبوں کی سچائی کا احترام کرتے ہوئے صرف تمہیں قبول کیا تھا۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی سمیر...... مگر اب میں کہتی ہوں سمیر! اگر میں صرف تمہیں قبول کرنے کی صورت میں آخر تک رشتہ نبھانے کا ارادہ رکھتی تھی تو اب میں تمہیں اتنا یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہیں کبھی کسی بھی صورت نہیں چھوڑوں گی۔ انشاء اللہ...... کیونکہ سمیر اب مجھے بھی تم سے پیار ہے۔ آئی لو یو سمیر......''

سمیر سمجھتا تھا کہ شہرینہ جو اس سے بات کرتی ہے تو وہ بھی اس سے پیار کرنے لگی ہے مگر جو ابا وہ کہہ رہی تھی تو وہ کچھ پریشان ہورہا تھا۔ اسے اپنی سانسوں کی روانی اور دل کی دھڑکن میں بے ترتیبی محسوس ہونے لگی تھی مگر جو آخر میں شہرینہ نے کہا تو بے اختیار ہی اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں اور اس نے اس شیریں سے درد کے ساتھ اِک احساسِ تشکر سے آنکھیں بند کیں۔ آنسو تیزی سے اس کے گالوں پر لڑھک آئے اور اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے ہی سرگوشی کی۔ ''آئی لو یو ری!''

شمع ہدایت

سیدہ ناز ظفر کاظمی

اسوہ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

تمام تعریفیں اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس پاک رب العزت کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور پھر ہماری معاشرتی زندگی، سماجی جدوجہد، تہذیب کے ارتقا، بنیادی حقوق کے تحفظ اور دنیاوی نظام کی تشکیل کے لیے اپنی جانب سے کچھ خاص ہستیوں کو منتخب فرمایا جنہیں انبیائے کرام اور مرسلین کہا جاتا ہے۔ ان ہستیوں کی بدولت انسان کی ہدایت و رہنمائی کا عمل بتدریج جاری رہا۔ نبوت کا یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور بالآخر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر اختتام پزیر ہوا۔

مقام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ دیگر تمام انبیائے کرام سے بہت بلند ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے انسان کی ہدایت، رہنمائی اور تربیت کا ایسا جامع دستور انسان کو مہیا کیا جس کے ذریعے روز قیامت تک رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپؐ افضل الانبیا اور سید المرسلین ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب میں ایک لقب ختمی مرتبت بھی ہے، جس سے مراد ہے کہ جتنے بھی مراتب انسان کی عظمت کے ہوسکتے ہیں ان سب کا اوجِ کمال اور خاتمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ہوتا ہے۔

بقول شاعر مشرق علامہ اقبال

حسن یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس وجہ تخلیق کائنات ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپؐ کو تخلیق کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں اس کائنات کو نہ بناتا، نہ روشن کرتا میں شمس و قمر کو، بناتا میں نہ ہرگز بحر و بر کو مگر مقصود یہ پیشِ خدا ہے جو ذات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے یعنی آپؐ کی ذات اقدس وجہ تخلیق کائنات ہے۔ آپؐ کا نور، نور الاولین قرار پایا اور خود اس بارے میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ اقدس سے ارشاد رب العزت بیان فرمایا۔

اول ماخلق الله نوری

اللہ نے آپؐ کو افضل المرسلین قرار دیا۔ آپ کو رحمت اللعالمین کے لقب سے سرفرازی عطا کی۔

معلم اخلاق

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ کائنات اور خُلق عظیم کا بے مثال نمونہ ہیں۔ آپؐ محسن انسانیت اور ہادی عالم ہیں۔ آپؐ دوسروں کے ہمدرد، یتیموں اور مسکینوں کے غمگسار اور بے کسوں کا سہارا ہیں۔ آپؐ سب کے ساتھ مساوات اور رواداری کا سلوک کرتے اور کبھی دوسروں کو اپنے سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ نے عفو و درگزر کے بہترین نمونے پیش کیے۔ آج انسان کے سرمایۂ حیات میں فلاح، سعادت، بہترین اخلاق اور نیک اعمال کے جو اثرات نظر آتے ہیں وہ سب آپؐ کے ہی

لکڑی سے قرآن پاک لکھنے کی سعادت

ہمارا چھوٹا سا شہر سلانوالی ضلع سرگودھا ہینڈی کرافٹ کے ہنر سے پہچانا جاتا ہے۔ بیشتر آبادی اس پیشے سے منسلک ہے۔ جگہ جگہ لکڑی کے کارخانے، آرا مشین ودیگر بھاری مشینری اور اسی سے متعلق خصوصی مارکیٹس دیکھنے کو ملتی ہیں۔

لکڑی سے بنے دیدہ زیب آئٹم، فرنیچر، ڈیکوریشن پیسز، جیولری باکسز، قیمتی منقش لکڑی کے جھولے، بال پوائنٹس، قلمدان، میکرامے، جھروکے، کٹلری سیٹ، کچن سیٹ، ڈرائی فروٹ سیٹ خوب صورت مختلف ڈیزائن میں باسکٹ غرضیکہ ہر چیز بنائی جاتی ہے۔ چاروں صوبوں کی ثقافت کے چیدہ آئٹم بھی بنائے جاتے ہیں۔ خوب صورت کھلونے، ٹرک، گاڑیاں، بیل گاڑیاں، جھونپڑیاں، فروٹ اور نہ جانے کیا کچھ یہاں کے ماہر اور کاریگر ہاتھ سے بناتے اور تراشتے ہیں۔ ہمیں اپنے ان محنتی کاریگروں پر بے حد فخر ہے۔ نہ صرف مرد بلکہ اس کام میں خواتین اور بچے بھی دن رات مصروف رہتے ہیں۔ بوجہ غربت خواتین مشینوں سے کٹائی کا کام بھی کرتی ہیں اور نقش نگاری بھی...... چھوٹے بچے ریگ مال، پالش اور پیکنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ یوں تو مقدس آیاتِ مبارکہ، درود پاک، آیت الکرسی کے لکڑی سے تراش کر خوب صورت فریم بھی بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کے خوب صورت آئٹم برآمد بھی کیے جاتے ہیں۔ یہاں سے تعلق رکھنے والے چوبیس سالہ نوجوان، حافظ محمد تنویر رؤف نے لکڑی سے پورا قرآن پاک لکھا۔ خود انہوں نے 17 سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ تنویر رؤف ہینڈی کرافٹ کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

یہ قرآن پاک سنبل کی لکڑی سے لکھا گیا ہے۔ مشین کے ذریعے لکڑی کو پریس کیا گیا ہے۔ پورا قرآن پاک کمپیوٹرائزڈ پرنٹ میں نکلوایا۔ لکڑی کے تختوں پر چسپاں کیا گیا۔

جرمنی کی تیار کی ہوئی آری کے ساتھ تراشا گیا اس آری کے ساتھ باریک سوئی بھی لگائی گئی ہے جو اعراب ، زیر، زبر، پیش، نقاط کو مہارت سے تراشا گیا۔ ایک پارے کی لمبائی 40 انچ، چوڑائی 24 انچ، وزن 20 کلوگرام ہے۔ پارہ نمبر 1 تا 30 الگ الگ بالترتیب نہایت محنت اور خوب صورتی ومہارت سے لکھے گئے ہیں۔ مکمل قرآن پاک کا وزن ساڑھے 16 من ہے۔ سرورق بے حد خوب صورت ہے، لاثانی کی شیٹ سے تیار کیا گیا ہے۔ حافظ تنویر رؤف صاحب نے ان شیٹوں کو خود ہی میرون کلر پالش کیا ہے، 26 ماہ میں قرآن پاک کا مقدس کام مکمل ہوا۔

اس کام میں لکڑی 18 کلوگرام، لوہا 45 کلوگرام، پلاسٹک 40 کلوگرام، کپڑا جس کا نام swade ہے کالے رنگ کا ہے، جس پر انتہائی مہارت کے ساتھ قرآن پاک کے حروف کو چسپاں کیا گیا ہے۔ (جزاک اللہ) اس پر تقریباً 12 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں، 8 لاکھ کا مٹیریل 40 لاکھ مزدوری کا خرچہ ہوا ہے۔ اس وقت قرآن پاک زیارت کے لیے لاہور بھیجا گیا ہے۔ حافظ تنویر رؤف کی دلی خواہش ہے کہ اس قرآن پاک کی سب زیارت کریں کہ بے حد دینی جذبے، محبت، ان تھک محنت سے انتہائی احتیاط سے خوب صورت حروف کو تراشا گیا ہے۔ ان کے اس جذبے اور کام پر اہالیانِ سلانوالی کو بے حد فخر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حافظ تنویر رؤف کو مزید ایسے کام کرنے کی اہمیت وصلاحیت طاقت اور محبت عطا فرمائے۔ اس نے بے مثال محنت، محبت، خلوص اور لگاؤ سے کام کیا ہے، ان کے کام اور اس جذبہ و محبت وعقیدت کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ ہم سب کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان کی دلی خواہش ہے قرآن پاک کی سب زیارت کریں اللہ تعالیٰ ان کی یہ خواہش پوری فرمائے، آمین۔

تحریر: امینہ عندلیب، سلانوالی

فیوض وبرکات کا ثمر ہیں۔

اصلاح معاشرہ

حضور پاک ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد اصلاحِ معاشرہ کے لیے دن رات ایک کردیا۔ اپنے کردار وعمل سے وحشی اور ظلم و بربریت میں گھرے معاشرے کی اصلاح کی۔ اس سلسلے میں آپؐ کو بے شمار مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپؐ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

مقام زن از روشنی پیغام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

یوں تو حضور پاک ﷺ کا اسوہ ہماری تمام زندگی کے پہلوؤں کے لیے مشعلِ راہ ہے لیکن عورت کو زبوں حالی سے نجات دلا کر ایک بلند و باعزت مقام عطا کرنا آپ کی زندگی اور فرضِ منصبی کا اہم ترین حصہ ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل عورت کو بے انتہا حقیر اور ایک خریدی ہوئی چیز سمجھا جاتا تھا۔

اسلام نے جنت کو ماں کے قدموں تلے قرار دیا ہے، بہن کو بھائی کا ہمدرد اور غمگسار بتایا، بیوی کو شوہر کی شریکِ حیات، شوہر کا نصف ایمان اور قابلِ احترام ساتھی قرار دیا۔ بیٹی کو باپ کے لیے رحمت اور گھر میں برکت کا ذریعہ قرار دیا۔

حضور ﷺ نے عورت کے احترام کے دروس کی نہ صرف کی تبلیغ کی بلکہ عملاً اس طرز زندگی کو اپنی زندگی سے اجاگر کیا۔ جب آپؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہوجاتے۔ آپؐ نے اس طرزِ عمل کے ذریعے ظاہر کیا کہ لڑکیاں قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ عزت و احترام ہیں۔ آپؐ نے کبھی بلند آواز میں کسی سے گفتگو نہ کی اور عورتوں کے سلسلے میں بھی نرم روی کا یہی سبق دیا، چاہے وہ جس رشتے سے بھی وابستہ ہوں۔ اسلامی تعلیمات میں کسی خاندان میں بیٹی کی پیدائش کو رحمت کی آبشار جاری ہوجانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کو کوئی اپنے گھر بیٹی ہونے کی خبر دیتا تو آپ ﷺ فرماتے۔ ”دختر تو مثلِ خوشبوگل ہے اور اس کا رزق اللہ پر ہے۔“ (میزان الحکمت)

نیز آپ نے فرمایا جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو، وہ اسے اذیت نہ دے، اس کی تذلیل نہ کرے اور بیٹوں کو اس پر ترجیح نہ دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ (میزان الحکمت)

آپ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ ایک بیٹی دے اور وہ اس کی اچھی تربیت کرے اور بہترین تعلیم دے اور اللہ کے دیے ہوئے رزق سے اس کی پرورش کرے تو وہ بیٹی قیامت کے دن اس کے لیے جہنم سے ڈھال بن جائے گی۔“ (میزان الحکمت)

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص دو لڑکیوں یا دو بہنوں کی خورونوش کا کفیل ہوتا ہے تو وہ دونوں اسے آتشِ جہنم سے محفوظ رکھیں گی۔ (حیات الصادقین)

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا: لڑکیاں حسنات ہیں اور لڑکے نعمات، حسنات پر ثواب ملتا ہے اور نعمات کا حساب ہوتا ہے۔ (حیات الصادقین)

حاصل گفتگو

غرض حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کا ہر پہلو تمام عالمِ انسانیت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے۔

لقد کان لکم فی رسول الله اسوه حسنه

(سورۃ الاحزاب، 21)

ترجمہ: تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں بہترین نمونہ ہے۔ اگر تمام مسلمان اخلاق رسول اللہ ﷺ پر خلوص دل سے عمل پیرا ہوجائیں تو نہ صرف دنیا میں ترقی اور عظمت کی معراج حاصل کرسکتے ہیں بلکہ روحانی عظمتوں کو حاصل کرکے اپنی آخرت کا سامان تیار کرسکتے ہیں۔

اللہ پاک ہم سب کو سنت رسول اکرم ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، الٰہی آمین۔

☆☆☆

”کون سا روپ ہے درکارِ محبت میں ظفرؔ“

شائستہ زریں

خالد معین اپنی نظم ”محبت“ میں محبت کے حوالے سے کہتے ہیں

یہ ایسا اسمِ اعظم ہے
جو دل سے دل کا رشتہ جوڑتا ہے

بلاشبہ محبت دو دلوں کے باہمی ارتباط کا دوسرا نام ہے۔ جس میں فریقین کے دل میں موجود ایک دوسرے کے لیے احترام، اعتبار، اعتماد اور ایثار کے جذبات محبت کو دوآتشہ کردیتے ہیں۔ انجم انصار اپنے افسانوی مجموعہ ”رنگ چاہت کے“ کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں کہ

”میرا یہ یقین ہے کہ زندگی کے تمام تر جذبات و احساسات میں محبت اسمِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہے کہ یہ رنگ انسان کا اصل رنگ ہے اور انسانیت کی بقا بھی اسی رنگ میں مضمر ہے۔ اور یوں بھی محبت کی روشنی زندگی کی تمام شاہراہوں کو روشن و منور رکھتی ہے۔ جس کسی کے پاس یہ نعمت نہیں اس سے بڑھ کر کوئی تہی دست نہیں۔“

گویا محبت سرمایۂ حیات ہے اور اس کھیتی کی نمو کے لیے اظہار کی آبیاری سونے پر سہاگہ ہوتی ہے۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں ”عورت کی محبت ہمیشہ اظہار کی محتاج رہتی ہے ورنہ اپنی موت آپ مرجاتی ہے۔“

یقیناً صنفِ نازک اس معاملے میں صنفِ آہن سے زیادہ حساس ہے لیکن اظہار کے طریقے بلاتخصیص زن و مرد سب کے مختلف ہوتے ہیں بقول شاعر

ہر سمت کو پھیلی ہے محبت کی زمیں
دریا میرے اظہار کا کس سمت کو جائے

اور محض اظہار پر ہی کیا منحصر ہے راہِ الفت کے بعض مسافر ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں تو بعض ہر فکر سے بے نیاز سب جائز ہے کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ صابر ظفر نے کہا تھا کہ

کون سا روپ ہے درکار محبت میں ظفرؔ

اور یہی تو ہم بھی جاننا چاہتے ہیں لیکن ان سوالوں کے ذریعے کہ

سوال۱: محبت کا سب سے خوب صورت رنگ آپ کی نظر میں کون سا ہے؟

سوال۲: کیا محبت (خواہ رشتے کی نوعیت کچھ بھی ہو) اظہار سے نمو پاتی ہے؟ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

سوال۳: ایک قول ہے ”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے“ جبکہ دوسرا قول ہے ”محبت اور جنگ میں جو ہو جائز ہو“ آپ کا نظریہ کیا ہے؟

شہناز احد

۱: محبت رنگ نہیں کہ اس کے اچھے برے رنگوں کو بیان کیا جائے یہ صرف اور صرف جذبہ ہے، احساس ہے جو کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی رشتے میں ہو لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا۔

۲: محبت کا اظہار تو بہت ہوتا ہے اور ہر رشتے میں ہوتا ہے خاص کر بنا سپتی محبت گلی گلی بک رہی ہے، بات یہ ہے کہ جس محبت کے بارے میں تم جاننا چاہ رہی ہو وہ تو اب خواب و خیال ہوئی۔ اس کو تو پوری ٹیوب لائٹ لے کر بھی ڈھونڈو گی تو نہیں ملے گی۔ محبت، اظہار سے نمو تو نہیں پاتی لیکن اظہار چاہتی ضرور ہے۔

۳: یہ محبت کی بہت پرانی تھیوری ہے۔ پہلے سب کچھ کرلیا پھر کہہ دیا سب جائز ہے۔ جائز اور ناجائز میں



شہناز احد

باریک سی لکیر ہے۔ اس کا قائم رہنا ضروری ہے اگر یہ نہ ہو تو محبت کچھ نہیں، ہاں جنگ ہوسکتی ہے۔

عائشہ ہمدانی
(ماہرِ نفسیات)

۱: محبت کے دو رنگ بہت حسین ہیں ایک ممتا کا رنگ جو محبت کے بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے کہ ماں اپنی اولاد کی خوشی اور سکھ کی خاطر ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر اور قربانی دے کر بھی تھکن نہیں راحت محسوس کرتی ہے۔ دوسرا میاں بیوی کی محبت کا رنگ، اگر اس رشتے کی سچائی کو محسوس کیا جائے تو ان کی ایک دوسرے سے باعزت محبت... پُرخلوص دوستی، آپس میں محبت بھرا اعتماد اور اعتبار ہی میں اس رشتے کی اصل خوب صورتی ہے اور جہاں یہ محبت بھرا رویّہ نہ ہو وہاں یہ رشتہ بہت سے نفسیاتی مسائل کا سبب بن کر اپنی خوب صورتی کھو بیٹھتا ہے۔

۲: اظہار تو محبت میں انتہا سے زیادہ ضروری ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ ستائش و اظہار چاہتی ہے اور یہ زبان سے ادا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ زبان سے ادا نہ کیا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، اس سے بعض دفعہ دوسرے لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ اور اپنے پیشے کے اعتبار سے مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ اظہار نہیں کرتے ان سے متعلقہ لوگوں کو اور خود انہیں بعض اوقات بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۳: میں دوسرے قول سے متفق ہوں اس لیے کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں ایک دوسرے سے ہمارا تعلق جڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہماری کسی بھی غلطی کا اثر ہم سے متعلق افراد پر ضرور پڑتا ہے خواہ بالواسطہ یا... بلاواسطہ۔ اس کی وجہ سے وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور ہم بھی۔ آج کل ہماری نوجوان نسل کے بعض لڑکے اور لڑکیاں محبت میں سب جائز ہے کہتے ہوئے ایسے.... بے باکانہ قدم اٹھا لیتے ہیں جو مذہبی و سماجی دونوں اعتبار سے نامناسب ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کے گھر والوں کو بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے خاص کر لڑکی کے والدین کی تربیت پر حرف آتا ہے تو اس کی بے قصور بہنیں بھی اس کی زد پہ آتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایک نہایت تکلیف دہ اور شرمناک صورت خاندانی رشتوں میں پامالی کے ساتھ افیئرز کا پروان چڑھنا ہے۔ مثلاً کسی شادی شدہ عورت کا اپنے بہنوئی، دیور یا نندوئی سے افیئر جس کے نتیجے میں فریقین کی ذہنی صحت متاثر ہوتی ہے۔ خاص کر عورت کے اپنے شوہر، بچوں اور دیگر رشتے داروں سے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور اس کے نفسیاتی اثرات سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا کہ احساسِ جرم بہرحال انہیں ستاتا ضرور ہے۔ وہ دلدل میں ایسے پھنستے ہیں کہ قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا پاتے اور نارمل زندگی بسر کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں اور یہ سارا فساد سب جائز ہے کی ناجائز سوچ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سب جائز ہے کہ نتیجے میں در آنے والے نفسیاتی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے ”محبت میں جو ہو جائز ہو“ پر عمل کیا جائے۔

شاہین صبیح
(نعت خواں)

۱: محبت بذاتِ خود بہت خوب صورت ہوتی ہے اس لیے اس کا ہر رنگ خوب صورت ہے لیکن ماں بننے کے بعد

اور اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے عمل سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ محبت کا سب سے خوب صورت رنگ ماں اور اولاد کی محبت کا ہے۔ بالخصوص ماں کی اولاد سے بے لوث محبت کا رنگ۔

۲: اظہار تو ہر رشتے میں بہت ضروری ہے اور محبت اظہار چاہتی بھی ہے خواہ وہ لفظوں سے ہو یا رویّوں سے۔ خاص کر میاں بیوی کے تعلق میں وقتاً فوقتاً اظہار تجدیدِ محبت کا ایسا وسیلہ ہے جس سے محبت ہی نہیں تعلق کی خوش رنگی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر یقین گہرا ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کے ساتھ ساتھ میری نظر میں اولاد سے بھی اظہار بہت ضروری ہے اس سے والدین اور اولاد میں قربت بڑھتی ہے۔

۳: بچپن میں یہ قول اتنا پڑھا کہ اسے ہم سچ سمجھتے تھے لیکن جب شعور آیا تو احساس ہوا کہ محبت میں وہ قدم اٹھانا چاہیے جو جائز رستے پر چلائے سو میں دوسرے قول سے متفق ہوں۔

روبی طٰہٰ
(معلمہ)

۱: محبت کا سب سے خوب صورت رنگ میری نظر میں میاں بیوی کے درمیان محبت کا ہے۔ اور یہ میرا تجربہ بھی ہے ماں، باپ، بہن، بھائیوں اور اولاد کی محبت تو فطری ہے۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور مسئلوں کو سمجھیں انہیں بانٹیں، ایک دوسرے کے مخلص اور وفادار دوست ہیں تو بلا شبہ میاں بیوی کی بے لوث وفا اور باہمی ایثار کے خوب صورت رنگ ہی محبت کے خوب صورت رنگ ہیں۔ الحمدللہ میری زندگی ان ہی رنگوں سے خوشنما بھی ہے اور خوشگوار بھی۔

۲: بالکل میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے جب تک ہم اپنے احساسات اور جذبات سامنے والے کو نہیں بتائیں گے کہ ہمارے دل میں اس کے لیے کتنا پیار، عزت اور احترام ہے تو وہ بھی تو صاحبِ کشف نہیں کہ ہمارے دل کا حال جان لے اس لیے محبت میں اظہار ضروری ہے تا کہ محبت پھلتی پھولتی رہے۔



روبی طٰہٰ

۳: پہلا قول میرے اسٹوڈنٹ اکثر دہراتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ محبت میں سب جائز ہے ماں باپ سے بغاوت کرنا، اپنی حدود پار کرنا اور اس حوالے سے ایک بچے نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ یہ قول انسان کا بنایا ہوا ہے اور ہم انسانوں کے لیے ہی بنا ہے۔ اس سوچ کی وجہ سے معاشرتی بے راہ روی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جو ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ میں دوسرے قول کی حامی ہوں کہ محبت اور جنگ میں جو ہو جائز ہو۔ اس سوچ پر عمل کر کے کم از کم کوئی اپنی حدود تو پار نہیں کرے گا ناں۔

نادیہ فاطمہ رضوی
(اسکرپٹ رائٹر، براڈکاسٹر)

۱: خالقِ حقیقی اور بندے کی محبت کا رنگ بہت خوب صورت ہے۔ باقی تمام رنگ اسی رنگ سے جنم لیتے ہیں۔ ہمارا خالقِ حقیقی ہماری تمام تر کوتاہیوں اور خطاؤں کے باوجود ہم پر اپنی رحمت سایہ فگن رکھتا ہے۔ دوسرا رنگ ماں اور بچے کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق میں ماں کو ایک بڑا حصہ دیا ہے کہ ماں کے بطن سے ایک نئی روح دنیا میں آتی ہے تو یہ تعلق کتنا حسین اور مستحکم ہے۔ دنیاوی محبت میں پاکیزگی اور وقار کا پہلو ہو تو وہ خالص نظر آتی ہے۔

۲: محبت کا پودا اظہار کے پانی اور مٹی سے نمو پاتا ہے۔ جس طرح ہر جذبے کا اظہار ضروری ہے اسی طرح اگر محبت کے جذبے کا اظہار نہ کیا جائے تو وہ دل ہی دل میں گھٹ کر اپنی دلکشی سے محروم ہو جاتی ہے اور ہماری ذات پر چھا کر ہماری روح کو خزاں رسیدہ کر دیتی ہے۔ محبت میں اظہار بے حد ضروری ہے بالکل ایسے ہی جیسے انسان کے لیے آکسیجن۔

۳: دونوں ہی باتیں میری نظر میں مناسب نہیں ہیں کہ محبت تو خود اپنے اندر بہت سارے جذبوں کو پنہاں رکھے ہوئے ہے۔ محبت میں سمجھوتے اور قربانی کا رنگ ہے تو وفا اور حرمت کی روشنی بھی ضبط و برداشت کا جگنو بھی ہے جو راہ سے بھٹکنے نہیں دیتا کہ محبت پاکیزگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

خوشبو رفیق

۱: محبت کا سب سے خوب صورت رنگ میری نظر میں ماں اور بچے کا رشتہ ہے جو بے لوث اور لازوال ہوتا ہے۔

۲: محبت اظہار سے نمو ضرور پاتی ہے۔ یہاں تک کہ مختلف تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر کسی پودے سے بھی پیار محبت سے باتیں کی جائیں تو وہ بھی ہرا بھرا رہ سکتا ہے اور زیادہ اچھی طرح پروان چڑھ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسانوں سے ہمیشہ الفاظ کے ذریعے ہی اظہار کیا جائے بلکہ چھوٹی، چھوٹی باتوں کی اہمیت کو جانتے ہوئے اظہار کے مختلف پیرائے اختیار کیے جا سکتے ہیں جو محبت کو پروان چڑھائیں۔

۳: میں دوسرے قول سے اتفاق کرتی ہوں۔ ہر چیز کی کچھ حدود و قیود مقرر ہوں تو انسان بہت سی مصیبتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ محبت اور جنگ ہی کو لیجیے، اگر یہ حد سے بڑھ جائیں تو دیوانگی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔

فرح عاکف
(گھریلو خاتون)

۱: محبت کا سب سے خوب صورت رنگ ماں کا اپنی اولاد سے بے غرض محبت کا ہے۔ جس میں ماں صرف محبت لٹانا چاہتی ہے اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتی۔ میری نظر میں دنیا کا سب سے بے غرض دل ماں کا ہوتا ہے۔ باقی ہر رشتہ کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر چلتا ہے۔ اللہ نے ایسے ہی تو ماں کو اتنا بڑا مقام نہیں دیا کہ اس کے قدموں تلے



خوشبو رفیق



فرح عاکف

جنت رکھ دی اولاد جب ماں کو دیکھ کر اس سے بات کر کے سکون پاتی ہے تب ممتا کی محبت کے اس رنگ سے بڑھ کر خوب صورت رنگ اور کوئی نہیں ہوتا۔

۲: میرا خیال اور تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ آج کے مشینی دور میں بھی گلاب کا پھول اپنی حیثیت رکھتا ہے اور یہ پھول کیا ہے؟ محبت کے اظہار کا خوب صورت ذریعہ ہی تو ہے جو سامنے والے کو بتاتا ہے کہ آپ اس کے لیے کتنے اہم ہیں۔ جو لوگ محبت دلوں میں چھپا کر رکھتے ہیں زمانہ انہیں مایوس کرتا ہے۔ اس لیے محبت میں اظہار بہت ضروری ہے خاص طور پر میاں بیوی کی محبت میں اظہار سے یہ تعلق زیادہ خوشگوار اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

۳: دوسرا قول انسانی بقا کے لیے درست ہے کہ ”حد“ ہر چیز میں ضروری ہے ”حد“ سے نکل جائیں تو نہ ہم اپنے لیے اچھا کریں گے نہ اوروں کے لیے ”حد“ تو ہمارے مذہب کا بھی حصہ ہے جس میں ہر چیز کے جائز اور ناجائز ہونے کی وضاحت کر دی گئی ہے تو پھر محبت اور جنگ میں ایسے کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں کہ اسے ہم ہر ”حد“ سے بالاتر کر دیں!!

عینی مرغوب

(طالبہ)

ا: میری نظر میں محبت کا ہر رنگ خوب صورت اور شفاف ہوتا ہے جو ہر رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔

۲: یوں تو محبت لفظوں کی محتاج نہیں۔ محسوس کی جاتی اور عملی ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ سامنے والا بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے تو پھر اظہار بہت ضروری ہے ورنہ خاموشی زیادہ بہتر ہے۔

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

۳: میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ محبت میں انسان جائز ناجائز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنی محبت حاصل کرنا چاہتا ہے، خواہ یہ کامیابی کسی بھی طرح اس کے حصے میں آئے، اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی



عینی مرغوب

پڑے۔ چونکہ محبت اندھی ہوتی ہے، اس لیے اسے اپنے پیار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر بھی میں کہتی ہوں کہ محبت کرنے والوں کو محبت کے حصول کے لیے غلط راہ کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ صورتِ حال یہ ہی کیوں نہ ہو کہ

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

☆☆☆

قارئین! آپ نے پڑھا محبت کے سفیر دل کی روشن آنکھوں سے محبت کو کیسے دیکھتے ہیں بے شک...

محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے سے نہیں رکتا
کبھی پھولوں میں بکھرے گا کبھی تاروں میں پھیلے گا

اور محبت کے اس رنگ سے کشید کئی رنگ اہلِ محبت کی زندگی کو خوشنما بنا دیتے ہیں۔ ایسے میں اظہار کا یہ رنگ محبت کرنے والوں کی زندگی کو انبساطی کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے خواہ صورت کوئی سی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت کرنے والوں کو جذبے کی پاسداری اور وقار بھی بہت عزیز ہونا چاہیے کہ یہی وقارِ محبت دراصل محبت کی اساس بھی ہے اور اثاثہ بھی ہے۔ بے شک محبت زندگی ہے زندگی کا حسنِ باطن بھی۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

٭ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ!

٭ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

٭ پیاری بہنو! میں ہمیشہ آپ سے یہی کہا کرتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کو اپنی سہیلیاں بنا کر رکھیں۔ ان کی ہر بات توجہ سے سنیں۔ اپنی ہلکی پھلکی باتیں بھی ان سے شیئر کریں تاکہ انہیں بھی احساس ہو کہ وہ اپنی ماں کو مشورہ بھی دے سکتی ہیں مگر چند دنوں سے میں خاصی حیران ہوں۔ اب مائیں مجھ سے اپنی بیٹیوں کی شکایتیں کرتے ہوئے یہاں تک کہہ رہی ہیں کہ میری بیٹی میری کسی تیز طرار نند سے کم نہیں ہے۔ اپنے باپ سے میری شکایتیں کرتی ہے۔ ایک بہن نے اپنی بیٹی کی بدتمیزیاں گنواتے ہوئے یہاں تک کہا کہ جب میں اسے اس کے باپ سے پٹواتی ہوں تو کچھ دنوں کے لیے اس کا دماغ درست ہو جاتا ہے اور ایک بیٹی تو اتنی خودسر ہے کہ وہ اپنی بیاہی بہنوں کے میکے آنے پر ان سے لڑا کرتی ہے اور ان سے یہاں تک کہہ دیتی ہے کہ باجی ہمارے گھر آ کر تو تمہارے بچوں کی بھوک کچھ زیادہ ہی کھل جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ بیاہی بیٹیاں اگر میکے میں آتی ہیں تو بجائے اس کے ان کو سکون پہنچایا جائے ان کی خاطر مدارت کی جائے ان کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ ان تمام مسائل کی ایک وجہ مجھے پیسے کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ وہاں اس سے بڑی کمی باہمی محبت و ایثار کی بھی ہے۔ بچیاں چاہے کتنی ہی خودسر کیوں نہ ہوں ماؤں کو ہرگز انہیں باپ سے پٹوانا تو نہیں چاہیے۔ ماں کی یہ غلط حرکت ان کے دل میں منفی جذبات کو مزید ابھارے گی اور وہ بیٹی ہر صورت ماں کے خلاف جائے گی۔ پیاری بیٹیوں خدارا اپنی ماؤں کی عزت کریں، ان سے محبت کریں کہ جب وہ نہیں رہیں گی تو کوئی آپ کو دعا دینے والا بھی نہیں رہے گا۔ دوسری جانب میں ماؤں سے بھی یہ گزارش کروں گی کہ اس میں کوئی شک نہیں آج کی نئی نسل بدتمیز بھی ہے اور گستاخ بھی۔ انہیں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز بھی نہیں ہے اور ان کی زبانیں بھی کندھوں پر پڑی ہوئی ہیں مگر ان کو آپ صرف محبت سے ہی سمجھا سکتی ہیں، جوان اولاد پر اگر سختی کی جائے تو وہ مزید سرکش ہو جایا کرتی ہے۔ اس لیے آپ کا میٹھا لہجہ اور محبت بھرا رویہ ان کے لیے ایک ٹانک بھی ہے اور مرہم بھی۔ خدارا آپ کی بیٹیاں خواہ کتنی ہی بدتمیز اور منہ پھٹ کیوں نہ ہوں مگر آپ انہیں کسی دوسرے کے سامنے ذلیل ہرگز مت کریں حتیٰ کہ ان کے باپ کے سامنے بھی نہیں۔

پیاری بہنوں! اس سے پہلے کہ آپ محبت نمبر کے کھٹے میٹھے خطوط سے محظوظ ہوں آیئے پہلے ایک بار درودِ ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا اله الا انت سبحانك انى كنت من الظالمين

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں۔

نوٹ: یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے۔ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیت، آیتِ کریمہ کہلاتی ہے اور اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر تو ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

٭٭٭

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

٭ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار انجم گلزار، کراچی نے بفضلِ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی کتابت حاصل کرنے کی سعادت حاصل کر لی ہے۔ (بے حد مبارک باد)

★ معروف شاعر محسن علوی اور معروف مصنفہ تبسم علوی، جدہ کے بیٹے کی شادی اور ولیمے کی تقاریب کراچی میں ہوئیں۔ (مبارک باد)

★ ہماری پیاری مصنفہ سکینہ فرخ، کراچی کے بڑے بیٹے مونس نے آرمی جوائن کرلی ہے۔ (مبارکاں)

★ معروف مصنفہ سعدیہ رئیس کی پیاری بیٹی کی شادی گزشتہ دنوں کراچی میں ہوئی۔ (مبارکاں)

★ پاکیزہ کی شاعرہ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی کے بھائی وقاص کا ولیمہ ایونٹس لان میں خوب دھوم دھام سے ہوا۔ (مبارک باد)

★ ہماری معروف مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے حوالے سے ہمارے پاس دوخبریں ہیں پہلی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس مسقط گئی ہوئی ہیں اور دوسری یہ کہ ان کے ناول خلش پر بنایا گیا ٹی وی سوپ نیے چینل پر شروع ہو چکا ہے۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی مستقل قاری اور پپی پیلس اسکول کی پرنسپل نسیم صدیقی صاحبہ ایک پیاری سی پوتی کی دادی بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز اقصیٰ عمران، لاہور کے ایک پیارا سا بیٹا ہوا ہے۔ جس کا نام محمد عدن، جنت کا باغ رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

★ ہماری پیاری مصنفہ اور شاعرہ شگفتہ شفیق، کینیڈا کا طوفانی دورہ کر کے واپس کراچی آگئی ہیں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری سعدیہ شاہ، کراچی کے ہاں ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ جس کا نام میرب فاطمہ رکھا گیا اور سعدیہ شاہ کی سالگرہ بھی ہے۔ (مبارک باد)

★ ہماری پیاری مصنفہ عقیلہ حق اپنی فیملی کے ساتھ ان دنوں عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار زرین زبیر کوٹھاری، کراچی ان دنوں پنجاب گئی ہوئی ہیں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی ڈاکٹر عنبر گل امریکا سے اوکاڑہ آئیں۔ اپنی خالہ سے ملنے اور ان کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ عصمت بہن اپنے شوہر کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب جا رہی ہیں۔ (مبارکاں)

★ پاکیزہ کی شاعرہ اور مصنفہ نیر رانی شفق کی نئی کتاب شفق رنگ کہانیاں کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ جس میں ان کی خوب صورت کہانیاں شامل ہیں۔ ہم یہ بھی بتادیں نیر رانی شفق کی دو کتابوں وطن خوشبو اور ضیائے وطن کو صدارتی ایوارڈز بھی ملے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف 250 روپے ہے اور اسے آپ بیکن بکس، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں۔

★ ہم چاہتے ہیں ہماری قارئین بہنیں نامور ادیبوں کی تحریریں بھی پڑھیں اس لیے آج ہم جس کتاب کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا نام ہے مشاہیر ادب کے خطوط میرزا ادیب کے نام۔ اس کتاب کی ترتیب اور تدوین ملک مقبول احمد نے کی ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں کے خطوط مختصر مگر جامع انداز میں لکھے گئے ہیں اور بڑی سے بڑی بات اس خوبی سے لکھی گئی ہے جیسے کسی نے ہیرے ٹانک دیے ہوں۔ یہ قیمتی خطوط ادبی معلومات کا خزانہ ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف 700 روپے ہے جسے آپ مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جناب ملک مقبول احمد کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب پچاس نامور ادبی شخصیات لکھ کر دھوم مچادی تھی۔ اس کتاب میں ہمارا یا ہماری ہم عصر کسی مصنفہ کا نام نہیں تھا۔ اب ان کی دوسری کتاب آئی ہے جس میں انہوں نے پچپن ادبی شناسا چہروں کا تعارف لکھا اور اس مرتبہ بھی ہمیں اور ہماری ہم عصر مصنفات کو بھول گئے ہیں یا انہوں نے قصداً ڈائجسٹ میں لکھنے والی خواتین کو اس سے علیحدہ رکھا ہے۔ ہم ہمیشہ مثبت امید رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے وہ کوئی الگ سے کتاب شائع کرنا چاہ رہے ہوں تو معلوم نہیں مگر اس کتاب کے پچپن ادبی شناسا چہرے ہمارے بھی شناسا ہیں اور ہمیں اس کتاب میں سلمٰی اعوان اور شبہ طراز کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قیمت 500 روپے ہے اور یہ اردو بازار لاہور میں آسانی سے مل جائے گی۔

★ جناب حمید اختر کے کالموں کی کتاب قصہ ایک صدی کا شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب اپنے دور کی ایک تاریخ ہے۔ یہ دو زمانوں کی کہانی ہے، ایک وہ جو قیام پاکستان کے بعد کا ہے لدھیانہ سے لاہور تک خون کی بے شمار ندیاں عبور کر کے پاکستان آنے والے حمید اختر کی زندگی مسلسل محوِ سفر رہی۔ اس ضخیم ترین کتاب کو علامہ عبدالستار عاصم نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کی قیمت 3000 روپے ہے اور یہ کتاب ہر لائبریری کی ضرورت ہے۔ اس کے ناشر ہیں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل 199 سرکلر روڈ چوک، اردو بازار، لاہور۔

★ پاکیزہ کی معروف شاعرہ اور مصنفہ نسیم نیازی کے ناولٹ کا مجموعہ خواب آنکھوں میں شائع ہوگیا ہے جسے خزینہ علم و ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی کے ہاں شامِ غزل ہوئی جس میں آفتاب خان نے گائیکی کا مظاہرہ کیا۔

★ پاکیزہ کی قاری بہن کے بھائی محمد مصطفیٰ کی سالگرہ ہے اور ان کے کزن ماموں کانجن ضلع فیصل آباد محمد عرفان اکرام اور محمد عیان اکرم کی اس ماہ شادی ہے۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی تبصرہ نگار تسنیم ماہ پارہ، کراچی اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی شاعرہ فریدہ جاوید فری نے بی ایڈ کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا ہے۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی مستقل قاری رخسانہ امجد، ملکوال کی طبیعت خراب ہے ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار فیروزہ بیگم، کراچی ان دنوں بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ خان غوری، کراچی بیمار ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویر استقبال بخاری کا اکیس سالہ بھتیجا عظیم صدیقی کینسر کے مرض میں مبتلا ہے اس کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

★ ہم سب کی بے حد پیاری امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں شدید بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

★ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار نجمہ اصغر، کراچی بسترِ علالت پر ہیں اور آپ کی دعاؤں کی متمنی ہیں۔

★ پاکیزہ کی شاعرہ اور مصنفہ فریدہ جاوید فری، لاہور ہنوز علیل ہیں اور دعائے صحت کی طلب گار ہیں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری مونا، لاہور کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پریشانیاں ختم کردے۔

★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

★ پاکیزہ کی شاعرہ عالیہ بشیر، اسلام آباد بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

★ اس ماہ ڈاکٹر ایچ کے خان کی برسی ہے۔

★ پاکیزہ کی قاری تسنیم خالد انتقال کر گئیں۔

★ ہماری مایہ ناز مصنفہ شیریں حیدر کے والد انتقال کر گئے۔

★ ہماری مایہ ناز مصنفہ غزالہ نگار اور کزنی کے والد انتقال کر گئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

★ ★ ★

اختر شجاعت، کراچی سے۔ ”نیا عیسوی سال سب کو مبارک ہو۔ آج اس لیے حاضر ہوئی کہ آپ لوگوں سے کچھ باتیں کرلوں۔ سب سے پہلے ان تمام بہنوں کا شکریہ جنہوں نے میرا انٹرویو پسند کیا۔ سیما مناف اور سیما یاسمین مجتبیٰ کے الفاظ میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں ہیں۔ میں افسانوں سے دور ضرور ہوں مگر اعلیٰ پائے کی مصنفات سے دور نہیں ہوں۔ ذکیہ ایوب کی پسندیدگی کا شکریہ دراصل وہ خود بھی بے حد نفیس خاتون ہیں۔ مجھے بھی ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ شائستہ

زرین کا بھی شکریہ۔ اب محترمہ تیریں نسیم سے یہ کہنا ہے کہ جن باتوں کی ان کو کمی محسوس ہوئی تو یہ کہنا ہے کہ کتاب کے حوالے سے سوالات نہیں پوچھے گئے۔ اگر نزہت مجھ سے کتاب کے حوالے سے سوالات کرتیں تو انٹرویو بے حد طویل ہو جاتا اور صفحات کی کمی کے باعث انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ میں نے اپنی ہم عصر مصنفات کا ذکر نہیں کیا تو اتنا کہوں گی کہ کبھی اتنی جلدی سامنے والے کے لیے رائے قائم نہیں کرتے۔ کبھی کبھی انجانے میں ہم سے چیزیں ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ کسی سے مقابلہ کیا جائے۔ پہلے بھی اور آج بھی میں فخر سے کہتی ہوں کہ میری پسندیدہ ترین رائٹرز جن کا اندازِ تحریر منفرد ہے جن میں ایم سلطانہ فخر مرحومہ، بشریٰ رحمان، انجم انصار، سیما یاسمین مجتبیٰ، سیما مناف، صبیحہ شاہ، افسر سلطانہ، رفعت سراج، رخ چوہدری، شمیمہ نقوی، مہناز عرفان، شیریں حیدر، عذرا بانو عرش مرحومہ، بلقیس ظفر مرحومہ، عطیہ عمر، قیصرہ حیات، عمیرہ احمد، رضوانہ پرنس اور یہ تمام میری پسندیدہ ترین ہیں۔ ہاں اب مسز رضا لاہور کے لیے بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ انجم ان کو بہت اچھا جواب دے چکی ہیں کہ تعریف اور تنقید ہر قاری کا حق ہے۔ اس حق کو ضرور استعمال کریں مگر تنقید میں انداز شائستہ ہو تو بہتر ہے۔ دوسرے یہ کہ بہنوں کی محفل کو زبیدہ آپا کا دستر خوان کہنا مجھے قطعاً اچھا نہیں لگا۔ جہاں ابتدا اللہ رب العزت کی حمد سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام سے ہو پھر انتقالِ پُرملال پر ایصالِ ثواب ہو۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشیوں میں حصہ دار ہو۔ پُرخلوص مفید باتیں اور باہمی مشوروں کو آپ نے مذاق بنا دیا۔ تنقید کے حوالے سے آپ کو خود غور کرنا چاہیے تھا آیا ہم جو تنقید کر رہے ہیں کہ کیا وہ جائز بھی ہے؟ آپ غور کرنا۔ ذکیہ ایوب کا یہ مشورہ کہ انجم تم ادارے کے ساتھ مل کر اپنی سلور جوبلی منا لو انجم آپ ضرور غور کرنا۔ یاد آیا کہ کچھ بہنوں نے پیشگی یہ فرمائش کی ہے کہ ذیشان کی شادی کی کوریج عظمیٰ آفاق کریں گی۔ تو بھئی بہنیں پڑھنا چاہتی ہیں تو اس لیے ڈیمانڈ کرتی ہیں اور اسی لیے یہ چیزیں شامل ہوا کرتی ہیں۔" (آپ کی تفصیلی رائے پہنچائی جارہی ہے۔ رہی بات سلور جوبلی کی تو پیاری بہن میں اپنی سالگرہ نہیں مناتی تو سلور جوبلی کیا مناؤں گی)

☆ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ "انجم ہم رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک میگزین کی ایڈیٹر بھی ہیں۔ اس لیے مسز رضا کا خط پڑھ کر صاف کہہ سکتے ہیں کہ یہ خط کسی نے لکھوایا ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں آپ کو اصل ٹارگٹ بنایا گیا ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے بدتمیز اور بدتہذیب خط کو جگہ ہی کیوں دی گئی۔ ہر سطر سے نفرت جھلکتی نظر آرہی ہے۔ بڑے چھوٹے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ تنقید کرنا آسان ہے بلکہ بہت آسان کام ہوتا ہے مگر دوسرے کی عزت کرنا بے حد مشکل کام۔ ہمارے پاس تو سارے میگزین آتے ہیں ہم نے تو یہ نام کبھی کسی تبصرہ نگار کا دیکھا تک نہیں ہے۔ ہم اس خط کی مذمت کرتے ہیں۔" (پیاری سیما، تمہیں شاید یاد ہو کہ میں نے اس محفل کے لیے بارہا لکھا ہے کہ اس کی حیثیت ہائیڈ پارک جیسی ہے۔ جس کا جو دل چاہے کہہ سکتا ہے ہاں ان کے لفظوں میں بے شک نشتر بہت زیادہ تھے۔ امید ہے کہ آئندہ وہ لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کریں گی)

☆ مسز عظمیٰ خورشید لاہور سے۔ "جنوری کا پاکیزہ پڑھا۔ نمرہ احمد کا پارس پڑھ کر بہت مزہ آیا مجھے تو یوں لگا جیسے سسپنس ڈائجسٹ کی کوئی کہانی پڑھ رہی ہوں۔ رفعت سراج، رضوانہ پرنس اور عنیزہ سید کے ناولوں کی اقساط بھی اچھی لگیں اور جو چیز بالکل اچھی نہیں لگی وہ مسز رضا کا خط تھا۔ پڑھ کر دل خراب ہو گیا۔ انجم تم اتنی محبت کے ساتھ کام کرتی ہو اور پھر بھی یہ صلہ ملا ہے۔ یہ دلوں کو توڑنے والے خط لگانے ہی نہیں چاہئیں۔ عظمیٰ کی ڈائری پسند آئی۔ جلترنگ تو پورے مہینے خوش رکھتا ہے۔ روحانی مشورے نے نئے سال کے شروع ہونے پر دعائیں پڑھنے میں سب کی مدد کی ہو گی۔ ہاں تمہارا ٹی وی سوپ محبت ہم سفر میری بھی دیکھ رہی ہوں اور بہت مزہ آرہا ہے۔" (شکریہ)

☆ ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی سے۔ "اس مرتبہ پاکیزہ مجھے خاصا لیٹ ملا۔ ناولوں میں رضوانہ پرنس کا منی ناول خصوصی طور پر پسند آیا کہ ہلکا پھلکا سا ہے۔ عنیزہ سید بھی میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ میں تو پاکیزہ کی فین ہوں اور صرف یہی ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ مجھے مسز رضا سے کہنا ہے کہ اگر آپ کو کوئی ڈائجسٹ پسند نہیں ہے تو آپ اسے نہ پڑھیں مگر پلیز اس طرح کی تنقید تو نہ کریں۔ یہ تو اہانت آمیز لفظوں کے تیر تھے جو آپ نے برسائے۔ اس سے مجھے تو تکلیف پہنچی ہے پتا نہیں انجم باجی نے ایسا خط کیوں لگا دیا۔" (گڑیا پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی تو ہوتے ہیں)

☆ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ "اس بار تفصیلی تبصرہ کرنا چاہتی تھی اس لیے ہمیشہ کی طرح پہلے بہنوں کی محفل پڑھی

لیکن لاہور کی مسز رضا کا خط پڑھ کر دماغ ایسا گھوم گیا کہ مزید کچھ نہ پڑھ سکی اور ان کو جواب دینے کے لیے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ مسز رضا صاحبہ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں لیکن جس طرح آپ نے ساری لکھاری بہنوں کی تحریریں ریجیکٹ کر دیں۔ اس سے تو لگتا ہے کہ پاکیزہ میں کوئی رائٹر لکھنے کا ہنر نہیں جانتی۔ صائمہ حیدر کے بارے میں آپ کی رائے صحیح ہے لیکن انجم انصار کے کہنے کے مطابق راجندر سنگھ بیدی کا نام چھپنے سے رہ گیا تھا۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ پاکیزہ میں اس سلسلے میں سوچنا چاہیے کہ آئندہ ایسا نہ ہو کہ رائٹر پر حرف آئے۔ صائمہ اکرم چوہدری اچھی تحریریں لکھنے میں شہرت پا چکی ہیں۔ وہ جس طبقے کی کہانی لکھتی ہیں اسی کی زبان استعمال کرتی ہیں یہ ایک اچھے رائٹر کی نشانی ہے کہ وہ اسی طبقے کی زبان استعمال کرے۔ جس سے اس کا تعلق ہے۔ آپ کو یہ اچھا نہیں لگا حیرت ہے۔ قیصرہ حیات ہماری بہت اچھی رائٹر ہیں موت اور زندگی دونوں ہی دو سچے پہلو ہیں جنہیں ہم اپنے افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ اب زندگی میں سب اچھا، اچھا تو نہیں ہوتا، برا بھی ہوتا ہے قیصرہ حیات نے ایسا ہی کچھ بتایا ہے۔ اتنی اچھی رائٹر کے بارے میں آپ کے خیالات مجھے پسند نہیں آئے۔ سوری جلترنگ تمام دنیا کے پاکیزہ پڑھنے والوں کے دلوں میں جلترنگ بجاتا ہے یہ کالم ہونٹوں پر مسکراہٹیں لاتا ہے۔ اس کی رائٹر انجم انصار ہوتی ہیں یا کوئی اور مطلب تو کالمز کے پڑھنے سے ہے اور جلترنگ اگر آپ پڑھتی رہی ہیں تو ہر موضوع پر یہ کالمز لکھے گئے ہیں جو موضوع آپ نے بتائے ہیں اس کے علاوہ بھی۔ مجھے افسوس نہیں دکھ ہوا ہے کہ آپ نے ان کالمز پر تنقید کی ہے جو ہمارے ناشاد دلوں کو تھوڑی دیر خوش کرنے کا سبب بنتے ہیں اور جس سے ہم ہنسی ہنسی میں بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ عظمیٰ آفاق، انجم انصار کی بیٹی ہی نہیں ایک اچھی رائٹر بھی ہے۔ انجم نے اسے دوسری رائٹرز کے مقابلے میں کبھی آگے نہیں کیا۔ مسز رضا صاحبہ اس طرح کی نشتر زنی نہ آپ کو نہ کسی اور کو زیب دیتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر آپ کی اس بات سے شدید تکلیف پہنچی ہے۔ رفعت سراج ایک بڑا نام ہے۔ وہ لکھنے کا فن جانتی ہیں، زندگی اچھے اور برے واقعات کا مجموعہ ہے اور امانت ان ہی واقعات کو لے کر چل رہا ہے۔ آج کی لڑکی کسی افسانے یا ناول سے متاثر ہو کر خودکشی نہیں کرتی بہرحال آپ کا خط تنقید..... تنقید اور صرف تنقید تھا۔ ایک گزارش ہے کہ پلیز تنقید ضرور کیجیے لیکن دلوں پر آریاں مت چلائیں کہ دل ٹوٹنے لگیں تو آواز بڑی دور تک جاتی ہے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

☆ ذکیہ ایوب، لاہور سے۔ "کل اسپتال سے آئی تو پاکیزہ منگوایا۔ سب سے پہلے ابتدائی صفحات پڑھے تو بہنوں کی محفل میں پہنچی اور مسز رضا کا خط پڑھ کر حیرت سے زیادہ دکھ ہوا۔ نہ یہ مثبت تنقید تھی نہ اصلاحی نوعیت کی۔ یہ تو سراسر ذاتیات پر حملہ تھا جس میں بزرگوں تک کا مذاق اڑایا گیا تھا اور یہ خط شائع ہونے کے بعد انہیں یہ یقین آگیا ہو گا کہ کسی کو کوئی کتنا ہی بے عزت کرنا چاہے وہ کبھی نہیں کر سکتا کہ عزت دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ بہرحال اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس خط کے بعد کچھ پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ہاں نمرہ احمد کا پارس پڑھا اور تمہارا جلترنگ بہت مزہ آیا۔ میری اور میری بہن کی جانب سے بھی تمہارے لیے بے شمار دعائیں۔" (جزاک اللہ)

☆ رابیل شاہ، کراچی سے۔ "گزشتہ ماہ میری شادی کی نیوز لگائی، بہت بہت شکریہ۔ سال نومبر میں سب سے پہلے اور حسبِ عادت بہنوں کی محفل پڑھی اور مسز رضا کا خط پڑھ کر تو میرا موڈ ہی خراب ہو گیا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ تنقید کیوں کی گئی۔ وہ ہونی چاہیے مگر تنقید اور بدتمیزی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم بہنیں تو اس محفل میں آپ سے خوشامدیں کرتے ہیں کہ عظمیٰ کی تحریریں لگائیں۔ آپ اس کو اگنور نہ کیا کریں اور وہ خاتون الٹی بات کر رہی ہیں۔ پلیز مسز رضا آپ اس محفل میں شاید کبھی شریک نہیں ہوئیں یا آپ نے کبھی انجم باجی سے بات نہیں کی یا آپ ان سے ملنے کبھی نہیں گئیں۔ میں چونکہ یہ تینوں تجربے کر چکی ہوں تو کہہ سکتی ہوں کہ پاکیزہ اور انجم باجی دو نہیں ایک ہی نام ہیں۔" (پیاری رابیل، ان محبتوں کا شکریہ اور مسز رضا فون پر مجھ سے بات کر چکی ہیں اور کسی کو بھی سمجھنے میں وقت تو لگا کرتا ہے)

☆ مسز انجم گلزار، کراچی سے۔ "بفضلِ خدا پاکیزہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس محفل سے بھی۔ میں ایک قرآن پاک کی کتابت سے فارغ ہوئی ہوں اور اب ان شاء اللہ دوسرا لکھنے کا ارادہ ہے۔ بہنوں کی محفل میں کبھی کبھار میرا تبصرہ بھی شائع ہو جاتا ہے مگر میں قلم سے لکھتی ہوں نشتر کو قلم نہیں بناتی۔ مسز رضا آپ کا تبصرہ ان شاء اللہ آئندہ بہت بھرپور ہو گا مگر جب آپ اپنے سینئرز کی عزت کریں گی۔ ہاں اس محفل کو دستر خوان کہہ سکتی ہیں مگر یہ علمی اور ادبی دستر خوان ہے۔ جس سے ہم بہت کچھ سیکھا کرتے ہیں۔" (نوازش)

رفعت سراج، کراچی سے۔ ''اس ماہ جنوری کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی معمول کے مطابق بہنوں کی محفل میں شرکت کی آپ کے آداب میزبانی سے حظ اٹھائے بغیر کہاں قرار آتا ہے۔ خاص طور پر اس خط میں جس بے ساختگی، شدت اور بے رحمی کے ساتھ آپ کو نشانہ بنایا گیا ہے مسز رضا سے معذرت کے ساتھ میں نے سوچا آپ کے محبت بھرے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اپنے کام سے دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی بہترین صلاحیتیں کام میں استعمال کی جائیں۔ آپ نے بہت محنت سے بکھری ہوئی محبتوں کو یکجا کیا ایک خاندان ایک فیملی کا تصور مضبوط کیا۔ پرچے کی ذمے داران اور قارئین ایک خاندان ہی تو ہوتے ہیں۔ ہر پرچہ اپنا ایک مشن لے کر چلتا ہے۔ پاکیزہ میں تعمیری سوچ دینے والی کہانیاں جو عام پڑھی لکھی عورت کا شعور اجاگر کرتی ہیں۔ یہ اس پرچے کا مشن ہے۔ کام کی بات ہنستے ہنستے کہہ دی جائے تو زیادہ لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ درس کا لبادہ اوڑھا دیں تو لوگ جمائیاں لینے لگتے ہیں۔ جب تک انسان زندہ رہے اس کی کوشش یہ رہنی چاہیے کہ اس کا ہر عمل فلاح و خیر اور محبت کے لیے ہو۔ مسز رضا نے آپ پر تنقید کی ہے کہ کالمز میں ساس، نند، بھاوج وغیرہ ہی زیادہ جگہ کیوں پاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان مزاحیہ کالمز میں اقوام متحدہ کے مسئلوں پر ووٹنگ تو نہیں کروائی جاسکتی؟ روزمرہ گھریلو مسائل سے گدگدیاں کی جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ ہر شے اپنی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔ مکھی سارا صاف جسم چھوڑ کر زخم پر بیٹھتی ہے۔ یہ جملہ قیصرہ حیات کے ناول کے لیے کہا گیا ہے کہ لکھنے والی نے مختلف واقعات قارئین تک پہنچائے کہ وہ سوچیں کہ اتنی غلطیاں کر کے پھر ایک آخری بھیانک غلطی کی جائے کہ قیامت تک مردود ٹھہریں۔ یہ ایک سبق اور نصیحت ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے ورنہ اس کا انجام یہ بھی ہوسکتا ہے۔ اب پڑھنے والا ہی ٹیڑھ پن سے سوچنے کا عادی ہو تو مفتیِ اعظم بھی اس کی فطرت نہیں بدل سکتا اور وہ کہانیوں کا قاری نہ بھی ہو تو اس کی زندگی منفی خیالات کے گرد گھومتی رہے گی۔ قارئین انجام سے پہلے یہ بھی دیکھ لیں۔ اتنے برے انجام سے پہلے غلطیاں کیا ہوئیں اگر وہ غلطیاں نہ کی جاتیں تو کیا انجام یہ ہوتا؟ عظمیٰ آفاق برسوں سے پاکیزہ سے وابستہ ہیں قارئین انجم انصار سے بہت محبت کرتے ہیں جو اپنے اداریے اور بہنوں کی محفل میں ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خیر خواہی کے جذبے میں اتنی کشش ہے کہ دل خود بخود محبتوں سے معمور ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے انجم انصار سے محبت کرنے والے قارئین ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور پرچے میں وہی مواد پیش کیا جاتا ہے جس سے قارئین کو دلچسپی ہو۔ یہ محبتوں کے رشتے ہیں جو نصیب سے استوار ہوتے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے اور محبت بھی رزق میں شامل ہے۔ اب مجھ پر چمچہ گیری کا الزام مت لگا دیجیے گا۔ پاکیزہ میں آج میرا ناول امانت چل رہا ہے۔ ادارہ 80ء کی دہائی سے مجھ سے سلسلے وار ناول کی فرمائش کر رہا تھا۔ میں ادارے میں ناول نہ دے پائی مگر ان سب نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا۔ مجھے اپنی تقاریب میں بلاتے کبھی فون پر بات ہوتی تو بہت عزت و محبت سے بات کرتے۔ سالوں میں کبھی پاکیزہ کے لیے ناولٹ یا افسانہ لکھا مگر یہ لوگ مجھے یوں یاد کرتے رہے جیسے میری ہر صبح ہر شام ان کے ساتھ ہو میرے سامنے ناول لکھنے کے اور بھی کئی پلیٹ فارم موجود ہیں مگر میں نے پاکیزہ کو اس لیے ترجیح دی کہ اس ادارے کی محبت کا قرض بھی ادا کرنا ہے مرنے سے پہلے۔ مسز رضا آپ بہت پیاری بہن ہیں اپنا قیمتی وقت ہمیں دیتی ہیں ہمیں پڑھتی ہیں مگر ہر رائٹر قرۃ العین سے متاثر ہو کر عنیزہ سید نہیں بن سکتی۔ ہر انسان مختلف صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ ہر ایک کا آئی کیو لیول اس کے ماحول، دوست، رویے اور جین یا ڈی این اے کو ملا جلا کر بنتا ہے۔ میرے دل میں تو آپ کا خط پڑھ کر آپ کی اہمیت ہزار گنا بڑھ گئی۔ کتاب پڑھنے کا ذوق، شوق رکھنے والے عام سے لوگ نہیں ہوتے۔ میں تو یہی سوچ کر خوش ہو رہی ہوں کہ آپ اتنا سارا پڑھے بیٹھی ہیں۔ آپ کی خیالی دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ جب میں اسکول میں پڑھاتی تھی شادی سے پہلے تو اپنی کولیگز کو تاکید کرتی تھی کہ گھر میں لڑائی یا غصے کی حالت ہو تو اس دن چھٹی کر لیں اپنا غصہ معصوم بچوں پر نہ اتاریں۔ ہفتے میں ایک بار بی پی بھی چیک کر لینا چاہیے۔ طبی مسئلے کی وجہ سے بھی موڈ خراب ہوجاتے ہیں۔ البتہ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے بیدی کی کہانی کی نشان دہی کی کہ یہ ادارے کی پیشہ ورانہ کوتاہی ہے کہ اس عظیم قلمکار کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نہ وضاحت کی گئی۔ آپ کے خط سے آنجہانی بیدی کی روح کو یقیناً سکون ملا ہوگا۔ اللہ آپ کی صحت، عمر، ایمان میں برکت عطا فرمائے، آمین۔ اب امانت کے بارے میں تھوڑی سی عرض کرتی چلوں۔ کہانی ادھوری ہے اس لیے مکمل تبصرہ کیسے ممکن ہے۔ انجم نے پہلے اس سلسلے میں بہت مناسب جواب دے دیا ہے۔ مجھے سیالکوٹ کی نجمہ اشرف سے ملنے کی ہمیشہ تڑپ رہتی ہے۔ انہوں نے میرا ناولٹ خوشبو کا دریا پڑھنے کے بعد مجھے ادارے کے توسط سے خط لکھا تھا کہ

جس دن سے انہوں نے خوشبو کا دریا پڑھا ہے ان کی تہجد قضا نہیں ہوئی۔ جس مصنفہ کو اس طرح کا خط مل چکا ہو اس کو کس قدر احتیاط کرنا پڑتی ہوگی آپ محسوس کرسکتی ہیں۔ جو بات آپ نے فرمائی وہی سوچ دینے کے لیے میں نے شاہ عالم کا کردار تخلیق کیا۔ جو آپ چاہتی ہیں وہی شاہ عالم چاہتے ہیں۔ باقی آپ سے دست بستہ عرض ہے کہ یہ چھوٹی، چھوٹی بچیاں لکھنے کچھ کہنے کے شوق میں میدان میں آئی ہیں ان کی خوب صورت انداز میں اصلاح کیجیے۔ معذرت کے ساتھ نئی رائٹرز پر آپ کا تبصرہ کچھ یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے نہتوں کے سامنے کوئی دو دھاری تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا ہو۔ آپ چاہتی ہیں آپ کی بات برداشت کی جائے ہم سب بھی آپ سے اسی جذبے کے طلب گار ہیں۔ اس بہانے ایک شکوہ انجم سے کرتی چلوں میں اتنے اہتمام سے تیار ہو کر آپ کی تقاریب میں آئی ہوں آپ میری ایک تصویر بھی نہیں لگاتیں، جی تو چاہتا ہے کہ پاکیزہ میں لکھنا چھوڑ دوں۔ سب کے لیے بے شمار دعائیں۔ اللہ آپ سب کو خالص ایمان کی لذت اور خیر خواہی کے نیک جذبے سے مالا مال کرے، آمین۔'' (رفعت بہن طویل خط لکھنے کا شکریہ مجھے اپنی سب رائٹرز اور تبصرہ نگار بہنیں عزیز ہیں اس لیے چھوڑنے کی دھمکی تو کسی کی برداشت نہیں کرسکتی)

فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''پاکیزہ نہ صرف میں، میرے گھر میں دیگر لوگ، میری فیملی میں اور میرے بے شمار اسٹوڈنٹس کا پسندیدہ ماہنامہ ہے جسے میں یقیناً بیس سالوں سے پڑھ رہی ہوں اور بہت عرصے سے اس میں تبصرے بھی لکھ رہی ہوں مگر آج تک میں نے مسز رضا جیسے خط نہیں پڑھے۔ خط لکھنے والے کی شخصیت اس کی تحریر سے صاف دکھائی دیا کرتی ہے۔ میں حیرت زدہ ہوں کیا ہم خواتین اتنی بدتمیزی سے بھی تنقید کرنے کی خواہش مند ہوا کرتی ہیں۔ بے حد افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ پاکیزہ کے دو قیمتی صفحات آپ نے ضائع کر دیے۔ انجم آپ نے جس محبت سے سب کو جوڑے رکھا ہے اس کو توڑنا اتنا آسان نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو رفعت سراج کے مضمون کی ابتدائی سطریں پڑھ کر یوں لگا جیسے وہ کچھ ناراض سی ہیں۔ کس سے ناراض ہیں اس کا اندازہ آخری سطر میں ہوا کہ شاید وہ آپ سے ناراض ہیں۔ اس کے بعد سوائے روحانی مشورے کے کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہا۔'' (پیاری فیروزہ، رفعت سراج میری دوست بھی ہیں۔ ان کے اس مضمون پر میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا کہ رفعت کوئی ناراضی تو نہیں ہے یہ اُس شب کی بات ہے جب عطیہ عمر نے چند رائٹرز کو اپنے ہوٹل میں ڈنر پر بلایا تھا۔ تب رفعت نے کہا انجم میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتی کہ کبھی پاکیزہ سے یا تم سے ناراض ہوں گی۔ اس لیے آپ کا یہ شبہ تو ختم ہوا رہی بات مسز رضا کی تو وہ ہمیں خط لکھنے کے باوجود کئی بار فون بھی کر چکی ہیں کہ جب وہ خط لکھنے بیٹھیں تو روانی میں لکھتی ہی چلی گئیں مگر خط کی اشاعت کے بعد انہیں خود اچھا نہیں لگا کہ انہوں نے کیا لکھ دیا بلکہ انہوں نے تو مجھ سے یہاں تک کہا کہ باجی میں کئی راتیں سو بھی نہیں سکی اس لیے اس بات کو بھی ہم یہیں ختم کر دیتے ہیں اور آئندہ کوئی بھی بہن مسز رضا کے حوالے سے مجھے کوئی خط نہ لکھے کہ جب بات ختم ہوگئی تو ختم ہوگئی)

⊠ ثمینہ وحید، پنجاب۔ آپ کی محبتوں کا شکریہ مگر میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا خط شائع نہیں کرسکتی جو بات مجھے اچھی نہیں لگی ویسی ہی بات دُہرانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہوگی۔ میری گڑیا یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہم اپنے آپ کو ہی خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اب ان باتوں سے آگے نکلتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے آسانیاں فراہم کرتے ہیں اور درگزر کی روش اپناتے ہیں، ٹھیک ہے ناں!

شمسہ الماس، ناروے سے۔ ''گزشتہ ماہ پاکستان گئی مگر وہاں جا کر تینوں بیٹے بیمار ہوگئے اس وجہ سے کسی سے ملنے کے لیے نہیں جاسکی۔ جنوری کا پاکیزہ پڑھا۔ حسبِ عادت ابتدا بہنوں کی محفل سے کی۔ مسز رضا کا خط پڑھا۔ اتنی سخت تنقید مجھے حیرت ہے کہ ایسا خط آپ نے شامل کیسے کر لیا۔ انجم باجی آپ کو تو شاید کوئی فرق نہیں پڑتا ہو مگر نئی لکھنے والیاں تو خوف زدہ ہو کر لکھنا چھوڑ دیں گی۔ ویسے ایک مزے کی بات بتاؤں صائمہ حیدر کا ایک بڑے رائٹر سے متاثر ہو کر ایک افسانہ ایک اور رسالے میں بھی شائع ہوا ہے مگر وہاں تو اس قسم کے خط نہیں چھاپے گئے۔ باجی آپ کو نئی رائٹرز کا بھی خیال رکھنا ہے۔ ان کے دل نہ ٹوٹیں۔'' (جی ضرور)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''لاہور کی بہن مسز رضا کا دھماکے دار خط آپ نے شائع کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ کہیں کہیں ان کی تنقید بے جا معلوم ہوئی جیسے عظمیٰ آفاق کے بارے میں بہر حال اپنی، اپنی سوچ ہے۔ اب ذرا تحاریر پر ایک نظر۔ امانت میں دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ وارث علی اپنی جون میں واپس آرہا ہے۔ جابر ٹیڑھی کھیر ثابت

ہوگا۔ اصیل خان کا کردار پُراسرار سا ہے۔ شمیم فضل خالق کی تحریر ہار جیت بالکل پسند نہیں آئی۔ سہیلی کس طرح ہار لے اڑی کچھ سمجھ نہ آیا اور پھر اتنی ہائی کلاس کی خاتون اور چوری پھر جوا جیسی گندی و قبیح چیز کا ذکر...... یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایسی بدعادات کی نفی کریں رواج کا پہلا حصہ اچھا رہا۔ عالیہ حرا کی یہ کیسی محبت لڑکیوں کے لیے مشکل راہ ثابت ہوگی۔ شامِ شہر یاراں کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میرال کے لیے دل دکھی ہے۔ راہ آسان ہوگئی، مزے دار تحریر لگی۔ محبت کھو گئی ہے ناہید فاطمہ نے اعلیٰ تحریر لکھی۔ خدا ان مردوں کو سمجھے۔ رشنا کا فیصلہ درست لگا۔ بہت سال پہلے کوئٹہ ٹی وی سے اک ڈراما چھاؤں چلا تھا۔ ناہید نے لگتا ہے اس کی ڈرامائی تشکیل سے متاثر ہو کر لکھا ہے کیونکہ اس کا انجام بھی یہی ہوا تھا۔ رابعہ نیازی کی تحریر نے آنکھیں نم کر ڈالیں۔ زمر نعیم نے بھی خوب ڈٹ کر لکھا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☆ صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی سے۔ ''انجم آپی کے پُرخلوص جوابات اور نزہت اصغر کی کاوشیں صاف صاف نظر آنے لگی ہیں۔ مسز رضا نے لاہور سے اتنی شدید تنقید بھیجی کہ دماغ سنک گیا۔ ارے ہماری پیاری، پیاری رائٹرز کو یوں بیلن تلے بیلا کہ ان کی محنت کے پتلے، پتلے پاپڑ بن گئے مگر صرف تنقید کیوں بر سا برس سے سیکڑوں ہزاروں میں مقبول پاکیزہ میں بہت کچھ بہترین بھی تو ہے۔ ارے ذرا سا میٹھا بھی مکس کر لیتیں محترمہ۔ کیا ہمیشہ منفی مواد ڈھونڈنے کی خاطر اتنی باریک بینی سے پاکیزہ پڑھا کرتی ہیں آپ؟ مائنڈ کو کچھ پازیٹو کیجیے اور پڑھنے کا لطف لیجیے۔ دوسری جانب ہماری انجم آپی ہیں جنہوں نے تنقید کا کھلا حق بھی دیا اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ کول سے جوابات دیے۔'' (تبصرہ کرنے کا ہر بہن کو حق ہے)

☆ نزہت جبیں ضیا، کراچی سے۔ ''عذرا رسول باجی نئے سال کی ابتدا میں بہنوں کی محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مگر گفتگو مختصر ہونے کے باعث تشنگی رہی۔ گزشتہ چند ماہ سے پاکیزہ سے دور رہی کیونکہ گھریلو مصروفیات اور کچھ مسائل بھی درپیش رہے۔ ساس صاحبہ کی علالت اس کے درمیان ہی بیٹے کی منگنی بھی تھی بس عجیب سی حالت رہی اپنی الجھنوں میں گھری رہی پھر ساس صاحبہ کی ڈیتھ نے خاصا شاکڈ کر دیا تھا۔ اب ذرا حالات معمول پر آئے ہیں۔ انجم باجی کو ڈھیروں ڈھیر مبارک باد کہ الحمدللہ ایک ساتھ تین، تین ڈرامے آن ائر جا رہے ہیں۔ جس طرح ڈائجسٹ میں ناولز نے دھوم مچائی امید واثق ہے اسی طرح ٹی وی پر بھی چھا جائیں گی، انشاء اللہ۔ نمرہ احمد کے ناول کا اختتام اچھا لگا۔ ثمینہ عظمت علی کا افسانہ بیٹی اچھا لگا۔ ہار جیت، یہ کیسی محبت، راہ آسان ہوگئی اچھے افسانے تھے۔ ناولٹ میں تینوں اچھے رہے۔ بہنوں کی محفل میں شامل تمام خطوط اچھے لگے خاص طور پر مسز رضا کا خط کہ انہوں نے کتنی عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور پھر اتنی عرق ریزی سے بھرپور تبصرہ بھی کیا۔ (ہاں یہ تو ہے) جلترنگ میں یہ سال بے وفا لوگوں کے نام رہے گا زبردست رہا۔ اس کے علاوہ دیگر سلسلے بھی اچھے رہے۔ شمیم ناز صدیقی کے بہنوئی کو اللہ تعالیٰ صحت کلی عطا فرمائے، آمین۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

☆ مسز رضا، لاہور سے۔ ''تمام قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔ اس دعا کے ساتھ کہ 2014ء تمام اہلِ وطن کے لیے خصوصاً کراچی کے لیے امن اور سلامتی کا سال ہو۔ محترمہ آپ کا لیٹر ٹو ایڈیٹر میں اپنے اندر تمام تر تنقیدی کاٹ کو سموئے ہوئے میرے خط کو شائع کرنا اور خندہ پیشانی کے ساتھ تمام اعتراضات کے جوابات دینا ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک بڑے ادارے کا بڑا نام ہیں اور اسم بامسمیٰ ہیں۔ میرا مقصد اپنی تمام معزز رائٹرز کی دل آزاری نہیں تھا اور نہ ہو سکتا ہے ان رائٹرز نے ہی اپنے قلم کی جولانیوں کی مدد سے زندگی کے تلخ و شیریں سفر کو آسان بنائے رکھا ہے۔ گزارش صرف یہ تھی اور ہے کہ آپ کی تحریر بے شمار پختہ و ناپختہ ذہن پڑھتے ہیں، ایک مثبت بات ایک کچے ذہن کو منزل کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے اور منفی بات غلط فیصلے کی طرف، یہ افسانے زندگی کو سہل کرنے میں مدد دیتے ہیں اور دے سکتے ہیں۔ شمیم فضل خالق، شیریں حیدر، عالیہ حرا، نمرہ احمد، عنیزہ سید اور بے شمار نئے پرانے نام ہیں جو نوجوان ذہنوں کو جلا بخشنے میں مدد کر رہے ہیں۔ ان سب میں ایک نام جس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے وہ محترمہ انجم انصار صاحبہ کا ہے جنہوں نے اپنے قلم اور اپنے شیریں دہن دونوں سے یہ کام کماحقہ انجام دیا ہے۔ محترمہ انجم صاحبہ جس طرح آپ نے اپنے قلم، اپنے ادارے اور اپنی تحریر کی حرمت کا پاس رکھا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ہماری تنقید کو بھی اپنے بڑے پن کے ساتھ قبول کیا اور ہماری نااہلی کو بھی مسکرا کر قبول کیا۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ تنقید فقط تنقید نہ ہو بلکہ اس کا مقصد بہتری ہے۔ آپ نے جس طرح ہماری تنقید کو قبول کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ میری ادنیٰ جسارت سے آپ کو جو تکلیف پہنچی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' (رات گئی بات گئی۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں)

☆ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''مسز رضا لاہور کا خط پڑھ کر سوچ رہی ہوں کہ آج تو رسالے پر کمنٹس نہ دوں اور بس اسی پر ہی لکھوں مگر یہ بھی مناسب نہیں۔ ان کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محترمہ پاکیزہ کا باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہیں۔ افسانوں، کہانیوں کے بارے میں وہ اپنا جو بھی نقطۂ نظر رکھتی ہیں بحیثیت قاری وہ اظہارِ رائے کا حق رکھتی ہیں اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ ہماری باجی نے اپنے جواب میں تنقید کے ہر، ہر پہلو کو بہترین طریقے سے ڈیفائن کیا ہے اور یہ باجی کا کمال ہے اور ان کے قلم کی طاقت۔ میں تو انجم انصار باجی کی ایک بیٹی کی حیثیت سے چھوٹی بہن کی حیثیت سے ان کی فیملی کے متعلق مسز رضا نے جو کہا ہے اس پر یہ کہنا چاہوں گی کہ محترمہ مسز رضا، انجم انصار ایک کوالٹی کنٹرول سسٹم کا نام نہیں ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ خلوص، محبت اور حسنِ اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ پاکیزہ سے ہماری دیرینہ وابستگی میں ننانوے فی صد انجم باجی کی محبت، ان کا حسنِ ظن کارفرما ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جو شخصیت، ہمیں.... اس قدر عزیز ہو... ہم اس سے محبت کرتے ہوں تو دل چاہتا ہے کہ ہم ان کی فیملی کو جانیں، ان کی خوشیوں میں شریک ہوں ان کے دکھ سکھ شیئر کریں خواہ تحریر کے حوالے سے ہی سہی۔ انجم باجی نے دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ ہوگیا اس رسالے کے لیے کام کیا اور اپنی انتھک محنت سے پاکیزہ کو معیار کے ساتھ شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا اور اس میں اللہ رب العزت کی مدد ان کے ساتھ رہی، الحمدللہ۔ تو اب کیا ان کا یہ رائٹ نہیں بنتا کہ وہ اپنی خوشیاں ہم سے شیئر کریں وہ بھی ہم بہنوں کے اصرار پر۔ ہمیں تو یوں لگ رہا تھا کہ ہم گھر بیٹھے اپنے بھائیوں کی شادی میں شریک ہیں پھر عظمیٰ کی نانی، جی ہاں وہ ہماری انجم باجی کی والدہ ہیں تو ہمارے لیے اتنی ہی قابلِ احترام ہیں جتنی انجم باجی کے لیے۔ ہم انجم باجی کی جس قدر عزت کرتے ہیں اس سے بڑھ کر ان کی والدہ کی بھی کریں گے۔ مسز رضا بزرگوں سے دعائیں تو قسمت والوں کو ملتی ہیں کبھی کسی بزرگ کے سامنے سر جھکاؤ اور وہ شفقت سے سر پر ہاتھ رکھے تو روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ کاش آپ رشتوں کی اہمیت کو سمجھ پاتیں اور جلترنگ پر اعتراض میرے نزدیک جلترنگ کے موضوعات تو حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ہاں کبھی کبھار کوئی ٹاپک مزہ نہیں بھی دیتا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ موضوعات یکسانیت کا شکار ہیں میرے نزدیک مزاح نگاری کی دنیا میں خواتین میں باجی انجم انصار کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام تا حال سامنے نہیں آیا۔ جلترنگ میں ان کا مخصوص انداز ان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اللہ پاک انجم باجی کو لمبی عمر عطا کرے اور ان کے قلم کی طاقت و حرمت کی حفاظت کرے۔'' (ظلِ شاہین، میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے طویل ترین خط کا صرف ایک حصہ لگایا ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہر بڑا رائٹر ہر تحریر بڑی نہیں لکھا کرتا۔ مکمل ذات صرف اللہ کی ہے)

☆ مسز امینہ عندلیب، سانوالی سے۔ ''بہن مسز رضا بہت اچھا لگا آپ اتنی پرانی پاکیزہ کی قاری ہیں وہ بھی خاموش۔ آپ کا خط پڑھا، اچھا لگا۔ آپ نے پاکیزہ پر بھرپور تنقید کی ہر سلسلے، تمام مصنفات، قارئین، مدیرہ باجی انجم انصار پر بھی خوب تنقید کی اور مجھے یہ خوشی ہوئی کہ باجی انجم انصار نے فراخ دلی کا ثبوت پیش کیا۔ آپ کی کسی بات پر تنقید برائے تنقید نہیں کی۔ آپ نے نہ صرف دل کھول کر تنقید کی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ دل کی بھڑاس نکالی۔ اچھی بات ہے دل کا بوجھ آپ کا ہلکا تو ہوا۔ کاش یہ تنقید آپ بہت پہلے کر لیتیں بقول آپ کے آپ تو بہت پرانی قاری ہیں۔ کیسے آپ نے برداشت کیا جب کسی کو کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی تو وہ اتنا عرصہ نہیں رہ سکتا۔ باجی انجم انصار کوئی معمولی مدیرہ نہیں ہیں۔ ان کا ایک نام ہے۔ پاکیزہ کی تحریریں نہ صرف خواتین، مرد حضرات بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ محترمہ باجی انجم انصار آنکھیں بند کر کے افسانے، کہانیاں نہیں لگاتیں۔ یوں تو ہر کوئی رائٹر بن بیٹھے۔ جتنی محنت باجی انجم کرتی ہیں آپ کو شاید اندازہ نہیں رات کے تین بجے بھی فون کیا تو جاگ رہی ہیں۔ افسانے پڑھ رہی ہیں، بہنوں کی ارسال کردہ کہانیوں کی تصحیح کر رہی ہیں اور پھر میں وہ وقت نہیں بھول سکتی جب باجی انجم انصار کی امی جان شدید بیمار تھیں اسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ جو انتہائی ایمرجنسی میں تھیں ... ان لمحوں میں بھی باجی انجم انصار پاکیزہ کا تمام کام اسلام آباد ساتھ لائیں بروقت ڈاک کراچی بھجوائی۔ بہنوں کی محفل میں پاکیزہ کے حوالے سے جو بھی خط لگتا ہے اس کا اہم حصہ شائع ہوتا ہے۔ آپ نے تنقید برائے اصلاح نہیں کی بلکہ سب کی دل سے حوصلہ شکنی کی ہے۔ کیا آپ کے اس تلخ رویے سے ہماری رائٹرز لکھنا چھوڑ دیں گی مگر آپ نے دیگر رائٹرز کے دل توڑنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا آپ کے تلخ لفظوں سے پاکیزہ کوئی نہیں پڑھے گا؟ دیگر تمام رسائل میں کھانوں کی ترکیب نہیں ہوتیں، میگزین ایڈیشن ہر

رسالے کا ماشاء اللہ اپنا معیار ہے کسی میں طبی مشورے، کسی میں روحانی علم کے کالم۔ صحت کی باتیں کہیں اداکاروں کے انٹرویو، نامور شخصیت، پکوان یہ سب ڈائجسٹ کا حصہ ہوتے ہیں۔ اگر صرف کہانیاں ہوں تو کوئی بھی دلچسپی نہ لے اور ہر رسالے میں سوال و جواب یا بہنوں کی محفل کی صورت میں قارئین کے خطوط شائع ہوتے ہیں جو اپنی آرا، تجاویز سے آگاہ کرتی ہیں۔ باجی انجم انصار نے سب بہنوں کو ایک محبت، امن پیار کے سائے میں رکھا ہوا ہے کیا انہیں کوئی لالچ ہے کسی بہن سے؟ ہر بہن بیٹی کے دکھ پر تڑپ اٹھتی ہیں۔ کس طرح دعائیں مانگتی ہیں۔ خون کا رشتہ نہیں محبت کا بے لوث، بے غرض رشتہ ہے۔ کاش آپ نے ان کی ذاتیات پر لکھنے سے پہلے کچھ سوچا تو ہوتا۔" (کوئی بات نہیں ہر ایک کو اپنی رائے دینے کا حق ہے اور میری یہ بہن آئندہ محبت کے ساتھ شریک ہوں گی)

٭ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں تم نے بہت اچھا پیغام دیا ہے۔ دین کی باتیں اور اسما النبیؐ ایمان میں اضافے کا ذریعہ ہیں۔ امانت کی یہ قسط گوارا تھی۔ شمیم فضل خالق کی تحریر اس طرزِ زندگی کے افراد کی ایک تلخ حقیقت کی عکاس ہے۔ رواج پر کہانی مکمل ہونے پر تبصرہ کریں گے۔ عالیہ حرا نے اچھا لکھا شکی مزاج لوگ زندگی بھر کا روگ ہوتے ہیں۔ شام شہر یاراں کی یہ قسط بھی خوب رہی، عنیزہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اسما قادری نے اپنی کہانی میں سمجھوتے کا اچھا سبق دیا۔ جو واقعی راہیں آسان کر دیتا ہے۔ محبت کھو گئی ہے گوارا تحریر ہے۔ اب میں مسز رضا سے کچھ کہنا چاہوں گی۔ آپ کا تفصیلی تبصرہ پڑھا۔ آپ نے جو لکھا وہ آپ کا حق ہے مگر اس میں ہمیں جو غلط لگا اس کی نشاندہی ہمارا حق ہے۔ آپ نے جن امور کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ انجم سے ان امور کا مس ہونا مشکل ہی ہے۔ صائمہ حیدر کی ماخوذ کہانی کا حوالہ چھپنے سے رہ گیا تو یہ سہو تو ہو ہی جاتے ہیں نشاندہی آپ نے کی مگر میں کہنا چاہوں گی کہ راجندر سنگھ بیدی جیسے رائٹر کی تحریر نہ تو دیمک زدہ ہوتی ہیں نہ ہی انہیں بھلایا جا سکتا ہے۔ پرنسپل ڈاکٹر معصور کی زبان سے لفظ جوتی کا استعمال آپ کو عجیب لگا مگر میں نے تو ان لوگوں کو دیگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو اس سے بھی گندی زبان استعمال کرتے سنا ہے۔ بہت سی لاڈلی بچیاں والدین کی وفات کے بعد برے حالات کا سامنا کرتی ہیں اور بھائی تو اکثر شادی کے بعد بدل جاتے ہیں۔ رفعت سراج نے اگر اپنی پرانی ڈگر سے ہٹ کر کچھ لکھا ہے تو کیا یہ ان کا حق نہیں پسند کرنا نہ کرنا آپ کا حق ہے۔ انجم کے مزاحیہ کالم اس پُرآشوب زمانے میں لوگوں کو خوشی کے چند لمحے دے دیتے ہیں کیا یہ بہت نہیں اس شمارے میں سالِ نو کی پیش گوئیوں میں انہوں نے لڑکوں کے پائل اور ٹاپس پہننے کا ذکر کیا ہے جس سے بے اختیار ہنسی آگئی تو کیا یہ معمولی بات ہے مزاح لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہنوں کی محفل کو آپ نے زبیدہ آپا کے دسترخوان سے ملایا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کو ایسا کیوں لگا؟ پاکیزہ کی قارئین، تبصرہ نگار، مصنفات اور ادارے کے ارکان ایک محبت بھرے خاندان کی طرح ہیں۔ ان کی خوشیاں اور غم سب سانجھے ہیں۔ اس میں عظمیٰ کے بھائی کی شادی اور نانی کا ذکر کچھ عجیب نہیں جو لوگ ان محفلوں میں شریک نہیں ہو سکتے ان سب کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ چلو قلم کے ذریعے اس میں شرکت کی اگر عظمیٰ کی نانی سے لوگوں نے دعا کے لیے کہا تو کیا عجیب بات ہے۔ بزرگوں سے لوگ دعا کی درخواست کرتے ہی ہیں۔ انجم کی بہو ہم سب کی بہو اور بھابی ہے دلہنوں کی تعریف کرنا عجوبہ تو نہیں اور عظمیٰ بے چاری پر تو انجم بہت زیادتی کرتی ہیں کہ ٹیلنٹ ہونے کے باوجود اس کو نظر انداز کرتی ہیں پھر اقربا پروری کا الزام آگیا وہ ڈیز روکرنے کے باوجود نظر انداز کی جاتی ہے۔ یہ سب لوگ اقربا پرور نہیں محبت کرنے والے محبتیں بانٹنے والے، حوصلہ بڑھانے والے لوگ ہیں جو آج کل عنقا ہیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ قیصرہ حیات کی وضاحت، سیالکوٹ سے۔ "میرا ناول کہیں دیپ جلے کہیں دل گزشتہ ماہ ختم ہوا۔ تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے تنقیدی و تعریفی تبصرے لکھے۔ تعریف جہاں رائٹرز کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنتی ہے وہاں تنقید اصلاح کا در بھی کھولتی ہے۔ اس لیے میں کھلے دل سے دونوں کا خیر مقدم کرتی ہوں لیکن گزشتہ ماہ ایک قاری بہن مسز رضا نے جو تنقیدی جائزہ پیش کیا وہ انتہائی مایوس کن اور الزامات سے بھرپور ہے۔ محترمہ نے پاکیزہ کی پرانی قاری ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو میں اس بات سے بالکل انکار کرتی ہوں کیونکہ اگر آپ پرانی قاری ہوتیں تو آپ مجھ پر ہرگز یہ الزام نہیں لگاتیں کہ میرے افسانوں نے پرانی ہندی اور پاکستانی فلموں کو مات دے دی ہے۔ یہ ایسا سنگین الزام ہے جو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔ میں 2000ء سے پاکیزہ میں گاہے بگاہے لکھ رہی ہوں اور میری تمام تحریریں روحانی، مذہبی و اخلاقی موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے پاکیزہ میں میرے شائع ہونے والے ناول پلِ صراط، حرام و حلال کے فلسفے پر، سایۂ دیوار بھی نہیں

مذہبی موضوع پر، وجودِ لاریب افسانہ اللہ کی وحدانیت پر نہیں پڑھے۔ الف اللہ اور انسان شاہ کار ادبی ناول، ذات کا سفر اور دوسری تحریریں پڑھی ہوتیں تو ایسا ہرگز نہ لکھتیں۔ دوسرا الزام یہ کہ کہیں دیپ جلے میں ردا مرنے سے پہلے اپنے عاشق کے نام خط لکھتی ہے اور حرام موت کو گلے لگاتی ہے بہتر تھا کہ کچے ذہن کی لڑکیوں میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آج کل کے زمانے میں کس کا ذہن ناپختہ ہے۔ آج کل تو چھوٹے، چھوٹے بچے بہت سمجھدار اور میچور ہیں۔ اچھا برا سب سمجھتے ہیں۔ مجھے تو آپ کا ذہن انتہائی ناپختہ اور امیچور لگ رہا ہے جو میرے ناول کا مقصد سمجھی ہی نہیں اور لگی تبصرہ کرنے۔ افسوس کہ مطلب سمجھانے کے لیے مجھے خود وضاحت کرنی پڑ رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کو ناول کے اختتام سے اختلاف ہے۔ میں انہیں بھی یہ واضح کرنا چاہتی ہوں کہ اس ناول کے دو ٹریکس تھے۔ پہلے ٹریک میں آزر کتنے بڑے گناہ کرتا ہے مگر پھر سچے دل سے توبہ کر کے اللہ سے معافی مانگتا ہے اور مرتے ہوئے اپنے ایک اچھے عمل سے کسی دوسرے کی زندگی کو روشن کر جاتا ہے اور ان کی زندگی میں خوشیوں کے دیپ جلتے ہیں۔ دوسری طرف ردا کا ٹریک کہ اس نے خودکشی کسی محبت کے لیے نہیں دوسرے لوگوں کے رویّوں سے تنگ آ کر کی تھی اور شوہر اور بھائی کے نام بھی خطوط لکھے۔ ہر برائی کی جڑ حسد ہے۔ اسی سے کینہ، نفرت، دشمنی پھیلتی ہے۔ حاسد انسان دوسروں کی جڑیں کاٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہی شمیلہ نے کیا۔ اس نے سازشوں کا ایسا جال بچھایا کہ کوئی ردا کی بات سننے کو کیا اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر محترمہ نے نہیں دیکھا تو وہ پھر کسی خلائی سیارے میں رہتی ہیں اکثر مائیں سچی ہوتے ہوئے بھی بے بسی سے خاموش رہتی ہیں کہ وہ بہوؤں کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتیں۔ بیٹے ایسے بدلتے ہیں کہ جو بہویں کہتی ہیں وہی حق سچ ہوتا ہے۔ ہم زندہ لوگوں کی خطائیں معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور اذیتیں دے کر ان کی زندگیوں کا دائرہ اتنا تنگ کر دیتے ہیں کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔ ختم دلائے جاتے ہیں اور قبروں پر جا جا کر پھول اور دیے جلائے جاتے ہیں۔ کیا ردا کی ماں اپنے بیٹوں کو یہ سب کچھ نہیں کہتی کہ جب وہ زندہ تھی تب تو تم اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھے اب کیوں آنسو بہا رہے ہو؟ شوہر کیوں پچھتاتا ہے کیونکہ اس نے بھی اس کے ساتھ ناحق کیا ہوا ہے مگر افسوس کہ اس ناول کو ایک عام رومینٹک اسٹائل میں ہیپی اینڈنگ کے ساتھ پڑھا جاتا تو بہت خوشگوار تاثر ہوتا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ ہمیں اپنے رویّوں کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم تعلیم کو سمجھنے کی کوشش تو کرنی چاہیے اور محترمہ نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کا حوالہ دیا ہے۔ اگر آج پاکیزہ میں آگ کا دریا شائع کیا جائے تو تنقید کرنے میں یہی سب سے آگے ہوں گی کہ یہ کیا سر کے اوپر سے گزر گیا، سمجھ ہی نہیں آیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی افسوس ہے کہ اتنی پرانی قاری کو پاکیزہ میں ابھی تک سوائے ایک کے کوئی اور اچھی رائٹر نہیں ملیں جن کی تحریر کو پڑھ کر ان کے ادبی ذوق کو تسکین ملتی۔ عظمیٰ کے افسانے میں نے بھی آج تک نہیں پڑھے ان کا جھوٹ تو یہیں پر کھل گیا۔ لگتا ہے پچھلے ماہ خصوصی طور پر پاکیزہ خرید کر نہ جانے اپنا کون سا لاوا اگلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہنوں کی محفل کہاں سے زبیدہ آپا کا دسترخوان لگتی ہے۔ انتہائی حیرت کی بات ہے میں اور باقی میگزین پڑھوں یا نہ پڑھوں مگر یہ ضرور پڑھتی ہوں کیونکہ اس میں تحریروں پر بھرپور تعریف و تنقید کے ساتھ ساتھ رائٹرز اور قارئین کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ انسان جس پلیٹ فارم سے وابستہ ہوتا ہے وہ سب لوگ ایک فیملی کی طرح ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات اور سرگرمیاں جان کر آگاہی ہوتی ہے۔ آخر اس میں مضائقہ کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے میگزین کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو کیا تجاویز پیش کی ہیں وہ بھی بتا دیں۔ ہم سب کو جان کر خوشی ہوگی کہ صرف منفی تنقید پر ہی اکتفا نہ کریں انسان کو عملی مظاہرہ بھی کرنا چاہیے۔ میں اب بھی کہتی ہوں کہ پاکیزہ کا معیار، کاغذ اور تحریریں دوسرے میگزینز سے بہت اچھی ہیں۔ عذرا صاحبہ، انجم باجی، نزہت اصغر سب لوگ اپنی بھرپور کوشش کر رہے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کی کوششوں کو سراہنا چاہیے جہاں کوئی کمی دکھائی دے تو مثبت انداز میں اس کا جائزہ لے کر حل بھی پیش کرنا چاہیے یوں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ میرے خیال میں محترمہ کو پہلے اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ مسز اقصیٰ عمران، لاہور سے۔ "بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے بہنوں کی محفل میں جگہ دی اور اچھا لگا یہ جان کر کہ آپ کو میری والدہ مرحومہ یاد ہیں۔ سب سے پہلے آپ کا پیغام پڑھا۔ واقعی اپنے مسائل کو بڑھانے میں سب سے زیادہ ہاتھ ہمارا خود کا ہوتا ہے۔ جیسے گھر کے کسی مسئلے کو یا تو چپ رہ کر ہم عقل مندی سے حل کر سکتے ہیں یا غصے میں آگ بگولہ ہو کر اپنا گھر خود برباد کر سکتے ہیں۔ افسانے سب بہت اے ون رہے اور شجاع کا اصلی چہرہ سامنے آگیا۔ ویل ڈن نمرہ جی۔ اک نئے موڑ

پر بھی دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ فاران اور زنیرا کی محبت بھری زندگی میں اتنا خطرناک موڑ آگیا، پڑھ کر افسوس ہوا۔ عالیہ حرا نے اس دفعہ بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا کہ عزتِ نفس، محبت سے زیادہ ضروری ہوتی ہے کیونکہ جو رشتہ آپ کو عزت نہیں دے سکتا وہ آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ یہ زندگی کے راستے عقیلہ حق کی اچھی کاوش تھی۔ زندگی میں پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے تو پیسے والوں کی زندگی برباد ہوتے دیکھی ہے۔ انسان کو ہر حال میں صبر شکر سے کام لینا چاہیے۔ بے وفا سے وفا ایک پرانے ٹاپک پر لکھی گئی تحریر تھی۔ ایسی کہانی پہلے بھی پڑھ چکی ہوں۔ اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی بیٹی تھی۔ ایسا لگا کہ یہ کہانی مجھ پر لکھی گئی ہے کیونکہ مجھے بھی بہت خواہش تھی کہ میری پہلی اولاد بیٹی ہو۔ بہنوں کی محفل میں مسز رضا کا تنقید سے بھرا خط پڑھا مگر میں یہی کہوں گی کہ کہانیاں وہی سب کچھ بتاتی ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے۔ آپ کا جواب آپ کی خوش اخلاقی کو ظاہر کرتا ہے انجم آنٹی۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✉ حمیرا الاشاری، نامعلوم مقام۔ گڑیا میرے موبائل پر مراسلات بھیجنے کے بجائے تم پاکیزہ کے ایڈریس پر بھیجو تا کہ پاکیزہ میں لگائے بھی جاسکیں۔ میں تو اپنا موبائل روزانہ دیکھتی تک نہیں ہوں بلکہ وہ اکثر میرے بیگ میں پڑا سوتا رہتا ہے۔

✉ ثریا ناز، کراچی۔ خوش آمدید، جی ہاں پاکیزہ بہت بڑی اشاعت کا پرچہ ہے۔ گزشتہ ماہ شائستہ زریں کا سالِ نو کے حوالے سے سروے شائع ہوا جس میں سیما رضا نے بھی شرکت کی تھی۔ سیما نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بلا مبالغہ کوئی 36 فون آگئے کہ وہ کون سا گلا خریدا ہے تم نے جو اپنی شرٹ پر لگاؤ گی انہیں یاد بھی نہیں آیا کہ وہ کیا بات پوچھ رہی ہیں اور جب انہوں نے پاکیزہ دیکھا تو فوراً کہا ماشا اللہ پاکیزہ بہت بڑی اشاعت کا پرچہ ہے۔

✉ ایک بہن، کراچی۔ میں نے دانستہ آپ کا نام نہیں شائع کیا۔ میرے پاس عموماً کھلے ہوئے خطوط آتے ہیں مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بند لفافے بھی آجاتے ہیں۔ آپ کا لفافہ کھولا تو اس میں آپ کے خط کے ساتھ لاہور کی ایک بہن کا خط بھی اس میں رکھا تھا۔ نیا نام تھا رائٹنگ بھی آپ کی نہیں ہے یا آپ نے کسی سے لکھوا کر رکھی ہے مگر یہ کیا طریقہ ہے کسی پر بھی تنقید کرنے کا۔ امید ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔

صائمہ یاسر شاہ، کراچی سے۔ ”بہت عرصے تک غیر حاضر رہنے کے لیے معافی چاہتی ہوں مگر خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ کوئی ایسا دن نہیں جب میں نے آپ کو اور پاکیزہ بہنوں کو یاد نہ کیا ہو۔ زندگی کا ہر دن ٹینشن سے بھرپور ہوتا ہے مگر ہم عورتیں ہر نئی صبح کا اس امید پر انتظار کرتی ہیں کہ شاید یہ خوشیوں کے پیغام لے کر طلوع ہو مگر آفرین ہے آپ پر اور ایسی دوسری عورتوں پر جو نہ صرف اپنے گھر، عزیز، رشتے داروں، دوست احباب کا حق پورا پورا ادا کرتی ہیں بلکہ ایک کامیاب سیلی بریٹی بھی ہیں۔ آپ جیسی خواتین یقیناً بہت خاص ہوتی ہیں جبھی اللہ نے کامیابیاں بھی عطا کی ہوئی ہیں۔ ہم جیسی تو گھر کے کاموں اور اپنی ذمّے داریوں سے ہی نبرد آزما ہو لیں تو بڑی بات ہے۔ ذرا سے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑے تو ساری عقل ہوا ہو جاتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کریں، کیا نہ کریں۔ یہی حال کچھ میرا بھی تھا۔ خود کو بہت حد تک دوبارہ سے کمپوز کر کے بہنوں کی محفل کے لیے حاضر ہوں۔“ (گڑیا، یہ تمہاری محفل ہے تبصرے کے ساتھ شرکت کرو۔ آپ تو ہاؤس جاب کرنے والی خواتین ہیں اور آپ کی ذمّے داریاں بہت زیادہ ہیں۔ اللہ آپ پر اپنا رحم اور کرم فرمائے اور ہمیشہ خوش رہو)

لاریب، ماہ زیب، چونیاں سے۔ ”سرورق بہت خوب صورت تھا۔ عینی بی بی ٹائٹل پر کافی جچ رہی تھیں۔ عنیزہ سید نے ہمیشہ کی طرح شاندار لکھا۔ میرال کی تلاش میں ہر طرف کنوؤں میں بانس ڈلے ہوئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے اس تلاش میں سب سے پہلے کامیابی کس کی ہوتی ہے۔ رفعت سراج کے ناول میں جابر علی کا جبر زوروں پر ہے اور یہ ہی قصہ ہے جو کچھ دلچسپ اور حقیقی لگتا ہے ورنہ باقی کہانی تو...... قیصرہ حیات کے ناولٹ کا اختتام بھی ویسا ہی قیامت خیز تھا جیسا دھماکا خیز آغاز تھا۔ بہرحال کہانی جیسی بھی رہی لیکن ردا کی موت کی توقع کسی کو بھی نہ ہوگی۔ روحیل اور حاتم کے ساتھ ٹھیک ہوا لیکن توقیر کا انجام اچھا ہونا چاہیے تھا۔ خدیجہ بیگم بھی آزمائشوں میں پوری اتر کر سزاوار کیوں ٹھہریں۔ ردا بے چاری کا کیا قصور تھا جس کی اسے اتنی کڑی سزا ملی۔ دنیا میں بھی تکلیفیں اٹھائیں اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بنی۔ شمیلہ کے انجام کے ساتھ ہمیں کوئی اختلاف نہیں اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہوتا تو وہ اس کی بھی حق دار تھی۔ یمنیٰ کا کردار ساری کہانی میں اچھا رہا۔ اس کو اس کی نیک فطرت کا صلہ مل ہی گیا محسن کی صورت۔ خالدہ نسیم نے محبت کا زیاں افسانوی اور یادگار افسانہ لکھا اچھا لگا۔

سب سے اچھا افسانہ جیسے کو تیسا رہا۔ ہاں بھئی آج کا دور ہی ایسا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دو تو لوگ کمزور سمجھ کر گردن پر پاؤں رکھنے کو آتے ہیں۔ اب درگزر یا نظر انداز کرنے کا وقت رہا ہی نہیں۔ فوزیہ احسان کا شاید یہ پہلا افسانہ تھا پر تھا زبردست۔ منحوس غیر حقیقی تحریر لگی اس لحاظ سے کہ حیدر کو تو عاشی کو محبت سے پروں میں چھپا لینا چاہیے تھا حاجرہ کی نشانی سمجھ کر لیکن اس نے اسے دھتکار کر زمانے کی ٹھوکروں پر چھوڑ دیا تو پھر یہ ہی انجام ہونا تھا بے چاری عاشی کا۔ حقیقت میں بھی اور کہانیوں میں بھی زیادہ تر بے قصوروں کو ہی سزا ملتی ہے۔ جلترنگ اس مرتبہ نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ بزم میں اختر شجاعت سے ملنا اچھا لگا۔ انجم آنٹی آپ بھی بزم کی مہمان بنیں ناں جانے کتنے لوگ آپ کی راہ تک رہے ہیں ہم سمیت۔ انتظار رہے گا آپ کی آمد کا۔ شمع ہدایت اور دین کی باتیں ہی صراط مستقیم ہیں جو کوئی سمجھے تو۔“ (تبصرے کا شکریہ۔ ہاں آپ اور دیگر بہنیں لال روشنائی سے خط لکھ کر مت بھیجا کریں پڑھنے میں بھی دشواری ہوتی ہے)

شبنم کنول، پاپا نگری سے۔ ”اس دفعہ ٹائٹل بہت ہی اچھا تھا۔ مجھے کچھ کہنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے تو ویسے بھی پاکیزہ میں لکھا ہوا ہر لفظ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ شاید مجھ سے ناراض ہیں جو میری شاعری شائع نہیں کرتیں۔ پورا سال میں نے لکھ کر بھیجا ہے لیکن آپ نے صرف دو دفعہ ہی شائع کیا ہے۔ آپ سب کی شاعری شائع کرتی ہیں پر میری کیوں نہیں کرتیں آپی۔ کیا میری شاعری اس لائق نہیں کہ شائع ہو میری سب فرینڈز جب مجھ سے پوچھتی ہیں کہ اس دفعہ بھی کچھ شائع نہیں ہوا تو میں کہتی ہوں نہیں، بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ اس دفعہ میں افسانہ لکھ کر بھیج رہی ہوں پلیز آپی شائع کر دیجیے گا۔ قیصرہ حیات آپی آخری قسط اچھی نہیں لگی۔ ردا کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا کہانی کا سارا مزہ ہی خراب ہو گیا۔“ (گڑیا آپ کا افسانہ ناقابلِ اشاعت ہے۔ آپ اپنے مراسلات نثر میں بھیجیں میں آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کروں گی)

کنیز بتول ملک، لاہور سے۔ ”میرا گھر گاؤں میں ہے۔ رکشے یا تانگے پر ماما کے ساتھ جاتی ہوں سو روپے کرایہ لگا کر پوسٹ آفس سے 100 روپے کے آٹھ لفافے ملتے ہیں جو میں اکٹھے لے آتی ہوں اور پھر بھائی کو خط دیتی ہوں پوسٹ کرنے جو بیس روپے لیتا ہے اور پھر خط پوسٹ کرنے جاتا ہے بقول اس کے 100 روپے کا لیٹر تیل لگتا ہے بائیک میں۔ میں تو صرف کولڈ ڈرنک کے پیسے لیتا ہوں تم سے۔ آنٹی ہم لوگ ایک گھر کی طرح ہیں آپ کو یاد ہوگا زم زم وہاڑی جو بہت دکھی تھی سال ہونے کو آیا اس کا کوئی اتا پتا نہیں پلیز آپ کے پاس اس کا ایڈریس ہو یا فون نمبر تو پلیز پتا کروالیں کہ وہ خیریت سے ہے۔“ (زم زم بیٹا کہاں ہو؟ رابطے میں رہو گڑیا، آپ نے آزمودہ نسخے جو ہمیں بھیجے تھے وہ اپنے خط میں ہی لکھ دیے تھے تو میں انہیں کیسے شائع کرتی اور شادیوں کے وظائف جو آپ نے بھیجے تھے وہ ہم بارہا لگا چکے ہیں)

کشمالہ، ملتان سے۔ ”میں پاکیزہ کی چاہنے والی خاموش بچی ہوں، ہاہاہا۔ اس بار قلم اٹھانے کی ہمت صرف اور صرف نمرہ احمد کے پارس نے کروائی۔ یوں تو پورا پاکیزہ پسند آتا ہے مگر پارس کی جتنی تعریف کروں اتنی کم ہے۔ نمرہ احمد ہر رائٹر سے زیادہ اچھا لکھ رہی ہیں۔ پارس پڑھتے ہوئے دل ہی نہیں چاہتا کہ کبھی ختم ہو۔ ایک، ایک لفظ دل کو چھو لیتا ہے۔ جس طرح کردار کا اپنے ماضی میں کھونا جو لوگ پارس کو پسند نہیں کر رہے دراصل ان کے اندر پڑھنے کا اصل ذوق ہی موجود نہیں ہے۔ کس طرح کے الفاظ ہیں کہ وقت کا رولر کوسٹر کائی کے تگ میں یادتو بھی بوندوں میں کاش پارس کی آٹھ سو اقساط ہوتیں، ہاہاہا۔ پلیز نمرہ احمد کو کہیں کہ پارس کتابی شکل میں بھی شائع کروائیں۔ نمرہ احمد تک میرا پیغام پہنچا دیں گی؟ کہ آپ میری پہلی اور آخری پسندیدہ رائٹر ہیں۔“ (گڑیا، اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا پیغام آپ کی پسندیدہ رائٹر تک پہنچایا جا رہا ہے)

شمسہ رضوان، کراچی سے۔ ”آپ کے رسالے کا نام ہی پاکیزہ نہیں تمام ٹیم کے حسنِ سلوک اور عملی رویّوں میں بھی پاکیزگی اور معصومیت ہے اللہ آپ سب کو بری نظر سے بچائے، آمین۔ ابھی کچھ کہنا ہے، دین کی باتیں الگ، الگ اندازِ تحریر کے ناول اور افسانے بہت بہترین ہیں۔ قربانی، میرا نام حنا ہے بہت اچھے لگے۔ عظمیٰ آفاق کی پاکیزہ ڈائری اس دفعہ کی بہت اچھی تھی جلترنگ کے دونوں موضوع بہت مزے کے تھے ہنسی آئے بغیر نہیں رہتی۔“ (پسندیدگی کا شکریہ۔ ہاں اپنے مراسلات نثر میں بھی بھیجو تا کہ لگائے جاسکیں)

عنبرین اختر، آزاد کشمیر سے۔ ”رسالہ بہت اچھا ہے۔ مجھے لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے۔ شاہکار اور خودکشی کہانیاں بھیجی ہیں کب لگیں گی۔ سب چیزیں شوق سے پڑھتی ہوں۔“ (میں کہانیاں پڑھ کر آفس بھجوا رہی ہوں۔ آپ آمنہ حماد سے معلوم کرلیں ویسے جہاں تک مجھے یاد ہے کہ ایک کہانی تو ناقابلِ اشاعت ہے)

ٹھ سمارہ خان، پشاور سے۔ ”اپنی کہانی بھیجی ہے پاکیزہ کو بہت پسند کرتی ہوں۔“ (کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ)

ٹھ نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ ”باجی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ میری بھیجی گئی ترکیبیں، اشعار اور مراسلے لگا رہی ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ رسالے کے معیار پر پوری اتر سکوں۔ ماہ دسمبر کا شمارہ اداس ٹائٹل لیے ہوئے تھا مگر اندر کی تحریروں نے اداس نہیں رہنے دیا۔ پارس کے تجسس کو اب ختم کرنا چاہیے۔ دیگر تحریروں میں رضوانہ پرنس اور عنیقہ محمد بیگ کی کہانیاں پسند آئیں ذراہٹ کر ہیں۔ خالدہ نسیم کی کہانیاں لگتا ہے سچی ہیں پہلے بھی محبت کے بہت اچھوتے معانی بیان کیے تھے۔ غزالہ عزیز نے خالص افسانہ لکھا مگر فوجی نوجوانوں کے بارے میں بہت اچھا لکھا واقعی ہمیں اپنی سرحدوں کے محافظوں کا مثبت انداز میں ہی ذکر کرنا چاہیے۔ اس دفعہ نزہت اصغر پھر ایک رائٹر کا انٹرویو لے کر آئیں کافی اچھی باتیں ہوئیں۔ شیریں حیدر، فرحانہ ناز ملک اور ایک پرانی رائٹر رفعت ناہید سجاد سے اگر ہو سکے تو ملاقات کروائیں۔ کہیں دیپ جلے کا اختتام بس سو سو تھا۔ ردا کے اینڈ پر افسوس ہوا۔ ویسے بات آدھی تو سچ ضرور ہے کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا کہ اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ اس دفعہ دینی مضمون ناز فاطمہ نے اچھا لکھا۔ یہ سلسلے شامل کرتی رہا کریں۔ نوٹ کیے جانے کے قابل ہوتے ہیں کچھ تو میں اپنی ڈائری میں اتار لیتی ہوں۔ آخر میں بہنوں کی محفل میں اپنی بہنوں کے متعلق عرض ہے کہ تمام بہنوں سے ملاقات اچھی اور دلچسپ لگتی ہے۔ سب اپنے گھر کی طرح خیالات کا اظہار کرتی ہیں ویسے یہ پاکیزہ سے دوستی کا ثمر ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے دردمند دل رکھتے ہیں۔“ (ہاں یہ بات تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں)

ٹھ صبا نور، لیہ سے۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں نے میٹرک کر لیا ہے اور آپ نے نہ صرف پاکیزہ میں مجھے مبارک باد دی بلکہ گفٹ بھی بھیجا جو مجھے بہت بہت پسند آیا۔ تھینک یو آپی بس اس خوشی میں ایک کمی سی ہے وہ یہ کہ آپی... کاش میں آپ کے سینے سے لگ سکتی۔ آپ بہت بہت اچھی ہیں۔ آپ کی محبت، آپ کا پیار، آپ کا خلوص میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گی اور آپ کو تمام عمر اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ آئی لو یو آپی اور ہاں آپی آپ نے جو بک گفٹ کی اس کی رائٹر کا دسمبر کے پاکیزہ میں انٹرویو دیکھ کر تو میں خوشی سے اچھل ہی پڑی واہ آپی جیو ہزاروں سال۔ آپ نے تو مجھے ڈبل خوشی سے نوازا اور ہاں اپیا جن بہنوں نے پوچھا کہ میٹرک کیسے کیا جائے تو پیاری بہنو! آپ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے میٹرک آسانی سے کر سکتی ہیں۔ فروری میں ایڈمیشن جائیں گے میں بھی انشاء اللہ اپنے ایف اے کا ایڈمیشن بھیجوں گی کیونکہ علم کی جو شمع مجھ میں انجم آپی نے روشن کی ہے میں اسے بجھنے نہیں دوں گی۔ تو آپ لوگ بھی بک شاپ پر جا کر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا پراسپیکٹس خرید لیں، اس میں ایک فارم ہوتا ہے اسے فل کریں اور بینک میں جمع کروا دیں تھوڑے عرصے بعد یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو بکس ملیں گی آپ انہیں پڑھیں اور امتحان کی تیاری کریں۔ اسائنمنٹ لکھ کر اپنے ٹیچرز کو بھیجیں، ٹیچرز کا ایڈریس یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو مل جائے گا چھ ماہ بعد یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈیٹ شیٹ ملے گی اور آپ کو جا کر امتحان دینا ہوگا میٹرک دو سال میں ہوتا ہے اور ہر چھ ماہ بعد امتحان دینا پڑتا ہے دوسے تین بکس کا ویسے بھی ساری معلومات آپ کو پراسپیکٹس سے مل جائے گی۔“ (پیاری بہنوں میں نے صبا نور کا خط اپنی واہ واہ کرنے کے لیے نہیں شائع کیا کہ میں نے سوائے اس کا حوصلہ بڑھانے کے کچھ نہیں کیا، یہ حقیقت ہے اور کسی کی ہمت بندھانا ایسا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ بھی اپنے آس پاس علم کا چراغ جلا سکتی ہیں۔ صبا نور جیسی بے شمار لڑکیاں ہیں اور ایف اے کرنے کے بعد یہ پیاری بیٹی سی ٹی کی ٹریننگ کرے گی تا کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی استعداد بڑھاتی چلی جائے گی۔ وہ بہنیں جو میٹرک، انٹر یا بی اے پرائیویٹ کرنے کی خواہش مند ہیں وہ صبا نور کی بتائی ہوئی معلومات سے مستفید ہو سکتی ہیں)

☒ سدرہ کلثوم مروت، لکی مروت۔ گڑیا اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی راتوں رات رائٹر بن جائے۔ عمیرہ احمد، قیصرہ حیات، رفعت سراج جیسے نام راتوں رات نہیں بنے ہیں۔ آپ بھی اچھی کتب کا مطالعہ کیجیے۔ ہم بہنوں کی محفل میں بھی کتابوں کا تعارف کرواتے رہتے ہیں آپ اپنی مایہ ناز مصنفات کی کتب سے بھی مستفید ہو سکتی ہیں۔

☒ صدف شاہ۔ ابھی آپ کا ناولٹ میں نے نہیں پڑھا۔

☒ فائزہ فاروق سحر، کراچی۔ آپ کی یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے تمام مسلمانوں میں یکجہتی رکھے پڑھ کر بے اختیار لبوں سے آمین اور ثم آمین کی صدا بلند ہوئی۔ گڑیا آئندہ خط میں تبصرہ بھی ضرور کیجیے گا۔

☒ مسز ناصرہ سلیم، کوئٹہ سے۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے ہمیں لکھا ہے کہ منحوس ناولٹ پڑھ کر آپ کو یاد آیا کہ اس موضوع پر ڈراما بھی ٹی وی پر آچکا ہے تو اس بارے میں عرض کر دوں کہ ہمارے پاس یہ ناولٹ کافی دنوں سے رکھا تھا اور عنیقہ محمد بیگ ہمارے ڈائجسٹ کی رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ٹی وی کی رائٹر بھی ہیں تو وہ ایسا کیوں کریں گی کہ ڈراموں کو لے کر ناولٹ لکھیں گی۔ ہماری یہ رائٹر تو کچھ لکھنے سے پہلے موضوع پر تبادلۂ خیال تک کرتی ہیں۔ اب رہی مشابہت کی بات تو وہ تو اگر پچاس فی صد ٹی وی ڈراموں کے بارے میں... یہ کہا جائے کہ وہ ملتے جلتے ہیں بلکہ ایک جیسے ہیں تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا۔ بہر حال خط لکھنے کا شکریہ۔

☒ عطیہ زہرہ، کراچی۔ خوش آمدید، آپ کی نظمیں تو اچھی لگیں۔ اب افسانے کے بارے میں کچھ کہیں گے تو آپ کو شکایت ہوگی اس لیے چھوڑیئے۔

ٹھ اُم طیفور، پنجاب سے۔ ”میں الحمدللہ تیسری مرتبہ پریگنینسی کے عمل سے گزر رہی ہوں۔ اب تو محض ایک ڈیڑھ ماہ ہی رہ گیا ہے فراغت میں۔ آپ سے دعاؤں کی طلب گار ہوں۔ ویسے بھی میں نے پہلے چار ماہ بے تحاشا تکلیف میں گزارے ہیں۔ اپنی بیماری کے دوران پاکیزہ بالکل نہیں پڑھ پائی تھی۔ سب اکٹھے ہوئے رکھے تھے جنہیں پچھلے ماہ ہی پڑھ پڑھ کر ختم کیا ہے۔ اس ماہ سے ریگولر ہو گئی ہوں۔ افسانے اور نمرہ احمد کا مکمل ناول پارس پڑھ چکی ہوں جبکہ سلسلے وار ناولٹ ابھی باقی ہیں ہاں جلترنگ ضرور پہلے پڑھ لیتی ہوں طبیعت کی کسلمندی اور چڑچڑاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے۔ فوزیہ احسان کی جیسے کو تیسا بہت ہلکی پھلکی اور مزے کی تحریر تھی۔ غزالہ عزیز کا افسانہ بھی اچھا تھا اور پارس تو اول تا آخر سنسنی اور اسرار سے بھرپور تھا۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ انجم آنٹی اب مجھے بھی بتایئے کہ میرا نمبر کب آئے گا۔ پچھلے ماہ کے خطوط میں آپ کا تمام نئی مصنفات کے نام پیغام پڑھا جس میں آپ نے سب کو اپنی تحریروں کے چھپنے کے سلسلے میں انتظار کا کہا تھا کہ اگر قابلِ اشاعت ہیں تو ضرور لگیں گی۔“ (گڑیا اللہ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ خوشیاں عطا فرمائے اور آپ کا افسانہ جلد لگے گا)

ٹھ شیریں ظفر، ملتان سے۔ ”دوڑتے بھاگتے پہنچے بہنوں کی محفل میں۔ انجم آنٹی آپ کا پیغام پڑھا بہت دل کو چھونے والی باتیں کہیں آپ نے۔ آپ سچی ہیں میں نے بھی اسی طرح نماز شروع کی تھی اب ہر نماز کے بعد والدین کی مغفرت کی دعا کرتی ہوں تو سکون ملتا ہے ورنہ بے چین رہتی ہوں۔ ان دونوں کو بھی ستر ہزار کلمہ پڑھ کر بخشا اور اب میں اور میرے شوہر، ساس، سسر عمرہ کرنے جا رہے ہیں (مبارک باد اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا) نزہت اصغر کا شکریہ کہ اختر شجاعت کا بہت اعلیٰ انٹرویو کیا مگر کتاب ذکرِ صالحین کا ذکر ذرا کم تھا مگر میرا بھرپور ارادہ بن گیا ہے کتاب پڑھنے کا انشاء اللہ۔ اختر شجاعت جی آپ کو اللہ نے توفیق بخشی آپ بخشی ہوئی روح ہیں، میں آپ کی فین ہو گئی ہوں۔ اللہ آپ کی طرح ہمیں بھی اندر باہر سے بدلنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔ نمرہ احمد پارس نے کئی کروٹیں بدل لیں۔ پارس کو پتا ہے کہ فیضان ہی فائز ہے یہ سوچ غلط ہو گئی ہم سب کی لیکن تنویر صاحب کا کردار شک کی دھند میں لپٹ گیا ہے اور سویرا بھی ان کی ساتھی ہے شاید۔ فیضان کو شدید شاک لگنے والا ہے مگر یہ تو اندازے ہیں پاکیزہ میں جاسوسی ناول پڑھ کر مزہ آ گیا منظر نگاری بہت خوب ہے، ویل ڈن۔ قیصرہ حیات نے بالآخر کہیں دیپ جلے کہیں دل کا اختتام کر ہی دیا۔ بہت ہی اچھا ناولٹ لکھا۔ فکشن ہے سو کبھی کبھی کچھ واقعات حقیقت سے ماورا لگتے ہیں مگر اوور آل اچھا تھا۔ عنیزہ جی شام شہر یاراں ابھی ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے اس پر تبصرہ پھر آئندہ۔ آپ کا اپنا ہی انداز ہے۔ اک نئے موڑ پر رضوانہ جی آپ کی ہیروئن تو فلم کی ہیروئن سے بھی زیادہ نخرے باز ہے۔ اپنے خاوند کو اور اس کے پروفیشن کو سمجھ ہی نہیں پا رہی۔ بے چاری کو لمبا اور بھاری تاوان بھرنا پڑ جائے گا۔ زنیرا کو ہوش کے ناخن دیں جن سے فاران کا منہ نہ نوچے اور اجالا کو تھوڑا کم فلیکس ایبل دکھائیں ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔ اجالا جو اچھائی کر رہی ہے اس کی کیا ضرورت ہے؟ اجالا کو اس کے گھر کا راستہ دکھائیں پلیز۔ انجم آنٹی عنیقہ محمد بیگ کا منحوس پڑھ کر بالکل بھی مزہ نہیں آیا۔ سکینہ فرخ کا میرا آشنا ہوا اجنبی پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور سچائی دل کو چھو گئی۔ صائمہ حیدر کا بابو اور میں ایک دلگداز افسانہ تھا۔ دھند میں لپٹی شام غزالہ عزیز پرانی کہنہ مشق رائٹر ہیں اچھا افسانہ تھا بہر حال مجموعی طور پر دسمبر کا شمارہ نمبر لے

گیا۔“ (طویل تبصرے کا شکریہ)

سیدہ علیشاہ، بہاول پور سے۔ ”دین کی باتیں اور روحانی مشورے ہمیشہ کی طرح مہکتے گلابوں جیسے لگے۔ خوش ذائقہ میں کچے گوشت کی چکن بریانی پسند آئی۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اور سندیسے عمدہ رہے۔ پاکیزہ ڈائری میں اپنی نظم دیکھ کر تھوڑی خوشی تھوڑا غم ہوا، ہی ہی ہی۔ بہنوں کی محفل میں آپ نے آنٹی افسانہ آفتاب کاوش کی بہت تعریف کی یقین جانیں آنٹی مجھے بہت جلن ہوئی۔ اب مجھے نہیں پتا آپ جلدی سے مجھے بھی سراہیں نہیں تو میں نے منہ پھلا لینا ہے وہ بھی غبارے جیسا، ہی ہی ہی۔ جلترنگ میں اب کی بار ایک خاکہ پڑھنے کو ملا شمع ہدایت سیدہ ناز فاطمہ نے بہت اچھا لکھا۔ تبصرہ مکمل ہوا اتنے اچھے اور خوب صورت رسالے کے لیے تھینکس۔“ (اب غبارے کی طرح منہ مت پھلاؤ۔ تم بھی اچھے مراسلات بھیجتی ہو اور نظمیں بھی چھوٹی بحر میں اچھی لکھ لیتی ہو)

فریدہ فری، لاہور سے۔ ”مجھ سے زیادہ نہیں لکھا جا رہا ایک تو بیماری کی وجہ سے دوسرے میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے یہ جو پاکیزہ میں مسز رضا کا خط لگایا ہے مجھے آپ پر بے حد غصہ آ رہا ہے یہ خاتون سب سے جیلسی فیل کر رہی ہیں تمام افسانہ نگاروں کے متعلق غلط لکھا ہے اتنی اچھی لکھنے والیوں کو تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ عظمیٰ آفاق کے متعلق پڑھ کر مجھے بے حد برا لگ رہا ہے اس معصوم سی لڑکی کو برا کہا وہ کون سا کہہ رہی ہیں، میں بڑی شاعرہ ہوں یا افسانہ نگار ہوں بس اپنی خوشی سے لکھتی ہیں انہوں نے تو نانی کو بھی نہیں چھوڑا بہنوں کی محفل کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ کون ہوتی ہیں دوسروں کو برا بھلا کہنے والی۔ آئندہ ان کا کوئی بھی خط مت لگائیے گا۔“ (گڑیا، یہ محفل سب کے لیے ہے۔ ہاں اپنی طبیعت کا پہلے خیال رکھیں)

نسیم سکینہ صدف، ڈسکہ سے۔ ”رفعت سراج کا ناول امانت کمال دکھا رہا ہے۔ عنیزہ سید تو لکھتی اچھا ہیں اور نمرہ کی تحریر بھی نمایاں ہوتی ہے سب تحریروں میں .... ہمیشہ سے انجم انصار کے شگوفے تو موڈ کو خوشگوار کر دیتے ہیں چاہے کتنے ہی اداس بیٹھے ہو۔ کوثر اعجاز اور فصیحہ آصف نے پوچھا تو دسمبر کی آخری شام کے بارے میں، میں نے بتایا کہ ہر سال دسمبر کی آخری شام میں اپنی امی کے خالی کمرے میں بکھری اداسی کے ساتھ ان کے بیڈ پر گزارتی ہوں جہاں ان کی ممتا کی خوشبو چاروں اور پھیلی ہوتی ہے اور اس کے لیے مجھے ڈسکہ سے فیصل آباد جانا پڑتا ہے۔ اوہ...... سوری میں نے تو سب کو اداس کر دیا جن کی مائیں سلامت ہیں میری دعا ہے کہ وہ ہزار برس زندہ رہیں۔“ (آمین)

ریحانہ حسن، کراچی سے۔ ”میرا نام ریحانہ حسن ہے۔ میں بھی ایک رائٹر ہوں مگر عمیرہ احمد آپ کی تحریر کو خدا نے جو حسن عطا کیا ہے وہ ہم میں ابھی نہیں ہے۔ بہرحال کوشش جاری ہے۔ میری بیٹی بسمہ حسن جو آپ کی بہت بڑی فین ہیں۔ آپ سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش مند ہے پلیز آپ اپنا کوئی کونٹیکٹ نمبر یا ای میل ایڈریس ضرور دیں تاکہ وہ فون پر آپ کی آواز سن سکے۔ آپ سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر سکے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

مسز تسنیم ماہ پارہ، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے اداریہ پڑھا بہت اچھا ہے۔ پارس تو سسپنس سے بھرپور رہا۔ قیصرہ حیات کے ناول کا اختتام مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ امانت ناول بھی سو سو چل رہا ہے۔ ایک بہن نے بہنوں کی محفل کو زبیدہ آپا کا دسترخوان کہا ہے مگر یہ پھولوں کا ہے اور اسے ہماری انجم نے ہم سب کو گلدستے کی شکل میں پرو رکھا ہے۔ رضوانہ پرنس کے ناول کی قسط اچھی لگی۔“ (شکریہ)

✉ نسرین ناز، کراچی۔ پیاری بیٹی، آپ کے امتحان ہونے والے ہیں۔ آپ ہمارے ڈرامے تو کیا کسی کے ڈرامے بھی نہ دیکھیں اور یکسوئی سے اپنی پڑھائی کریں۔ جی ہاں ان دنوں ایک ٹی وی چینل سے میرا پرانا سوپ اٹکھیلیاں چھوٹی چھوٹی شوخیاں کے نئے نام سے دکھایا جا رہا ہے۔

صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ”پاکیزہ میں اس بار ایک بہن مسز رضا، لاہور نے خاصی تفصیلاً تنقید کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ اردو ادب میں تنقید برائے تنقید کی پروفیسر ہیں ہر نئی پرانی دونوں مصنفات کو خاصی عرق ریزی سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مسز رضا کو چاہیے کہ ایک عدد افسانہ خود لکھیں تاکہ پڑھنے والے ان کے قیمتی تجربات سے مستفید ہو سکیں۔ رہی بات بہنوں کی محفل کی تو اگر آپ کو وہ زبیدہ آپا کا دسترخوان لگتی ہے اس میں برا کیا ہے گہما گہمی ہے رونق ہے آپ کو ہر طرح کے مسالے لگے چٹ پٹے خط، تحریریں اور تبصرے ملیں گے یہی انفرادیت ہے مزہ تو اسی میں ہے۔ بس آپ کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ خودکشی کو پروموٹ نہ کیا جائے صحیح ہے۔ تعمیری اصلاح کریں جو ہضم ہو سکے بلاوجہ ہر کسی کو تنقید کا نشانہ

نہیں بنانا چاہیے۔ رضوانہ پرنس بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ کہانی میں آگے کیا موڑ آتا ہے انتظار رہے گا۔ پارس کا اختتام اچھا ہوا نمرہ احمد کی یہ تحریر قابل تحسین ہے سسپنس تھا کہ اینڈ کیا ہوگا لیکن شکر ہے اچھا ہوا۔ باقی افسانے اچھے تھے عقیلہ حق نے اچھے موضوع پر لکھا واقعی طوائف صرف بھری جیب تک ساتھ ہوتی ہے جبکہ بیوی تاعمر سکھ دکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔ رفعت سراج کے سنگھار کے مشورے اچھے لگے چہرے کو بغض و عناد، حسد سے دور رکھا جائے تو خوب صورت نظر آنے لگتا ہے۔ خود بھی سکھی رہیں اور دوسرے کو بھی سکھی رہنے دیں۔ یہی اصل خوب صورتی ہے۔“ (بے شک)

✉ فریدہ فرح لاکھانی، آسٹریلیا۔ پیاری فریدہ آپ کا پُرمحبت خط اور نئے سال پر آپ کی جانب سے کارڈ ملا۔ بے حد شکریہ۔ عرصہ ہو گیا آپ کی نظمیں غزلیں مجھے نہیں ملیں۔ پہلی فرصت میں ارسال کر دیں۔ انشاء اللہ جب بھی میں بچوں کے پاس سڈنی آئی تو آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔

مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ”مجھے بہنوں کی محفل سب سے زیادہ پسند ہے۔ مسز رضا کا خط پڑھ کر تکلیف ہوئی۔ ایسے خطوط کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا جو لوگوں کو دکھ دیں۔ انہیں تو سب قارئین سے معذرت کرنی چاہیے۔ مجھے رائٹرز کے انٹرویوز بھی بہت پسند ہیں۔ اختر شجاعت کا انٹرویو اچھا لگا تھا۔ اب اس میں مجھے ذکیہ بلگرامی، نگہت سیما، شیریں حیدر، عظمیٰ آفاق اور آپ کا انٹرویو بھی پڑھنا ہے۔ ہاں اس ماہ کا جلترنگ پڑھ کر بے اختیار آپ کو دعائیں دے ڈالیں۔“ (شکریہ)

مسز راحت وفا، لاہور سے۔ ”انجم باجی! میں مسز رضا کے خط کی مذمت کرتی ہوں۔ ایسے سائیکی خطوط پلیز آئندہ مت لگائیں۔ باجی آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہمیں آپ سے کتنی محبت ہے...... ہاں نئے سال میں شامل تمام تحریریں پسند آئیں۔“ (تحریریں پسند کرنے کا شکریہ)

کوثر اعجاز چوہدری، قصور سے۔ ”ایک پریشانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے اگر نہ لکھتی تو ضمیر بے چین رہتا... وہ وجہ وہ پریشانی لاہور سے مسز رضا کا خط...... آپی آپ درمیان سے ہٹ جائیں مجھے اس پلیٹ فارم سے مسز رضا سے ڈائریکٹ مخاطب ہونا ہے۔ جی مسز رضا صاحبہ...... آپ کے خط میں کی گئی تنقید بلاشبہ آپ کا بنیادی حق ہے مگر آپ نے جو تنقید کی وہ تنقید برائے اصلاح کم اور تنقید بوجہ ذاتی عناد زیادہ لگی ہے۔ میری بہن آپ بقول آپ کے اگر پرانی قاری ہیں تو کاش تنقید کے ساتھ کھلے ذہن سے یہ بھی لکھ دیتیں کہ پاکیزہ ڈائجسٹ وہ واحد ڈائجسٹ ہے اور پاکیزہ ڈائری وہ واحد پلیٹ فارم ہے جس نے ہم اور آپ کو نہ صرف جگہ دی بلکہ کتنی نامور مصنفات اور شاعرات کو تخلیق کر کے قارئین اور ادبی شائقین کی تسکین کا باعث بنایا۔ میری بہن! آپ کی ہٹ لسٹ پر صائمہ اکرم چوہدری ہیں تو میں وضاحت کر دوں کہ کہانیوں کے کردار معاشرے سے ہی لیے جاتے ہیں اور تب ہی دلچسپی حاصل کر پاتے ہیں۔ ایک طرف آپ نے کہا ہے کہ کیا آج کے ماحول کی پروردہ لڑکی اس قدر لاڈلی ہے کہ ہر ایک اس کے پیروں تلے بچھا جا رہا ہے اور دوسری طرف آپ نے کہا کہ کچے ذہن کی لڑکیاں ڈراموں اور کہانیوں کی ہیروئنوں کا اثر لیتی ہیں محترمہ غور کریں آپ کہ ردا نے کن حالات میں خودکشی کی اور اس نے اپنے عاشق کو خط کیوں لکھا کب لکھا۔ اس نے شوہر سے بے وفائی یا غداری نہیں کی بلکہ صبر کی انتہا کو چھو کر کوئی چارہ کوئی شنوائی نہ پا کر یہ قدم اٹھایا۔ میری بہن ہم پاکستانیوں بالخصوص لاہوریوں کی تو روایت ہے کہ ایک کی بیٹی سب کی بیٹی ایک کی ماں سب کی ماں اور بزرگ تو سانجھے ہوتے ہیں، میں دعوے سے کہوں گی کہ میں آج اگر اپنی نانی کا لکھ کر بھیجوں تو وہ بھی سب کی نانی کا اعزاز حاصل کر لیں گی اور پاکیزہ کی تاریخ گواہ ہے کہ انجم آپی نے آج تک عظمیٰ آفاق کو پروموٹ نہیں کیا، ایک جملہ بھی ان کی ادبی صلاحیت پر کبھی استعمال نہیں کیا۔ وہ اپنی محنت اپنے جذبے سے آگے آنے میں کامیاب ہوئی ہیں اور قیصرہ حیات اور رفعت سراج نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں بچیوں کو یہ باقاعدہ سمجھایا ہے کہ غلط قدم اٹھانے کا نتیجہ کبھی مثبت نہیں ہوتا، پچھتاوے مقدر بن جاتے ہیں۔ اصلاحی موضوعات پاکیزہ کا خاصہ ہیں اور بہنوں کی محفل کو اگر آپ زبیدہ کا دسترخوان کہہ رہی ہیں تو یقین کریں غلط کہہ رہی ہیں آپ بھول گئی ہیں کہ اس محفل سے کتنی دکھی بہنیں ہیں جو بات کر کے سکونِ قلب پاتی ہیں کتنی ہیں جو آزمودہ دعائیں، وظائف، ٹوٹکے بہنوں تک پہنچاتی ہیں کتنی ہیں جن کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں۔ کتنی ہیں جو باقاعدہ تبصرہ کر کے اپنے خیالات اور تجاویز پیش کرتی ہیں۔ کتنی ہیں جو اس میں تبصرہ لکھتے لکھتے آج باقاعدہ تبصرہ نگار اور نقاد بن چکی ہیں بہرحال میری بہن خوبیاں اور خامیاں کسی بھی انسان ادارے یا رسالے میں پائی جاتی ہیں۔ خیال کریں کہ جب بھی آپ تنقید

کے لیے قلم اٹھائیں خامیاں پیش کرنے کے ساتھ خوبیاں بھی مدِنظر رکھیں۔ آپ نے مزاحیہ کالم جلترنگ کے خاکوں میں یکسانیت کا ذکر کیا ہے...... بہن آپ یہ غور بھی کرتیں کہ جب ان کو پڑھتے، پڑھتے بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر بکھر جاتی ہے وہ کتنی بڑی نیکی ہے، صدقہ ہے، آج کے دور میں جو پریشانیاں بانٹ رہے ہیں کاش آپ ان پر تنقید کرتیں تو ہمیں دکھ نہ ہوتا بہر حال پاکیزہ سے محبت اور لگاؤ نے مجھے مجبور کیا کہ میں قلم اٹھا کر آپ کو آپ کے اعتراضات کا جواب دوں۔ یہ وہ ادارہ ہے جو ہماری تحریروں، اقتباسات، مراسلات، شاعری کی نوک پلک سنوار کر شائع کرتا ہے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے جس کے نتیجے میں آج کتنی لکھاری اور شاعرات صاحبِ دیوان بن گئی ہیں اور جس کامیابی سے معراج رسول صاحب کے زیرِ سایہ محترمہ انجم انصار صاحبہ اس کو چلا رہی ہیں ہم کو ان کے حوصلے، فہم وفراست اور تدبرانہ انداز کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ مثبت تنقید کے ذریعے تجاویز دینی چاہیے آپ نے تو جانے کون سا غصہ انڈیلا کہ کم از کم پرانی قارئین نے تو آپ کے انداز کو بالکل پسند نہیں کیا۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے اور خط مختصر بھی کر دیا گیا ہے)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''محبت کھوگئی ہے میں مردوں کے ہرجائی پن کو بہت ہی الگ انداز سے اجاگر کیا گیا اور مامتا کے جذبے کی خوب صورتی دکھائی کہ اپنی اولاد کے لیے وہ اپنے دل پر بھی پاؤں رکھ لیتی ہے۔ امیدِ صبح میں بھابی نے برا چاہا لیکن خدا نے سب کے نصیب کی ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ بے وفا سے وفا میں ثمین کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جو محبت سے بھرے ہوئے دل کو توڑے اس کو اس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔ بیٹی پڑھ کر واقعی یقین آگیا کہ ماں، باپ کی صحیح قدر دان بیٹی ہوتی ہے۔ رفعت سراج کا مضمون سنگار سارے سنگاروں پر بازی لے گیا۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ بہنوں کی محفل میں باجی جو کام آپ نے بتایا ہے اللہ آپ کو اس کی جزا دے یہ کام صدقۂ جاریہ میں آتا ہے۔ اس کام میں آپ کے ساتھ ہوں گو کہ پہلے بھی قرآن پاک کی تلاوت ترجمے کے ساتھ پڑھتی تھی لیکن باقاعدگی نہیں رہتی تھی۔ میری تجویز پسند کرنے کا شکریہ۔ جب عذرا باجی عمل کرلیں گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ مسز رضا کا تبصرہ پڑھا لگتا ہے تنقید کی عینک پہن کر لکھا۔ پورے تبصرے میں تنقید کا پہلو نمایاں رہا۔ یہ بات ٹھیک نہیں تنقید برائے تنقید تو اصلاحی پہلو نہیں ہے تنقید برائے تعمیر ہونی چاہیے لیکن باجی یہ آپ کی وسیع القلبی ہے کہ آپ نے خط کو من وعن شائع کیا۔ پاکیزہ ڈائری میں تسنیم رضا کا مضمون پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جلترنگ اس دفعہ پورے شمارے کی جان تھا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ نبیلہ نازش راؤ، اوکاڑہ سے۔ ''پاکیزہ کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اس میں لکھنے والوں کو موقع دیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے میرے خط کے ساتھ ساتھ میرے افسانوں اور غزلوں کو جگہ بھی دی جائے گی .... ردی کی ٹوکری کی نظر نہیں کیے جائیں گے۔ میں کافی عرصے سے لکھ رہی ہوں تقریباً تمام رسالوں میں جگہ بنا چکی ہوں۔ امید کرتی ہوں پاکیزہ میں بھی جگہ مل جائے گی۔'' (خوش آمدید، انشاء اللہ آپ پاکیزہ میں بھی اپنی جگہ بنائیں گی)

اس ماہ بہت سے خطوط شامل ہونے سے رہ بھی گئے ہیں جن کو میں آئندہ ماہ شامل کروں گی۔ پیاری بہنوں اس ماہ کے کھٹے میٹھے اور قدرے کڑوے خطوط بھی آپ کو کیسے لگے ہمیں ضرور بتایئے گا اور آپ لوگ جہاں، جہاں ہیں وہاں محبت کو پھیلائیں کہ سچائی، ایمانداری اور ایثار محبت کی خوب صورت شکلیں ہیں اور آیئے اب ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ... یارحمٰن، یارحیم میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یارب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے، آمین، ثم آمین۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اے اللہ اے میرے مالک دھڑکن دھڑکن تیرا نام
پیارے نبیؐ نے پہنچایا ہے ہم تک تیرا ہر پیغام
سب کی بخشش کردے گا تو تیری رحمت کہتی ہے
جینا مرنا تیرے لیے ہے نام جپوں میں صبح شام
تیرے نبیؐ کو میں بھی چاہوں ان کو اپنے دل میں بسالوں
تو بھی بھیجے میں بھی بھیجوں سب بھیجیں گے انؐ کو سلام
تیرے آگے سر کو جھکاؤں، سر کو جھکاؤں پھر نہ اٹھاؤں
ساری عبادت ساری دعائیں سارے سجدے تیرے نام
پیارے نبیؐ کی گر ہو شفاعت کیوں نہ برسے تیری رحمت
خوفِ خدا کو دل میں بسا کر بھرلوں میں رحمت کے جام

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: صائمہ یاسر شاہ، کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

حضورؐ شمع اجالوں کی لے کے آئے ہیں
ذرے کتنے ہی جگ میں جگمگائے ہیں
بے کسوں بے نواؤں کے آسرا ہیں حضورؐ
کتنے ہی اجڑے دل گنگنائے ہیں
درس ہم کو بھلائی کا دے گئے آقاؐ
بھولے بھٹکے مسافر راہ لگائے ہیں
کائنات کی ہر شے پہ انؐ کا ہے احساس
دو جہانوں پر ابرِ کرم کے سائے ہیں
عزتوں کی ردائیں انہیؐ کے دم سے ہیں
آگہی کے سبھی در دلوں میں آئے ہیں
دشمنوں کو بنایا ہے بھائی آپس میں
محبتوں کے شجر دل میں سرسرائے ہیں
انشاء اللہ ملے گی سرخروئی ہمیں
لفظ نعتوں کے ہم نے بڑے سجائے ہیں

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

احادیثِ مبارکہ ﷺ

☆ ندامت، گناہوں کا کفارہ ہے۔
☆ استغفار، گناہوں کو مٹادیتا ہے۔
☆ بہترین وسیلہ استغفار ہے۔
☆ اعترافِ گناہ، مجرم کے لیے سفارش ہے۔
☆ توبہ سے رحمتِ خداوندی نازل ہوتی ہے۔
☆ گناہوں پر ڈٹے رہنا بدکاروں کی عادت ہے۔
☆ گناہوں پر خوش ہونا گناہ کرنے سے زیادہ برا ہے۔
☆ کیا کوئی ایسا شخص نہیں؟ جو موت کے آنے سے پہلے گناہوں سے توبہ کرلے۔
☆ وہ شخص کتنا بدبخت ہے جو توبہ کا خیال آتا ہے تو اسے آئندہ پر ٹال دیتا ہے اگر اسے آرام و عافیت ملے تو سمجھتا ہے کہ اس نے توبہ کرلی ہے اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو اللہ تعالیٰ سے شک میں پڑجاتا ہے۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی بھیرہ

ایک آنسو کی اہمیت

امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ کے پاس ایک مرتبہ جبرائیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے رو رہا تھا، جبرائیلؑ امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا وزن ہوگا مگر اللہ تعالیٰ و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو

تولا نہ جائے گا بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ بجھا دے گا۔

معارف القرآن جلد 3 صفحہ 533

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

تین آدمیوں پر ہنسی آتی ہے اور تین چیزوں پر رونا آتا ہے

حضرت جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تین آدمیوں پر ہنسی آتی ہے اور تین چیزوں سے رونا آتا ہے۔

1- ایک تو اس آدمی پر ہنسی آتی ہے جو دنیا کی امیدیں لگا رہا ہے حالانکہ موت اسے تلاش کر رہی ہے۔

2- دوسرے اس آدمی پر ہنسی آتی ہے جو غفلت میں پڑا ہوا ہے اور اس سے غفلت نہیں برتی جا رہی۔ فرشتے اس کا ہر برا عمل لکھ رہے ہیں اور اسے اس عمل کا بدلہ ملے گا۔

3- تیسرے منہ بھر کر ہنسنے والے پر جسے معلوم نہیں کہ اس نے اپنے رب کو خوش کر رکھا ہے یا ناراض اور مجھے تین چیزوں پر رونا آتا ہے۔

1- پہلی چیز محبوب دوستوں یعنی حضرت محمد ﷺ اور ان کی جماعت کی جدائی۔

2- دوسرے موت کی سختی کے وقت آخرت کے نظر آنے والے مناظر کی ہولناکی۔

3 تیسرے اللہ رب العزت کے سامنے کھڑا ہونا جبکہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں جنت میں جاؤں گا یا جہنم میں۔ (حیاۃ الصحابہ جلد 3 صفحہ 574)

مرسلہ: اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

نیا سال

نئے سال کی آمد پر
دعا ہے رب کعبہ سے
اجالے دلوں کا مقدر ٹھہریں
تاریکیوں کے دور دور ہو جائیں
اشک خاموشی سے لوٹ جائیں ہر آنکھ سے
ہر لب پر مسکراہٹ دعا کی طرح ٹھہرے
پریاں امن کی رقصاں رہیں
جگنو سے پھریں ہر رہ میں
پھول تتلیوں کی چاہ میں ہوں
بیتے برسوں کی ساری عداوتیں
آتی گھڑیوں کی برکھا میں
ڈھل جائیں بہہ جائیں
نئے سال کی آمد پر
محبت کا سورج طلوع ہو جائے
چاہت کا موسم شروع ہو جائے

شاعرہ: سعدیہ مریم سعدی، گولارچی

انمول موتی

دو قطرے اللہ کو بہت پیارے ہیں۔ ایک جہاد میں خون کا اور دوسرا آنکھ کا وہ آنسو جو تنہائی میں خوفِ خدا سے نکلے۔

☆ پانی بنو جو راستہ خود بناتا ہے، پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔

☆ محبت کی کشتی میں پہلا سوراخ شک کا ہوتا ہے۔

☆ چہرے نہیں رویے دکھ دیتے ہیں۔

☆ کسی کو گالی مت دو، یہ ایک ایسا کھوٹا سکہ ہے جو اسی وقت تم کو واپس کر دیا جاتا ہے۔

☆ جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے، اللہ جو کرتا ہے درست کرتا ہے۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

اہم بات

محبت اور وقت ایسی دو چیزیں ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ وقت انسان کو مجبور کر دیتا ہے اور محبت انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔

کچھ لوگ محبت بھرے خطوط کی طرح ہوتے

ہیں، جنہیں بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا اور کچھ لوگ نفرت بھی محبت کی طرح کرتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی بات کا اصل مطلب کیا ہے۔

از: صبا نور، لیہ

تیری محبت میں

اے میرے محبوب!
میں تیری سلطنتِ محبت سے
اپنا نام خارج کرتی ہوں
کیونکہ......
میں تیری بے اعتنائیوں، بے وفائیوں کے تیر
مزید روح میں نہیں اتار سکتی
اور محبت کے جرم کی اتنی
کڑی سزا نہیں سہار سکتی
سو آج میں بغاوت کرتی ہوں
اور یہ اعلان کرتی ہوں
کہ میں تیری محبت کی مرتد ہو چکی ہوں

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

مشکل کھیں جسے......!

☆ باپ: "بیٹا امجد...... یونیورسٹی کے چار سالوں میں تم نے کون سے مشکل کام سیکھے؟"

بیٹا: "بہت سے...... کوئی کام بھی مجھے آسان نہیں لگا۔ کوئی ایک مشکل ہو تو بتاؤں آپ کو۔"

باپ: "پھر بھی کچھ تو بتاؤ!"

بیٹا: "صبح اٹھ کر یونیورسٹی جانا، اور یونیورسٹی جا کر کینٹین میں بیٹھنا۔ وہاں بیٹھ کر دوستوں کو ادھار پر چیزیں کھلانا اور لڑکیوں کو فری میں کھلانا اور پھر کوچ کی چھت پر بیٹھ کر گھر آنا اور تیز ہوا میں ایک دیا سلائی سے تین سگریٹ سلگانا۔"

وجۂ خاص

ڈاکٹر مریض سے۔ "آپ کون سا تیل استعمال کرتے ہیں؟"

مریض: "حبیب کا۔"

ڈاکٹر: "آپ کون سا شیمپو اور صابن استعمال کرتے ہیں؟"

مریض: "حبیب کا شیمپو اور صابن استعمال کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر: "کیا حبیب کی کمپنی یہ ساری اشیاء بناتی ہیں؟"

مریض: "نہیں حبیب اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔"

مرسلہ: زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

اک شوہر کی دعا

اے خدا تجھ کو تو معلوم ہے حالت میری
دیکھ سکتا نہیں بیوی کا میں بیوہ ہونا
جب مرے واسطے وہ جاں سے گزر سکتی ہے
اس کی خاطر مجھے منظور ہے رنڈوا ہونا

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

غزل

جب سے رخ پہ نقاب دیکھا ہے
شوق کو بے حساب دیکھا ہے
حسن گو لاجواب دیکھا ہے
خلق اس سے نایاب دیکھا ہے
میں نے دیکھے ہیں سر قلم ہوتے
میں نے جلتے گلاب دیکھا ہے
چشم خوباں کی مستیاں توبہ
ایک عالم کو ہوتے خراب دیکھا ہے
زندگانی کی حقیقت مت پوچھ اے دوست
جیسے پانی پہ حباب دیکھا ہے

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

عجیب دوستی

ساجد نے تنویر صاحب سے کہا۔ "آپ کو پتا ہے روزانہ باس آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں،

کبھی کسی سے تو کبھی کسی سے۔“

تنویر صاحب فوراً بولے۔ ”ساجد بھائی، دفتر میں ایک ساتھ کام کرنے کے باعث میں تو آپ کو اپنا دوست سمجھتا تھا مگر نے آپ تو بڑی عجیب دوستی نبھائی۔ جو تیر باس نے مجھے مارے اور وہ مجھے لگ نہ سکے لیکن تم وہی تیر اٹھا اٹھا کر مجھے مار رہے ہو تاکہ میں تکلیف محسوس کروں۔“

مرسلہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

بہار

میں تجھ کو کہاں ڈھونڈوں ہم دم
شہر تو ویران پڑا ہے سارا
دل پہ خزاں کا ہے موسم
لوگ کہتے ہیں بہار آئی ہے

مرسلہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

تجدید محبت

میں کیسے اپنے انمول
جذبوں کو
ارزاں کرلوں
میں کیسے اس سے
تجدیدِ وفا
اظہارِ محبت کرلوں
یہ بھی ہے منظور مجھے
اسے کسی اور کا ہوتا دیکھوں
چپ چاپ
یہ غمِ جاں گسل بھی
مسکرا کے سہہ لوں
میں کیسے اس سے
تجدیدِ وفا
اظہارِ محبت کرلوں

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

یادیں

یادیں سب کے ساتھ رہتی ہیں کبھی آنسوؤں کی صورت میں تو کبھی مہکتے ہوئے پھولوں کی صورت میں یادیں کبھی کبھار کانٹوں بھرے دشت کی سی بھی ہو جاتی ہیں پھر بھی یہ بھلائے نہیں بھولتیں اور ہمیشہ دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں یادوں کا یہ انمول خزانہ کسی کسی کے پاس ہی ہوتا ہے۔

مرسلہ: سائرہ مشال، کراچی

نادان لڑکیاں

کس قدر نادان ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو محبت کے جھوٹے اور ان دیکھے سپنوں میں دن رات جلتی رہتی ہیں۔ ہر وقت اپنے محبوب کی یاد میں بس ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد صرف محبوب کی پرستش کرنا ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف اس عمل کا... ردِعمل کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اس بے معنی اور فضول چیز جس کا نام محبت ہے کے لیے دوسروں کے پاس بالکل وقت نہیں ہوتا اور ایسے لوگ ہی زندگی میں کامیاب و کامران ہوتے ہیں ان خرافات سے بچ کر رہتے ہیں سو میرا مشورہ ہے اپنی بہنوں کے لیے خدارا! اس موذی مرض کو اپنے سے دور رکھیں تبھی وہ اپنی زندگی کے ستارے کو درخشاں بنا سکتی ہیں۔ اپنی عزت کے آبگینوں کو بہت سنبھال کر رکھیں کیونکہ یہ آبگینے بہت نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ خدا ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

از: ارم کمال، فیصل آباد

غزل

خواہشوں کے صحرا میں کب صبا گزرتی ہے
دل کے سونے آنگن میں بس خزاں اترتی ہے
تو اچانک زندگی میں ایسے آ گیا جاناں
دھوپ میں جیسے کبھی بارش آ برستی ہے
تیرا ساتھ پانے کو دل بہت مچلتا ہے
لیکن اس راہ گزر میں بس سزا ہی ملتی ہے
میں نے تیری خواہش میں کشتیاں جلادی ہیں
لیکن ایسی خواہش میں زندگی تو مرتی ہے

پسند: ظلِ شاہین، رحیم یار خان



جلترنگ

انجم انصار

مینارِ محبت

آپ اسے میری خامی کہہ لیں مگر پھوہڑ پن ہرگز نہیں دراصل عورت کے ساتھ پھوہڑ پن کا اضافہ مجھے ہتک آمیز لگتا ہے۔ یوں جیسے اس کی نسائیت کا 95 فی صد حصہ اس کی ذات سے منہا کردیا گیا ہو۔ ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی اپنی خامی کا بہت سی خامیاں ہیں مجھ میں جو پچاس فی صد مجھے معلوم ہیں اور دو سو فی صد دوسرے لوگوں کے علم میں ہیں جو گاہے بہ گاہے مختلف مواقع پر مجھے جتاتے رہتے ہیں۔ جسے میں عموماً نظر انداز کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوں پھر بھی ایک خامی ایسی ہے جو کلی طور پر لوگوں سے پوشیدہ ہے مگر مجھ پر بخوبی واضح ہے۔ بات گو معمولی ہے مگر میرے لیے خاصی وحشت کا سبب بنتی ہے۔ جی ہاں الماریوں میں قرینے سے چیزیں رکھنا میرے لیے انتہائی مشکل ہے۔ کتنا ہی چیزوں کو چھان پھٹک کر سجا سنوار کر طریقے سے رکھو دو چار روز میں سب آپس میں دست و گریباں ہو جاتی ہیں۔ بچوں کی چیزیں بڑوں کی چیزوں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ کئی مرتبہ بچوں اور بڑوں کی الماریاں الگ، الگ کیں مگر جب ایمرجنسی میں چیزیں الماری میں ٹھونسی جاتی ہیں تو چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ جاتی ہے اور یہ ہنگامی صورتِ حال دن کے بارہ گھنٹوں میں کوئی چوبیس، پچیس مرتبہ تو ضرور ہوتی ہے۔ بچوں کے موزے لاکھ میں تھیلیوں میں ڈال کر رکھتی ہوں کہ چھوٹی چیز کو ڈھونڈتے میں دشواری نہ ہو مگر وہ تھیلی الماریوں میں جا کر ایسی ڈوبتی ہے کہ کم بخت ابھرنے کا نام نہیں لیتی۔ عموماً ہنگامی طور پر کہیں جانے کے مواقع میں اس لیے رد کر دیتی ہوں کہ شاید موزے نہ ملیں شاید یکساں جوتوں کی جوڑیاں دستیاب نہ ہوں۔ بچوں کے رونے پیٹنے اور میاں کی غصے بھری جھڑکیوں سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ کہیں جانے سے ہی احتراز کیا جائے۔ میرے گھر کی تمام الماریاں بھی شاید جناتی قسم کی ہیں عین وقت پر الماری کی پوری چیزوں کو بے شک جھنجوڑ کر کھسوٹ دوں مگر مطلوبہ چیز ٹھینگا دکھا جاتی ہے۔ اب میں اپنی آپ بیتی کہاں تک سناؤں (آپ کی رنجیدگی کا بھی ڈر ہے) میاں جانی کے چاروں انڈرویئر ہفتے بھر سے الماری میں کھوئے ہوئے ہیں۔ بازیاب ہی نہیں ہو رہے کئی مرتبہ تو غصے سے الماری کے دونوں پٹ کھول کر غصے میں آواز بھی لگائی ہے۔ ”ارے مل جاؤ، حاضر ہو جاؤ“ مگر وہ نہ جانے الماری کے کس کونے میں چھپے بیٹھے ہیں کہ نظر ہی نہیں آ رہے۔ آخر سلیقہ مند بیویوں کی طرح میں میاں جانی کے انڈرویئر لے آئی...... ہاں بنا کہیں جائے یہ کام بھی کرڈالا ذہین جو ہوں۔ میاں جانی کے چار پاجامے گھٹنوں سے اوپر کاٹ دیئے ڈھیلے ڈھالے آرام دہ انڈرویئر میں جا ہے انہیں پہلے سے زیادہ آرام ملے مگر مجال ہے کہ وہ ہمارے سگھڑاپے کو سراہیں۔ ایسے حالات ہمارے ساتھ تنہا نہیں ہیں اکثر سروس کی ماری پریشان حال خواتین کے ساتھ ہیں۔ آج پانچواں دن ہے چھوٹی بیٹی کی چڈیاں الماری میں کھو چکی ہیں اور کسی صورت ملنے کا نام نہیں لے رہیں اور میری تین سالہ بچی اپنے چھ سالہ بھائی کا نکر پہنے

گھوم رہی ہے۔ آپ سوچتی ہوں گی کہ میں الماریاں ہمہ وقت سنگواتی نہیں ہوں گی جبھی تو یہ حال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے ہمارے ہاں ہر فرد کو ہر بات کی جلدی ہوتی ہے کسی چیز کی بھی طلب ہو وہ منٹوں، سکینڈوں میں حاضر ہونی چاہیے۔

''امی میری ٹائی کہاں ہے، اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔'' بڑا لڑکا ہر روز یہی جملہ اپنے اسکول جانے سے پہلے دُہراتا ہے۔

''بیٹے اپنی الماری میں دیکھو۔'' میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور وہ آن کی آن میں الماری کا تمام سامان اپنے پیروں پر گرا ٹائی نکال یہ جا وہ جا اور میں تمام سامان اندر ٹھونس دیتی ہوں جسے دوپہر کو آ کر اسے دوبارہ گرانا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے میں اس کی الماری سنگوانے کا خیال احمقانہ ہی ہوسکتا ہے اور یونہی میری ننھی منی سی حماقتیں ایک مینارسی بن جاتی ہیں مگر ایسے مینار دیکھ کر مجھے غصہ کم ہنسی زیادہ آتی ہے اسی لیے آپ ان کو مینارِ محبت سمجھیں جو آپ کو ہر دوسرے گھر میں نظر آئیں گے۔

سچ کی آنچ

وقت جب کروٹ بدلتا ہے تو تبدیلیاں تو ضرور آتی ہیں۔ لوگ باگ بارہ سال کے تناظر سے کسی وفادار جانور کا محاورہ بھی استعمال کرتے ہیں کہ اتنے عرصے میں حالات و واقعات تبدیل ہو جاتے ہیں اور درستگی بھی ہو جاتی ہے۔ یوں ہمارے نصیبوں میں بھی جب ڈالر اور ریال کے جھپکے آنے لگے تو ہماری کوٹھی کا نام اکبر محل رکھ دیا گیا حالانکہ اکبر کسی بھائی کا نام نہیں تھا مگر وسیع و عریض کوٹھی کی وجہ سے اس کا نام اکبر محل رکھ دیا گیا۔ ہمارے دو بھائی امریکا میں تھے تو دو سعودی عرب میں ایک بھائی پاکستان میں تھا تو وہ بھی ایسے محکمے میں چلا گیا تھا جہاں سب بادشاہ تھے۔ ہمارا گھر جہاں پہلے کسی کے پاس سائیکل نہیں ہوتی تھی اب پارکنگ پلاٹ زیرو میٹر گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان حالات میں بڑی آپا کی شادی چھوٹی چچی کے بھائی سے ہوئی۔ اماں نے چچی کی اوقات سے زیادہ جہیز دیا کہ سارے خاندان میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ اب خالہ جانی کے خط پر خط اور فون پر فون ہمارے گھر آنے لگے کہ انہیں خواب میں بشارت بار بار ہو رہی ہے کہ اشرف کی شادی ثریا سے ہونی چاہیے۔

''اُف، میں کبھی اشرف سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ غریب شوہر کے ساتھ گزارہ کرسکتی ہوں، جاہل کے ساتھ ہرگز نہیں۔'' میں نے گھر میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''گھر کا بچہ ہے باہر کے لوگوں سے تو اچھا ہی ہوگا۔'' امی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''گھر کے لڑکوں کو بھی اچھی طرح سے دیکھنا چاہیے۔ آنکھ بند کرکے رشتے ناتے نہیں کیے جاتے۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایسی بات ہے تو خالہ کے ہاں دو چار روز رہ کر آنے میں کیا حرج ہے؟'' یہ رائے بڑی بھابی کی تھی۔

''آئیڈیا برا نہیں ہے۔'' میں ہنسی۔

''وہاں جا کر بدتمیزی مت کیجیو۔'' اماں کو میری منہ پھٹ عادت سے خاصی پریشانی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کے منہ پر کڑوا سچ نہیں مارنا چاہیے۔

''میں تو اپنی ہونے والی سسرال میں جا رہی ہوں جس طرح پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے ہیرو نام بدل کر جایا کرتے تھے۔'' میں ہنسی۔

''وہ تو نوکر کے روپ میں جاتے تھے اور تم اصلی روپ میں جاؤ گی۔'' بھابی نے جتایا۔

''وہاں میں نوکر بن کر تو نہیں جا سکتی، وہ لوگ مجھ جیسی کاہل کو فوراً نکال باہر کریں گے ہاں مہمان اور سرمایہ دار مہمان کو خوشی، خوشی اس لیے برداشت کرلیں گے کہ میرے طفیل ان کی ایک بڑی لاٹری

بھی لگ سکتی ہے۔''

یوں میں کوئٹہ سے کراچی آگئی۔ خالہ مجھے دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں اور اشرف بلاوجہ مجھ سے شرما رہے تھے۔ جہاں دیکھ لیتے ان کی آنکھوں میں ایک نشہ سا چھا جاتا۔ ہونٹ مسکانے لگتے بہنیں میرا نام لے لے کر چھیڑ رہی تھیں، کہنیاں مار رہی تھیں، ٹہوکے دے رہی تھیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے بازیاں کر رہی تھیں۔ ان کے ہاں جا کر چوبیس گھنٹوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کے ہاں ہر چیز غلط ترتیب سے اور غلط جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ سب لوگ خود کتنے غلط ہوں گے اس بارے میں چاہتے ہوئے کچھ سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ جو کمرا ڈرائنگ روم ہونا چاہیے تھا وہ بیڈ روم تھا۔ ٹی وی لاؤنج کو ماسٹر بیڈ روم بنایا ہوا تھا شکر ہے کہ وہ دادا دادی کا کمرا تھا۔ گھر کے لوگوں کی عادتیں اس قدر تکلیف دہ بھی ہوسکتی ہیں اس کا اندازہ مجھے جلد ہی ہو گیا تھا۔ گھر کی ملازمہ جو برتن دھونے اور صفائی ستھرائی کیا کرتی تھی اس کو گھر کا ہر فرد ڈانٹنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اشرف سے بڑے صرف ایک ہی بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی شاہدہ نیک، شریف اور سیدھی سادی سی تھی مگر اس پر ہمہ وقت تنقید کی جاتی۔

''ارے بڑی گھنی ہے یہ، اس کے کمرے میں تم جانا بھی نہیں، پتا نہیں کیا پڑھ کر پھونکتی ہے اس کا میاں تو اس کا غلام ہے۔'' جبکہ حشمت بھائی شکل سے ضرور غلام نظر آتے تھے مگر عادتیں ایسی کہ اپنی کوئی رائے نہیں، جو جس نے کہہ دیا یقین کرلیا اور بیوی کی طرف تو ایسی خشمگیں نظروں سے دیکھتے کہ جیسے وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہوں۔ شاہدہ بھابی کو کسی لمحے بھی بخشا نہیں جاتا تھا۔ حد تھی کہ وہ نماز پڑھتیں تو خالہ کی بیٹیاں کہتیں۔

''ارے آپ کو نماز تک پڑھنی نہیں آتی، ایسے

غزل

اب کے برس جو میں سو جاؤں تو جگا مت دینا
جو تم سے دور چلا جاؤں تو بھلا مت دینا
تیری زندگی میں جو خوشیوں کا انبار نہ لگا سکا
اپنے آپ سے روٹھ کر مجھے سزا مت دینا
ہوں گا تو میں انہی راستوں میں تیرے ساتھ
بس کبھی مجھے نظروں سے گرا مت دینا
محبت کے اس جزیرے پہ یونہی رکھنا مجھ کو
راستہ مجھے کنارے کا کبھی دِکھا مت دینا
سدا رہے اس پر رحمت تیری یارب
کبھی زندگی میں غموں کو جگہ اے خدا مت دینا
مجھے امید ہے کہ تیرے آنگن میں آؤں گا اِک دن
شام کے بعد تم کبھی دیا بجھا مت دینا
یہ دنیا ہی تو ہے راکھ کی صورت خضرؔ
پھر کبھی دل اپنا یہاں لگا مت دینا

شاعر: محمد امین خضرؔ

انتخاب: شانزے شاہ، اسلام آباد

غزل

میں شام سجائے رکھوں گی
اِک آس لگائے رکھوں گی
تم آؤ گے نہ دیر سویر
میں دیپ جلائے رکھوں گی
جذبوں کی آنچ نہ دھیمی ہو
اِک آگ لگائے رکھوں گی
تیری دید کی آس ہے آنکھوں میں
چند خواب سجائے رکھوں گی
وہ عشق جو من میں بستا ہے
وہ اس سال بھی چھپائے رکھوں گی

شاعرہ: مونا سکندر، لاہور

نہیں پڑھتے ویسے پڑھتے ہیں پیر تو جوڑے ہی نہیں، آپ کی تو نماز ہی نہیں ہوئی۔'' اور وہ کھسیا کر خاموش ہی رہا کرتیں۔ اشرف کیا تھے ہنسی کا گول گپا تھے۔ ہر وقت ہی، ہی کرتے رہتے جب جس کا ہنسنے کو دل چاہتا وہ اشرف کو چھیڑ دیا کرتا تب وہ بات بعد میں کرتے پہلے دو کلو سے پانچ کلو تک کے قہقہے لٹاتے پھر بات کا آغاز بھی قہقہوں کے جھٹکوں میں ہوتا۔ جس سے لفظوں میں سکتے تک طاری ہو جاتے اور بعض جملوں میں تو تشنج کا دورہ ایسا پڑ جاتا کہ لاکھ کی بات بھی خاک کی ہو جاتی۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں واقعی سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

''خالہ آپ اشرف بھائی کو تو نوٹنکی میں جاب دلوا دیں بہ آسانی مل جائے گی۔ ان کی تو شکل دیکھ کر ہی ہنسی آ جاتی ہے۔'' ایک دن میں نے خالہ سے کہا۔

''ارے میرا بچہ بڑا خوش مزاج ہے جس کی اس کے ساتھ شادی ہوگی وہ ہمہ وقت ہنستی ہی رہے گی......''

''وہ ہنس، ہنس کر پاگل ہو جائے گی۔'' میں نے ان کا ادھورا جملہ مکمل کر کے شاہدہ بھابی کو دیکھا، وہ دھیمے سے مسکرائیں اور زیرِ لب بڑبڑائیں۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' ان کا چہرہ ہلدی سا ہو گیا۔

''میں نے تو صاف سنا ہے جو آپ کہہ رہی تھیں۔'' میں نے نڈر سے لہجے میں کہا۔

''نہیں تو۔'' اب وہ مزید گھبرائیں۔

''مگر میں نے صاف سنا ہے۔'' میرا لہجہ وثوق بھرا تھا۔ ''اچھا کیا میں جھوٹ بولوں گی؟'' میں نے تنک کر کہا۔

''ارے واہ، ہماری گڑیا کیوں جھوٹ بولنے لگی۔ بچپن سے ہی سچ بولنے کی عادی ہے۔''

''یہ بھابی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں۔ بتایا بھی تھا پہلے ان کو گڑیا کو خاص مہمان سمجھ کر ٹریٹ کرنا مگر جل کر انہوں نے اوقات دکھا ہی دی۔'' بڑی بہن نے کہا۔

''اب یہ نہیں جلیں گی تو کون جلے گا کہ ہماری دوسری بھابی اتنی اچھی کیسے آ رہی ہے۔'' دوسری بہن نے مکھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں آپ نے میری بات نہیں مانی ناں۔ گڑیا کے آنے پر انہیں ان کے میکے دفع کر دیا جاتا تو آج یہ بات تو نہ ہوتی مگر آپ کو تو ان کا کام ہی اس قدر عزیز تھا کہ انہیں جانے ہی نہیں دیا۔''

''اے سیدھی طرح بتا کیا کہا ہے تو نے گڑیا کو؟'' خالہ چڑھ کر آئیں۔ شاہدہ بھابی کے لرزہ سا چڑھ گیا اور دانت کٹکٹانے لگی۔

''بھابی جو بھی کہہ رہی تھیں بالکل جھوٹ کہہ رہی تھیں۔'' میں نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''ارے یہ تو ہے ہی اول نمبر کی جھوٹی مگر یہ کہہ کیا رہی تھی؟'' خالہ نے نفرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھابی کہہ رہی تھیں کہ اشرف کی بیوی تو بہت خوش قسمت ہوگی جو اس.... گھر میں آئے گی۔'' میں نے پھر مسکرا کر بھابی کو دیکھا اور میرا جملہ سن کر انہیں شادیِ مرگ کی سی کیفیت ہو گئی۔

''اے لو اس میں غلط کیا ہے، صحیح تو کہہ رہی ہیں بھابی۔''

''کیوں بھئی؟''

''وہ اس لیے کہ اشرف تو بالکل پاگل ہیں ان کے ساتھ کسی پاگل کا تو گزارہ ہو سکتا ہے مگر کسی ذی ہوش کا ہرگز نہیں۔''

''ارے ایسا تو نہ کہو ہم تو آنے والی کو پھولوں کی طرح رکھیں گے۔''

''جیسے شاہدہ بھابی کو رکھا ہوا ہے۔'' میں نے تمسخر سے کہا۔

''وہ تو پاگل ہے۔''

''جب ہی تو گزارہ ہو رہا ہے سب کا۔'' میں ہنستی ہی چلی گئی۔

تب خالہ اپنی چھوٹی بیٹی کے کہنی مارتے ہوئے شاہدہ بھابی کو سناتے ہوئے بولیں۔

''سنا تھا کہ بچپن میں اس پر جن آ گئے تھے لگتا ہے گئے نہیں۔'' تب میں مسکراتے ہوئے اپنے گھر فون کرنے لگی۔

''آج کی فلائٹ سے میں گھر آ رہی ہوں۔'' اور شاہدہ بھابی مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھتے ہوئے آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں جا رہی تھیں۔

جادو

سمیرا اپنے آپ کو کہاں تک بچاتی آخر اس پر سسرال والوں کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ نزلہ بھی ہوتا تو وہ پہلی بات یہ کرتی۔

''مجھ پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔''

''گرما گرم کھانا کھا کر اے سی والے کمرے میں آؤ گی تو نزلہ تو ہونا ہی تھا۔''

''یہ اب ہر دوسرے دن کیوں ہو رہا ہے نزلہ؟'' وہ فریم میں لگی چاروں نندوں کی تصاویر کو گھورتے ہوئے بولی۔

''اب ہم بجلی چوری کرنے لگے ہیں، اے سی زیادہ چلتا ہے اس لیے ڈاکٹروں کے پاس پیسہ تو خرچ ہوتا ہے ناں۔'' ان کی بڑی بیٹی نے کہا۔

''پچھلے ماہ میرے سر میں کیسا درد ہوا تھا، کسی دوا سے آرام نہیں آ رہا تھا وہ بھی تو بابا کے تعویذ سے ٹھیک ہوا تھا۔'' سمیرا نے غصے سے بیٹی کو دیکھا۔

''وہ تو بابا نے کہا ہے کہ سسرال سے آنے والی کوئی بھی میٹھی اور سفید چیز آپ نے نہیں کھانی اور عین اسی روز بڑی تائی رس گلے کا ڈبا لے آئیں۔ ان کی بیٹی کا میڈیکل میں داخلہ ہوا تھا۔'' سمیرا نے مٹھائی چکھ کر نہ دی۔ چار دن کے بعد نند نے کھیر بنالی

اور بضد تھیں کہ سمیرا ضرور چکھے گی مگر اب سمیرا ان باتوں میں کہاں آنے والی تھی منہ میں رکھ کر اگلے ہی لمحے واش بیسن میں اگل دیا۔

''سمیرا کیسی لگی کھیر؟''

''بہت اچھی مگر میٹھا بہت ہے۔'' انہوں نے یہ سوچ کر یہ جملہ کہا کہ کہیں وہ مزید اصرار نہ کر دیں۔

''اچھا گھر میں تو سب کہہ رہے تھے کہ اس دفعہ کھیر پھیکی سی بنی ہے۔''

''میں میٹھا بہت کم کھاتی ہوں ناں شاید اس وجہ سے زیادہ لگا۔'' نند کے جانے کے بعد جو بھی مہمان آیا سمیرا نے وہ کھیر انہیں وسیع القلبی سے کھلائی۔

''امی آپ نے جادو کے اثرات والی کھیر مہمانوں کو کھلا دی اگر انہیں کچھ ہو گیا تو؟'' بیٹی نے پریشان سے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' مگر ایک شام وہ حیران رہ گئیں ان کی کنجوس مکھی چوس پڑوسن کا فون آیا اور انہوں نے کہا۔

''سمیرا بھابی، آپ کے لیے لان کا ایک سوٹ لائی ہوں ملازمہ کے ہاتھ بھجوا رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ پر بہت اچھے لگے گا۔''

''کتنے کا ہے؟'' سمیرا کو سوٹ واقعی بہت اچھا لگا تھا سوٹ کو تنقیدی نظروں سے جانچ کر انہوں نے فون کیا۔

''یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے اور تحفے کی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی۔''

''دیکھا ناں ہو گیا ناں کھیر کا اثر...... ہو گئی وہ پاگل!'' سمیرا فون بند کر کے اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

دوسری جانب پڑوسن سوچ رہی تھی۔

''اپنی جیٹھانی کا دیا ہوا یہ گہرا سبز سوٹ پہن کر میں کیوں ان کے اشاروں پر ناچوں، میں کوئی پاگل ہوں جو جادو والا سوٹ اپنے تن پر ڈال لوں۔''

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆مسز اقصیٰ عمران......لاہور

کسی غریب قبیلے کی آبرو کی طرح
ہمارا درد کسی درد میں شمار نہیں

☆سعدی آرائیں......گولارچی

مجھے اچھی لگیں تمہاری سبھی رُتیں سعدی
کبھی بہاروں کی رونق کبھی خزاں کی اداسی

☆سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

یہ خنک رُت یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل کی خواہش ہے محسن کہ کوئی یاد آئے

☆فصیحہ آصف خان......ملتان

تیری غزلیں تیرے گیت دھرے کے دھرے رہ جائیں گے
اوڑھ کے سو جائیں گے ہم مٹی کی چادر ایک دن

☆مقدس تنویر......لاہور

طے کیا ہے تو کر ہی جانا ہے
دل نے حد سے گزر ہی جانا ہے
ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

لمحہ لمحہ لگتا ہے کبھی اِک ، اِک سال
لمحے بھر میں کبھی سال گزر جاتا ہے

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ

لاجواب کر گیا وہ اِک سوال ہمیں
بتا میں تیرا ہوتا ہوں کون

☆نزہت جبیں ضیا......کراچی

آج تک ہے دل کو اس کے لوٹ آنے کی امید
آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ
لاکھ چاہا ہم نے تجھ کو بھول بھی جائیں مگر
حوصلے اپنی جگہ ہیں بے بسی اپنی جگہ

☆عرشیہ جنید......کراچی

پلٹ کے آگئی خیمے کی سمت پیاس میری
پھٹے ہوئے تھے سبھی بادلوں کے مشکیزے

☆سیدہ علیشاہ......بہاول پور

درد کی رُت میں کون کسی کے زخم پہ مرہم رکھتا ہے
سردی کی راتوں میں ہم نے پورے چاند کو تنہا دیکھا

☆صبا کمال......فیصل آباد

میں سمندر سے پلٹ آیا ہوں لے کر خشک ہونٹ
کوئی رکھے تو وقارِ تشنگی میری طرح

☆ارم کمال......فیصل آباد

بنتِ تہذیب ذرا اپنے خدوخال کو ڈھانپ
مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تیرا عریاں ہونا

☆نگہت آصف......اسلام آباد

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

☆نگہت غفار......کراچی

اہلِ دل ہوں گے تو سمجھیں گے سخن کو میرے
بزم میں آہی گیا ہوں تو سنائے جاؤں
جان تو چیز ہے کیا رشتۂ جاں سے آگے
کوئی آواز دیے جائے میں آئے جاؤں

☆صدف نورین......لاہور کینٹ

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

☆نگینہ بنگش......کیماڑی

وقت آج بھی تھم گیا ہو جیسے
تیری تصویر جو دیکھی اسیر لمحوں کی

☆فضہ بتول......بہارہ کہو

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆امینہ مشیر......نئی دہلی

اِک طبع رنگ، رنگ تھی سو نذرِ گل ہوئی
اب یہ کہ اپنے ساتھ بھی رہتا نہیں ہوں میں
ہو دیدۂ ہنر دلِ درد آشنا کی خیر
کب لذت خیال میں دریا نہیں ہوں میں

☆نفیسہ آرا......راس الخیمہ

جس میں بھی ڈھل گئی اسے مہتاب کر گئی
میرے لہو میں ایسی بھی اِک روشنی تو ہے

☆شہلا محمود......واہ کینٹ

اس نے کہا کہ بول ترا مدعا ہے کیا
میں نے بھی اس سے بات بہت صاف صاف کی
میں نے کہا کہ دیکھ یہ میری بیاضِ دل
ہے کب سے منتظر ترے آٹوگراف کی

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص

کبھی ہو گیا میسر نہ ہوا کبھی میسر
سرِعام کیا کہوں میں کہ یہ راز کی ہیں باتیں
کبھی میں نے کش لگایا کبھی کش نہیں لگایا
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں

☆لبنیٰ حیات......جھنگ

جنگ لڑنی پڑتی ہے اپنے زورِ بازو پہ
زندگی کے میداں میں معجزے نہیں ہوتے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

جس سے امیدِ وفا ہو گی وہی دکھ دے گا
بے وفا جان کے چاہو جسے اب کی چاہو

☆ایلیا عباس......لاہور

کیا لکھا تھا سرِ محضر جسے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہوا ہر دوست بہانے سے اٹھا

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

ہیں سرخ قبا اتنے کہ مشکل میں صبا ہے
تزئینِ گلستاں کے لیے کس کو چُنا جائے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

تیرے کرم کی دھوپ تو خیر کسے نصیب تھی
تیرے ستم کے ابر بھی اور کہیں برس گئے

☆ثوبیہ ظہور......اٹک

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تارہ سا اِک خیال تری چشمِ تر پہ تھا

☆ناظمہ شاہین اعوان...... واہ کینٹ

دل میں یادوں کے اجالوں کے سوا کچھ بھی نہیں
وقت ظالم ہے کہ ہر نقش مٹا دیتا ہے

☆فرحت احمد......کراچی

تم محبتوں کے سودے عجیب کرتے ہو
مسکراتے ہو بس اور دل خرید لیتے ہو

☆پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

میں اس کا ہوں یہ راز وہ جان گیا ہے فرازؔ
وہ کس کا ہے یہ سوال مجھے سونے نہیں دیتا

☆شائستہ محمد علی......حیدر آباد

میری کسی بھی بات کا ہوتا نہیں اس پر اثر
اس لیے اب سوچتی ہوں کچھ لفظ نئے ایجاد کروں

* * *

خوش ذائقہ
پاکیزہ بہنیں



انڈے آلو کا سالن

قارئین بہنو! سب سے پہلے ایک بات واضح کردوں کہ یہ ڈش سردیوں کی خاص ڈش ہے کیونکہ اُبلے ہوئے انڈے موسم سرما میں بہت اچھے لگتے ہیں۔ یوں تو آپ یہ سالن بناتی ہی ہوں گی مگر یہ ترکیب نہایت آسان ہے تو آیئے اجزا نوٹ کیجیے۔

اشیا: انڈے، کم سے کم چھ عدد۔ آلو، تین عدد درمیانے۔ پیاز، دو عدد۔ ٹماٹر، تین عدد (پیاز چھیل کر اور ٹماٹر کو دھو کر ثابت ہی ابال لیں اور گرائنڈ کر کے آمیزہ چھان لیں) نمک، حسب ذائقہ۔ پسی ہوئی سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ تیل، حسب ضرورت۔ ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔ میتھی دانہ، دس سے پندرہ دانے۔ ثابت کالی مرچ، چار سے پانچ عدد۔ کڑی پتا، پانچ سے چھ عدد۔ پسا دھنیا، آدھا چائے کا چمچ۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ، ایک، ایک چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، سجاوٹ کے لیے۔

ترکیب: تیل میں پہلے میتھی دانہ کڑکڑائیں پھر کڑی پتا بھی ڈال دیں اب اس میں لہسن، ادرک، ہلدی، دھنیا، نمک، مرچ، کالی مرچ ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور پھر گرائنڈ کیا ٹماٹر، پیاز کا آمیزہ ڈال کر اس میں آلو چھیل کر بڑے ٹکڑے کاٹ کر ڈال دیں اور پکنے دیں۔ مسالا بھن جائے اور آلو گل جائیں تو حسب پسند شوربا لگالیں۔ ابلے ہوئے انڈے ایک طرف فرائنگ پین میں فرائی کرلیں ان کی اوپری سطح ہلکی ہلکی گولڈن ہوجائے تو آلو کے شوربے میں ڈال دیں یا ایک سرونگ ڈونگے میں پہلے انڈے رکھیں پھر سالن ڈالیں اوپر سے ہرا دھنیا باریک کاٹ کر چھڑک دیں۔ مزے دار انڈے آلو تیار ہے۔

نوٹ: خالی یخنی ...... کے پلاؤ میں بھی ابلے انڈے تل کر سجا سکتی ہیں۔

فضہ بتول، بہارہ کہو

پنجیری یا ستورا

پیاری بہنو! ویسے تو ستورا (زچہ خانے) میں کھانے کی چیز ہے مگر سردی سے بچاؤ کے لیے اور طاقت اور گرمائش کے لیے یہ موسم سرما کی خاص سوغات ہے، وہ بھی ہر عمر کے زن و مرد کے لیے مگر اس کے کھانے میں اعتدال از حد ضروری ہے۔

اشیا: بادام، پستہ، اخروٹ، کھوپرا، چھوارے، کشمش، منقہ، چار مغز اور کھانے اپنی پسند کی مقدار کے حساب سے لے لیں۔ مثلاً کٹے ہوئے چھوارے، ایک پیالی تو باقی اجزا کٹے ہوئے آدھی، آدھی پیالی۔ یہ گھٹا بڑھا بھی سکتی ہیں۔ سفید تل، دو کھانے کے چمچ۔ خشخاش صاف کی ہوئی، دو سے تین کھانے کے چمچ۔ گوند، آدھا پاؤ (صاف کر کے الگ دیگچی میں تیل کے ساتھ خوب گرم کرلیں مکمل ٹھنڈی ہونے پر اسے کوٹ لیں۔ گرم گرم چپکے گی جبکہ ٹھنڈی ہو کر چورا چورا ہوجائے گی) ویسے گوند کے ساتھ ستورا زچہ کے ساتھ ساتھ کمر درد کی شکار خواتین بھی ضرور استعمال کریں۔ سوجی (روا)، آدھا کلو یا زیادہ بھی لے سکتی ہیں۔ چینی، اپنے ذائقے اور پسند کے حساب سے ڈالیں۔ اگر دیسی گھی استعمال کریں تو بہت اچھا ہے ورنہ کوئی سا بھی گھی۔

ترکیب: ایک دیگچی میں تمام میوہ گھی ڈال کر بھون لیں۔ یاد رہے کھوپرے کو الگ فرائی کریں پھر

ملادیں۔ سارے اجزا باری باری گھی کے ساتھ فرائی کر کے ایک الگ برتن میں ڈال دیں اب دیگچی میں سوجی بغیر گھی کے بھونیں رنگ بدلنے پر گھی ڈال کر بھونیں پھر اس میں چینی ڈال کر خوب چمچ چلاتی رہیں اور تمام میوہ اسی میں ڈال کر چمچ چلا کر چولھا بند کردیں۔ کھانے الگ گھی میں اچھی طرح فرائی کرنے کے بعد اس میں شامل کریں۔ خشخاش، چار مغز اور تل بھی ہلکے سے تل کر شامل کریں۔ اگر سب پسند کریں تو چورا کی ہوئی گوند بھی اسی میں شامل کرلیں۔ بڑی بوڑھیاں زچاؤں کو پسی سونٹھ ڈال کر کھانے کا مشورہ بھی دیتی ہیں۔ (موٹی خواتین صرف ایک چمچ کھا کر اللہ کا شکر ادا کریں)

نگہت رضوی، اسلام آباد

بوائلڈ سلاد

سردیوں میں سبزیوں کی بہار ہوتی ہے لہٰذا اپنے دسترخوان کو ابلی ہوئی سلاد سے سجائیں اور متوازن غذا کا لطف اٹھائیں۔

اشیا: اُبلے ہوئے مٹر، ایک پیالی۔ گاجر، تین عدد۔ چقندر، دو عدد (ثابت اور چھلکے سمیت الگ برتن میں ابال لیں پھر چھلکا اتار کر چوکور کاٹ لیں)۔ شملہ مرچ، دو عدد (صرف ایک دو بھاپ دیں) آلو، دو عدد۔ پھول گوبھی، ایک کپ ابلے ہوئے پھول۔ سفید اور لال لوبیا ابلے ہوئے، آدھا، آدھا کپ۔ انڈے، دو عدد ابلے ہوئے۔ گوار پھلی یا سیم کی پھلی یا فرنچ بینز جو بھی موجود ہو، آدھی پیالی۔ شلجم، دو عدد ابلے ہوئے۔ سلاد کے پتے باریک کاٹ لیں۔ زیتون کا تیل، دو چمچ۔ اخروٹ کی گری، چند عدد۔ سوئٹ کارن (نرم اور ابلے ہوئے بھٹے کے دانے)، آدھی پیالی۔

ترکیب: تمام سبزیاں ابال کر کیوب کی شکل میں یعنی چوکور الگ، الگ کاٹ کر رکھ لیں۔ ایک سلاد کی سرونگ ڈش لیں جو گول یا لمبی ہو اور پھیلی ہوئی ہموار سطح کی ہو۔ اب ایک طرف سے شروع کریں پہلے لوبیا ڈالیں پھر پھول گوبھی، چقندر، آلو، گاجر، شلجم، پھلیاں رکھتی جائیں رنگ کا خاص خیال رکھیں یعنی گاجر اور چقندر اکٹھا مت رکھیں۔ ڈش کے اطراف باریک کٹے ہوئے سلاد کے پتوں کا حاشیہ سا بنالیں اور انڈے لمبائی کی صورت یا گول سلائس کی صورت میں اس پر سجادیں۔ زیتون کا تیل اوپر سے پوری ڈش پر چھڑک دیں۔ پسند کے حساب سے نمک، پسی کالی مرچ، پسا ہوا زیرہ اور لیموں بھی چھڑک سکتی ہیں۔ شروع میں ایک طرف لوبیا رکھے ہیں تو آخر میں مکئی کے ابلے ہوئے دانے سجادیں اور ڈش کے درمیان میں اخروٹ کی گری سجادیں۔ یہ سلاد جتنی خوب صورتی سے پیش کی جائے اتنا ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ تمام اجزا کو مکس کر کے بھی پیش کرسکتی ہیں بس چقندر کا رنگ چونکہ سب پر لگ جاتا ہے اسے مہارت سے شامل کریں۔ پیاری بہنو! یہ سلاد آپ کی دعوت کے مینیو کی شان یقیناً بڑھادے گی۔ مزے سے کھائیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔ پیٹو افراد بون لیس چکن کی بوٹیاں بھی ابال کر شامل کرسکتے ہیں۔

نفیسہ آرا، راس الخیمہ

کچن غزل

میری محبت کو اپنے دل میں ڈھونڈ لینا
اور ہاں آٹے کو اچھی طرح گوندھ لینا
مل جائے اگر پیار تو کھونا نہیں
پیاز کاٹتے وقت رونا نہیں
مجھ سے روٹھ جانے کا بہانہ اچھا ہے
تھوڑی دیر اور پکاؤ گوشت ابھی کچا ہے
مل کے پھر خوشیوں کو بانٹنا ہے
ٹماٹر ذرا باریک ہی کاٹنا ہے
لوگ ہماری محبت سے جل نہ جائیں
چاول ٹائم پہ دیکھ لینا کہیں گل نہ جائیں
کیسی لگی غزل بتا دینا
نمک کم لگے تو اور ملا دینا

مرسلہ: صدف نورین، لاہور کینٹ

سندیسے

پاکیزہ بہنیں



ذکرِ خدا

کون ومکاں کی جلوتیں
ارض وسما کی خلوتیں
سما جاتی ہیں نس نس میں
ذکرِ خدا بن کر

مرسلہ: قرۃ العین سکندر، لاہور

سوچو تو سہی

ایک امیر آدمی کے بیٹے سے استاد نے کہا۔ ''رانا وجاہت پڑھو الف سے انار۔''

وجاہت نے کہا۔ ''پہلے انار لوں گا اسے کھاؤں گا پھر پڑھوں گا۔'' استاد نے یہ بات بچے کے والد تک پہنچادی۔ انہوں نے انار بھیج دیا۔

دوسرے دن استاد نے کہا۔ ''پڑھو ب سے بکری۔''

رانا وجاہت۔ ''پہلے بکری لوں گا پھر پڑھوں گا۔'' استاد نے یہ پیغام اس کے والد کو بھجوادیا اور کہا۔

''ابھی تو بکری بھیج دیں اور یہ سوچ لیں کہ اردو کے قاعدے میں ج سے جہاز آرہا ہے۔''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

محبتوں کے دکھ

محبت چاند بھی بن جائے
تب بھی
من جلاتی ہے
ہمیں انتار لاتی ہے

شاعرہ: افتخار شوق، میاں چنوں

نفرت کیسی

صاف کہہ دیتی ہیں آنکھیں سب کچھ
رازِ دل راز کہاں رہتا ہے
ہائے اس شخص سے نفرت کیسی
جو قریب از رگِ جاں رہتا ہے

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

غلط

ظاہراً انجام اب ہے سامنے
تا بکے یہ جائزے سارے غلط
قامتِ زیبا ہے اس کا اور ہم
غم جو دیکھے ہوگئے سارے غلط
یوں بھی اب عثمان کہتے ہیں غزل
کم ہے مضمون قافیے سارے غلط

شاعر: عثمان صدیقی
مرسلہ: صبا نور، لیہ

گوری اور محبت

گوری کا کوکا
نٹ کھٹ ہے، سب کو
دیتا ہے دھوکا
☆☆
گوری میری جان
تجھ پر صدقے ہوں
میرے سب دیوان

شاعر: ظفر علی راجا
مرسلہ: اینہ عندلیب، سلانوالی

دل والے

یہ المیہ ہے میری زیست کا
جو شخص دل میں رہا سدا
وہی شخص مجھ کو نہ مل سکا

شاعرہ: شائستہ محمد علی، حیدرآباد

سوال

میرے اس سوال پر کہ تم فارغ اوقات میں کیا کرتی ہو اس نے میری جانب دیکھا اور گویا ہوئی۔ ''بیٹھے، بیٹھے یوں ہی اکثر میں اس سوچ میں گم ہوجاتی ہوں کہ میں اکثر کیا سوچتی رہتی ہوں، میں کیا چاہتی ہوں...... اسی سوچ میں سوچ کی دھاریں جانے کس سمت بہہ جاتی ہیں۔ اسی سوچ میں وقت کٹ جاتا ہے مگر سوچ کی سمت کا تعین ہی نہیں ہو پاتا۔ اسی سوچ میں جیے جارہی ہوں کہ شاید وہ لمحہ آجائے کہ میری سوچ کی سمت متعین ہوجائے لیکن......!''

تحریر: مہر و میر، کشمیر

اپنا

نیند آجائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں
کاش صندل سے میری مانگ اجالے آکر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ میں اپنا دیکھوں

مرسلہ: مسز نگہت غفار، کراچی

کردار

اپنے خیالات کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہارے اعمال بن جاتے ہیں۔ اپنے اعمال کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہارا کردار بن جاتے ہیں۔ اپنے کردار کی حفاظت کرو کیونکہ تمہارا کردار تمہاری پہچان ہوتا ہے۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

دیکھتے دیکھتے

قسمت بنانے والے یہ تو نے کیا لکھا
تمام عمر پھروں دربدر یہ تو نے لکھا
پلکوں سے چنتی رہوں کانٹے اپنی راہوں کے
پھر بھی دشوار ہے تمہاری رہ گزر یہ تو نے لکھا

شاعرہ: کاجل شاہ، خانیوال

موسم

بہت حسین لگتا ہے
تمہاری یاد کا موسم
کبھی بادل سا لگتا ہے
کبھی ساون سا لگتا ہے
کبھی یہ گدگداتا ہے
کبھی بہت ہی رُلاتا ہے
مگر پھر بھی یہ بھاتا ہے
تمہارے پیار کا موسم
تمہاری یاد کا موسم

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

خواہش

جو مسکراہٹوں کے واسطے
اندر اپنا مار کر بھی
تم خود گمشدہ رہ گئے
زمانہ اِک نیا دے کر
مگر تم سے یہ کس نے پوچھا
کرن وہ دبی خواہش
لاؤ دکھاؤ پوری کردیں

شاعرہ: انیلا کرن شاہ، گولارچی

☆☆☆

روحانی مشورے



ادارہ

ہر مرض کی دوا

عزیز قارئین آپ درودِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ کوئی دن بغیر درود پڑھے نہ گزرے۔ اپنی دعاؤں کے اول و آخر میں درود پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لازمی پڑھا کریں۔

☆ ہر مرض کا علاج درود شریف پڑھنے میں ہے۔

☆ ہر مرض کی دوا درود پاک ہے۔

اس لیے خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کی تلقین کیجیے۔

اب آیئے پڑھتے ہیں فرشتوں کو تھکا دینے والا درود شریف۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص ایک بار یہ درود پڑھے گا تو اللہ پاک اس مبارک کلمے پر اس کو اتنا ثواب عطا فرماتے ہیں کہ ستر فرشتے ستر دن تک اس کا ثواب لکھیں تو نہ لکھ سکیں اور ایک روایت میں ہے کہ فرشتے ہزار دن تک اس کا ثواب لکھتے لکھتے تھک جائیں گے۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا (سَيِّدَنَا) مُحَمَّدًا مَاهُوَاهلهٗ

ترجمہ: اللہ جل شانہ جزا دے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس بدلے کے وہ مستحق ہیں۔

ہر قسم کی بیماری کا آسان علاج

بے شک ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا ہو آپ کو کوئی بھی بیماری ہو آپ امید کا دامن چھوڑ چکے ہوں تو خوش ہو جایئے اور اپنا یقین اور اپنی امید اللہ تعالیٰ پر پوری رکھیں۔ جس نے ہر مرض کا علاج بتایا ہے اور جو ہر شے پر قادر ہے۔ نماز کی باقاعدگی کیجیے۔ اپنا صدقہ روزانہ دیجیے، بے شک ایک روپیہ یا چنے (اناج) کی ایک مٹھی سے دے دیں۔ سلام پھیلایئے ہر ایک کو سلام کرنے میں پہل کرنے میں سبقت لیجیے۔ بزرگوں کی دعائیں لیجیے اپنے اخلاق کو بہتر بنایئے۔ فجر کی نماز کے بعد 41 بار سورۃ الفاتحہ اول و آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درودِ ابراہیمیؑ کے ساتھ پڑھ کر مریض پر پھونکیں یا مریض خود پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے اور پانی پر پھونک دیں اور یہ دم کیا ہوا پانی مریض اپنے پینے میں استعمال کرے۔ روزانہ یہی عمل کرنا ہے۔ کمرے میں سورۃ رحمٰن کا کیسٹ مستقل لگا رہے۔ آپ دیکھیں گے کہ 41 دن کے بعد ہی بحالی کے آثار نظر آنے شروع ہو جائیں گے جب تک بیماری جڑ سے نہ جائے۔ یہ عمل کرتے رہیں۔ صحت یاب ہو جائیں تو غریبوں کی مدد کریں اور درودِ ابراہیمیؑ کثرت سے پڑھنا اپنی عادت بنالیں کہ ہر مرض کی دوا ہے صلِ علیٰ محمد۔

کاروبار میں ترقی کے لیے

آپ اپنی دکان، آفس، کلینک یا فیکٹری میں جانے کے بعد بسم اللہ شریف سات بار، سورۃ الکوثر تین بار پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے اپنے چہرے پر پھیر لیا کریں اور یہ اپنی عادت بنالیں کہ نمازِ فجر کے بعد ہر روز ایک بار آیت الکرسی اور نماز عشا کے بعد تین بار سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر 19 پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے فراخیِ رزق کی دعا کریں۔ کاروبار میں بے ایمانی سے بچیں۔ اچھے اخلاق ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ سائل کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیں۔ بہت جلد آپ کے کاروباری حالات بہتر ہو جائیں گے۔

بلڈ پریشر کا علاج

اگر آپ کو لو یا ہائی بلڈ پریشر رہتا ہے تو آپ

بازار کا پسا نمک اور بازار کی پسی ہوئی ہلدی استعمال کرنا فوراً بند کر دیں۔ لاہوری نمک کا استعمال کریں۔ خود گھر میں پیسیں یا اپنے سامنے چکی پر پسوا کر رکھ لیں۔ اسی طرح ثابت ہلدی خرید کر پیس کر استعمال کریں یا کچی ہلدی جو شکل میں اروی کی شکل جیسی ہوتی ہے اسے پیس کر اپنے فریج میں رکھ لیں اور اسے اپنے کھانوں میں استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ جب بھی آپ اپنا کھانا بنائیں درودِ ابراہیمیؑ صرف تین بار پڑھ کر دم کر دیا کریں۔ آپ خود دیکھیں گے کہ بلڈ پریشر آپ کا نارمل رہتا ہے۔

اچھی اسکن کے لیے

رات کو جلدی سوئیں اور صبح سویرے اٹھیں۔ پانی زیادہ پئیں۔ موسمی، گاجر اور چقندر کا جوس پیا کریں۔ مرغن کھانے، مٹھائیاں، بیکری کے آئٹم اور ڈرائی فروٹ بند کر دیں۔ صرف پھل اور سبزی کھائیں۔ خوش رہیں اور خوش رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح **یَا اَللّٰہُ یَا مَالِکُ یَا مُصَوِّرُ** پڑھا کریں یقینی افاقہ ہوگا۔

ایک اچھی عادت

آپ جب رات کو سونے کے لیے لیٹیں تو دل میں یہ ضرور سوچیں کہ آج آپ نے کوئی اچھا کام کیا ہے یا نہیں۔ استغفار، درودِ ابراہیمیؑ، چاروں قل، آیت الکرسی اور صرف سات مرتبہ یا خبیر پڑھ لیا کریں اور صرف تین ماہ بعد مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے حالات کی بہتری میں ہر لحاظ سے کتنے فی صد افاقہ ہوا ہے۔

انمول خزانے کی دعا

قرآن پاک کی پانچ آیات اور ایک دعا کل چھ چیزیں ایسے غیبی روحانی اثرات رکھتی ہیں جن کا اندازہ آپ کو خود پڑھنے کے بعد ہو جائے گا۔

پہلے خزانے کے فضائل وفوائد

مندرجہ ذیل چھ دعاؤں کو پہلے درودِ ابراہیمیؑ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ ہر فرض نماز کے بعد پڑھیں۔ وہ چھ دعائیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ سورۃ الفاتحہ (پارہ نمبر 1)

2۔ آیت الکرسی (پارہ نمبر 3، سورۃ البقرہ آیت 255)

3۔ **شَهِدَ اللّٰهُ** سے **حِسَاب** تک (پارہ نمبر 3، سورۃ آل عمران آیت (18.19)

4۔ **قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ** سے **حِسَاب** تک (پارہ 3، سورۃ آل عمران آیت نمبر 27-26)

5۔ **لَقَدْ جَاءَكُمْ** سے آخر تک (پارہ 11 سورۃ التوبہ، آیت 129-128)

6۔ دعائے ابودرداء یا حادثات سے بچنے کی دعا۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَلَيْكَ سے **اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** تک (کتاب الاسماء والصفات، صفحہ 125)

نوٹ: مندرجہ بالا تمام دعائیں پڑھنے سے لاعلاج مریضوں کو شفا ہوگی اور بگڑے ہوئے کام سنور جائیں گے انشاء اللہ خود بھی پڑھیں اور لوگوں کو بھی بتائیں۔

انمول خزانہ نمبر 2

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

یَا لَطِیفًا بِخَلْقِهٖ

یَا عَلِیمًا بِخَلْقِهٖ

یَا خَبِیرًا بِخَلْقِهٖ

اُلْطُفْ بِیْ یَا لَطِیْفُ یَا عَلِیْمُ یَا خَبِیْرُ ○

عزیز قارئین! یہ وظیفہ آپ ہر نماز کے بعد پڑھیں (بے شمار پڑھیں) اسے آپ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، وضو بے وضو ہر حال میں پڑھیں۔ جب آپ اسے باقاعدگی سے پڑھیں گے تو آپ کو اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کی برسات میں سیراب ہونے کا خود موقع ملے گا انشاء اللہ۔ بزرگوں نے اس وظیفے کے لیے فرمایا ہے۔

"یہ وہ تحفہ ہے جو ہمیشہ کام آنے والا ہے۔ جب کسی کو کوئی تنگی پیش آئے یا کوئی آفت نازل ہو تو ان کو پڑھ لیا کرو۔ تنگی دفع ہو جائے گی اور آفت سے خلاصی ہوگی انشاء اللہ۔"

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں۔ پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

قبل از وقت سر کے سفید بال

عبدالمنان فیصل آباد

میری عمر 19 سال ہے میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے بال سفید ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ میرے سر میں خشکی زیادہ نہیں ہے۔ جب یہ مسئلہ ہوا

تو Dermetologist کو دکھایا لیکن اس نے امید ہی توڑ دی اور کہا جتنے سفید ہوگئے ہیں یہ سفید رہیں گے اور باقی کو سفید ہونے سے روکا جاسکتا ہے، یہ نہیں بتایا کہ یہ کیوں ہوا؟ دوائیاں بہت مہنگی تھیں۔ سب دوائیاں Supplements تھیں۔ زیادہ مہنگی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ اب آپ بتائیں اس کا کیا حل ہے۔

جواب: قبل از وقت بالوں کا سفید ہونا۔ اس کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ رطوباتِ جسمانی کا نکلنا (احتلام / جلق) خون کا بہنا / متوازن غذا کا استعمال نہ کرنا جس کی وجہ سے جسم میں مختلف وٹامنز کی کمی واقع ہوجاتی ہے۔ شیمپو، تیل، بالوں کو گندا رکھنا وغیرہ۔ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Jaborandi-Q کے 7 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں لیں۔ Thyroidinum 30 اور Lycopodium30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں استعمال کریں۔

اے مینوریا

زارا، فرانس

میں ڈھائی مہینے سے دوا کھا رہی ہوں لیکن مینسز ابھی تک نہیں آئے، اسپاٹنگ ہورہی ہے، لیکن گردن پر جو موٹے بال تھے وہ باریک ہوگئے ہیں اور تھوڑے کم ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب پہلے بھی مجھے چھ ماہ کے بعد جواب ملا۔ میں پریشان ہوں کہ لیٹ جواب ملا تو دوا کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا میں فرانس میں رہتی ہوں اور دوا پاکستان سے منگوانا پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے ایڈریس پر جواب دے دیں یا ای میل سے رابطہ کریں یا پلیز فون نمبر دیں کہ ایمرجنسی میں رابطہ ہوسکے۔ ڈاکٹر صاحب ساری عمر دعائیں دوں گی خدا کے لیے جلد از جلد جواب دیں۔

جواب: یقیناً ہمارے ڈاک کے سسٹم کی وجہ سے مجھے آپ کا پہلا خط دیر سے ملا اب یہ خط بھی مجھے دسمبر کے آخر میں ملا ہے اور میں اس کا جواب بھی دے رہا ہوں۔ آپ میرے اس ایڈریس پر رابطہ کرسکتی ہیں hdrzubairahmad@yahoo.com بہر حال آپ Pulsatilla IM کی ایک خوراک پہلے لیں پھر اس کے دو دن بعد سے Ferr.Phos 30 Calc.Phos 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں جبکہ Ashoka Q کے 10 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ تک Puls-IM کی ہر ماہ ایک خوراک لیں، مینسز شروع ہونے پر Puls روک دیں گی۔

یادداشت نفسیاتی مسئلہ

مسز حسین کراچی

میرا بیٹا مجتبیٰ حسین جو کہ پڑھائی میں بہت کمزور ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اُسے بہت کوشش

کے باوجود پڑھا ہوا بھول جاتا ہے۔ ویسے اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ اسے نسوار کھانے کی بھی عادت ہے۔ بہت سمجھایا ہے، اس کو چھوڑنے میں آپ ہماری مدد فرمائیں۔ اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔

جواب: آپ کا بیٹا نسوار کیوں کھاتا ہے گھر میں کوئی نسوار کھانے والا ہے؟ یا اس کا کوئی دوست؟ کب سے کھا رہا ہے؟ نسوار کھانا ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔ یادداشت کی کمزوری بیماری ہی نہیں بلکہ عدم توجہ کی وجہ سے بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ اس کو کلینک پر لاکر دکھائیں، پہلے فون کر کے وقت لیں۔ مندرجہ ذیل دوائیاں استعمال کریں۔ ایک گولی دن میں 3 مرتبہ پانی کے ساتھ لیں CRATEX کی اور AvenaSat Q کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بستر پر پیشاب

بلقیس عبدالرزاق، فیصل آباد

میری بیٹی بستر پر پیشاب کردیتی ہے، وہ ساڑھے تین سال کی تھی تو اسے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا اس سے پہلے یہ مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ بیماری کے بعد شاید اس کا مثانہ کمزور ہوگیا ہے۔ بہت سے ڈاکٹروں سے دوا لے چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آپ برائے مہربانی میرا یہ مسئلہ حل کردیں اور یہ بھی بتادیں کہ یہ دوا کہاں سے ملے گی۔

جواب:۔ کیا وہ پیشاب کرنے کے بعد سوتی رہتی ہے؟ روزانہ کرتی ہے؟ وہ نیند کے کس حصے میں کرتی ہے، شروع / درمیان / آخر؟ نیند میں ڈرتی تو نہیں ہے؟ نیند میں کروٹیں لیتی رہتی ہے؟ کمرے کا درجہ حرارت ٹھنڈا تو نہیں؟ بچی کو سونے سے 2 گھنٹے پہلے کوئی بھی پینے کی چیز نہ دیں اور سونے سے پہلے

پیشاب کرا کر سلائیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد حال بتائیں۔Calc.Phos30,Rhustox30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔آپ کو یہ ادویات کسی بھی ہومیو پیتھک اسٹور سے مل جائیں گی۔

لیکوریا

آمنہ چوہدری، لاہور

مجھے کافی عرصہ یعنی دو تین سال سے لیکوریا کی شکایت ہے جو کہ بعض اوقات بہت شدید ہوجاتی ہے۔ مجھے مینسز بھی بے قاعدگی سے آتے ہیں، کبھی ڈیڑھ دو ماہ بھی گزر جاتے ہیں اور کبھی کبھار جما ہوا خون آتا ہے۔میری کمر میں بہت درد بھی ہوتا ہے۔میرے جسم اور چہرے پر بہت گھنے بال ہیں۔ میرے چہرے پر پیپ والے دانے نکلتے ہیں بعض دانے نشان چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے ان سب مسائل کے لیے کبھی کوئی دوائی نہیں لی۔ بعض اوقات سرخ دانے بھی نکلتے ہیں۔کیا میرے چہرے اور جسم کے بال ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے اور مجھے کتنا عرصہ دوائیں کھانی پڑیں گی۔پلیز رنگ صاف کرنے کے لیے بھی کچھ بتادیں۔ میرے چہرے کا رنگ سانولا ہے پلیز اس کے لیے بھی کچھ بتادیں۔

جواب:۔اپنی سوچ کو ہمیشہ مثبت رکھیں، نماز کی پابندی کیا کریں۔متوازن غذا استعمال کریں اور ورزش کیا کریں، صبح سویرے کی دھوپ لیا کریں۔ مرغن کھانوں، جنک فوڈ سے پرہیز کریں۔تازہ پھل اور سبزیاں خوب کھایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں کم از کم 3 ماہ تک Pulsatilla 30 , Calc. Carb 30 کے 5,5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Asterias rubens 30 کے بھی 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔آئندہ جب خط لکھیں تو لیکوریا کے متعلق بتائیے گا کہ یہ کب زیادہ ہوتا ہے، مینسز سے پہلے یا بعد یا چلنے پھرنے سے یا خواب وخیالات سے اس کا کوئی تعلق ہے؟

سر کے بال اور نظر کی کمزوری

فاطمہ زہرہ، ملتان

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بڑھ نہیں رہے جبکہ میری خوراک بھی ٹھیک ہے۔میرے بال بہت پتلے ہوگئے ہیں اب تو لچھوں کی صورت میں اترتے ہیں میری تمام دوستیں جو میرے ساتھ تھیں ان کی چوٹیاں بن گئی ہیں جبکہ میرے بال کندھے سے نیچے نہیں ہیں اور ان بالوں کے آخر میں دو منہ کے ہوجاتے ہیں یہ اتنے پتلے اور چھوٹے ہیں کہ مجھے دوپٹا اتارتے ہوئے شرم آتی ہے۔برائے مہربانی میری مدد کریں مجھے کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے میرے سر کے بال لمبے اور موٹے ہوجائیں اور مجھے ڈر ہے کہ دوا کے استعمال سے میرے جسم یا چہرے کے بال نہ بڑے ہوجائیں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عینک لگی ہوئی ہے جو کہ 1. ہے لیکن مجھے آنکھ کے اندر بھی درد ہوتا ہے اور دھندلا نظر آتا ہے کیا میری عینک ہٹ سکتی ہے آنکھ کے درد کی وجہ سے سر میں بھی درد ہوتا ہے لیکن یہ کبھی کبھی ہوتا ہے میں چونکہ طالبہ ہوں مجھے پڑھنا ہوتا ہے آپ ایسی کوئی دوا بتائیں جس سے میری نظر ٹھیک ہوجائے آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

جواب: بی بی آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ متوازن غذا کا خیال رکھیں، ورزش کیا کریں۔ پھل گاجر سیب کا استعمال زیادہ کریں، روزانہ صبح نہار منہ 7 بادام کھایا کریں۔سر میں لگانے کے لیے زیتون کا تیل استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے کی مندرجہ ذیل دوائیں ایک ماہ تک استعمال کریں۔ Cantharis30, Ruta 30, Calc Flour 30 , Physostigma30 کے

5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

جوڑوں کا درد

محمد اعجاز، فیصل آباد

پاکیزہ شمارہ فروری 2013 صفحہ 305 اور 306 میڈیکل کے مفید مشورے نظروں سے گزرا، میں ریلوے ملازم ریٹائرڈ ہوں عمر 60 سال ہے اور جوڑں کے درد میں عرصے سے مبتلا ہوں۔ جو بھی تشخیص اور علامات کتاب میں تحریر ہیں ہو بہو بالکل سطور کے مطابق میرے جوڑوں کی تکلیف کی یہی علامات ہیں۔ میڈیکل رپورٹ کی کاپیاں ارسال کررہا ہوں۔

جواب :۔ ڈاکٹر شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل دوائیاں ایک ماہ تک استعمال کریں پھر حال بتائیں۔

Rhustox 30 , Bryonia 30, Calc.Carb 30 کے 5 . 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں ہر دو گھنٹے بعد استعمال کریں پہلے ہفتے پھر دوسرے ہفتے سے دن میں 4 مرتبہ استعمال کریں۔

بہت سارے مسائل

سحر حفیظ، لاہور

شادی شدہ ہوں۔ 1 سال سات ماہ کی بیٹی ہے۔میرے بہت سے مسائل ہیں۔میں بہت کمزور ہوں کوئی بھی کام کروں تو تھک جاتی ہوں۔ پٹھوں میں ہر وقت درد رہتا ہے۔لیکوریا کا بھی مسئلہ ہے کبھی بہت زیادہ ہوجاتا ہے کبھی خود ہی رُک جاتا ہے۔ میری ٹانگوں اور کمر میں بھی بہت درد رہتا ہے۔ بھوک بھی کم لگتی ہے اگر بھوک لگے بھی تو کھانے کو دل نہیں کرتا۔ بلڈ پریشر ہر وقت کم رہتا ہے۔سر کے بال بھی بہت پہلے سفید ہونا شروع ہوگئے تھے۔اب تو آدھے بال سفید ہوگئے ہیں۔ بال بہت گرتے



ہیں ۔ جسم بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا ہے۔ لیکوریا گاڑھا دودھیا کلر کا ہوتا ہے۔کسی وقت خارش بھی ہوتی ہے۔تقریباً 4 ماہ سے میری گردن کے دائیں طرف ایک بیر کے سائز کی گلٹی بنی ہے۔ پہلے اس میں درد اور کھنچاؤ تھا۔ایلو پیتھک دوائی تقریباً 1 ماہ استعمال کی اس سے درد تو ٹھیک ہوگیا لیکن گلٹی ختم نہیں ہوئی۔

جواب :۔مشورے کے لیے رپورٹس اور مکمل احوال کا ہونا ضروری ہے بلکہ مریض کو دیکھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ HbA1.C, ICT TB, CBC, VDRL ٹیسٹ کی رپورٹس بھیجیں۔ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

صرف ایک خوراک Medorrhinum1M کے 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں لیں پھر 3 دن بعد Gelsemium30Calc. Flour 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد 1/2 گلاس پانی میں 10 قطرے Alfalfa Q کے 3 مرتبہ لیں۔

انسانی غلطی

سوال: میری عمر 25 سال ہے ۔میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی برباد کردی ہے ۔اب احتلام جریان سرعت انزال بھی ہے۔ کمر اور ٹانگوں میں درد ہوتا ہے اور عضوِ خاص بھی کمزور ہوچکا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہوں۔ روز بروز لاغر اور کمزور ہوتا جا رہا ہوں اور وزن بھی بہت کم ہوچکا ہے۔آنکھیں اندر کو چلی گئی ہیں اور بہت زیادہ دبلا ہوگیا ہوں۔

جواب :۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے مزید نقصان سے بچانے کے لیے سزا ملتی ہے کہ سدھر جاؤ

توبہ کرو اور مسلسل غلطی سے بچو۔ اپنی بیوی تک ہی محدود رہیں۔ بچے کی اچھی تعلیم و تربیت کی فکر کریں۔ نماز کی پابندی کریں۔ اچھے لوگوں کی صحبت میں رہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔

Staphisagria 30,

AgnusCast 30, اور China 30 کے 5,5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد Alfalfa Q کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بغلوں میں پسینا

ماہ نور ثاقب، پشاور

میں پہلی مرتبہ اپنا مسئلہ آپ کے سامنے لے کر حاضر ہو رہی ہوں، امید ہے کہ آپ کا بورڈ رہنمائی کرے گا۔ مجھے پسینا بہت آتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ گرمی ہو یا سردی مجھے بغلوں میں بہت پسینا آتا ہے اور پسینا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت پہلے سے ہے۔ میرا وزن پہلے 56 تھا مگر اب 65 ہو گیا ہے۔ پسینے میں عجیب سی بو ہوتی ہے۔ میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی اور پاکیزہ کے توسط سے آپ نے انسانیت کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

جواب: ۔ بی بی وزن کم کریں، ورزش کیا کریں اور مرغن اور جنک فوڈ سے پرہیز کریں، کولڈ ڈرنکس کا استعمال نہ کریں۔ Sulphur200 کی صرف ایک خوراک صبح نہار منہ لیں اور ایک دن بعد Calc.Phos 30 کے 5.5 قطرے 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بچے کی پیدائش کے بعد ماہواری کا نہ ہونا

فاطمہ صفدر، کراچی

آپ کی بہت تعریف سنی ہے آج آپ کو اپنا مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ میرا 10 مہینے سے ماہواری کا مسئلہ ہے۔ 10 ماہ کا بیٹا ہے جب سے بیٹا ہوا ہے تو ہر مہینے ماہواری سے لیٹ ہوتی ہوں۔ ہر وقت چکر آتے رہتے ہیں تمام ٹیسٹ الٹراساؤنڈ کروا لیے سب ٹھیک ہیں۔ میرا وزن بہت زیادہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ میں نے بہت ڈاکٹروں سے علاج کروایا ہے پر وقتی آرام ہوتا ہے پھر سب ویسے ہی ہو جاتا ہے۔ میں بیٹے کو اپنا دودھ پلاتی ہوں اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا پہلے بھی دو بیٹے ہیں۔ تینوں بچے نارمل ڈلیوری سے ہوئے ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے وزن کم کرنے اور ماہواری ٹھیک کرنے کی دوا دیں۔ مجھے پانی کی بھی شکایت ہے۔

جواب: آپ نے کون سے ٹیسٹ کروائے ہیں آ کر ملیں۔ وزن کتنا ہے۔ جب بچے کو دودھ پلایا جاتا ہے تو اس میں ایسا ہوتا ہے، چکر آنے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں متوازن غذا کا استعمال کریں۔ پانی کی شکایت کے متعلق بھی بیان کریں۔ پانی کا رنگ، حالت کیسی ہے، کس مقدار میں آتا ہے، جلن، خارش ہوتی ہے؟ فی الحال 15 دن تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Calc.Phos 30, Pulsatilla30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

***